وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

شمائل نبویہ کا سرچشمہ

ترجمہ

مِن مَعِين الشَّمائِل

مؤلفہ

شیخ صالح احمد شامی حفظہ اللہ

از

شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الٰہ آبادي دامت برکاتہم

ناشر

مکتبہ دار المعارف الہ آباد،

وادارہ معارف مصلح الامتؒ الہ آباد

کتاب سے متعلق ضروری معلومات

نام کتاب　:　شمائل نبویہ کا سرچشمہ

ترجمہ　:　شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمرالزمان صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم

تعداد صفحات　:　۶۰۰

تعداد اشاعت　:　۱۱۰۰

سن اشاعت　:　رجب المرجب ۱۴۴۵ھ مطابق فروری ۲۰۲۴ء

باہتمام　:　مولانا محمد عبداللہ قمرالزمان قاسمی الہ آبادی

مراجعت　:　مولانا عبدالقدوس نیرانوی قاسمی، استاذ دارالعلوم زکریا، ساؤتھ افریقہ

کمپوزنگ　:　مولانا عبدالرحمٰن قاسمیؔ ندوی

ناشر　:　مکتبہ دارالمعارف الہ آباد، وادارہ معارف مصلح الامتؒ الہ آباد

ملنے کے پتے:

(۱) امکتبہ دارالمعارف الہ آباد، بی/۶۳۹ وصی آباد، الہ آباد، یوپی، ۲۱۱۰۰۳

(۲) مکتبہ فیضان قمر ٹائم ٹو ٹائم دکان نمبر ۷ ایس ڈی چال، بہرام باغ روڈ، جوگیشوری، ممبئی

(۳) مکتبہ رحمانیہ، دارالعلوم عربیہ اسلامیہ بھروچ، محمود نگر کنتھاریہ، بھروچ، گجرات

(۴) قاضی بکڈپو، بالمقابل بڑی مسجد (مرکز) رانی تلاؤ، سورت، گجرات ۳۹۵۰۰۳

(۵) مکتبہ النور دیوبند ☆مکتبہ صدیق دیوبند

(۶) الفرقان بکڈپو، ۳۱/۱۱۴ نظیر آباد، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

يَا أَشرَفُ! مُرسَلًا كَرِيمًا ۞ مَا أَلطَفَ هٰذِى الشَّمَائِل!
مَنْ يَسْمَعْ وَصْفَهَا تَرَاهُ ۞ كَالغُصْنِ مَعَ النَّسِيمِ مَائِل

(الزركشيؒ)

(صلى الله عليه وأله وبارك وسَلِّمْ)

اے وہ ذاتِ گرامی! جو سب سے اشرف ہیں، حاملِ رسالت، (ذات و صفات میں) کریم ہیں، آپ کی یہ ادائیں کس قدر پر لطف (پیاری ہیں)!!!

جو بھی ان شمائل کی خوبی سنے گا، تو دیکھے گا کہ وہ بے خودی میں جھوم رہا ہے، جیسے: ٹہنی نسیمِ صبا کے ساتھ۔

أَخِلَّائِي إِنْ شَطَّ الحَبِيبُ وَرَبْعُهُ ۞ وَعَزَّ تَلَاقِيهِ وَنَاءَتْ مَنَازِلُهُ
وَفَاتَكُمْ أَنْ تُبْصِرُوهُ بِعَيْنِكُمْ ۞ فَمَا فَاتَكُمْ مِنْهُ، فَهٰذِى شَمَائِلُهُ

(للشيخ محمد الجزري قُدِّسَ سِرُّه)

یارو! اگر محبوب اور اُن کا درِ دولت دور جا پڑا ہے،
اور اُن کی ملاقات دشوار اور رہائش گاہیں فاصلوں پر واقع ہیں۔
اور بچشم خود اُن کا دیدار نہ ہو سکا (افسردہ خاطر نہ ہوں)،
سو تمہارا کچھ نہیں گیا، یہ ہیں ان کی پیاری ادائیں۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک روز عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین پر دس آدمی بھی ایسے نہیں ہیں، جن کو میں نے آزمایا نہ ہو، لیکن اے آقائے کریم (صلی اللہ علیہ وسلم!) میں نے آپ سے زیادہ مال خرچ کرنے والا اور کسی کو نہیں پایا۔ (سنن دارمیؒ)

بحرِ سخا ہیں اور سمندر ہیں جُود کا ۞ لطف و کرم کی موج، یہ شانِ حضور ہے (ﷺ)

(حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی)

محمد بشر لاكا البشر
بل هو كالياقوت بين الحجر

فہرست مضامین

پہلا مقصد:

نسب شریف اور قرابتِ طاہرہ

دوسرا مقصد

رسول اللہ ﷺ کے اوصاف اور آپ کی شکل وصورت

تیسرا مقصد

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق وخصائل

چوتھا مقصد

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اخلاقِ رذیلہ سے نزاہت

پانچواں مقصد

آنحضرت ﷺ کے آداب کے بیان میں

چھٹا مقصد

لازمی ضروریات کی فراہمی میں آپ کی سیرت مبارکہ

ساتواں مقصد

کھلم کھلا ڈرانے والا

آٹھواں مقصد

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کا ایک گوشہ

نواں مقصد

جو معاشرہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم فرمایا

دسواں مقصد

مسلمانوں پر نبی ﷺ کے حقوق

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت وکامرانی اور دنیا وآخرت کی سعادت کے لیے نبیوں کی بعثت کا مبارک سلسلہ شروع فرمایا، یکے بعد دیگرے بڑی تعداد میں انبیائے کرام بھیجے گئے جنہوں نے دنیا میں آکر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بلایا، ان کے عقائد واعمال اور اخلاق وعادات کو درست کیا اور اپنے اپنے دائرہ کار اور زمانے میں انسان کو خدا سے مربوط کرنے، اسے تعلیمات خداوندی، آخرت میں حساب وکتاب اور جزاوسزا کے عمل سے روشناس کرنے کی کوششیں فرمائیں۔ پھر باری آئی اس سلسلے کو ختم کرنے کی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو نبی بنا کر مبعوث فرما کر تا قیامت تمام انسانوں کی ہدایت ونجات کا سامان کیا۔ آپ ﷺ کی ولادت وبعثت انسانی تاریخ کا سب سے عظیم الشان اور منفرد واقعہ ہے اور اس واقعے نے سارے عالم کو ایک غیر معمولی، بے نظیر اور خوشگوار انقلاب سے ہمکنار کیا۔ آپ ﷺ کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام خوبیاں اور کمالات رکھ دیے جو آپ سے پہلے مختلف نبیوں کو عطا کیے گئے تھے، مکارم اخلاق، احسان وکرم، عفو ودر گزر، تحمل وبردباری، تواضع وانکساری، شجاعت وبہادری، شرم وحیا، نرم دلی وخیر خواہی وغیرہ جیسے اوصاف حمیدہ میں آپ ﷺ کا جو مقام تھا وہاں تک اہل ذہانت کی ذہانت اور شعراء کے خیال وتصور کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اگر ان صفات اور ان پر مبنی واقعات کا بیان ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہو کر کمال تواتر، غیر معمولی اسنادی تسلسل اور پورے انضباط وارتباط کے ساتھ وجود میں نہ آتا تو آج لوگوں کو یقین کرنا مشکل ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے خود آپ کی صفات حمیدہ اور مکارم اخلاق پر یہ فرما کر مہر لگادی ہے:

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ — بے شک آپ بہت عظیم اخلاق کے حامل ہیں [۱]۔

---

(۱) سورۃ القلم: ۴

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

أدبنی ربی فأحسن تأدیبی میری تربیت اللہ تعالیٰ نے فرمائی اور بہترین فرمائی ہے[1]۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن الله بعثنی لتمام مکارم الأخلاق و کمال محاسن الأفعال. اللہ تعالیٰ نے مجھے مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا، انھوں نے کہا:

کان خلقه القرآن آپ ﷺ اخلاق میں قرآن کا مجسم قرآن تھے[3]۔

بس اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ تمام اوصاف و خصائل جو انسانیت نوازی کی مثال سمجھے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے کسی انسان کی مدح وثنا کی جاتی ہے وہ آپ ﷺ کی ذات کے اندر کامل واکمل درجے میں پائے جاتے تھے۔

ہمارے نبی ﷺ کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے اپنے بعد کے تمام مسلمانوں بلکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے ایک عملی نمونہ چھوڑا جسے اللہ تعالیٰ نے "اسوۂ حسنہ" سے تعبیر فرمایا یعنی انسان کی دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کے لیے ایک کامل و مکمل نمونہ یہ دراصل اس بات کی دعوت ہے کہ مسلمان جو محمد ﷺ کی رسالت اور آپ ﷺ کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس نمونے کو اپنی زندگی میں اختیار کریں اور اسی کے مطابق زندگی گزاریں۔

آنحضرت ﷺ کی شخصیت کا یہ نمونہ ایک کامل، عالمگیر، لافانی ولاثانی نمونہ ہے جو تمام انسانی طبقات کے لیے ہے اور ہر ماحول، ہر زمانے، ہر پیشے، ہر قسم کے حالات اور ہر سطح و معیار کے لیے بنایا گیا ہے۔ اسی باعث آپ ﷺ کے حالات و کوائف، اخبار و آثار، اخلاق و شمائل، عادات و خصائل، اقوال واعمال، سیرت و کردار، رفتار و گفتار، غرض زندگی کے تمام لمحات حیات کی ایک ایک ادا کو پوری دیانت وامانت اور باریک بینی و دقیقہ رسی کے ساتھ قلم بند کرنے کی آپ کے متبعین کو اللہ تعالیٰ کی

---

(۱) الجامع الصغیر للسیوطی ۱/۲۱

(۲) مصابیح السنن للبغوی رقم: ۴۴۹۰

(۳) مسند أحمد رقم: ۲۵۸۱۳

طرف سے خاص توفیق بخشی گئی جس کی بدولت آپ ﷺ کی سیرت وتاریخ، جلوت وخلوت، نشست وبرخاست اور زندگی کے ایک ایک لمحے کا وہ عظیم الشان ذخیرہ جمع ہو گیا جس کی نظیر سے بلا استثناء تاریخ عالم خالی ہے۔ جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سب کچھ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ عین منشائے الٰہی کے مطابق وجود میں آیا ہے۔

مسلمانوں کو اسی اسوۂ حسنہ کی طرف بلانے اور اسے اپنی عملی زندگی میں برپا کرنے کی ترغیب دینے کے لیے علمائے اسلام اور محدثین کرام وسیرت نگاروں نے ہر زمانے میں شمائلِ نبوی ﷺ اور اخلاقِ نبوی ﷺ پر مستقل کتابیں مرتب کرنے کا اہتمام فرمایا ہے، تاکہ مسلمان حضورِ اکرم ﷺ کی زندگی واخلاق سے بآسانی واقفیت حاصل کر سکیں اور آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو اپنا کر اپنی دنیا وآخرت کو سنوارنے کا اہتمام کر سکیں۔ اب تک شمائلِ نبوی ﷺ پر سیکڑوں کتابیں تالیف کی جا چکی ہیں، جن میں امام ترمذی کی "الشمائل المحمدیۃ" اور اس کی مختلف شروح اور قاضی عیاض کی کتاب "الشفا" اور اس کی تشریح میں لکھی جانے والی درجنوں کتابیں خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی عربی سمیت دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں اخلاقِ نبوی ﷺ پر کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے ایک دنیا استفادہ کر رہی ہے۔

اسی زریں سلسلے کی ایک کڑی یہ کتاب "من معین الشمائل" ہے جس کے مؤلف معروف محدث شیخ صالح احمد شامی ہیں۔ شیخ صالح موجودہ عہد کے نابغۂ روزگار محدث ہیں، جنھوں نے صحیحین کے علاوہ علم حدیث کی کئی دیگر کتابوں پر قابل قدر کام کیا ہے۔ ان کی کتاب "معالم السنۃ النبویۃ" ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں انھوں نے چودہ امہاتِ کتب حدیث کے وہ مضامین منتخب کر کے جمع کر دیے ہیں، جن کا تعلق عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات جیسے امور سے ہے اور جو ہر مسلمان کے لیے نہایت مفید ہیں۔ "السیرۃ النبویۃ فی بیتہ" ان کی نہایت اہم کتاب ہے، جس میں انھوں نے آپ ﷺ کی خانگی زندگی کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب بھی ان کا ایک قابلِ قدر علمی کارنامہ اور ایک بڑی مبارک خدمت ہے، جس میں انھوں نے غیر معمولی دقتِ نظری سے کام لیتے ہوئے اخلاق وشمائل نبویہ سے متعلق تمام احادیث وآثار وواقعات کو جمع کیا ہے اور زندگی کے تقریباً تمام ہی شعبوں میں آپ ﷺ نے امت کو

جو ہدایات دی ہیں، جن عادات واخلاق کو اپنانے کا حکم دیا ہے اور جن چیزوں سے روکا ہے ان سب کی تشریح وتوضیح پیش کی ہے۔ مواد کی ترتیب بھی قابل تعریف ہے۔ کتاب کو کل دس ابواب میں منقسم کیا گیا ہے اور (۱) پہلے باب میں آپ ﷺ کے نسب شریف اور قرابت داری کا بیان ہے، (۲) دوسرا باب آپ ﷺ کے حلیہ شریف کی تفصیلات پر مشتمل ہے، (۳) تیسرے باب میں آپ ﷺ کے اخلاق وشمائل کا تذکرہ ہے، (۴) چوتھا باب برے اخلاق سے آپ ﷺ کے احتراز اور پاکیزگی کو بیان کرتا ہے۔ (۵) پانچواں باب حضور پاک ﷺ کے آدابِ زندگی پر مشتمل ہے جس سے ہمیں زندگی گزارنے کا نبوی طریقہ وسلیقہ معلوم ہوتا ہے، (۶) چھٹے باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ اپنی ضروریات کی تکمیل میں کیا طریقہ اختیار فرماتے تھے۔ (۷) ساتواں باب ان چیزوں کے بیان پر مشتمل ہے جن سے آپ ﷺ نے اپنی امت کو ڈرایا اور ان سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ (۸) آٹھویں باب میں آپ ﷺ کے شب وروز کی عبادات کا بیان ہے۔ (۹) نواں باب اُس معاشرے کی منظر کشی کرتا ہے جسے آپ ﷺ نے اپنی جدوجہد سے تشکیل دیا اور جو دنیا کا سب سے مکمل اور خوبصورت معاشرہ تھا۔ کتاب کے دسویں اور آخری باب میں امت پر آپ ﷺ کے حقوق کا تذکرہ ہے۔ مؤلف نے ہر باب کو مختلف فصلوں میں تقسیم کیا ہے اور متعلقہ موضوع پر صحیح ومستند مرویات واحادیث کے حوالوں کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

شمائل واخلاق نبویہ پر مشتمل ایسی عمدہ، جامع اور مستند کتاب اس لائق تھی کہ اردو زبان میں بھی اس کا ترجمہ کیا جائے اور اس کی افادیت کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

ہم سب کے لیے یہ انتہائی مسرت وسعادت کی بات ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس مبارک کام کے لیے ہمارے شیخ ومرشد، عالم ربانی، مصلح کبیر، شریعت وطریقت کی جامع شخصیت، دین حق کے عظیم اور بے لوث داعی عارف باللہ حضرت مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی دامت برکاتہم کا انتخاب فرمایا اور آپ کو توفیق بخشی کہ اس ضخیم اور انتہائی مفید وضروری کتاب کا ترجمہ کر کے اسے اردو داں حلقے میں بھی پیش فرمائیں تاکہ مسلم معاشرہ کے سامنے اس کی اصلاح وتربیت اور رفعت وبلندی کے لیے سرور کائنات محمد ﷺ کی سیرت طیبہ اور آپ کے اخلاق وشمائل کا ایک صاف شفاف آئینہ رکھ دیا جائے جس کو سامنے رکھ کر لوگ اپنی زندگی کے کاکل وگیسو سنواریں اور نبوی اخلاق وتعلیمات کے اس جامع ترین مرقعے سے فیضیاب اور حسین ترین گلدستے کی خوشبو سے اپنے مشام جان کو معطر کریں۔ بلاشبہ حضرت

والا کی ذات گرامی عہد حاضر میں ایسا چشمہ فیض ہے جس سے نہ صرف ہندوستان، بلکہ افریقہ، یوروپ اور امریکا کے دور دراز خطوں سے طالبان رشد وہدایت بالخصوص اہل علم آپ کی خدمت میں پہنچ کر کسب فیض کر رہے ہیں۔ اور آپ مکمل خاموشی، انتہائی یکسوئی اور کمالِ اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ خلقِ خدا کی ہدایت واصلاح کے کارِ عظیم میں ہمہ تن مصروف ہیں، آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنے والوں اور ان کی مجالسِ اصلاح سے فیض پانے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ آپ کی شخصیت اپنے وفور علم وفضل، ورع وتقویٰ، تواضع وانکساری، اخلاص وپاک نفسی، سادگی وبے تکلفی، حلم وبردباری، سچی انسانیت، اعتدال وتوازن، گروہی تعصب وتحزب سے بالاتر ہو کر اپنے اور غیروں کے تئیں ہم دردی وخیر خواہی اور بلند اخلاقی جیسی خصوصیات کی جامع ہونے کے ساتھ ساتھ امت کی فکر اور اس کی اصلاح کی تدابیر کے لیے نوے سال کی عمر کے اس مرحلے میں بھی اسی طرح سر گرم عمل ہے جس طرح کہ نوجوانی میں، اس کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق اور آپ کی کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کی اس مقبولیت ومحبوبیت، تعلیمی وتربیتی، دینی واصلاحی اور تدریسی وتالیفی خدمات کا اعتراف ہر خاص وعام کو ہے اور اس اعتراف ووقار اور عزت واعتبار میں جہاں آپ کی گفتار دلبرانہ، کردارِ مؤمنانہ اور جذب قلندرانہ کا دخل ہے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ آپ کی شخصیت در حقیقت نبوی اخلاق وشمائل کی آئینہ دار ہے۔ خود زیرِ نظر کتاب کے ترجمہ کے لیے انتخاب اور اس کی نشر واشاعت کی بھرپور کوشش بھی اس کا ایک مظہر ہے۔ یہی حضرت والا کی شفقت کی انتہا ہے کہ آپ نے اپنے الطاف کریمانہ کی بنا پر راقم کو اس کتاب پر یہ سطور لکھنے کی سعادت سے بہرہ ور فرمایا۔ اس لیے حضرت کے حکم کی تعمیل اور حصول برکت کے لیے یہ سطریں لکھنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت والا کی قدر کرنے کی اور زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ یقین ہے کہ لوگ اس انتہائی اہم اور عظیم الشان کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اس کا مطالعہ کر کے اپنی زندگی کی اصلاح فرمائیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس عظیم وبابرکت کام پر حضرت والا کو جزائے خیر عطا فرمائے، آپ کی عمر وصحت میں برکت عطا فرمائے اور آپ کے ذریعے اصلاحِ امت کا کام یوں ہی جاری وساری رہے۔ (آمین)

از مولانا عبد القدوس صاحب نیرانوی قاسمی

استاذ حدیث دار العلوم زکریا، ساؤتھ افریقہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

مفتی خورشید انور صاحب گیاوی

خادم تدریس دار العلوم دیوبند

مخلوقات میں سب سے اشرف انسان ہے، اور انسانوں میں سب سے افضل اولیاء ہیں، اور ولیوں میں سب سے افضل انبیاء ہیں، اور نبیوں میں سب سے افضل اور اعلی سید الانبیاء والمرسلین، خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح سب سے اشرف، اعلی اور افضل ہیں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل وخصائل، اخلاق واوصاف، عادات واطوار، سیرت وکردار اور گفتار ورفتار سب سے بلند اور عظیم ہیں، جن کی تصدیق کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ٤)'': یقیناً آپ خلق عظیم پر فائز ہیں، عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔ سیدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''إِنَّمَا بُعِثْتُ لأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخْلَاقِ'': مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے (احمد بیہقی، حاکم)

آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق عظیمہ، افعال حسنہ، شمائل فاضلہ اور خصائل حمیدہ کے حامل اور صرف حامل ہی نہیں؛ بل کہ سب سے بلند درجے پر فائز ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تمام سیرتوں میں سب سے بہتر، جامع اور مکمل ہے اور تمام اقوام عالم کے لیے یہی مبارک سیرت قابل عمل اور بہترین نمونہ ہے، جو زندگی کے ہر شعبے، ہر شوشے اور ہر گوشے کو محیط ہے اور ہر انسان کی صحیح زندگی کے لیے ہر وقت مکمل رہنمائی کا ضامن ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کو اسوۂ حسنہ اور بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد

خداوندی ہے: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'': درحقیقت تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ایک بہترین نمونۂ عمل ہے (الاحزاب: ۲۱)۔

اور اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال، شمائل واحوال، اخلاق واطوار، عادات وآداب اور سیرت وکردار سارے احوال انفرادی شان اور امتیازی بیان کے ساتھ معجزانہ انداز میں بے مثال معتبر واسطے سے محفوظ ہیں، جن پر دنیا کی ہر زبان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور صبح قیامت تک لکھا جاتا رہے گا اور ہر زمانے میں شمائل نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مستقل کتابیں منصۂ شہود پر آتی رہی ہیں، اسی سلسلۃ الذہب کی ایک زریں کڑی ''من معین الشمائل'' ہے، جسے شیخ صالح احمد شامی حفظہ اللہ وادامہ نے مرتب فرمایا ہے، مصنف ایک جید عالم، عظیم محدث اور کئی کتابوں کے مصنف ومرتب ہیں اور فاضل مصنف نے اس کتاب کو دس مقاصد وابواب پر تقسیم کرکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل واخلاق کو جامع انداز میں مرتب کرنے کی ایک مفید اور کامیاب کوشش کی ہے، پیش نظر کتاب ''شمائل نبویہ کا سرچشمہ'' اسی عربی کتاب کا بامحاورہ، سلیس، شگفتہ اور رواں ترجمہ ہے اور ترجمہ کیا ہے؟ علمی وادبی زبان میں سہل ممتنع انداز میں مستقل تصنیف ہے، جس میں حضرت مترجم کے عشق نبوی کی حلاوت، اتباع سنت کی سعادت، سوز دروں کی حرارت اور جذب باطن کی لذت صاف طور پر محسوس ہوتی ہے۔

ترجمہ کی صحت وموزونیت اور معتبریت وثقاہت کے لیے یہی ضمانت کافی ہے کہ اس کے مترجم عالم ربانی، مرشد کامل، جامع شریعت وطریقت، بافیض مشہور صاحب سلسلہ بزرگ، عارف باللہ حضرت اقدس مولانا محمد قمر الزماں صاحب الہٰ آبادی، دامت برکاتہم ہیں، حضرت والا محتاج تعارف نہیں ہیں، البتہ لکھنے والے حضرت پر لکھ کر اپنے تعارف کے محتاج ہیں؛ کیوں کہ جہاں آپ ولی کامل، شیخ طریقت، مصلح امت اور بافیض پیر ومرشد ہیں، وہیں آپ ماہر علم وفن، صاحب قرطاس وقلم بھی ہیں اور آپ سے خدا کی بڑی مخلوق فیض یاب ہوئی اور ہو رہی ہے، عمر عزیز کے اس نویں دھے میں اصلاح وارشاد، اسفار واشغال، اعمال واذکار اور امراض واعذار کے باوجود ایسی ضخیم کتاب کا ترجمہ جہاں اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے، وہی عالی مقام حضرت مترجم دامت

برکاتہم کی کھلی کرامت ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت المحترم نے اصل کتاب کو اردو میں منتقل کرکے دین کی ایک بڑی خدمت کی ہے، یقیناً یہ مجموعہ عوام وخواص ہر طبقہ کے لیے بے حد مفید اور قیمتی تحفہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت والا کا سایۂ رشد وہدایت تادیر بسلامت قائم رکھے اور آپ کے علمی، روحانی اور عرفانی فیضان کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ باقی رکھے اور اس علمی سوغات کو حضرت کی دوسری مفید علمی تصنیفات کی طرح حسن قبول عطا فرمائے، نیز اس کے مؤلف، مترجم اور جملہ معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین بجاہ النبی الکریم وصلی اللہ علی النبی الامین۔

محتاج دعا

خورشید انور گیاوی

خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

۱۴۴۵/۲/۲۲ھ

مقدمہ

الحمد لله القادر الفرد الحكيم، الفاطر الصمد الكريم، باعث نبيه محمد صلى الله عليه وسلم بجوامع الكلم، وبدائع الحكم، بشيرًا ونذيرًا وداعيًا إلى الله بإذنه وسراجًا منيرًا، صلى الله عليه وعلى آله الذين أذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرًا، أما بعد! فإن فى الألفاظ النبوية والآداب الشرعية جلاء لقلوب العارفين وشفاء لأدواء الخائفين لصدروها عن المؤيد بالعصمة والمخصوص بالبيان والحكمة الذى يدعو إلى الهدى ويبصر من العمى، ولا ينطق عن الهوى، صلى الله عليه وسلم أفضل ما صلى على أحد من عباده الذين اصطفى. أما بعد!

سب قسم کی تعریف اس اللہ کی لئے ہے، جو قدرت والا، یکتا اور حکمت والا ہے، جو پیدا کرنے والا بے نیاز اور کریم ہے، جس نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جامع کلمات اور نادر حکمتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا، جو (مسلمانوں کو جنت کی) خوشخبری دینے والے اور (کافروں کو جہنم سے) ڈرانے والے ہیں، جو خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے اور چراغ روشن کرنے والے ہیں، ان پر اللہ کی رحمت کاملہ نازل ہو اور ان کی اولاد پر (بھی) جن سے پلیدی کو دور کرکے پاک وصاف کردیا، حمد وصلاۃ کے بعد (یہ عرض ہے) کہ الفاظ نبویہ اور آداب شرعیہ میں خدا شناس لوگوں کے دلوں کو روشنی اور اس سے ڈرنے والوں کے امراض و بیماریوں کی شفا ہے۔ کیونکہ ان کا صدور اس ذات گرامی سے ہوا ہے، جس کی عصمت کے ساتھ تائید کی گئی ہے اور وہ بیان حکمت کے ساتھ مخصوص ہے، جو ہدایت کی طرف بلاتے ہیں، اندھوں کو بینا کرتے ہیں، جو اپنی خواہش سے اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے، ان پر اللہ تعالیٰ کی بہترین رحمت ہو، جس کو وہ اپنے برگزیدہ بندوں پر نازل فرماتا ہے۔[(۱)]

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کے بعد چونکہ اب نبوت کا مبارک سلسلہ ہی ختم ہوگیا اس لئے آپ ﷺ کو ایک ایسی کامل و مکمل اور جامع ومدلل شریعت سے نوازا گیا کہ اس میں زندگی بلکہ زندگی سے ماقبل رحم مادر اور اس کے مابعد حشر و نشر تک کا بھی کوئی مسئلہ تشنہ

(۱) بستان المحدثین، تالیف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ تصحیح، مطابقت، مراجعت، مفصل مقدمہ اور متعلقات، مولانا نورالحسن صاحب راشد کاندھلوی، ص: ۴۹۷

نہیں چھوڑا گیا تاکہ امت کو نبی کی عدم موجودگی کا احساس ستا نہ سکے۔

چنانچہ آپ علیہ السلام نے اپنے اقوال وافعال اور احوال سے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق خواہ وہ ایمانیات وعبادات سے تعلق رکھتے ہوں یا تجارت ومعاملات سے، اخلاقیات ومعاشرت سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاسیات ومعاشیات سے، غرضیکہ موت وحیات کے ہر ہر گوشے اور ہر ہر شعبے سے متعلق آپ علیہ السلام کی قولاً یا عملاً کسی نہ کسی لحاظ سے کچھ نہ کچھ ہدایات ضرور موجود ہیں، اور اس صفت میں آپ کا کوئی ہمسر وثانی نظر نہیں آتا۔ اور یہ شعر آپ ہی پر صادق آتا ہے کہ:

مضت الدھور وما أتین بمثلہ ولقد اتی فعجزن عن نظرائہ

یعنی زمانے گذرتے رہے لیکن ان کا مثل نہ لاسکے اور جب وہ آگئے تو زمانہ ان کی نظیر لانے سے عاجز ہو گیا۔

چنانچہ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ ایک دشمن اسلام نے بطور طنز واستہزاء حضرت سلمان فارسیؓ کو یہ کہا "لقد علمکم نبیکم کل شیء حتی الخراءۃ" کہ تمہارا نبی تو تمہیں ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے حتی کہ پیشاب، پاخانہ کا طریقہ بھی سکھلاتا ہے، تو جواب میں حضرت سلمان نے فرمایا کہ: ہاں! ہمارے نبی ﷺ ہمیں اس بات سے منع کرتے ہیں کہ پیشاب، پاخانہ کے وقت ہم قبلہ کی جانب رخ کریں، اور یہ کہ ہم داہنے ہاتھ سے استنجا کریں، اور یہ کہ ہم تین ڈھیلے سے کم سے استنجا کریں، یا گوبر وہڈی سے استنجا کریں۔ مطلب یہ کہ حضرت سلمان فارسیؓ اپنے حکیمانہ انداز میں اسے یہ سمجھانا چاہ رہے تھے کہ جس چیز کو تم نقص وعیب کی بات سمجھ رہے ہو وہ نقص وعیب کی نہیں بلکہ وہی فخر وکمال کی بات ہے کہ ہمیں ہمارے نبی اتنی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی سکھلاتے ہیں۔

چنانچہ معارف السنن جلد ۱/ص ۱۱۳ میں علامہ یوسف بنوریؒ مذکورہ بالا روایت کے تحت یوں رقمطراز ہیں:

والحاصل انہ صلی اللہ علیہ وسلم نہانا عند الاستنجاء عن امور، وامرنا بامور، وھذہ آداب ینبغی ان تخضع لھا العقول السلیمۃ، فان ذکرھا امر مستحسن لاقباحۃ فیہ بل یکاد عدم ذکرھا مستقبحا عند العقلاء حیث ان جمال النظام وکمال القانون ان یصدع بکل حال مایحتاج الیہ المکلف فی حیاتہ الشخصیۃ الفردیۃ والاجتماعیۃ وتدبیر النفس وتدبیر المنزل وما الی ذلک فی ناحیۃ من نواحی الحیاۃ۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قاری سعود بن ابراہیم بن محمد الشریم حال امام وخطیب مسجد

حرام زادہما اللہ شرفاو عظماکے اُس مقدمہ کا چند اقتباس بھی درج کر دیا جائے جسے آنمحترم نے ”محمد رسول اللہ ﷺ“ نامی کتاب مؤلفہ ڈاکٹر مولانا تقی الدین صاحب ندوی مدظلہ کے متعلق تحریر فرمایا ہے تاکہ قارئین کے لیے مزید بصیرت وحلاوت کا سبب ہو، وہو ہذا۔

”کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے زیادہ خیر وبرکت کی حامل سیرت مصطفیٰ ﷺ ہے، یہ مشام جاں کو معطر کرنے والی بے مثال سیرت ہے جس کا ورق ورق روشن ہے، عاشق رسول جب اس سیرت کی ورق گردانی کرتا ہے تو جابجا اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، اور قلب میں عشق ومحبت کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے اور کیوں نہ ہو کہ یہ رحمت عالم، پیغمبر اعظم، سرور کونین، محسن انسانیت اور سید البشر ﷺ کی بابرکت سیرت ہے۔“

نیز رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ ایک مسلمان کے لئے نہایت درجہ نفع کا سامان ہے، اس سے اس کے اخلاق سنورتے ہیں اور وہ ایسے لوگوں کی سوانح پڑھنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے جن کی سوانح پڑھنے میں کوئی فائدہ نہیں اسی سلسلہ میں آپ کا یہ شعر بھی قابل دید ہے۔

دعوا عنكم ليلى وسعدىٰ وعبلة فحب رسول الله طب ومرهم

وحب رسول الله في الدين واجب وحب رسول الله شهد وزمزم

یعنی لیلیٰ، سعدی اور عبلہ کا تذکرہ چھوڑو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی محبت ہی ہماری دوا اور اسی میں ہمارے دلوں کی شفاء ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کی محبت دین وشریعت کے لئے واجب وضروری ہے اور آپ ﷺ کی محبت شہد وزمزم ہے۔

پیشِ نظر کتاب ”شمائل نبویہ کا سرچشمہ“ ترجمہ ”من معین الشمائل“ مؤلفہ مکرم الدکتور صالح احمد شامی حفظہ اللہ ہے، اصل کتاب بدست مکرم قاری عبدالحکیم الہ آبادی مرحوم دستیاب ہوئی، جستہ جستہ دیکھا تو کتاب بہت ہی مفید اور بصیرت افروز معلوم ہوئی، دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ اگر اس کا ترجمہ اردو زبان میں ہو جائے تو بہتر ہے تاکہ یہ گوہر نایاب جس میں آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا عکس جمیل ہے اور آپ کے جسد اطہر کی تابانی اور ”کان خلقه القرآن“ کی ترجمانی ہے، جس میں اصلاحی وتربیتی پہلو نمایاں ہے جو درحقیقت آپ ﷺ کے خصائل وشمائل کا آئینہ ہے، امت کے باذوق حضرات کے ہاتھوں پہنچایا جاسکے۔

چناں چہ اس حقیر نے توکلًا علی اللہ ترجمہ شروع کر دیا لیکن نوع بنوع مصروفیات کی وجہ سے کام میں تاخیر ہو رہی تھی جس کا اظہار اپنے مخلصین سے کیا تو ماشاء اللہ مکرم قاری محمد احسن صاحب فتحپوریؒ، عزیزم مولانا جمیل احمد نذیری مبارکپوری اور عزیزم مولانا خورشید انور بنارسی وغیرہم نے اس بار عظیم کو اٹھالیا اور مختلف ابواب کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا، اسی اثناء میں عزیزم مولانا عبدالرشید بستوی دیوبند سے تشریف لائے، ان سے بھی تذکرہ کیا تو انھوں نے بھی بقیہ ترجمہ کی ذمہ داری قبول کرلی اور ترجمہ کرنے لگے، ترجمہ سے فراغت کے بعد مولانا موصوف سے کہا کہ آپ سب کے ترجمے کو سامنے رکھ کر بغور دیکھ کر ترجمہ میں یکسانیت پیدا کردیں تاکہ ترجمہ سلیس اور رواں ہو جائے، مولانا نے یہ کام بھی شروع کر دیا لیکن زندگی نے وفا نہ کیا اور یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔

اس لیے اخیر میں عزیزم مولانا عبدالقدوس نیرانوی استاذ حدیث دارالعلوم زکریا ساؤتھ افریقہ نے اس کام کو بحسن وخوبی انجام دیا اور کمپوزنگ اور تصحیح کا کام بھی اپنی زیرِ نگرانی انجام دیا۔ فجزاہم اللہ تعالیٰ

اخیر میں اس حقیر نے اس ترجمہ کو ایک مرتبہ پورا سنا اور اس کے بعد دوبارہ حرفاً حرفاً پڑھا اور ضرورت کے مطابق جا بجا اصلاح وترمیم بھی کیا، اس کام میں میرے لئے معاون رہے عزیزم مولوی محمد سلمہ استاذ دارالمعارف الاسلامیہ الٰہ آباد۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے تمام معاونین کو جزائے خیر مرحمت فرمائے اور تمام مسلمانوں کو اس سے نفع اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے اور میری صلبی وروحانی اولاد کو متخلق باخلاق الرسول ﷺ کی سعادت سے سرفراز فرمائے۔ آمین

مرشدی حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھیؒ کے اس شعر پر مضمون ختم کر رہا ہوں:

رحمت کا ابر بن کر جہاں بھر میں چھایئے ۔۔۔ عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھایئے
خلق نبی کا اب تو نمونہ دکھایئے ۔۔۔ اغیار کو بھی اپنے گلے سے لگایئے

فالحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ وعلی آلہ وعلی من والاہ۔

محمد قمرالزمان الٰہ آبادی

بیت الاذکار وصی آباد، الٰہ آباد

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، حَمْدًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ، وَأَفْضَلُ الصَّلٰوةِ وَأَتَمُّ التَّسْلِيمِ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ الْمَبْعُوثِ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ، وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِينَ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ {الحشر:۷}

اور رسول ﷺ تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝۲۱﴾ {الاحزاب:۲۱}

تم لوگوں کے لیے یعنی ایسے شخص کے لیے جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکرِ الٰہی کرتا ہو، رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ دونوں آیاتِ کریمہ میں مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ وہ جو چیز بھی لیں آپ کے واسطے سے لیں۔

پہلی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اوامر و نواہی کے باب میں آپ کے احکامات کی تعمیل واجب ہے۔ علامہ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''یعنی جو بھی آپ ﷺ حکم دیں تو اس کو بجالاؤ اور جس کسی بات سے روکیں تو رک جاؤ؛ اس لیے کہ آپ بھلائی ہی کا حکم دیتے ہیں اور برائی ہی سے روکتے ہیں۔''

جیسا کہ خود ہی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ وَ إِذَا أَمَرْتُكُمْ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ

{متفق علیہ: خ:۷۲۸۸، م:۱۳۳۷}

جب میں تم کو کسی چیز سے منع کروں تو اس سے رک جاؤ اور جب کسی بات کا حکم دوں تو حتی المقدور اس پر عمل کرو۔

اس آیتِ کریمہ میں ایک مؤمن کے لازمی دائرۂ عمل کو طے کیا گیا ہے جو کہ فرض اور واجب کا دائرہ ہے؛ جبکہ دوسری آیتِ کریمہ میں دین کے اصولوں میں سے ایک بہت بڑے اصول کو طے کیا گیا

ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال اور احوال کی حیثیت ہمارے لیے نمونے کی ہے؛ لہٰذا عمل کا دائرہ اس آیتِ کریمہ میں پہلے آیت کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔

''تَأَسِّی'' کا مطلب ہے عادات، عبادات، فرائض، واجبات، مباحات اور ہر چھوٹے بڑے معاملے میں آپ کے اقوال و افعال کی پیروی، عمل میں بھی اور اس کے طریقۂ ادا میں بھی، قول میں بھی اور اس طریق میں بھی جس کے ذریعے یہ قول معرضِ وجود میں آیا؛ گویا مضمون اور شکل دونوں کی اتباع مراد ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آیتِ کریمہ کا یہی مطلب سمجھا تھا، چنانچہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ بھی سنا اور جو کچھ بھی مشاہدہ کیا، سب چیزوں کو ہمارے لیے نقل کر دیا، طریقہ اور اسلوب بھی نقل کیا؛ کھانے، پینے، سونے، گفتگو کرنے اور چلنے پھرنے کا طریقہ بھی نقل کیا؛ یہاں تک کہ اس چیز کو بھی نقل کیا جس کا تعلق خاص طور پر انسان کے اپنے گھریلو کاموں ہی سے ہوتا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ ساری باتیں ہمارے لیے نقل کیں اور آپ کی اتباع کرتے ہوئے ان پر عمل بھی کیا؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ وہ مکہ اور مدینے کے بیچ ایک درخت کے نیچے آتے ہی قیلولہ کرتے تھے اور بتاتے کہ رسول اللہ ﷺ یہاں قیلولہ فرمایا کرتے تھے۔ (حیاۃ الصحابۃ: ۳۵۶/۲)

یہ کتاب -اور دیگر کتبِ شمائل -اجمالی طور پر اسی آیت کے گرد گھومتی ہیں۔ سب میں آں حضرت ﷺ کے ان اخلاق و عادات اور آداب کا بیان ہے جن سے آپ کی ذاتِ گرامی آراستہ تھی؛ ان کتابوں کی تالیف کا مقصد یہ ہے کہ یہ کتب شمائل طالبانِ علم و معرفت کے لیے قریبی مرجع و ماخذ اور آپ کی اتباع کرنے والوں کو بآسانی میسر ہوں، جس سے اولین مقصود ان آداب و اخلاق سے واقفیت ہے اور پھر ان کو اپنی زندگی میں اتارنا ہے۔

یہاں اس بات پر تنبیہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض کتبِ شمائل میں احادیثِ ضعیفہ کے لانے میں توسع سے کام لیا گیا ہے اور اس توسع کی بنیاد اس رائے پر ہے کہ فضائل کے میدان میں احادیثِ ضعیفہ پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اس کتاب میں صرف ان احادیث سے استشہاد کیا گیا ہے جو صحیح یا حسن درجے کی ہیں،

اگر میں نے کوئی ضعیف حدیث نقل کی بھی ہے تو اس کے ضعف پر تنبیہ کر دی ہے اور ایسا بھی صرف وضاحت اور بات کو دل سے قریب کرنے کے لیے کیا ہے، احکام کو ثابت کرنے کے لیے نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیرت نگاری میں خیالی باتیں لکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ بولنے سے عموماً اور آپ کی جانب جھوٹ منسوب کرنے سے خصوصاً منع فرمایا ہے؛ کیونکہ اس میں بڑے مفاسد ہیں؛ اس لیے سیرت کے سلسلے میں حدیث صحیح اور حدیث حسن ہی پر اکتفا کرنا بہتر ہے۔

بیشتر کتبِ شمائل میں رسول اللہ ﷺ کے جسمِ مبارک، آپ کی شکل وصورت کی تفصیلات اور ان سامانوں کی تفصیل پر توجہ دی گئی ہے جنھیں آپ استعمال فرماتے تھے، اس طرزِ تالیف سے شمائل کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

جیسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف رسول اللہ کی گفتگو، ہنسی، مزاح، گریہ وزاری، تواضع، حیا اور اخلاق کے تذکرے پر اکتفا کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے صرف اخلاق، سخاوت، مزاح اور زہد وشجاعت کے بیان پر اکتفا کیا ہے، اور علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۔جن کی کتاب کتبِ شمائل کی مفصل کتابوں میں سے ایک ہے۔ صرف حسنِ اخلاق، حلم وعفو، نرمی، رحمت وشفقت، گریہ وبکا، ہنسی، حیا، شجاعت، سخاوت، تواضع اور خوف کا ہی تذکرہ کیا ہے۔

ان حضرات کو صرف ان ہی چیزوں کے ذکر پر آمادہ کرنے والا غالباً یہ ذہن ہے کہ وہ شمائل کو مثبت اور عملی میدان ہی میں منحصر سمجھتے ہیں اور اکثر یہ چاہتے ہیں کہ ہر عنوان کے لیے ایسا حسّی واقعہ ہو جسے عنوان کے لیے شاہد بنایا جائے، وہ اخلاق، جن کے لیے انھیں واقعات نہیں ملتے؛ وہ ذکر نہیں کرتے؛ لیکن اگر ہم گہری نظر سے دیکھیں تو شمائل کو درجِ ذیل تین قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں:

اول: وہ مثبت اخلاق وشمائل جن کا تعلق آپ کے افعال سے ہے، مثلاً شجاعت، حیا، شمائل لکھنے والوں نے اسی قسم اول کے بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

دوم: وہ مثبت اخلاق وشمائل جو آپ کے اقوال سے مستفاد ہیں، اور یہ نیکی کے وہ اعمال ہیں جن کی رسول اللہ ﷺ نے ترغیب دی ہے۔ یہ شمائل واقعات کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتے؛ بلکہ عام

برتاؤاور طرز زندگی میں ان کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، اور بعض اوقات آثار کا بھی ظہور نہیں ہوتا جیسے اخلاصِ نیت۔

رسول اللہ ﷺ نے اخلاص پر بہت زور دیا ہے اور اخلاص کے فقدان سے ڈرایا ہے؛ لیکن اخلاص ایسی چیز ہے جس کا ظہور حسی واقعات کی شکل میں نہیں ہوتا، بلکہ اس کا تعلق صرف انسان کی نیت اور باطن سے ہے۔

تاہم جب رسول اللہ ﷺ نے اخلاص کا حکم دیا ہے تو یہ بات بدیہی اور لازمی ہے کہ آپ بھی اس کا التزام اور اہتمام کرتے ہیں؛ کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کسی چیز کا دوسروں کو حکم دیں اور خود نہ کریں۔

بلاشبہ یہ طرزِ عمل بھی شمائل ہی میں داخل ہے۔

سوم: منفی شمائل: یہ قسم اخلاقِ سیئہ سے باز رہنے پر مشتمل ہے۔

یہ تیسری قسم شمائل کا بہت ہی اہم پہلو ہے؛ لیکن شمائل نگاروں میں سے کسی نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

ہماری اس کتاب میں ان شاءاللہ یہ گوشے بھی نمایاں کیے جائیں گے اور اس طرح شمائلِ کریمہ کا پورا خاکہ کامل و مکمل شکل میں نظر آئے گا، تاہم کوئی بھی مصنف و محقق رسول اللہ ﷺ کے شمائل کا ممکنہ کوششوں کے بعد بھی احاطہ نہیں کر سکتا، اس لیے کہ آپ کے شمائل کا احاطہ کرنا ممکن ہی نہیں، اور اس موضوع یا اور کسی ایسے موضوع کے لیے جس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ہے، احادیث کی کتابیں ہی سب سے وسیع اور کامل مرجع قرار پائیں گی۔

کتاب کا نام "مِنْ مَعِينِ الشَّمَائِلِ" (شمائل نبویہ کا سرچشمہ) کا کچھ حصہ تجویز کیا گیا ہے؛ تاکہ یہ عنوان؛ واقع کے مطابق ہو؛ کیونکہ کتاب میں آپ کے اخلاق و شمائل کے چند نمونے ہی پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب دس مقاصد وابواب پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک کے تحت متعدد فصلیں ہیں۔

چوتھا باب- مقصدِ چہارم: برے اخلاق سے آپ کے پاک و محفوظ ہونے کا بیان

پانچواں باب- مقصدِ پنجم: آپ کے آدابِ زندگی کا بیان

چھٹا باب- مقصدِ ششم : اپنی حاجاتِ ضروریہ کی تکمیل کی سیرت کا بیان

ساتواں باب- مقصدِ ہفتم: آپ کے ارشاد (کھلا ڈرانے والا) کا بیان اور اس بات کی تفصیل کہ آپ نے کن کن چیزوں سے ڈرایا ہے۔

آٹھواں باب- مقصدِ ہشتم: آپ کی عبادات کے کچھ حصے کا تذکرہ

نواں باب- مقصدِ نہم : آپ کے تشکیل دادہ معاشرے کا بیان

دسواں باب- مقصدِ دہم: آپ کے حقوق کا بیان

میں نے کتاب کی، ایک فہرست موضوعات کے اعتبار سے بنائی ہے، اور دوسری فہرست مقاصد وفصول کی ترتیب کے مطابق۔ اللہ تعالیٰ سے سوال اور دعا کرتا ہوں کہ اسے اپنی ذات کے واسطے خالص بنائے۔

صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

تحریر

صالح احمد الشامی

یکم جمادی الاخری ۱۴۱۷ھ

مطابق ۱۳/اکتوبر ۱۹۹۶ء

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جب دنیا و آخرت میں بندے کی صلاح وفلاح کا دار و مدار آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے ہی پر موقوف و منحصر ہے، تو ہر وہ شخص جو اپنا خیر خواہ ہو، اور اپنی نجات و سعادت چاہتا ہو، اسے چاہئے کہ آپ ﷺ کی سیرتِ پاک کے تمام پہلوؤں کا علم وادراک حاصل کرے، اور خود کو بے خبروں اور جاہلوں کے زمرے سے نکال کر آپ ﷺ کے متبعین و مطیعین کی جماعت میں شامل کرے۔ اور لوگ علم و معرفت اور اتباع واطاعت کے سلسلے میں متفاوت ہیں، قلیل مقدار والے بھی ہیں، کثیر مقدار والے بھی، اور حرماں نصیب بھی، اور فضل و کرم کے مالک اللہ تعالیٰ ہیں وہ جسے چاہتے ہیں نواز دیتے ہیں، وہ عظیم فضل والے ہیں۔"(۱)

مزید فرمایا:

"جب بندہ اپنے افکار وخیالات کو یکجا کرکے اپنے رب کا ارادہ کرنے (یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت) میں صادق و مخلص ہوتا ہے (کیوں کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی محبت مطلوب ہے) تب اسے آں حضور ﷺ کی محبت عطا کی جاتی ہے، اور آپ ﷺ کی روحانیت اس کے قلب پر چھا جاتی ہے، اور وہ آپ ﷺ کو اپنا امام و معلم، استاذ و شیخ اور اسوہ وقدوہ بنا لیتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنا نبی ورسول، اور اپنی طرف دعوت دینے والا ہادی ورہبر بنایا۔ پھر بندہ آپ ﷺ کی سیرت، آپ ﷺ کے دین کے مبادیات واصول، آپ ﷺ پر آمدِ وحی کی کیفیت کا مطالعہ کرتا ہے اور آپ ﷺ کے اوصاف و محاسن، شمائل واخلاق، اور آپ ﷺ کی حرکات وسکنات، نیند اور بیداری، عبادت وریاضت، اہل وعیال اور اصحاب کے ساتھ معاشرت ومجالست کے اخلاق وآداب کا علم حاصل کرتا ہے، اور ایسا ہو جاتا ہے جیسے آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کا کوئی صحابی ہم نشین ہو۔"(۲)

---

(۱) زاد المعاد: ۱/ ۶۹

(۲) مدارج السالکین: ۳/ ۲۶۸

پہلا مقصد:

نسب شریف

اور قرابتِ طاہرہ

فصل اول

نسب، ولادت، اسمائے گرامی

نسب شریف:

رسول اللہ ﷺ مکے میں پیدا ہوئے، مکہ اس زمانے میں جزیرۃ العرب کا قلب تھا، یہ وہ دینی مرکز تھا جس کی سبھی تعظیم کرتے تھے، اسی میں وہ کعبہ شریف واقع تھا جسے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر کیا تھا، سبھی لوگ کعبے کا حج کرتے اور اس کے گرد طواف کرتے تھے۔

مکے میں بسنے والے قبیلۂ قریش میں آپ کی ولادت ہوئی، عربوں کے دلوں میں اس قبیلے کا بڑا احترام اور بڑی قدر و منزلت تھی، یہ لوگ حرم شریف کے محافظ اور اس سے متعلق جملہ امور کے نگراں تھے۔

عرب ایک ایسی قوم ہے جو نسب کو باعثِ عزت سمجھتی ہے، نسب ان کی شناخت ہے، اس پر وہ فخر کرتے ہیں، ایسے ماحول میں نبیٔ کریم ﷺ کی ولادت ہوئی۔

نسب بیان کرنے والوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کا نسب نامہ اس طرح ہے:

محمد بن عبد اللہ، بن عبد المطلب، بن ہاشم، بن عبد مَناف، بن قُصَیّ، بن کِلاب، بن مرَّۃ، بن کَعب، بن لوی، بن غالب، بن فہر، بن مالک، بن نَضْر، بن کنَانہ، بن خُزَیمہ، بن مُدرِکہ، بن الیاس، بن مضَر، بن نزِار، بن معد، بن عدنان۔ (۱)

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ”یہاں تک نسب یقینی طور پر صحیح اور معلوم ہے اور ماہرینِ انساب کا اس پر اتفاق ہے، اس میں ذرا بھی اختلاف نہیں، ہاں! عدنان کے اوپر نسب نامے میں اختلاف ہے؛ لیکن اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ عدنان حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تھے“۔ (۲)

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۱، زاد المعاد: ۱/۱۷

(۲) سیرت ابن ہشام: ۱/۱، زاد المعاد: ۱/۱۷

ماں کی طرف سے آپ ﷺ کا نسب اس طرح سے ہے:

آمنہ بنت وہب، بن عبد مَناف، بن زُہرہ، بن کِلاب، بن مرّۃ، بن کعب، بن لؤیّ، بن غالِب، بن فِہر۔[(۱)]

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نسب کے اعتبار سے زمین والوں میں سب سے بہتر ہیں۔

رَوَیٰ مُسْلِمٌ عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الأَسْقَعِ، رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ اللهَ اصْطَفَى مِنْ وَلَدِ إِبْرَاهِيمَ إِسْمَاعِيلَ وَاصْطَفَى مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيلَ بَنِي كِنَانَةَ وَاصْطَفَى مِنْ بَنِي كِنَانَةَ قُرَيْشًا وَاصْطَفَى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ»[(۲)]

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے اولادِ ابراھیم میں سے اسماعیل کو چنا اور اولادِ اسماعیل میں سے بنو کنانہ کو چنا، بنو کنانہ کی اولاد میں سے قریش کو چنا قریش میں سے بنی ہاشم کو چنا بنی ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا۔

آپ ﷺ کی اس نسبی برتری کی آپ کے دشمنوں نے بھی گواہی دی ہے، چنانچہ حدیثِ ابو سفیان میں ہے کہ ہرقل نے ابو سفیان سے نبی ﷺ کے نسب کے بارے میں پوچھا؛ حالانکہ اُس وقت تک وہ آپ کے دشمنوں میں تھے، اس کے باوجود انھوں نے جواب دیا: وہ ہم میں عالی نسب ہیں، اس پر ہرقل نے کہا: میں نے تم سے ان کے نسب کے بارے میں سوال کیا تو تم نے بتایا کہ وہ بڑے عالی نسب ہیں، چنانچہ سارے رسول اپنی قوم کے اعلیٰ نسب خاندان میں ہی مبعوث کیے جاتے ہیں۔[(۳)]

یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں نے قابلِ اعتراض باتیں تلاش کرنے کی پوری کوششیں کیں، تاکہ ان کے ذریعے آپ ﷺ پر زبانِ طعن دراز کر سکیں؛ لیکن ان کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں، انھیں کوئی بات قابل گرفت نہیں مل سکی۔ اس کے بعد انھوں نے جادو اور جنون کا الزام لگایا جس سے ان کا جھوٹ کھل کر سامنے آگیا، نسب پر حرف گیری کرنے اور انگلی اٹھانے کی تو وہ سوچ ہی نہ سکے؛ کیونکہ انھیں آپ کے نسب کی عظمت معلوم تھی۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۱۵٦

(۲) مسلم: رقم: ۲۲۷٦

(۳) بخاری: رقم: ۷

مناسب ہے کہ ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیں کہ رسول اللہ ﷺ کا نسب قریش میں بالکل مرکزی مقام پر تھا، قریش کی کوئی شاخ ایسی نہیں تھی جس میں حضور ﷺ کی قرابت داری نہ ہو، چنانچہ درج ذیل آیتِ کریمہ اس کی طرف اشارہ کرتی ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ﴾ {الشوریٰ:۲۳}

آپ یوں کہیے کہ میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بجز رشتے داری کی محبت کے۔

بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث نقل کی ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ قَوْلِهِ: {إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى} فَقَالَ سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ: قُرْبٰى آلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: عَجِلْتَ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ بَطْنٌ مِنْ قُرَيْشٍ، إِلَّا كَانَ لَهُ فِيهِمْ قَرَابَةٌ. فَقَالَ: «إِلَّا أَنْ تَصِلُوا مَا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ مِنَ الْقَرَابَةِ»(۱).

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے {إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى} کے بارے میں سوال کیا گیا، تو سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ (جو وہاں موجود تھے) بولے کہ قربیٰ سے مراد آں حضرت ﷺ کے اہل وعیال ہیں، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم نے آیت کی تفسیر کرنے میں جلدی کی، قریش کی کوئی ایسی شاخ نہیں جس میں رسول اللہ ﷺ کی قرابت داری نہ ہو، آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرے اور تمھارے درمیان جو قرابت ہے اس کی وجہ سے تم صلہ رحمی کرو۔

گویا آپ ﷺ نے یوں فرمایا کہ اگرچہ تم نبوت کی بنا پر میری اتباع نہیں کرتے؛ لیکن میری تم سے قرابت بھی تو ہے، اس کا تو لحاظ کرو۔

قریش کا طریقہ یہ تھا کہ وہ قرابت داری کو نبھاتے تھے؛ لیکن جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو انھوں نے قطع رحمی کی، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: تم میرے ساتھ بھی اسی طرح صلہ رحمی کرو جیسے دیگر اقارب کے ساتھ کرتے ہو۔(۲)

اور "اِلَّا الْمَوَدَّةَ" میں استثناء منقطع ہے جیسا کہ فتح الباری میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت پر کوئی اجرت طلب نہیں فرمائی، صرف ایذارسانی سے باز رہنے اور قرابت داری کے تقاضے نبھانے کا مطالبہ فرمایا۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ نسب کے اعتبار سے بالکل مرکزی مقام پر تھے؛ اس لیے یہ بات محض

---

(۱) بخاری: رقم: ۴۸۱۸

(۲) بخاری: رقم: ۷

اتفاقات میں سے نہیں کہ آپ جس زمانے میں مبعوث کیے گئے وہ تمام زمانوں میں سب سے بہتر زمانہ ہو اور وہ نسل ساری نسلوں میں سب سے اچھی نسل ہو۔ اور یہ بات بھی محض اتفاقات میں سے نہیں کہ وہ دونوں-زمانہ اور نسل-دنیائے تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت اور برتری کے حامل ہوں، خواہ یہ موازنہ ماضی سے کیا جائے یا مستقبل سے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے:

عَن اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنهُ اَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُونِ بَنِي آدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا، حَتَّى كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِي كُنْتُ فِيهِ»(۱).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں بنی آدم کی سب سے بہترین صدی میں مبعوث کیا گیا ہوں، صدی پر صدی گزرتی گئی یہاں تک کہ وہ صدی آگئی جس میں میں ہوں۔

حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللهُ عَنهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ»(۲).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب سے اچھے میرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر وہ جو ان سے ملے ہوئے ہیں؛ پھر وہ جو ان سے ملے ہوئے ہیں۔

اس طرح بہترین زمان و مکان، اونچا قبیلہ و خاندان، عظیم مقصد کے لیے منتخب سب سے افضل انسان کے ساتھ یکجا اکٹھے ہو گئے۔

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ {الانعام: ۱۲۴}

اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ وہ اپنی رسالت و پیغام بری کے لیے کس کو منتخب فرمائیں۔

اسمائے گرامی:

یہ بات معلوم ہی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تو آپ کے دادا نے آپ کا نام ''محمد'' رکھا اور قرآنِ کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی آپ کا نام ''احمد'' آیا ہے اور نبوت سے قبل آپ ''امین'' کے لقب سے معروف تھے۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۵۵۷

(۲) بخاری: رقم: ۲۶۵۲، مسلم: رقم: ۲۵۳۳

بخاری و مسلم کی حدیث میں حضرت جُبیر بن مُطعِم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عَن جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللهُ عَنهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لِي خَمْسَةُ أَسْمَاءٍ: أَنَا مُحَمَّدٌ، وَأَحْمَدُ، وَأَنَا الْمَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللهُ بِيَ الْكُفْرَ، وَأَنَا الْحَاشِرُ الَّذِي يُحْشَرُ النَّاسُ عَلَى قَدَمَيَّ، وَأَنَا الْعَاقِبُ»[۱].

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے پانچ نام ہیں: میں محمد ہوں، احمد ہوں، ماحی ہوں، میرے ذریعے اللہ کفر مٹاتا ہے، میں حاشر ہوں، لوگوں کا حشر میرے دونوں قدموں پر ہوگا، اور میں عاقب ہوں۔(مسلم شریف میں یہ اضافہ ہے کہ "عاقب اُسے کہتے ہیں جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو"۔)

وَعَن أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَمِّي لَنَا نَفْسَهُ أَسْمَاءً فَقَالَ: «أَنَا مُحَمَّدٌ، وَأَحْمَدُ، وَالْمُقَفِّي، وَالْحَاشِرُ، وَنَبِيُّ التَّوْبَةِ، وَنَبِيُّ الرَّحْمَةِ»[۲].

اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اپنے نام اس طرح بتاتے تھے کہ: میں محمد ہوں، احمد ہوں، مُقَفِّی ہوں، یعنی انبیائے سابقین کے راستے پر چلنے والا آخری نبی ہوں، حاشر ہوں، نبیٔ توبہ ہوں، نبیٔ رحمت ہوں۔

وَقَالَ جُبَيْرُ بْنُ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللهُ عَنهُ: «وَقَدْ سَمَّاهُ اللهُ رَؤُوفًا رَحِيمًا»[۳].

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ نے آپ کو رؤوف اور رحیم سے موسوم کیا ہے۔"

علامہ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: " یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ہیں، جو آپ کے تعارف کے لیے ہیں؛ صرف نام نہیں ہیں بلکہ یہ نام اُن محاسن کے اسمائے مشتقہ ہیں (ان سے ماخوذ ہیں) جو آپ کے ساتھ قائم ودائم ہیں، جو آپ کے لیے مدح وکمال کو ثابت کرتے ہیں۔"[۴].

اس طرح بہت سے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر صفتِ کریمہ سے آپ کے اسما مشتق کرنے لگے اور سمجھنے لگے کہ وہ کوئی اچھا کام کر رہے ہیں۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۵۳۲، مسلم: رقم: ۲۳۵۴
(۲) مسلم: رقم: ۲۳۵۵
(۳) مسلم: رقم: ۲۳۵۴
(۴) زاد المعاد: ۸۶/۱

ابنِ دحیہ اپنی ایک تصنیف میں -جو صرف اسمائے نبویہ کے ہی بارے میں ہے- کہتے ہیں کہ: بعض علماء نے کہا کہ اسمائے نبی، اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی تعداد کے مطابق ننانوے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی آپ کے ناموں کو تلاش کرے تو تین سو تک تعداد پہنچ جائے گی۔(۱).

قسطلانی کہتے ہیں کہ میں نے قاضی ابو بکر ابن العربی کی ''احکام القرآن'' میں دیکھا ہے کہ بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے ایک ہزار نام ہیں اور نبی ﷺ کے بھی ایک ہزار نام ہیں۔(۲).

صاحبِ مواہبِ لدُنّیّہ نے قاضی عیاضؒ کی مشہور کتاب ''الشفاء'' (۳۱۱-۳۳۶/۱) کی اتباع کرتے ہوئے چار سو سے زائد نام گنائے ہیں۔(۳).

اور چونکہ آپ ﷺ کے ان صفاتی اسماء میں اللہ تعالیٰ کے بعض اسمائے حسنیٰ بھی شامل تھے، تو قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کو مجبوراً ایک فصل قائم کرنی پڑی جس میں اس بات کو واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اسماء اور صفات میں اپنی مخلوق میں سے کسی کے مشابہ نہیں۔(۴).

علامہ زرقانی، مواہب لدنیہ کی شرح میں فرماتے ہیں کہ: ''امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور فتح الباری میں بھی اسے تسلیم کیا گیا ہے کہ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم آپ ﷺ کو اس نام سے موسوم کریں جو نہ آپ کے والدین نے رکھا ہو، اور نہ خود آپ نے وہ نام بتایا ہو یعنی ہمیں نیا نام ایجاد کرنے کی اجازت نہیں، خواہ وہ صفتِ کمال پر ہی دلالت کرتا ہو، اگر ہم ان ناموں کی اجازت دے دیں جو نام آپ کے منقول نہیں ہیں تو ممکن ہے غفلت میں نیا نام رکھ کر حضور ﷺ کو ایسے اوصاف کے ساتھ متصف کر دیا جائے جو صرف اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہیں۔ اس طرح آپ کا وصف بیان کرنے والا غیر شعوری طور پر کسی محظور و ممنوع امر میں مبتلا ہو سکتا ہے''۔(۵).

علامہ زرقانی کی نقل کردہ یہ بات بالکل درست ہے؛ اس لیے اتنی ہی بات پر اکتفا کرنا چاہیے

---

(۱) فتح الباری: ۵۵۸/۶، المواہب اللدنیہ: ۱۴/۲

(۲) المواہب اللدنیہ للقسطلانی: ۱۴/۲

(۳) المواہب اللدنیہ للقسطلانی: ۲۱-۱۵/۲

(۴) الشفاء: ۳۴۰-۳۳۷/۱

(۵) شرح الزرقانی علی المواہب: ۱۱۹/۳

جس پر نص وارد ہوئی ہے (یعنی جتنی بات منقول اور ثابت ہو)۔[۱]

آپ ﷺ کی کنیت صحیح حدیث کے مطابق ''ابوالقاسم'' ہے۔[۲]

ولادتِ باسعادت:

آپ ﷺ کے نسب اور اسماء کی گفتگو کے بعد ہم ولادتِ باسعادت کی طرف آتے ہیں، خیال رہے کہ ہم ولادت کے بارے میں زمانہ، تاریخ اور دن کے اعتبار سے گفتگو نہیں کریں گے؛ کیونکہ یہ تو کتبِ سیرت کا موضوع ہے؛ ہم ولادت کے متعلق کتب شمائل کے زاویے اور نقطۂ نظر کے مطابق گفتگو کریں گے۔

یہ موضوع خود ہمیں اُن دوسرے موضوعات کی طرف لے جاتا ہے جو ولادت سے مربوط ہیں اور ہم اُن ہی کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

آپ ﷺ کی والدہ کو اسی طرح حمل قرار پایا جس طرح ساری عورتوں کو حمل قرار پاتا ہے اور اسی طرح حمل کے مہینے گزرے جیسے ساری عورتوں کو گزرتے ہیں اور انھوں نے اسی طرح آپ کو جنا جس طرح دوسری عورتیں جنتی ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ میلاد کی کتابوں اور اسی طرح شمائل کی کتابوں میں ''واقعۂ ولادت'' کے سلسلے میں بعض مؤلفین نے خیال آفرینی کو جگہ دی ہے، اور عجیب و غریب واقعات بیان کر گئے ہیں، انھوں نے یہ سمجھا کہ وہ نبی ﷺ کے مرتبے کو بڑھا رہے ہیں؛ حالانکہ یہ سراسر باطل، وہم اور

---

(۱) جس خدشے کا اظہار علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا وہ پیش آچکا ہے؛ صاحبِ مواہب وغیرہ نے ان ناموں میں ''اَحَد''، ''اَوَّل''، ''بَاطِن'' اور ''جَبَّار'' وغیرہ کو بھی ذکر کیا ہے حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کے وہ اسمائے حسنیٰ ہیں جو صرف اللہ ہی کے ساتھ خاص ہیں۔

اور عجیب وغریب بات وہ ہے جسے صاحب فتح الباری نے ابنِ دحیہ سے نقل کیا ہے کہ: انھوں نے حضور ﷺ کے ناموں میں ''لَبِنَة'' (اینٹ) کو بھی شمار کیا ہے، بخاری کی اس حدیث کی بنا پر کہ ''میری مثال اور مجھ سے پہلے کے انبیاء کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے ایک گھر بنایا اور بہت ہی اچھا اور خوب صورت بنایا؛ مگر ایک گوشے میں ایک لَبِنَة (اینٹ) کی جگہ چھوڑ دی، لوگ اس گھر کے گرد گھومتے ہیں اور اس کی خوب صورتی کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ اینٹ بھی کیوں نہیں لگادی گئی۔ سن لو وہ اینٹ میں ہوں، میں نبیوں کا خاتم ہوں۔ (فتح الباری: ۶/۵۵۸)؛ حالانکہ یہ حدیث صرف بات کو سمجھانے کے لیے بطور تمثیل و تشبیہ وارد ہوئی ہے۔

(۲) بخاری: رقم: ۳۱۱۵، مسلم: رقم: ۲۱۳۳

دھوکہ ہے۔رسول اللہ ﷺ کی عظمت آپ کے اس مقام اور اخلاق میں مضمر ہے جو اللہ کے اعزاز بخشنے سے آپ کو ملے ہیں؛اس خیال آفرینی پر نہیں، جس کی بنیاد اوہام اور من گھڑت قصے کہانیاں ہوں۔

بعض کتابوں میں اس موضوع پر ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں جنھیں پڑھ کر انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دورانِ حمل، آپ کی والدہ نے کوئی بوجھ محسوس نہیں کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ نے دوسری حاملہ عورتوں کے بر خلاف بہت زیادہ بوجھ محسوس کیا، بعد میں دوسرے لوگ آئے تو انھوں نے دونوں متعارض باتوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی اور اپنے ذہن کو اس گتھی کے حل میں لگایا۔[1]

بعض لوگ حمل کے ایک ایک مہینے کی تفصیل میں لگے رہے اور ان قدرتی رونما ہونے والی باتوں کا ذکر کرتے رہے جو اس ماہ میں پیش آئے۔

بعض حضرات فرشتوں کی آمد ورفت کا ذکر کرتے ہیں جو آمنہ کو خوش خبری دیتے تھے۔

ولادت کی رات میں بھی عجیب و غریب واقعات پیش آئے، مثلاً ستاروں کا زمین کے قریب آجانا، فرشتوں کا نازل ہونا، آمنہ کے گھر کا نور سے بھر جانا، آمنہ کا شاعرہ بن جانا اور اس موقعے کے علاوہ دوسرے مواقعے پر بھی شعر کہنے لگنا۔

اور اس رات میں جیسا کہ بہت سے مصنفین نے لکھا ہے-ایوانِ کسریٰ لرزنے لگا اور اس کے چودہ کنگورے گر گئے، آتش کدۂ ایران کی آگ بجھ گئی اور طبریہ کی جھیل خشک ہو گئی۔[2] اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔[3]

یہ سب وضّاعین کے خیالات ہیں جن کا حقیقت اور واقع سے کوئی تعلق نہیں، اگر ان میں سے کوئی چیز پیش آئی ہوتی تو پیغمبرِ خدا صادق و مصدوق ﷺ کی احادیثِ صحیحہ میں ان کا ذکر ضرور آیا ہوتا۔

---

(۱) المواہب اللدنیہ للقسطلانی: ۱/۱۲۰-۱۲۱

(۲) شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اور اس کا قائل ہونا جائز نہیں۔ دیکھیے: المصنوع فی معرفة الحدیث الموضوع للقاری، تحقیق عبد الفتاح ابو غدہ: ص: ۱۸

(۳) دیکھیے اس موضوع پر السیرۃ النبویة الصحیحة للعمری: ۱/۱۰۱-۹۸

آپ ﷺ کے اول الخلق (آپ کی تخلیق سب سے پہلے) ہونے کی بحث:

یہ قضیہ بھی کتبِ شمائل وخصائصِ نبوی میں اہمیت کا حامل ہے، اس لیے مناسب ہے کہ ہم اس کی طرف اشارہ کر دیں، سیرت کی بعض کتابوں میں انسان کو سب سے پہلے اسی سے واسطہ پڑتا ہے۔

علامہ سیوطی علیہ الرحمہ کہتے ہیں: ''حضور ﷺ کی خصوصیات کا باب، آپ کا تخلیق کے اعتبار سے سارے نبیوں میں اول اور آپ کی نبوت کا مقدم ہونا اور اس پر عہد لیا جانا''۔ کا باب قائم کرتے ہیں، پھر کہتے ہیں:

أَخْرَجَ ابْنُ أَبِي حَاتِمٍ فِي تَفْسِيرِهِ وَأَبُو نُعَيْمٍ فِي الدَّلَائِلِ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ﴾ {الاحزاب:۷} قَالَ: كُنْتُ أَوَّلَ النَّبِيِّينَ فِي الْخَلْقِ وَآخِرَهُمْ فِي الْبَعْثِ[۱].

ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اور ابو نعیم نے دلائل میں قتادہ سے، وہ حسن بصریؒ سے، وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، وہ نبیٔ کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ﴾ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں تخلیق کے لحاظ سے سب نبیوں میں پہلا نبی ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب سے آخری نبی ہوں۔''

اسی طرح کی بات قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہی ہے اور اس میں یہ اضافہ کیا ہے:

''یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی مٹی کی صورت بنا دی گئی تو اس سے محمد ﷺ نکالے گئے اور نبی بنائے گئے اور ان سے عہد لیا گیا، پھر آدم علیہ السلام کی پشت میں لوٹا دیے گئے؛ تاکہ اس وقت نکلیں جس وقت نکلنا، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر کیا ہے، لہٰذا آپ تخلیق کے اعتبار سے اول ہوئے۔''

''یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کا آپ سے پہلے ہونا لازم آتا ہے؛ کیونکہ اس وقت تو حضرت آدم علیہ السلام بے جان تھے، ان میں روح نہیں تھی، اور محمد ﷺ جب نکالے گئے تو آپ زندہ تھے، نبوت سے سرفراز کیے گئے اور آپ سے عہد لیا گیا، لہٰذا آپ تخلیق کے اعتبار سے پہلے نبی ہوئے اور بعثت کے اعتبار سے آخری نبی''۔[۲]

---

(۱) الخصائص الکبریٰ للسیوطی، بتحقیق الدکتور ہراس: ۹/۱

(۲) المواہب اللدنیہ: ۱/۶۲-۶۵

ان دونوں حضرات سے پہلے علامہ اصبہانی نے اپنی کتاب ''دلائل النبوۃ'' میں حدیثِ مذکور روایت کی ہے۔[۱]

ان علمائے کبار رحمۃ اللہ علیہم پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ حدیثِ مذکور کی صحت پر بحث و تحقیق سے پہلے ہی کیسے احکام اور واقعات بیان کرنے لگے ؟! اگر وہ تحقیق سے کام لیتے تو خود بھی بے جا مشقت سے محفوظ رہتے اور امت کا بھی وقت ضائع ہونے سے بچا لیتے۔

ڈاکٹر محمد خلیل ہراس کہتے ہیں: اس حدیث کو ابو نُعیم نے ''دلائل النبوۃ'' میں اور دیلمی نے ''الفردوس'' میں روایت کیا ہے، اس کی سند میں ''بقیہ'' نامی راوی ہے جو متہم ہے اور سعید بن بشیر ہے جسے ابن معین وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے اور صَغَانِی اور ابن تیمیہ وغیرہ نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے۔[۲]

اس سلسلے میں اور بھی دوسری موضوع و منکر روایتیں ہیں، ہم اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتے، جہاں تک اِس بات کا تعلق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، علمِ الٰہی میں تخلیقِ آدم سے مقدم ہے، تو یہ ایک ایسی بات ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

نوٹ: مذکورہ بالا روایتوں کو یک لخت غلط قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے؛ بلکہ ان میں سے بعض روایتوں کا ثبوت شمائل و تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے تفصیل کے لیے دیکھیں[۳]۔

کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباواجداد نبی تھے؟

ابو نُعیم نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف ایک اثر کی اسناد کرتے ہوئے، اس آیتِ کریمہ: ﴿وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِينَ﴾ کے تحت ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیا کی صلبوں میں بدلتے رہے؛ یہاں تک کہ آپ کی ماں کے یہاں آپ کی ولادت ہوئی۔[۴]

یہ اثر صحیح نہیں، آیتِ کریمہ کا سیاق اُسے رد کرتا ہے، ہم آیت کے سیاق پر نظر ڈالتے ہیں۔

---

(۱) دلائل النبوۃ للأصفہانی، مطبوعہ ہند: ص:۱۲

(۲) الخصائص الکبریٰ للسیوطی: ۹/۱

(۳) فرحۃ اللبیب بتخریج احادیث نشر الطیب: ۴-۱ تا ۱۱۶

(۴) دلائل النبوۃ للأصفہانی، مطبوعہ ہند: ص:۲۵

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝٢١٤ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝٢١٥ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝٢١٦ وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝٢١٧ الَّذِىْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝٢١٨ وَتَقَلُّبَكَ فِى السّٰجِدِيْنَ ۝٢١٩ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٢٢٠﴾ {الشعراء: ۲۲۰-۲۱}

اور آپ اپنے قریب کے رشتے داروں کو ڈرایئے اور پیروی کرنے والے مسلمانوں کے ساتھ فروتنی سے پیش آیئے، اور اگر یہ لوگ آپ کا کہنا نہ مانیں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں تمھارے افعال سے بیزار ہوں اور خدائے قادر و رحیم پر بھروسہ کیجیے، جو آپ کو اُس وقت دیکھتا ہے جب آپ کھڑے ہوتے ہیں اور تب بھی، جب آپ نمازیوں کے ساتھ نشست و برخاست کرتے ہیں، بے شک وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

آیاتِ کریمہ رسول اللہ ﷺ کو اُس اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر توکل کی دعوت دیتی ہیں جو آپ کے سارے احوال سے مطلع ہے، خواہ آپ تنہا نماز ادا کر رہے ہوں اور خواہ جماعت کے ساتھ۔ یہ آیات، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اطمینان دلانے کے لیے ہیں۔

تاریخ کے جو مسلّمہ واقعات ہیں وہ اس اثر کی تردید کرتے ہیں، آپ کے قریبی آبا واجداد کی سیرت معروف ہے، کسی نے بھی نہیں کہا کہ وہ نبی تھے؛ بلکہ اس ماحول میں ایک لمبے زمانے تک کسی نے نبوت کا دعویٰ بھی نہیں کیا، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کردہ حدیثِ ابوسفیان میں ہے: ''ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا: کیا ان سے پہلے بھی تم میں سے کسی نے اس طرح کی بات کہی ہے؟ ابوسفیان نے جواب دیا: نہیں''۔[1]

کیا آپ ﷺ ختنہ شدہ اور ناف کٹے پیدا ہوئے تھے؟

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں ایک حدیث ہے جو کہ صحیح نہیں ہے اور ابو الفرج ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اُسے ''موضوعات'' میں ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔[2]

---

(۱) بخاری: رقم: ۷

(۲) زاد المعاد: ۸۶/۱

دوسری فصل

آپ ﷺ کی اولاد کے تذکرے میں

ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ آپ ﷺ کی ساری اولاد حضرت خدیجہ بنتِ خویلد رضی اللہ عنہا سے تھیں، سوائے ابراہیم رضی اللہ عنہ کے، جو کہ حضرت ماریہ بنت شمعون قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے۔ (١)

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے قاسم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے، پھر زینب، پھر رقیہ، پھر امِّ کلثوم، پھر فاطمہ ، پھر عبداللہ رضی اللہ عنہ۔ ان کے زمانۂ ولادت میں اختلاف ہے۔ پھر مدینے میں ابراہیم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ (٢)

بہتر یہ ہے کہ ہم ہر ایک کا مختصر تذکرہ کر دیں۔

حضرت قاسم رضی اللہ عنہ:

یہ حضور ﷺ کی اولاد میں سب سے پہلے ہیں، قبل نبوت پیدا ہوئے، اِن ہی کی وجہ سے آپ کی کنیت ابوالقاسم ہے۔

ان کی مدتِ حیات کے بارے میں اختلاف ہے، کہا جاتا ہے کہ سترہ مہینے زندہ رہے، آپ ﷺ کی اولاد میں سب سے پہلے وفات بھی اِن ہی کی ہوئی۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ:

کہا جاتا ہے کہ بچپن میں مکے میں فوت ہوئے،اور رہا یہ سوال کہ ان کی ولادت نبوت سے پہلے ہوئی یا بعد میں ؟تو اس بارے میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اس بات کو صحیح قرار دیا ہے کہ نبوت کے بعد پیدا ہوئے،اس وجہ سے طیب وطاہر کے لقب سے ملقب ہوئے،کچھ لوگ کہتے ہیں کہ طیب وطاہر، آپ ﷺ کے دوسرے لڑکے ہیں،ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ بات صحیح ہے کہ یہ دونوں عبداللہ رضی اللہ عنہ

---

(١) البدایہ والنہایہ: ٥/ ٣٠٧-٣٠٦

(٢) زادالمعاد: ١/ ١٠٣

ہی کے لقب ہیں۔[1]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا:

یہ حضور ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی ہیں، ابنِ اسحاق کہتے کہ ان کی پیدائش رسول اللہ ﷺ کی ولادت کے تیس سال بعد ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کی شادی ابوالعاص بن ربیع کے ساتھ کی جو کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے، یہ شادی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی خواہش پر ہوئی تھی، وہ ابوالعاص بن ربیع کو اپنے بیٹے ہی کی طرح مانتی تھیں، ابوالعاص؛ مال، امانت اور تجارت میں مکے کے چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ان کی ساری بیٹیاں ایمان لے آئیں؛ لیکن ابوالعاص (اس وقت) مشرک ہی رہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی عتبہ بن ابی لہب اور سیدہ امِّ کلثوم رضی اللہ عنہا کی شادی عتیبہ بن ابی لہب کے ساتھ کی تھی، آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب قریش کو (اسلام کے لیے) پکارا تو وہ کہنے لگے: تم لوگوں نے محمد کو فکر سے فارغ کر دیا ہے، انھیں ان کی بیٹیاں لوٹا دو اور انھیں ان کی بیٹیوں کی فکر میں مشغول کر دو۔

ابولہب کے دونوں بیٹوں نے یہ بات مان لی اور اپنی بیویوں کو رخصتی سے قبل جدا کر دیا، پھر عتبہ کی شادی ابان بن سعید بن العاص کی بیٹی سے ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی کو اس کے قبضے سے چھڑا کر عزت بخشی۔

قریش ابوالعاص کے پاس گئے اور کہا کہ اپنی بیوی کو اپنے سے جدا کر دو، تم قریش کی جس لڑکی سے چاہو گے، تمھاری شادی کر دیں گے، ابوالعاص نے جواب دیا: خدا کی قسم! میں اپنی بیوی کو جدا نہیں کر سکتا اور مجھے اپنی بیوی کے مقابلے میں قریش کی کوئی عورت پسند نہیں۔ رسول اللہ ﷺ ابوالعاص کی اس بات کا ذکرِ خیر فرماتے تھے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا مسلمان ہونے کے باوجود اپنے مشرک شوہر کے ساتھ زندگی گزارتی رہیں؛ کیونکہ اب تک اس کی حرمت کی آیات نازل نہیں ہوئی تھیں۔

---

(۱) زادالمعاد: ۱/۱۰۳

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور زینب رضی اللہ عنہا اپنے شوہر کے ساتھ مکے میں رہ گئیں، جب غزوۂ بدر ہوا تو قیدیوں میں ابو العاص بھی تھے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے فدیے میں وہی ہار بھیجا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کی شادی کے موقعے پر انھیں دیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وہ ہار دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید رقت طاری ہو گئی، آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: "اگر تم مناسب سمجھو تو زینب کے قیدی کو (یونہی) چھوڑ دو اور ان کا مال انھیں لوٹا دو؛ چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسا ہی کیا۔[1]

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو العاص سے وعدہ لیا (اور ان کو بتلایا) کہ ان کے کفر کی وجہ سے اسلام نے ان کے اور زینب کے درمیان تفریق پیدا کر دی ہے؛ اس لیے وہ زینب کا مدینہ ہجرت کرنے کا راستہ صاف کر دیں، ابو العاص نے وعدہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (ابو العاص) کو رہا کر دیا، اور ان کے ساتھ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری شخص کو بھیج دیا اور انھیں یہ حکم دیا کہ وہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا مکے کے باہر مدینے کے راستے پر بطنِ یَأجَجْ میں انتظار کریں؛ تاکہ وہ لوگ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہو سکیں۔

ابو العاص نے اپنا وعدہ پورا کیا، انھوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے کہا کہ وہ مدینے کے سفر کی تیاری کریں اور اپنے بھائی کنانہ بن ربیع سے کہا کہ وہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو وہاں تک پہنچا دیں جہاں زید رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتظار کر رہے ہیں۔ انھوں نے ایسا اس لیے کیا کہ شاید وہ خود حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی جدائی کا منظر نہ دیکھ پائیں اور پھر یہ یاد انھیں ستاتی رہے۔

کنانہ نے اپنی کمان اور ترکش سنبھالا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو دن میں لے کر نکلے، سیدہ زینب رضی اللہ عنہا اپنے کجاوے میں تھیں، قریش کے کچھ لوگوں نے اس پر چہ می گوئی کی اور ان کی تلاش میں نکل پڑے، سب سے پہلے ہبّار بن اسود آگے بڑھا، اس نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو کجاوے میں ہی نیزہ دکھا کر ڈرایا، یہ منظر دیکھ کر کنانہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے، تیروں کا تھیلا پھیلا دیا؛ پھر کہا: واللہ! جو شخص بھی میرے قریب آئے گا میں اس کے جسم میں تیر پیوست کر دوں گا، یہ سن کر سارے قریش پیچھے ہٹ گئے۔

---

(۱) ابو داؤد: رقم: ۲۶۹۲

ابو سفیان قریش کے سر برآوردہ افراد کے ساتھ آئے اور کہا: اے جوان! اپنے تیر کو روکو، تو ہم تم سے کچھ بات کریں، چنانچہ کنانہ رک گئے، تو ابوسفیان کنانہ کے قریب آئے اور اس کے پاس کھڑے ہو کر بولے: تم نے اچھا کام نہیں کیا، تم اس عورت کو لوگوں کے سامنے علانیہ لے کر جا رہے ہو، حالانکہ تم ہماری مصیبت اور ہماری ذلت کو جانتے ہو، ہمارے ساتھ محمد کی وجہ سے جو کچھ پیش آیا اس کی بھی تمھیں خبر ہے، جب تم ان کی بیٹی کو علانیہ سب کے سامنے سے لے کر جاؤ گے تو لوگ سمجھیں گے کہ یہ بات بھی ہماری ذلت کی وجہ سے پیش آئی ہے، یہ ہمارے ضعف اور بزدلی کا نتیجہ ہے، میں اپنی زندگی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہمیں زینب کو ان کے باپ سے روکنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، نہ ہی اس میں ہمارا کوئی انتقام ہے، ایسا کرو کہ فی الحال زینب کو لے کر لوٹ جاؤ، جب ماحول پر سکون ہو جائے، اور لوگ کہنے لگیں کہ ہم نے زینب کو روک لیا تو خفیہ طور پر اسے نکال لے جاؤ اور اس کے والد کے پاس پہنچا دو؛ چنانچہ کنانہ نے ابوسفیان کے مشورے پر عمل کیا۔ (۱)

زینب رضی اللہ عنہا مدینہ پہنچ گئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ پورا واقعہ معلوم ہو گیا جو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو پیش آیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹی کے پیش آمدہ مصائب پر خاموش نہیں رہے، بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ وہ کہتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو فوج کی ایک ٹکڑی کے ساتھ بھیجا اور فرمایا: ''اگر تم فلاں اور فلاں کو پاؤ تو آگ میں جلا دینا''۔ پھر جب ہمارے روانہ ہونے کا وقت آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے تم کو فلاں اور فلاں کو جلانے کا حکم دیا تھا، سنو! آگ کا عذاب اللہ ہی دیتا ہے، تم اگر ان دونوں کو پاؤ تو قتل کر دینا''۔ (۲)

بخاری کے علاوہ دوسری روایات سے واضح ہوتا ہے، جن میں ایک ابن اسحاق کی روایت ہے جیسا کہ ابن ہشام کے یہاں مذکور ہے کہ وہ دو اشخاص جنھیں آپ نے قتل کا حکم دیا تھا وہ ہبّار اور اس کا ساتھی تھا۔

زمانہ گزرتا گیا، ابو العاص مکے میں تھے، اپنی بیوی سے دور، انھوں نے کسی اور سے شادی کے

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۶۵۴

(۲) بخاری: رقم: ۳۰۱۶

تعلق سے نہیں سوچا، بھلا کوئی عورت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے حسن و جمال اور حسب و نسب کی جگہ کہاں لے سکتی تھی؟ جب ہجرت کا چھٹا سال ہوا؛ ابو العاص اپنا اور قریش کا مال لے کر تجارت کے لیے شام گئے، اور وہ بہت ہی معتمد شخص تھے، جب تجارت سے فارغ ہو کر قافلہ لوٹنے لگا تو راستے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک فوجی ٹکڑی سے ان کا سامنا ہو گیا جس نے ان کا سب کچھ مال اپنے قبضے میں لے لیا؛ البتہ یہ جان بچا کر بھاگ گئے۔ جب یہ فوج ان کا مال لے کر آئی تو ابو العاص رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچ گئے اور امان چاہی، حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے امان دے دی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے لیے نکلے اور اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھی اور لوگوں نے بھی اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی؛ تو اچانک عورتوں کے لیے مخصوص نماز کی جگہ سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے چیخ کر کہا: ''اے لوگو! میں نے ابو العاص بن ربیع کو امان دی''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''اے لوگو! کیا تم نے وہ سنا جو میں نے سنا؟'' لوگوں نے جواب دیا: ہاں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: '' اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا، جب میں نے تمھاری طرح وہ بات سنی جو تم نے سنی تو معلوم ہوا، سن لو! مسلمانوں میں ان کا ایک ادنیٰ شخص بھی امان دے سکتا ہے۔''

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے گھر تشریف لائے اور بیٹی کے پاس جا کر فرمایا: ''اے پیاری بیٹی! اس کو اچھی طرح رکھنا؛ لیکن وہ تم سے خلوت نہ کرے؛ کیونکہ تم اس کے لیے حلال نہیں ہو''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی ٹکڑی کے ان حضرات کے پاس؛ جنھوں نے ابو العاص کا مال (غنیمت میں) حاصل کیا تھا، یہ کہلوایا: یہ شخص جیسا کہ تمھیں معلوم ہے ہمارا ایک فرد ہے، تم نے اس کا مال (غنیمت میں) پایا ہے، اگر اچھا سمجھو اور ان کا مال انھیں لوٹا دو تو یہ چیز ہمارے لیے پسندیدہ ہے؛ لیکن اگر تم نہ لوٹاؤ تو یہ اللہ کا عطیہ ہے جو اللہ نے تمھیں دیا ہے، تم اس کے زیادہ حقدار ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کہنے پر ان حضرات نے مال لوٹا دیا۔

ابو العاص اپنا مال لے کر مکہ آئے، جس کا جو مال تھا دے دیا، پھر کہا: کیا کسی کا کوئی مال میرے پاس

باقی رہ گیا ہے جسے اس نے نہ لیا ہو؟ لوگوں نے کہا: نہیں، اللہ تمھیں بہترین بدلہ دے، ہم نے تمھیں پوری پوری ادائیگی کرنے والا شریف انسان پایا۔ ابو العاص نے کہا: ”سن لو! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اللہ کی قسم! مجھے ان کے پاس اسلام لانے سے صرف اس بات نے روکا تھا کہ تم لوگ سمجھوگے کہ میں تمھارے اموال ہڑپنا چاہتا ہوں، اب جب اللہ نے تمھارا مال تمھیں پہنچا دیا اور میں اُس سے عہدہ برآ ہوگیا، تو میں نے اسلام قبول کرلیا“۔ پھر وہ وہاں سے نکلے اور مدینہ آگئے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو نکاحِ اول پر ہی ابو العاص کے پاس لوٹا دیا، نیا کچھ نہیں کیا۔ (١)

معزز گھرانہ ایک بار پھر یکجا ہوگیا؛ لیکن یہ رفاقت زیادہ دیر تک نہیں رہی؛ چنانچہ ہجرت کے آٹھویں سال حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات ہوگئی۔

زینب رضی اللہ عنہا سے علی اور امامہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئے۔

علی رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کے بعد اپنے والد کی حیات میں وفات پاگئے، بلوغ کے لگ بھگ عمر پائی۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں بنو غاضرہ سے لیا تھا، جہاں وہ دودھ پیتے تھے، اس زمانے میں ان کے باپ مکے میں مشرک تھے، یہی علی رضی اللہ عنہ فتحِ مکہ کے موقعے پر رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی پر آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ (٢)

امامہ رضی اللہ عنہا اپنی والدہ کی وفات کے وقت چھوٹی بچی تھیں، انھیں رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز میں اپنے کندھے پر اٹھالیتے، جب رکوع کرتے تو اتار دیتے اور جب سجدے سے سر اٹھاتے تو پھر کندھے پر بٹھا لیتے تھے۔ (٣)

امامہ رضی اللہ عنہا سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وقت شادی کرلی جب اُن کی خالہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امامہ رضی اللہ عنہا نے مغیرہ بن نوفل ہاشمی رضی اللہ عنہ سے شادی

---

(١) اس سوانح کا ماخذ سیرت ابن ہشام: ٢/٦٥١-٦٥٩ ہے۔
(٢) شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ: ٣/١٩٧
(٣) متفق علیہ: خ: ٥١٦، م: ٥٤٣

اور اُن ہی کی زوجیت میں رہتے ہوئے وفات پائی، حضرت امامہ رضی اللہ عنہا کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی، نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے، نہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے۔

ابو العاص رضی اللہ عنہ کی وفات ان کی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات کے چار سال بعد ۱۲ھ میں ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے بارے میں تعریفی کلمات کہے؛ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا: ''اما بعد! میں نے اپنی بیٹی (زینب) کا نکاح ابو العاص بن ربیع سے کیا؛ چنانچہ انھوں نے مجھ سے بات کہی اور سچے ثابت ہوئے''۔[1]

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا:

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا مولود ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۳/ سال تھی، عتبہ بن ابی لہب نے رخصتی سے قبل ہی جب انھیں طلاق دے دی، تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے مکے میں ان سے شادی کی، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ دو ہجرتیں کیں، پہلی حبشہ کی جانب، پھر مدینے کی جانب۔ یہ بہت ہی خوب صورت تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر کی طرف نکلنے سے پہلے یہ بیمار پڑ گئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی تیمارداری کے لیے مدینے میں ہی چھوڑ دیا اور فرمایا:

«إِنَّ لَكَ أَجْرَ رَجُلٍ مِمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا وَسَهْمَهُ»[2]

جو لوگ بدر میں شریک ہوئے ان میں سے ایک کے برابر تمھیں ثواب ملے گا اور اس کا حصہ بھی ملے گا۔

یہ اپنی اسی بیماری میں وفات پا گئیں، جب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں فتح کی خوش خبری لے کر مدینہ آئے تو انھوں نے دیکھا کہ لوگ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی قبر برابر کر چکے۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک لڑکا عبد اللہ پیدا ہوا، اسی سے وہ اپنی کنیت ابو عبد اللہ رکھتے تھے، چھ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا، پھر انھوں نے اپنے دوسرے بیٹے عمرو سے

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۷۲۹، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح کے تحت ابو العاص رضی اللہ عنہ کی تاریخِ وفات لکھی ہے۔

(۲) بخاری: رقم: ۳۶۹۸

اپنی کنیت ابو عمرو رکھی۔

حضرت امِّ کلثوم رضی اللہ عنہا:

امِّ کلثوم رضی اللہ عنہا کا کوئی نام معلوم و منقول نہیں ،وہ اپنی کنیت ہی سے پہچانی جاتی ہیں۔
حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شادی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دی۔
یہ ۳ سنہ ھ کا واقعہ ہے۔
وہ مسلسل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس رہیں، یہاں تک کہ ۹ سنہ ھ میں ان کی وفات ہو گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر پر بیٹھے ہوئے تھے اور دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی ہے جس نے رات میں اپنی بیوی سے مقاربت نہ کی ہو؟'' ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں! میں موجود ہوں، آپ نے ارشاد فرمایا: ''ان کی قبر میں اترو؛ چنانچہ وہ قبر میں اترے''۔ (۱)
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا لقب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن ہی دو بیٹیوں کی وجہ سے ''ذو النورین'' پڑا، حضرت امِّ کلثوم رضی اللہ عنہا سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا:

ان کے سنہ ولادت پر اتفاق نہیں ہے۔ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: نبوت سے پانچ سال پہلے پیدا ہوئیں، ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے اکتالیسویں سال میں پیدا ہوئیں۔ (۲)
۲ سنہ ھ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال میں آپ کے نزدیک یہ سب سے زیادہ محبوب تھیں، اگر یہ کسی بات سے ناراض ہوتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ناراض ہو جاتے اور یہ راضی ہوتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی راضی ہو جاتے تھے۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۱۲۸۵
(۲) المواہب اللدنیہ للقسطلانی: ۶۴/۲

بخاری و مسلم میں مِسوَر بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

«إِنَّ عَلِيًّا خَطَبَ بِنْتَ أَبِي جَهْلٍ فَسَمِعَتْ بِذٰلِكَ فَاطِمَةُ فَأَتَتْ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَتْ: يَزْعُمُ قَوْمُكَ أَنَّكَ لَا تَغْضَبُ لِبَنَاتِكَ، وَهٰذَا عَلِيٌّ نَاكِحٌ بِنْتَ أَبِي جَهْلٍ، فَقَامَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَسَمِعْتُهُ حِينَ تَشَهَّدَ، يَقُولُ: «أَمَّا بَعْدُ أَنْكَحْتُ أَبَا العَاصِ بْنَ الرَّبِيعِ، فَحَدَّثَنِي وَصَدَقَنِي، وَإِنَّ فَاطِمَةَ بِضْعَةٌ مِنِّي وَإِنِّي أَكْرَهُ أَنْ يَسُوءَهَا، وَاللهِ لَا تَجْتَمِعُ بِنْتُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبِنْتُ عَدُوِّ اللهِ، عِنْدَ رَجُلٍ وَاحِدٍ» فَتَرَكَ عَلِيٌّ الخِطْبَةَ».

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُمَا: «إِنَّ بَنِي هِشَامِ بْنِ الْمُغِيرَةِ اسْتَأْذَنُوا فِي أَنْ يُنْكِحُوا ابْنَتَهُمْ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ، فَلَا آذَنُ، ثُمَّ لَا آذَنُ، ثُمَّ لَا آذَنُ، إِلَّا أَنْ يُرِيدَ ابْنُ أَبِي طَالِبٍ أَنْ يُطَلِّقَ ابْنَتِي وَيَنْكِحَ ابْنَتَهُمْ، فَإِنَّمَا هِيَ بِضْعَةٌ مِنِّي، يُرِيبُنِي مَا أَرَابَهَا، وَيُؤْذِينِي مَا آذَاهَا»[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی کو نکاح کا پیغام بھیجا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات معلوم ہوئی، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور فرمایا: آپ کی قوم سمجھتی ہے کہ آپ کو آپ کی بیٹیوں کی وجہ سے غصہ نہیں آتا، یہ دیکھیے! علی، ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے والے ہیں، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو گئے اور خطبے میں فرمایا: امابعد! میں نے اپنی بیٹی (زینب) کا نکاح ابو العاص بن ربیع سے کیا، انھوں نے مجھ سے ایک بات کہی اور وہ سچے ثابت ہوئے۔[2] فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے، ہے، مجھے ناپسند ہے کہ اسے کوئی تکلیف پہنچے، اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک شخص کے پاس جمع نہیں ہو سکتیں؛ چنانچہ علی رضی اللہ عنہ نے نکاح کا ارادہ ترک کر دیا۔

بخاری و مسلم دونوں کی روایت میں ہے کہ: ''بنو ہشام بن مغیرہ نے اجازت طلب کی کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح علی بن ابی طالب سے کر دیں، میں اس کی اجازت نہیں دیتا، اجازت نہیں دیتا، اجازت نہیں دیتا، اگر ابن ابی طالب نکاح کرنا چاہتے ہیں تو وہ میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی بیٹی سے نکاح کر لیں، فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے، مجھے بے چین وپریشان کرتی ہے وہ چیز جو اُسے بے چین وپریشان کرتی ہے اور مجھے وہ چیز ایذا دیتی ہے جو اس کو ایذا دیتی ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اِس امت کی عورتوں کی سردار ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

---

(١) متفق علیہ: خ: ٣٧٢٩، ٥٢٣٠، م: ٢٤٤٩

(2) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے (حدّثني وصدقني) کی وضاحت کی ہے کہ شاید ابوالعاص ابن ربیع نے اپنے کو پابند کیا تھا اور اپنے اوپر شرط کی تھی کہ حضرت زینب کی حیات میں کسی اور سے نکاح نہیں کروں گا (فتح الباری، ٨/٤٤٤) از مصحح

فرمایا ہے، بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے:

''ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، ہم میں سے ایک بھی وہاں سے نہیں گئی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چلتی ہوئی آئیں، اللہ کی قسم! ان کی چال، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال جیسی ہوتی تھی، آپ نے جب انھیں دیکھا تو خوش آمدید کہا اور فرمایا: اے میری پیاری بیٹی! مرحبا، انھیں اپنے دائیں یا بائیں بٹھالیا، پھر چپکے سے ان سے کوئی بات کہی، وہ سنتے ہی شدت کے ساتھ رونے لگیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ حال دیکھا تو پھر چپکے سے کوئی بات کہی، وہ یہ بات سن کر ہنس پڑیں۔ میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ہم ساری بیویوں کے ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر تم سے رازدارانہ بات کہی، پھر تم کیوں روتی ہو؟ انھوں نے جواب دیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راز کو فاش نہیں کر سکتی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو میں نے ان سے کہا کہ دیکھو! میرا جو تمھارے اوپر حق ہے اس کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ مجھے وہ بات بتاؤ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے کہی تھی، وہ کہنے لگیں: ہاں! اب میں بتادوں گی۔ چنانچہ انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پہلی مرتبہ رازدارانہ بات کہی تھی تو فرمایا تھا کہ: ''جبرئیل علیہ السلام ہر سال ایک مرتبہ مجھ سے قرآن سنتے اور سناتے تھے؛ مگر اس سال دو بار قرآن سنا اور سنایا، میرا خیال یہ ہے کہ اب موت قریب ہے، پس اللہ سے ڈرنا اور صبر کرنا، اس لیے کہ میں تمھارے لیے بہترین آگے جانے والا والد ہوں۔'' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گھبراہٹ اور پریشانی دیکھی تو دوبارہ رازدارانہ بات کہی، وہ یہ کہ: '' اے فاطمہ! کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تم مؤمن عورتوں کی سردار ہو گی، یا یہ کہ تم اس امت کی عورتوں کی سردار ہو گی۔''[(١)]

بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ: ''کیا تم خوش نہیں ہو کہ تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو گی؟''[(٢)]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد ہوئی، ان سے حسن، حسین اور محسن تولد ہوئے، محسن بچپن میں ہی وفات پا گئے اور دو بیٹیاں ہوئیں: ام کلثوم اور زینب۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی سے ہے، آپ کی نسل

---

(١) متفق علیہ: خ: ٦٢٨٥، ٦٢٨٦، م: ٢٤٥٠

(٢) بخاری: رقم: ٣٦٢٣، ٣٦٢٤

شریف آپ کے دو نواسوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سے ہی چلی، حسن رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب لوگ ''حسنی'' کہلاتے ہیں اور حسین رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب لوگ ''حسینی'' کہلاتے ہیں۔

امِّ کلثوم بنتِ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا، ان سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے، ان دونوں کی نسل نہیں چلی، پھر امِّ کلثوم رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد عون بن جعفر سے نکاح کیا، عون بن جعفر کی وفات کے بعد ان کے بھائی محمد بن جعفر سے عقد نکاح کیا، ان کے مرنے کے بعد ان ہی دونوں کے بھائی عبد اللہ بن جعفر سے نکاح کیا، پھر وہیں امِّ کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی، ان تینوں بھائیوں میں سے صرف دوسرے بھائی سے ایک چھوٹی بچی پیدا ہوئی، اس کی کوئی نسل نہیں چلی۔

عبداللہ بن جعفر نے ان کی بہن زینب بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی، ان سے کئی اولادیں ہوئیں۔ (١)

حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ:

حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ ٨ سنہ ھ میں پیدا ہوئے، ان کی ماں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا ہیں۔
مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «وُلِدَ لِي اللَّيْلَةَ غُلَامٌ، فَسَمَّيْتُهُ بِاسْمِ أَبِي إِبْرَاهِيمَ» ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى أُمِّ سَيْفٍ، امْرَأَةِ قَيْنٍ يُقَالُ لَهُ أَبُو سَيْفٍ» (٢).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گذشتہ رات میرے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے، میں نے اس کا نام اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کے نام پر ابراہیم رکھا ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچے کو دودھ پلانے کے لیے امِّ سیف کو دے دیا، یہ ایک لوہار کی بیوی تھیں، جن کو ابو سیف کہا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عوالئ مدینہ میں - جہاں ابراہیم رضی اللہ عنہ کی انّا کا گھر تھا - جایا کرتے تھے، انھیں دیکھتے، انھیں بوسہ دیتے اور واپس آجاتے۔

مسلم میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اپنے اہل و عیال پر شفیق کسی کو نہیں دیکھا، ابراہیم رضی اللہ عنہ عوالئ مدینہ میں ایک جگہ دودھ پیا کرتے

---

(١) المواہب اللدنیہ: ٢/٦٧-٦٦
(٢) مسلم: رقم: ٢٣١٥

تھے، رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لے جاتے، ہم لوگ بھی ساتھ رہتے تھے، آپ گھر میں داخل ہوتے، گھر دھوئیں سے بھرا ہوتا، کیونکہ ان کی انّا لوہارن تھیں، آپ انھیں لیتے، بوسہ لیتے اور لوٹ جاتے''۔[١]

بخاری کی روایت میں ہے کہ ''بوسہ لیتے اور سونگھتے''۔[٢]

ابراہیم رضی اللہ عنہ کی زندگی لمبی نہیں ہوئی، عالمِ شیر خوارگی میں ہی ان کی وفات ہوگئی، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ابراہیم میرا بیٹا ہے، وہ دودھ پینے کی عمر میں ہی داغِ مفارقت دے گیا، اس کے لیے جنت میں دو انّائیں مقرر کی گئی ہیں، جو اس کی شیر خوارگی کو پورا کریں گی''۔[٣]

بخاری کی روایت میں ابراہیم رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری لمحات کی منظر کشی کی گئی ہے؛ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

'' ہم ابراہیم رضی اللہ عنہ کے پاس اسوقت آئے جب ابراہیم رضی اللہ عنہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے، یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کی دونوں آنکھیں چھلک پڑیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ایسے موقعے پر آپ بھی روتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اے ابن عوف! یہ رحمت ہے''۔ پھر اس کے بعد دوسرا جملہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا: ''آنکھ آنسو بہا رہی ہے، دل غمگیں ہے، مگر اس موقعے پر بھی ہم وہی بات کہیں گے جو ہمارے رب کو راضی کرے اور اے ابراہیم! تیری جدائی سے ہم غمزدہ ہیں''۔[٤]

ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن سورج میں گہن لگ گیا تھا، لوگوں نے کہا: ''ابراہیم رضی اللہ عنہ کی موت کی وجہ سے سورج میں گہن لگا ہے''، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سورج اور چاند میں کسی کی موت اور زندگی کی وجہ سے گہن نہیں لگتا، جب تم گہن دیکھو تو نماز پڑھو اور دعا مانگو۔''[٥]

---

(١) مسلم: رقم: ٢٣١٦
(٢) بخاری: رقم: ١٣٠٣
(٣) مسلم: رقم: ٢٣١٦
(٤) بخاری: رقم: ١٣٠٣
(٥) متفق علیہ: خ: ١٠٤٢، م: ٩١٥

تیسری فصل

رسول اللہ ﷺ شفیق باپ

پدرانہ شفقت:

رسول اللہ ﷺ کی اولاد کا سابق میں جو تعارف پیش کیا گیا، اس سے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں ایک بلند پایہ پدرانہ عظمت کے مظاہر و مناظر سامنے آتے ہیں۔

یہ پدری جذبۂ شفقت و محبت: الفت و نرم دلی اور تربیت و نگہداشت کے تمام معانی و مفاہیم اپنے پہلو میں سمیٹے ہوئے ہے، واقعی صورتِ حال سے یہ صاف جھلک رہا ہے، الفاظ و کلمات ان معانی کے احاطے اور مقاصد کے بیان سے عاجز ہیں۔ ایک رائٹر (مؤرخ و سیرت نگار) بھی یہی کر سکتا ہے کہ واقعات کی روایت اور الفاظ کو قاری کے سامنے جوں کا توں پیش کر دے اور غور و فکر کے لیے اسے آزاد چھوڑ دے تاکہ وہ آپ کی مراد اور واقعات کی حقیقت تک پہنچ سکے۔

باپ کی مسرت و شادمانی کے اظہار کا پہلا مرحلہ اپنے بچے کی پیدائش پر خوش ہونا ہوتا ہے؛ مگر جذبات کی گرم جوشی کو ہم کسی پیمانے سے ناپ کر اس کی کوئی مقدار متعین نہیں کر سکتے، ہاں بعض محسوس حرکات و سکنات اور طرزِ عمل سے اس کے جذبات کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے حالات اور ان کی ولادت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت کی خوش خبری رسول اللہ ﷺ کو آپ کے آزاد کردہ غلام ابو رافع نے دی، آپ نے اس خوش خبری پر ابو رافع کو ایک غلام بخش دیا"۔[1]

گویا خوش خبری کا انعام غلام، اور غلام اس زمانے میں بڑی قیمت رکھتا تھا، اس واقعے سے رسول اللہ ﷺ کی خوشی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

کیا آپ ﷺ کا یہ طریقہ صرف حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے متعلق تھا؟ ہمارے خیال میں ایسا

---

(١) زاد المعاد: ١/١٠٤

نہیں ہے۔ آپ کی پہلی اولاد کے بارے میں آپ کا طریقہ کتبِ حدیث وسیرت میں اس لیے مذکور نہیں ہے کہ ان کی ولادت مکے میں ہوئی تھی، اور نبوت سے پہلے ہوئی تھی، اور بعض کی ولادت نبوت کے بعد ہوئی، مثلاً عبد اللہ، لیکن مکہ کے حالات اس قسم کے جذبات کے نقل کی اجازت نہیں دیتے تھے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سخت دشوار گزار دور سے گذر رہے تھے، حالات نے گنجائش ہی نہیں دی کہ وہ اس موقعے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کو نقل کریں۔

ہم تقریباً یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دوسری اولاد کی ولادت کی خوشی غالباً اس سے بھی زیادہ ہوئی؛ کیونکہ ان کی ماں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین بیوی تھیں، جبکہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ آپ کی باندی ماریہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بچوں سے ان کے بچپن میں بے حد جذباتی وابستگی رکھتے تھے؛ چنانچہ آپ - جیسا کہ روایتوں میں ہم نے دیکھا - عوالی جاتے، جبکہ عوالی، مدینے سے تین میل کے فاصلے پر ہے، مقصد یہ ہوتا تھا کہ اپنے بیٹے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی زیارت کریں، انھیں بوسہ دیں، سونگھیں، پھر لوٹ آئیں۔

اسی انداز کا ایک واقعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی نقل کرتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دن کے ایک حصے میں نکلے، نہ آپ نے مجھ سے کوئی بات فرمائی اور نہ میں نے آپ سے کچھ عرض کیا، یہاں تک کہ آپ بنو قینقاع کے بازار میں آئے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے صحن میں بیٹھ گئے اور پوچھا: "بچہ کہاں ہے؟ بچہ کہاں ہے؟" فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بچے کو کچھ دیر روکا۔ میں نے یہ سمجھا کہ وہ انھیں لونگ وغیرہ کا ہار پہنا رہی ہیں، یا منہ وغیرہ دھلا رہی ہیں، پھر بچہ دوڑتا ہوا آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سینے سے چمٹا لیا اور بوسہ دیا اور فرمایا: "اے اللہ! اسے محبوب رکھ اور جو اس سے محبت کرے اسے بھی محبوب رکھ"۔ (۱)

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر جاتے، مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ حسن رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیں اور گلے لگائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ آپ کی خاص وعام ہر مجلس میں تھا؛ چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۲۱۲۲، م: ۲۴۲۱

''ایک دن حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا بوسہ لیا، وہاں پر اقرع بن حابس تیمی بیٹھے ہوئے تھے، اقرع نے کہا: میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا: ''جو رحم نہیں کرتا اُس پر رحم نہیں کیا جاتا''۔[(۱)]

ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس نے کہا:

''تم لوگ اپنے بچوں کا بوسہ لیتے ہو؟ ہم تو بوسہ نہیں لیتے!!! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر اللہ نے تمھارے دل سے رحم نکال دیا ہے تو میں کیا کروں؟''[(۲)]

بلاشبہ اولاد سے محبت کرنا اور انھیں چومنا، پیار کرنا، دل میں رحم کے پائے جانے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بچہ کھیل کود اور ہنسی مذاق کو پسند کرتا ہے، یہ اس کی نفسیاتی اور جسمانی تعمیر کی تکمیل کے لیے ضروری ہے، چنانچہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کمالِ انسانی کی صورتوں میں سے ایک صورت کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ عَلَى عَاتِقِهِ»[(۳)].

میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کے کندھے پر حسنؓ بن علیؓ سوار ہیں۔

«وَدَخَلَ الحَسَنُ الْمَسْجِدَ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي وَقَدْ سَجَدَ فَرَكِبَ عَلَى ظَهْرِهِ، فَأَبْطَأَ فِي سُجُودِهِ حَتَّى نَزَلَ الحَسَنُ، فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ لَهُ بَعْضُ أَصْحَابِهِ يَا رَسُولَ اللهِ قَدْ أَطَلْتَ سُجُودَكَ قَالَ: «إِنَّ ابْنِي ارْتَحَلَنِي فَكَرِهْتُ أَنْ أُعَجِّلَهُ»[(۴)].

حسن رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے ہیں اور سجدے میں ہیں، وہ آپ کی پیٹھ پر سوار ہو گئے، آپ نے سجدے میں دیر لگادی یہاں تک کہ حسن رضی اللہ عنہ اتر گئے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ کے بعض اصحاب نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے سجدہ لمبا کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرا بیٹا مجھ پر سوار ہو گیا تھا؛ میں نے اسے جلدی اتارنا پسند نہیں کیا۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۵۹۹۷، م: ۲۳۱۸

(۲) متفق علیہ: خ: ۵۹۹۸، م: ۲۳۱۷

(۳) متفق علیہ: خ: ۳۷۴۹، م: ۲۴۲۲

(۴) أخرجہ أحمد فی المسند: ۳/۴۹۴، وکذا النسائی برقم: ۱۱۴۰

اولاد کے ساتھ حسنِ تعامل کی یہ دو تصویریں ہیں جنھیں سنتِ مطہرہ نے محفوظ کر دیا ہے؛ تاکہ مسلمان اس راستے پر آپ کے نقوشِ قدم کی اتباع کرتے ہوئے چلیں۔

رسول اللہ ﷺ اپنی بیٹیوں کا اکرام کرتے تھے، جب آپ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے پاس آتیں، آپ ان کے لیے کھڑے ہو جاتے، انھیں بوسہ دیتے، انھیں اپنی دائیں جانب بٹھاتے، کبھی کبھی ان کے لیے اپنا کپڑا بچھا دیتے۔

بیٹیوں کے غم سے آپ غمگیں ہو جاتے تھے، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''آپ ﷺ کی ایک بیٹی نے آپ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا جاں بہ لب ہے، آپ تشریف لائیے، آپ نے قاصد سے کہا: ''اسے سلام کہو اور بتاؤ کہ: اللہ ہی کی وہ چیز ہے جو وہ لے لیتا ہے اور اللہ ہی کی وہ چیز ہوتی ہے جو وہ دیتا ہے؛ پس صبر کرو اور اللہ سے ثواب کی امید رکھو''۔ بیٹی نے پھر آدمی بھیجا اور قسم دی کہ آپ ضرور تشریف لائیں، پس حضور ﷺ اُٹھ کھڑے ہوئے، آپ کے ساتھ سعد بن عبادہ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور دوسرے حضرات بھی تھے، بچہ آپ کے پاس لایا گیا، بچہ جاں کنی کی حالت میں تھا، راوی کہتے ہیں کہ اس کی حالت ایسی تھی جیسے پرانی چھوٹی مشک (کہ اس کو حرکت دینے سے آواز نکلتی ہے)، آپ ﷺ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! یہ کیا؟'' آپ نے فرمایا: ''یہ وہ رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرمائی ہے اور اللہ تعالی اپنے اُنھیں بندوں پر رحم کرتا ہے جو رحم دل ہوتے ہیں''۔(۱)

اسی طرح آپ ﷺ کی جو اولاد بیمار ہو جاتی اُس پر بہت مہربانی فرماتے اور اس کے مرض کی حالت میں خصوصی دیکھ بھال کرتے۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کس طرح گھر ہی پر رہنے دیا؛ تاکہ وہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی بیماری میں ان کے پاس رہیں۔

اس ساری محبت اور شفقت کے باوجود آپ ﷺ کے جذباتِ پدری ان چیزوں کو نافذ کرنے میں مانع نہیں ہوئے جن کی پہلے ضرورت ہوتی تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۱۲۸۴، م: ۹۲۳

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وہ درخواست منظور نہیں فرمائی جب انھوں نے قیدیوں میں سے ایک خادم کا مطالبہ کیا تھا، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی تھیں، آپ نے انھیں جواب دیا: ''میں فاقہ مست اہلِ صفہ کو چھوڑ کر تم دونوں کو غلام نہیں دے سکتا''۔ (۱)

یہاں تک کہ بچوں کے ساتھ بھی اوامرِ شرع کے لاگو کرنے میں کوئی نرمی نہیں برتی، یہ دیکھیے! حسن و حسین رضی اللہ عنہما صدقات کی کھجوروں سے کھیل رہے ہیں، اچانک ان میں سے ایک نے ایک کھجور اپنے منہ میں ڈال لی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

«كِخْ كِخْ»فَأَخْرَجَهَا مِنْ فِيهِ، فَقَالَ: «أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ آلَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَأْكُلُونَ الصَّدَقَةَ» (۲).

ایسا نہ کرو، ایسا نہ کرو، پھر کھجور ان کے منہ سے نکال دی اور فرمایا: ''کیا تم جانتے نہیں کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ نہیں کھاتے۔

یہ اولاد کی ایسی تربیت ہے جو اوامرِ شرع کے ساتھ منسلک اور مربوط ہے۔

لڑکا لڑکی کے درمیان تفریق نہیں:

زمانۂ جاہلیت کی زندگی لڑکے کو لڑکی پر فوقیت دینے کی بنیاد پر قائم تھی، اگر پیدا ہونے والا بچہ لڑکا ہوتا تو خوش ہوتے، لڑکی ہوتی تو افسردہ و غمگیں ہو جاتے۔ قرآنِ کریم نے اُن کے اس عام طرزِ زندگی کو بیان کیا ہے:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٥٩﴾﴾

{النحل:59-58}

اور جب اُن میں سے کسی کو بیٹی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے، اور دل ہی دل میں گھٹتا رہتا ہے، اور جس چیز کی اسے خبر دی جاتی ہے اس کے عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیا اُسے بحالتِ ذلت لیے رہے، یا اس کو مٹی میں گاڑ دے، خوب سن لو! اُن کا یہ فیصلہ بہت ہی بُرا ہے۔

اسلام آیا تاکہ اس روش کو درست کرے، اور لڑکیوں پر بھی وہی لڑکوں جیسی عنایت مبذول

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: من معین السیرۃ: ص: ۲۲۶

(۲) متفق علیہ: خ: ۱۴۹۱، ۱۴۸۵، م: ۱۰۶۹

کرے اور بتائے کہ پیدا ہونے والا بچہ اللہ کا عطیہ ہے، مسلمان کو زیب دیتا ہے کہ وہ اس عطیے پر خوش ہو اور غور کرے کہ عطیہ دینے والا کون ہے؟۔

﴿يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاءُ الذُّكُوْرَ﴾ {الشوریٰ:۴۹}

جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے۔

جو شخص اس قسم کا ذہن و مزاج نہ رکھے اسے اپنے ایمان کا محاسبہ کرنا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ کے لڑکے بڑے نہیں ہوئے، اس لیے ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم اس بات کا موازنہ کریں کہ آپ لڑکوں کے ساتھ کیسا اور لڑکیوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتے تھے؛ لیکن ہم لڑکیوں کے سلسلے میں آپ کا طریقہ دیکھ چکے ہیں کہ آپ لڑکیوں کے لیے جو احترام، توقیر اور محبت رکھتے تھے، اس پر اضافہ کی گنجائش نہیں، آپ ان کے لیے کھڑے ہو جاتے، ان کا استقبال کرتے، ان کی خوشی سے خوش ہوتے، ان کے غم سے غمگیں ہو جاتے۔ جو چیز ہمارے لیے یقینی ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ کی نرینہ اولاد بڑی ہوتی تو آپ اُن کے ساتھ اس سے بڑھ کر سلوک نہ کرتے۔

اگر آپ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بچے مسجد میں آکر آپ کی پشتِ مبارک پر چڑھ جاتے تو آپ اس کی وجہ سے سجدہ لمبا کر دیتے، سارے مسلمانوں نے یہ بھی دیکھا کہ آپ ان کی امامت کر رہے ہیں اور اپنی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کی بیٹی امامہ بنت ابی العاص بن ربیع کو اٹھائے ہوئے ہیں، جب آپ ﷺ سجدہ کرتے تو اُسے اتار دیتے اور جب اٹھتے تو اٹھا لیتے۔(۱)

اس بچی امامہ رضی اللہ عنہا کا رسول اللہ ﷺ کے نزدیک کیا مقام تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں، وہ فرماتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کو یمنی موتیوں کا ایک ایسا ہار ہدیے میں ملا جس پر سونا ملمع کیا ہوا تھا، آپ کی ساری ازواجِ مطہرات ایک گھر میں جمع تھیں، اور امامہ بنت ابی العاص بن ربیع گھر کی ایک جانب میں مٹی سے کھیل رہی تھی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہار مجھے دے دو''، جب آپ نے اسے لے لیا تو فرمایا: اللہ کی قسم! میں یہ ہار اس کی گردن میں پہناؤں گا جو میرے گھر والوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ زمین اور میری دنیا (مجھ پر) تاریک ہو گئی، مجھے یہ ڈر لگا کہ آپ یہ ہار

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۵۱۶، م: ۱۵۴۳

کہیں میرے علاوہ کسی اور بیوی کی گردن میں نہ پہنادیں، بالکل اسی طرح کی کیفیت دیگر ازواجِ مطہرات کی بھی تھی، ہم سب پر سکوت طاری تھا، پھر حضور ﷺ امامہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور وہ ہار امامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہا کی گردن میں پہنادیا، یہ منظر دیکھ کر ہمارا غم دور ہو گیا۔‘‘[۱]

رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے آپ کی صاحبزادی کی ساری اولاد، خواہ لڑکی ہو یا لڑکا، متمتع ہوتی رہی، آپ کی توجہ اور شفقت و محبت سب کو عام تھی۔

لڑکی کے لیے مناسب شوہر کا انتخاب:

امام نسائی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

«عَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: خَطَبَ أَبُوبَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا فَاطِمَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّهَا هِيَ صَغِيرَةٌ، فَخَطَبَهَا عَلِيٌّ فَزَوَّجَهَا مِنْهُ»[۲].

ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’وہ چھوٹی ہے‘‘، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پیغام بھیجا تو آپ نے ان سے شادی کر دی۔

اس حدیث کے اندازِ بیان اور موضوع سے متعلق دوسری احادیث اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پیغام ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پیغام کے بعد تھا، اور زمانے کے اعتبار سے کوئی خاص فاصلہ نہیں تھا۔

لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ ’’وہ چھوٹی ہے‘‘، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ شادی کے لائق نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر، اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر میں سن کا جو فرق تھا اس کے لحاظ سے ’’وہ چھوٹی ہے‘‘۔

---

(۱) مجمع الزوائد: ۲۵۴/۹، ہیثمی کہتے ہیں کہ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے، الفاظ اُن ہی کے ہیں، اور امام احمد نے اختصار کے ساتھ روایت کیا، اور ابو یعلیٰ نے بھی روایت کیا ہے اور احمد اور ابو یعلیٰ کی سند حسن ہے۔

مسند احمد کے الفاظ یہ ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ دیا گیا، جس میں یمنی موتیوں کا ایک ہار تھا، آپؐ نے فرمایا: میں اسے اپنے گھر والوں میں جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، اس کو دوں گا، آپ ﷺ کی ازواج نے کہنا شروع کیا کہ ابو قحافہ کی بیٹی یہ ہار لے جائے گی، مگر رسول اللہ ﷺ نے امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو بلایا اور اس کی گردن میں وہ ہار ڈال دیا۔ (الفتح الربانی: ۱۱۲/۲۲)

(۲) نسائی: رقم: ۳۲۲۱

جب علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے تو چونکہ ان کی عمر فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر سے کوئی قابل ذکر زیادہ نہیں تھی، اس لیے علی رضی اللہ عنہ کے پیغام پر آپ نے رضامندی ظاہر کر دی؛ کیونکہ دونوں کی عمریں قریب تھیں۔

اس معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سیرت سامنے آئی وہ ظاہر ہے، بیٹی کے مصالح میں سے یہ بھی ایک مصلحت ہے، باپ کے لیے اس کا خیال رکھنا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے تعلق سے ضروری ہے کہ بیٹی اور داماد کی عمروں میں زیادہ تفاوت نہ ہو۔

یہ عجیب بات ہے کہ بہت سے بڑی عمر کے حضرات چھوٹی عمر کی عورت سے شادی کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنے کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کو بھول جاتے ہیں جو آپ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے وقت کیا۔

یہ بھی آپ کا عمل ہے اور وہ بھی آپ کا عمل ہے، پھر کیوں یہ لوگ ایک ہی عمل کو یاد رکھتے ہیں اور دوسرے کو یکسر بھول جاتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی کے معاملے کے احوال وواقعات تقریباً اس شادی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت کا رجحان پیدا کرتے ہیں۔ [1]

جب معاملہ اس طرح ہے تو اس لیے جو فعل خصوصیت پر دلالت نہیں کرتا وہ اس فعل پر مقدم رہے گا جو خصوصیت کو ظاہر کرے۔

اسی طرح ہر باپ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کے امور کی طرف خصوصی توجہ رکھے اور ان کے لیے وہ چیز منتخب کرے جس میں دینی ودنیاوی دونوں مصلحتوں کی رعایت ہو۔

بیٹیوں کی دیکھ بھال، شادی کے بعد:

آدمی اپنی بیٹی کی شادی کر دے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب بیٹی اور اس کے درمیان رشتہ منقطع ہو گیا۔ اس کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دے اور اس کی ہر چیز سے ناآشنا ہو جائے۔

---

(۱) ان میں سے ایک یہ کہ: حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کی تصویر لے کر آئے اور فرمایا کہ: "یہ آپ کی بیوی ہیں"۔ دوم: نکاح کا پیغام شادی سے تین سال قبل دیا گیا۔ سوم: ان کے گھر میں وحی کا نزول ہوا، کسی اور بیوی کے گھر میں وحی کا نزول نہیں ہوا۔ ان باتوں کو ہم اگلی فصل میں ذکر کریں گے۔

بلکہ بیٹی کی نگرانی اور دیکھ بھال جس طرح شادی سے پہلے ضروری تھی، شادی کے بعد بھی ضروری ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیٹیوں کو دیکھنے کے لیے بار بار جاتے تھے، اور یہ جانا ان کے حالات کے متعلق آپ کے اطمینان کا ذریعہ ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے لیے جو بات قابلِ توجہ ہے وہ آپ ﷺ کی یہ صراحت ہے کہ ''جو بات آپ کی بیٹی کو تکلیف پہنچاتی ہے وہ آپ کو بھی تکلیف پہنچاتی ہے۔''، حالانکہ اس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ آپ کی کوئی اور بیٹی موجود نہیں تھی۔

حضرت مِسوَر بن مخرَمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی کو نکاح کا پیغام بھیجا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات معلوم ہوئی، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور عرض کیا: ''آپ کی قوم سمجھتی ہے کہ آپ کو آپ کی بیٹیوں کی وجہ سے غصہ نہیں آتا، یہ دیکھیے! علی، ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنے جا رہے ہیں''، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو گئے اور آپ نے خطبے میں ارشاد فرمایا: ''امابعد! میں نے اپنی بیٹی (زینب) کا نکاح ابو العاص بن ربیع سے کیا، انھوں نے مجھ سے گفتگو کی اور میرے ساتھ سچا معاملہ کیا۔ بے شک فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے، مجھے ناپسند ہے کہ اسے کوئی تکلیف پہنچے، اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک شخص کے پاس جمع نہیں ہو سکتی''؛ چنانچہ علی رضی اللہ عنہ نے نکاح کا ارادہ ترک کر دیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ: ''بنو ہشام بن مغیرہ نے اجازت طلب کی کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح علی بن ابی طالب سے کر دیں، میں اس کی اجازت نہیں دیتا، اجازت نہیں دیتا، اگر ابن ابی طالب نکاح کرنا چاہتے ہیں تو وہ میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی بیٹی سے نکاح کر لیں، فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔''

ایک اور روایت میں ہے: ''میں کسی حلال کو حرام نہیں کرتا اور نہ کسی حرام کو حلال کرتا ہوں۔''(١)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ جو بات آپ کی بیٹی کو غم زدہ کرتی تھی اس سے آپ کو بھی ناگوارِ

(١) متفق علیہ: خ: ٣٧٢٩، ٥٢٣٠، ٣١١٠، م: ٢٤٤٩

خاطر ہوتا تھا۔ آپ نے علی رضی اللہ عنہ (کے ابوجہل کی بیٹی یا بنو ہشام کی بیٹی سے شادی) کے معاملے کو صرف اپنا اور علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ نہیں بنایا؛ بلکہ منبر پر تشریف لے جا کر اس کا اعلان کیا؛ تاکہ سب لوگ جان جائیں کہ۔

پدرانہ دیکھ ریکھ کا یہ مفہوم سب کے لیے ایک تعلیم اور درس ہے۔ باپ کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی صلاح و فلاح کی خاطر کوشش کرے، خواہ اولاد بڑی ہو یا چھوٹی۔

ابو العاص رضی اللہ عنہ کی تعریف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے کی تھی کہ آپ نے دیکھا کہ انھوں نے آپ کی بیٹی کا کیسا عمدہ لحاظ کیا اور کس طرح دوسری شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں؛ حالانکہ وہ اپنی بیوی سے دور ہو چکے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انھیں مدینہ بھیج چکے تھے اور وہ خود مکہ میں تھے۔[1]

ہر باپ کی ذمے داری ہے کہ اپنی بیٹیوں کی دیکھ بھال، ان کے حالات کی چھان بین اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کی اتباع و اقتداء کرے۔

قابلِ ذکر بات، جسے ہم اِس بحث کے خاتمے پر ریکارڈ میں لانا پسند کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کے سارے شوہروں نے آپ کی بیٹیوں کی موجودگی میں کوئی اور نکاح نہیں کیا، غالباً یہ چیز ان کے اعزاز کے طور پر ہوئی، اور ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے احترام میں بھی؛ جیسا کہ اس کی وضاحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح کا پیغام دینے والے واقعے کے تحت پہلے گزر چکی ہے۔

---

(۱) ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ "حَدَّثَنِي وَصَدَّقَنِي" کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "ابو العاص رضی اللہ عنہ نے مجھ سے بات کی اور میرے ساتھ سچا معاملہ کیا، غالباً انھوں نے اپنے اوپر یہ شرط رکھی تھی کہ زینب رضی اللہ عنہا کے ہوتے ہوئے کسی اور سے نکاح نہیں کریں گے، اسی طرح علی رضی اللہ عنہ نے بھی شرط رکھی تھی؛ لیکن اس شرط کو بھول گئے؛ چنانچہ نکاح کا پیغام دے بیٹھے۔" (فتح الباری: ۷/۸۶)

لیکن "حَدَّثَنِي وَصَدَّقَنِي" سے جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "ابو العاص رضی اللہ عنہ نے زینب رضی اللہ عنہا کو بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کے پورا کرنے میں سچے رہے"۔ کبھی کبھی "صدق" کو حسنِ معاملہ اور اس پر برقرار رہنے سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، واللہ اعلم۔

چوتھی فصل

آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے بیان میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ﴾ {الاحزاب:٦}

نبی ﷺ کا حق مؤمنوں پر خود ان کی جانوں سے بھی زیادہ ہے، اور آپ کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں۔

ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ماں ہونا اُن کے مؤمنوں پر حرام ہونے اور ان کی عزت و عظمت کے حوالے سے ہے؛ لیکن ان کے ساتھ تنہائی میں ہونا جائز نہیں، اور بالاجماع یہ حرمت ان کی بیٹیوں اور بہنوں تک متجاوز نہیں۔ (لہذا ان سے نکاح وغیرہ کیا جاسکتا ہے)۔

صاحب مواہب کہتے ہیں: ''خواہ رسول اللہ ﷺ انھیں چھوڑ کر وفات پا گئے ہوں، یا حضور ﷺ کے نکاح میں رہتے ہوئے حضور ﷺ کی زندگی میں ان کا انتقال ہوا ہو۔''

بغوی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ازواجِ مطہرات مؤمن مردوں کی مائیں ہیں، عورتوں کی نہیں، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ (۱)

رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کو دوسری تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، اور ان کا ثواب وعقاب دونوں دوگنا ہے۔

﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝۳۱ ﴾ {الاحزاب:۳۱-۳۰}

اے نبی کی بیویو! جو کوئی تم میں کھلی ہوئی بے حیائی کرے گی اس کو دوہری سزا دی جائے گی، اور یہ بات اللہ کو آسان ہے۔ اور جو کوئی تم میں اللہ کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک کام کرے گی تو ہم اس کو اس کا ثواب دوہرا دیں گے، اور ہم نے اس کے لیے ایک عمدہ روزی (یعنی جنت) تیار کرر کھی ہے۔

---

(۱) المواہب اللدنیہ: ۲/۷۳، یعنی وہ مردوں کی مائیں ہیں، عورتوں کی نہیں۔

ان سے سوال پردے کے پیچھے ہی سے کیا جائے گا:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ﴾ {الاحزاب: ۵۳}

اور جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمھارے دلوں اور ان کے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے۔

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں افضل حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما ہیں:

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال جن نو بیویوں کو چھوڑ کر ہوا وہ یہ ہیں:

عائشہ، حفصہ، ام حبیبہ، زینب بنت جحش، ام سلمہ، میمونہ، سودہ، جویریہ، صفیہ۔

دو بیویوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں وفات پائی: خدیجہ اور زینب ام المساکین رضی اللہ عنہما۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو باندیاں تھیں: ماریہ قبطیہ اور ریحانہ قُرظیہ رضی اللہ عنہما۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہم ان سب کے حالات (آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے) شادی کی ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے نقل کر رہے ہیں۔

حضرت خدیجہ بنت خُویلد رضی اللہ عنہا:

یہ خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبد العزیٰ بن قُصَیّ ہیں، قریشی ہیں، نسب، گھر اور شرافت کے اعتبار سے بلندی کی چوٹی پر تھیں، ان کا نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے پانچویں پشت: قُصَیّ بن کِلاب پر جا کر مل جاتا ہے۔

ابنِ ہشام کہتے ہیں کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اس وقت قریش کی عورتوں میں نسب کے اعتبار سے اعلیٰ، شرافت میں سب سے بڑھ کر اور مال میں سب سے زیادہ تھیں۔ (۱)

ان کے بارے میں گذر چکا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کرنے سے پہلے دو مرتبہ شادی کی تھی۔

پہلے عتیق بن عابد بن عبد اللہ بن مخزوم سے شادی کی، ان سے دو بچے پیدا ہوئے، لڑکا عبد اللہ، لڑکی ہند، یہ اسلام لائیں اور شرفِ صحابیت حاصل کیا۔ (۲)

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱۸۹/۱

(۲) سیرت ابن ہشام: ۶۴۴/۲، شرح الزرقانی علی المواہب: ۲۲۰/۳

عتیق کا انتقال ہو گیا تو حضرت خدیجہؓ نے ابو ہالہ بن نباش بن زُرارہ تمیمی سے شادی کی، وہ بھی اُنھیں چھوڑ کر وفات پا گئے۔ ان سے دو لڑکے تولد ہوئے، ہند اور ہالہ۔ دونوں مشرف بہ اسلام ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہے۔

ان سے نکاح کا پیغام دینے کے لیے اشرافِ قریش میں سے بہت سے لوگ آگے بڑھے، سب چاہتے تھے کہ اگر ہو سکے تو ان کا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہو، وجہ ان کا بلند رتبہ، ان کی خوب صورتی اور ان کا مال تھا؛ لیکن انھوں نے اس سے گریز کیا اور تجارت کے ذریعے اپنے مال کو بڑھانے پر توجہ دی، وہ لوگوں کو اپنے مال کی تجارت میں لگاتیں اور انھیں نفع میں شریک کرتیں۔[1]

انھوں نے محمد بن عبد اللہ ﷺ کی امانت و دیانت کے بارے میں سن رکھا تھا، چنانچہ انھوں نے آپ کو پیشکش کی کہ ان کا مالِ تجارت لے کر ملکِ شام جائیں، بات طے ہو گئی اور یہی چیز ان کے لیے حضور ﷺ کے تعارف کا ذریعہ بنی، پھر اُنھیں کی خواہش پر آپ سے اُن کی شادی بھی ہو گئی۔

اس وقت آپ کی عمر ۲۵/ سال تھی، اور حضرت خدیجہؓ ۳۵/ سال کی تھیں۔[2] یہ پہلی عورت ہیں جن سے آپ نے شادی فرمائی، ان کے رہتے ہوئے ان کی وفات تک کسی اور سے شادی نہیں کی۔

آپ ﷺ کی ساری اولاد، سوائے ابراہیم رضی اللہ عنہ کے اُنہی سے ہیں، جیسا کہ میں اس سے پہلی فصل میں ذکر کر چکا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں عزت بخشی کہ جب آپ ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو سب سے پہلے یہی ایمان لائیں۔ نصرتِ دین اور آپ کا ساتھ دینے کے تعلق سے اُن کا قابلِ ذکر کردار رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ ان کا برابر تذکرہ کرتے اور ان سے وابستگی رکھنے والوں کا اکرام کرتے، یہاں تک کہ حضور ﷺ کے اس طرزِ عمل نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی غیرت کو ابھار دیا۔

خود فرماتی ہیں:

---

(۱) مضاربت ایسی تجارت ہے جس میں ایک شخص کا مال اور دوسرے کی محنت ہو اور نفع میں دونوں شریک ہوں۔ جو محنت اور کاروبار کرتا ہے اسے ''مضارب'' کہتے ہیں۔ (از مترجم)

(۲) یہ البدایہ والنہایہ (۲/۲۹۵) میں ابنِ کثیر کا قول ہے، اقرب الی الصواب یہی ہے اور حضور ﷺ کی ان سے جو اولاد ہوئی اس کے پیشِ نظر یہ قول زیادہ قرینِ عقل ہے۔ بقیہ کتبِ سیرت میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں چالیس سال عمر ہونے کا ذکر ہے۔

«مَا غِرْتُ عَلَى امْرَأَةٍ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَا غِرْتُ عَلَى خَدِيجَةَ، هَلَكَتْ قَبْلَ أَنْ يَتَزَوَّجَنِي، لِمَا كُنْتُ أَسْمَعُهُ يَذْكُرُهَا، وَأَمَرَهُ اللهُ أَنْ يُبَشِّرَهَا بِبَيْتٍ مِنْ قَصَبٍ، وَإِنْ كَانَ لَيَذْبَحُ الشَّاةَ فَيُهْدِي فِي خَلَائِلِهَا مِنْهَا مَا يَسَعُهُنَّ، قَالَ: فَرُبَّمَا قُلْتُ لَهُ: كَأَنَّهُ لَمْ يَكُنْ فِي الدُّنْيَا امْرَأَةٌ إِلَّا خَدِيجَةُ، فَيَقُولُ: «إِنَّهَا كَانَتْ، وَكَانَتْ، وَكَانَ لِي مِنْهَا وَلَدٌ»(۱).

''جتنی غیرت مجھے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے معاملے میں آئی اُتنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بیوی کے متعلق نہیں آئی، میری شادی سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا، کیونکہ میں آپ کو ان کا تذکرہ کرتے ہوئے پاتی، اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ انھیں موتیوں کے گھر کی خوش خبری دیں، آپ بکری ذبح کرتے تو اس میں سے ان کی سہیلیوں کے پاس اتنا ہدیہ بھیجتے جو ان کو کافی ہو جائے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ کبھی کبھی میں آپ سے کہتی کہ لگتا ہے کہ دنیا میں خدیجہ کے سوا کوئی عورت ہی نہیں ہے۔ آپ فرماتے: وہ ایسی تھیں اور ایسی تھیں اور انھیں سے میری اولاد ہے''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی غیرت کے موقعوں میں سے ایک موقع اس وقت آیا جس کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

«اسْتَأْذَنَتْ هَالَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ، أُخْتُ خَدِيجَةَ، عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَعَرَفَ اسْتِئْذَانَ خَدِيجَةَ فَارْتَاعَ لِذَلِكَ، فَقَالَ: «اَللّٰهُمَّ هَالَةَ». قَالَتْ: فَغِرْتُ، فَقُلْتُ: مَا تَذْكُرُ مِنْ عَجُوزٍ مِنْ عَجَائِزِ قُرَيْشٍ، حَمْرَاءِ الشِّدْقَيْنِ، هَلَكَتْ فِي الدَّهْرِ، قَدْ أَبْدَلَكَ اللهُ خَيْرًا مِنْهَا»(۲).

''ایک بار حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہالہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت طلب کی، آپ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اجازت طلبی یاد آ گئی، آپ چونک گئے۔ پھر فرمایا: ''اچھا! ہالہ ہیں!؟'' مجھے اس پر غیرت آئی، میں نے عرض کیا: آپ قریش کی بوڑھیوں میں سے ایک بوڑھی کو کیا یاد کرتے رہتے ہیں؟ جو پوپلے منہ والی تھی، زمانہ ہوا انتقال کر چکی، اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ ان سے اچھی آپ کو دے دی''۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۸۱۶، ۳۸۱۸، م: ۲۴۳۵

(۲) متفق علیہ: خ: ۳۸۲۱، م: ۲۴۳۷۔ مسند احمد اور طبرانی میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں آج کے بعد ان کا اچھے انداز ہی سے ذکر کروں گی۔'' (فتح الباری: ۷/۱۷۱، ط: ریاض، ت: عبد القادر شیبۃ الحمد) (از مترجم)

غیرت کا یہ رویہ، ایک ایسی عورت سے متعلق ہے جو انتقال کر چکی ہے، اس سے آپ ﷺ کے نزدیک ان کے مرتبہ کا اظہار ہوتا ہے اور آپ ﷺ کی ان کے ساتھ وفاداری کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مقام و مرتبہ کے متعلق جو قول نقل کیا ہے اس میں آپ ارشاد فرماتے ہیں:

«خَيْرُ نِسَائِهَا مَرْيَمُ ابْنَةُ عِمْرَانَ وَخَيْرُ نِسَائِهَا خَدِيجَةُ»(۱).

''عورتوں میں سب سے اچھی مریم بنت عمران ہیں اور عورتوں میں سب سے اچھی خدیجہ ہیں''۔

یعنی ان میں کی ہر ایک اپنے زمانے کی سب سے اچھی عورت ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور فرمایا:

«يَا رَسُولَ اللهِ: هٰذِهِ خَدِيجَةُ قَدْ أَتَتْ مَعَهَا إِنَاءٌ فِيهِ إِدَامٌ، أَوْ طَعَامٌ أَوْ شَرَابٌ، فَإِذَا هِيَ أَتَتْكَ فَاقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنْ رَبِّهَا وَمِنِّي وَبَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لَا صَخَبَ فِيهِ، وَلَا نَصَبَ»(۲).

''یہ خدیجہ آئی ہیں، ان کے پاس ایک برتن ہے جس میں سالن یا کھانا یا پینے کی چیز ہے، جب وہ اے اللہ کے رسول! آپ کے پاس آئیں تو انھیں ان کے رب کی طرف سے اور میری طرف سے سلام کہیے، اور انھیں جنت میں خول دار موتیوں کے گھر کی خوش خبری سنائیے، جہاں کوئی شور و شغب ہو گا نہ تکان۔''

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہجرت سے تین سال قبل ہوا، وہ مقامِ حجون میں دفن کی گئیں، اس وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی، اس وقت تک میت پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جاتی تھی، حضور ﷺ کے ساتھ ان کی مدتِ رفاقت ۲۵ یا ۳۰ سال ہے، واللہ اعلم۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی سچی معاون رفیقۂ حیات تھیں، آپ کو ان سے سکون ملتا تھا، ان کی اور ابو طالب کی وفات ایک ہی سال میں ہوئی، اس لیے آپ

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۴۳۲، م: ۲۴۳۰

(۲) متفق علیہ: خ: ۳۸۲۰، م: ۲۴۳۲

نے اس سال کو ''عام الحزن'' (غم کا سال) نام دیا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے اپنے عنفوانِ شباب میں ایک بیوی پر اکتفا کرنے اور ۲۵ سال تک تنہا اُنہی کے ساتھ زندگی گذارنے۔ جبکہ وہ آپ سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ نے ہر اُس زبان کو گونگا کر دیا اور دہنوں پر تالے لگا دیے جو حضور ﷺ پر غلبۂ شہوت وغیرہ جیسے الزامات لگانے کی کوشش کرتے ہیں، اور آپ کے تعددِ ازواج کو اپنے اس خیال باطل کی دلیل بناتے ہیں؛ حالانکہ آپ ﷺ اس الزام سے بری ہیں۔

آپ کے تعددِ ازواج سے جو کھلا درس ملتا ہے جس سے اس سلسلے کی حکمتیں اور مصلحتیں ظاہر ہوتی ہیں، اسے ہر منصف مزاج محقق جانتا اور سمجھتا ہے۔

حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا:

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد مکے ہی میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت سودہ بنت زمعہ بن قیس بن عبد شمس سے شادی فرمائی۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی شادی، ان کے چچازاد بھائی سکران بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی، جو کہ سہیل بن عمرو کے بھائی تھے، یہ دونوں بہت پہلے اسلام لے آئے تھے، دونوں نے حبشہ کی طرف دوسری ہجرت کی تھی، جب یہ دونوں حبشہ کے مہاجرین کے ساتھ مکہ آئے تو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔

مدینہ ہجرت کے بعد جب وہ بوڑھی ہو گئیں تو انھیں خوف ہوا کہ رسول اللہ ﷺ انھیں طلاق دے دیں گے، جبکہ ان کی خواہش تھی کہ ان کا شمار رسول اللہ ﷺ کی بیویوں میں ہی ہوتا رہے، چنانچہ انھوں نے اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف ان کی سوچ اور ان کا خوف تھا، حالانکہ ان کی اس سوچ کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔

ان کی تاریخِ وفات میں اختلاف ہے، امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام میں ان کی وفات ہوئی۔

---

(۱) شرح الزرقانی علی المواہب: ۲۲۳/۳

انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے پانچ حدیثیں روایت کی ہیں، جن میں سے ایک حدیث بخاری شریف میں بھی ہے۔[(۱)]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا:

حضرت عائشہ بنت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما، زمانۂ اسلام میں پیدا ہوئیں، وہ کہتی تھیں:

«لَمْ أَعْقِلْ أَبَوَيَّ إِلَّا وَهُمَا يَدِينَانِ الدِّينَ»[(۲)]۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا، اپنے والدین کو دین کو ماننے والا ہی پایا۔

ان کی والدہ ام رومان رضی اللہ عنہا قدیم الاسلام ہیں، انھوں نے ہجرت کی اور ۶ھ میں وفات پائی۔

ان کے والد نے ۱۰ھ نبوی میں ان کی شادی رسول اللہ ﷺ سے کر دی۔ اس وقت ان کی عمر چھ سال تھی، اور ہجرت کے پہلے سال شوال میں رخصت ہو کر آپ کے گھر آئیں، یہ مدینہ آنے کے سات ماہ بعد ہوا۔

شیخین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزَوَّجَهَا وَهِيَ بِنْتُ سِتِّ سِنِينَ، وَأُدْخِلَتْ عَلَيْهِ وَهِيَ بِنْتُ تِسْعِ سِنِينَ»[(۳)]۔

جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے شادی کی تو ان کی عمر چھ سال اور جب وہ حضور ﷺ کے پاس آئیں تو نو (۹) سال کی تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جس دن حضور ﷺ کے پاس لائی گئیں، اس دن کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

”جب مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے شادی فرمائی تو میں چھ سال کی تھی، ہم لوگ مدینہ آئے، ہم بنی حارث بن خزرج کے گھر میں اترے، مجھے بخار آگیا، میرے سر کے بال جھڑ گئے (پھر میں تندرست ہو گئی) اور میری زلفیں خوب گھنی ہو گئیں تو میری ماں امِّ رومان آئیں، میں جھولے میں

(۱) شرح الزرقانی: ۲۲۹/۳
(۲) بخاری: رقم: ۳۹۰۵
(۳) متفق علیہ: خ: ۵۱۳۳، م: ۱۴۲۲

تھی، میرے ساتھ میری سہیلیاں تھیں، انھوں نے بلند آواز سے مجھے پکارا، میں ان کے پاس آئی، میں نہیں جانتی تھی وہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہیں، انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا یہاں تک کہ دروازے پر لا کر کھڑا کر دیا، اور میں ہانپ رہی تھی، یہاں تک کہ میری سانس برابر ہو گئی، پھر انھوں نے کچھ پانی لیا اور اسے میرے چہرے اور سر پر ملا، پھر انھوں نے مجھے گھر میں داخل کر دیا، میں نے دیکھا کہ وہاں کمرے میں کچھ انصاری عورتیں ہیں، وہ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں: بہتر اور مبارک ہو، تمھاری قسمت کھل گئی، میری ماں نے مجھے ان عورتوں کے حوالے کر دیا، انھوں نے مجھے بنا سنوار دیا، رسول اللہ ﷺ کی چاشت کے وقت آمد سے مجھے گھبراہٹ ہوئی، (وہ آپ کی آمد کا وقت نہ تھا)، ان عورتوں نے مجھے رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیا، اس وقت میں نو سال کی تھی"۔ (۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ابھی شادی کے لائق بھی نہیں ہوئی تھیں، پھر بھی شادی میں جلدی کیوں کی گئی، اس کی وضاحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایتِ بخاری و مسلم سے ظاہر ہو جاتی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

"مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمھیں خواب میں دیکھا کہ فرشتہ ریشم کے ایک ٹکڑے میں تمھیں لے کر آیا ہے، اس نے مجھ سے کہا: "یہ آپ کی بیوی ہے"، میں نے تمھارے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو تم نکلیں، میں نے اپنے دل میں کہا: اگر یہ اللہ کی طرف سے ہے تو وہ اس کو پورا کرے گا"۔

بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے تمھیں خواب میں دو مرتبہ دیکھا، اور مسلم کی روایت میں ہے کہ میں نے تمھیں خواب میں تین رات دیکھا"۔ (۲)

یہ بار بار خواب دیکھنا - جبکہ معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی کی ایک قسم ہے - ظاہر کر دیتا ہے کہ شادی میں جلدی کرنے والی چیز کیا تھی؟ چنانچہ یہ شادی منجانب اللہ تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تنہا وہ کنواری خاتون ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ نے شادی فرمائی، آپ نے ان کی صغر سنی کی رعایت کی، خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسے بیان کرتی ہیں، وہ کہتی ہیں:

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۸۹۴، م: ۱۴۲۲

(۲) متفق علیہ: خ: ۳۸۹۵، ۵۱۲۵، م: ۲۴۳۸

«كُنْتُ أَلْعَبُ بِالْبَنَاتِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَانَ لِي صَوَاحِبُ يَلْعَبْنَ مَعِي، فَكَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ يَتَقَمَّعْنَ مِنْهُ، فَيُسَرِّبُهُنَّ إِلَيَّ فَيَلْعَبْنَ مَعِي»(۱).

میں حضور ﷺ کے پاس گڑیوں سے کھیلتی تھی، میری کچھ سہیلیاں تھیں جو میرے ساتھ کھیلتی تھیں، جب رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے وہ چھپ جاتیں، آپ انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر میرے پاس بھیجتے اور وہ میرے ساتھ کھیلتیں۔

ابوداؤد کی روایت میں ہے:

«قَالَتْ: كُنْتُ أَلْعَبُ بِالْبَنَاتِ وَأَنَا عِنْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَكَانَ يُسَرِّبُ إِلَيَّ صَوَاحِبِي يُلَاعِبْنَنِي».

میں گڑیوں سے کھیلتی تھی اور میں حضور ﷺ کے پاس تھی، رسول اللہ ﷺ میری سہیلیوں کو میرے ساتھ کھیلنے کے لیے تلاش کر کر کے بھیجتے تھے۔

ان دونوں روایتوں سے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پوری خواہش رکھتے تھے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے وہی ماحول باقی رہے جس سے وہ شادی سے پہلے مانوس تھیں، یعنی سہیلیوں سے ملنا اور اپنی بنائی ہوئی گڑیوں سے کھیلنا۔

یہ صورتِ حال کافی حد تک دیر تلک باقی رہی، چنانچہ ابوداود کی حدیث میں ہے:

«أَنَّهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ قُدُومِهِ مِنْ غَزْوَةِ تَبُوكَ أَوْ خَيْبَرَ - كَشَفَ نَاحِيَةَ السِّتْرِ عَلَى بَنَاتٍ لِعَائِشَةَ لُعَبٍ - فَقَالَ مَا هٰذَا يَا عَائِشَةُ قَالَتْ بَنَاتِي، قَالَتْ: وَرَأَى فِيهَا فَرَسًا مَرْبُوطًا لَهُ جَنَاحَانِ فَقَالَ: مَا هٰذَا؟ قُلْتُ: فَرَسٌ قَالَ: فَرَسٌ لَهُ جَنَاحَانِ؟ قُلْتُ: أَلَمْ تَسْمَعْ أَنَّهُ كَانَ لِسُلَيْمَانَ خَيْلٌ لَهَا أَجْنِحَةٌ فَضَحِكَ»(۲).

جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ خیبر یا غزوۂ تبوک سے واپس آئے اور اس پردے کا کنارہ کھولا جہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گڑیاں رکھی ہوئی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! یہ کیا ہے؟'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: میری گڑیاں ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ان گڑیوں میں آپ نے دیکھا کہ ایک گھوڑا ہے جس کے دو پر ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا: گھوڑا ہے، آپ نے فرمایا: ''گھوڑے کے پر کیسے؟'' میں نے جواب دیا: آپ نے سنا نہیں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑے کے پر تھے؟ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۱۳۰، م: ۲۴۴۰

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۹۳۲

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کو لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھیں اور سوال کیے جانے پر صراحتاً کہہ بھی دیتے تھے، چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

«قُلْتُ: أَيُّ النَّاسِ أَحَبُّ إِلَيْكَ؟ قَالَ ﷺ: عَائِشَةُ، فَقُلْتُ: مِنَ الرِّجَالِ؟ فَقَالَ: أَبُوهَا»[1].

میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ لوگوں میں آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ آپ نے جواب دیا: ''عائشہ''۔ میں نے پوچھا: مردوں میں کون سب سے زیادہ محبوب ہے؟ فرمایا: ''ان کے باپ''۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مردوں کے بارے میں سوال اس لیے کیا تھا؛ تاکہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک اپنے مرتبہ کو جان سکیں، لیکن چونکہ ان کا سوال عام تھا، لہٰذا جواب واضح اور صریح آیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تعلق سے اس محبت کو صحابۂ کرام بھی اچھی طرح جانتے تھے، چنانچہ اگر کوئی رسول اللہ ﷺ کو کسی قسم کا ہدیہ دینا چاہتا تو انتظار کرتا، جب آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر ہوتے تو وہ آپ کو اپنا ہدیہ بھیجتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

''میری سوکنیں (حضور ﷺ کی دوسری بیویاں) ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر جمع ہوئیں اور ان سے کہا: اے ام سلمہ! اللہ کی قسم! لوگ حضور ﷺ کو ہدیہ دینے کے سلسلے میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کا انتظار کرتے ہیں، ہم بھی عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح خیر ہی چاہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ سے کہیے کہ لوگوں کو حکم دیں کہ وہ آپ کو وہیں ہدیہ دے دیا کریں جہاں آپ ہوں، یا جہاں آپ جائیں۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس بات کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے اعراض فرمایا، جب دوبارہ حضور ﷺ میرے یہاں آئے، میں نے پھر ذکر کیا، آپ نے پھر اعراض فرمایا، جب تیسری بار میں نے آپ سے کہا تو آپ نے فرمایا: ''اے ام سلمہ! مجھے عائشہ کے معاملے میں ایذاء نہ دو۔ اللہ کی

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۶۶۲، م: ۲۳۸۴

قسم! مجھ پر صرف عائشہ کے لحاف میں وحی نازل ہوئی، تم میں سے کسی اور کے لحاف میں نہیں''۔(1)

آپ کا یہ فرمان اس بات پر واضح طور پر دلالت کرتا ہے کہ یہ امتیازی شان اللہ تعالیٰ نے اُن ہی کو خاص طور پر عطا فرمائی تھی، جیسا کہ یہ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے آنے والی بات کی رعایت تو کرتے تھے، مگر ازواجِ مطہرات کے درمیان آپ نے جو عدل قائم کر رکھا تھا اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔

یہ شادی جو وحی الٰہی سے ہوئی، اور نزولِ وحی کی اس تخصیص نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اس کی حکمت کو جاننا ممکن بنایا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علمی مقام و مرتبہ ظاہر ہو گیا، وہ امت کی ساری عورتوں میں علی الاطلاق سب سے بڑی فقیہہ تھیں، سب سے بڑی عالمہ تھیں، اکابرِ صحابہ رضی اللہ عنہم ان کے قول کی طرف رجوع کرتے تھے، ان سے فتویٰ پوچھتے تھے، جیسا کہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔(۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بڑی ذہین اور سمجھ دار تھیں، مسجد سے ان کے حجرے کے متصل ہونے کی وجہ سے انھیں یہ موقع میسر آیا کہ رسول اللہ ﷺ کے خطبات، آپ کی احادیث اور آپ کے احکام سے وہ مستقل تعلق جوڑے رہیں، وہ انھیں محفوظ رکھتی تھیں، اور جو ان کے غائبانے میں ہوتا اس کے بارے میں سوال کرتی تھیں، وہ آیات کی شانِ نزول اور احادیث کے وارد ہونے کے مواقع کا پورا علم رکھتی تھیں، ان سب چیزوں سے انھیں ایسا فقہی ملکہ پیدا ہو گیا جس کی نظیر کم ملتی ہے۔

پھر - باستثنائے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل کرنے والی ان بیویوں میں سب سے لمبی مدت رکھتی ہیں جن عورتوں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد مختلف وقتوں میں آپ نے شادی فرمائی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو احادیث روایت کیں اور بقیہ ازواجِ مطہرات نے جو احادیث روایت کیں، ان سب پر معمولی نظر ڈالنے سے بھی ان کا وہ کارنامہ ظاہر ہو جاتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں تیار کیا تھا۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۷۷۵

(۲) زاد المعاد: ۱/۱۰۶

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ احادیث کی تعداد ۲۲۱۰ ہے، اس سلسلے میں جو ان سے کسی درجے میں قریب ہیں وہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کی مرویات ۳۷۸ ہیں، میمونہ رضی اللہ عنہا کی ۷۶ ہیں، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی ۶۵ ہیں، حفصہ رضی اللہ عنہا کی ۶۰ ہیں، جویریہ رضی اللہ عنہا اور سودہ رضی اللہ عنہا میں سے ہر ایک کی پانچ پانچ ہیں، زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی ۹ اور صفیہ رضی اللہ عنہا کی ۱۰ احادیث ہیں۔ (۱)

اگر ہم تمام امہات المومنین کی ساری احادیث کو جمع کریں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ احادیث کی تہائی مقدار کو بھی نہیں پہنچتی، عورتوں کے معاملات پر اور دیگر امور پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جو فتاویٰ ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

علاوہ ازیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا شعر، انساب اور طب کی بھی معرفت رکھتی تھیں، یہاں تک کہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تعجب میں پڑ گئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اتنے سارے علوم کا احاطہ کیے ہوے ہیں، چنانچہ انھوں نے تعجب سے پوچھ ہی لیا کہ میں آپ کے معاملے میں جتنا غور کرتا ہوں، تعجب میں پڑ جاتا ہوں، میں آپ کو لوگوں میں سب سے بڑی فقیہہ پاتا ہوں، تو میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ بھلا کیوں نہ ہوں، جبکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں، میں آپ کو ایامِ عرب، انساب اور اشعارِ عرب کی عالمہ پاتا ہوں، تو دل میں کہتا ہوں کہ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ آپ کے والد علامہ قریش ہیں، لیکن میں اس وقت بہت تعجب میں پڑ جاتا ہوں جب میں آپ کو طب کا بھی واقفِ کار پاتا ہوں، یہ کیسے ہوا؟

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: اے عُرَیّہ! (عُروہ کی تصغیر ہے) بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت بیمار ہوا کرتے تھے، اور عرب و عجم کے اطباء آپ سے آپ (کے علاج معالجہ) کے سلسلے میں دوائیں بتاتے تھے، اس سے میں نے علم طب سیکھ لیا"۔ (۲)

اسی طرح تقریباً نصف صدی تک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا علم و فتویٰ کے میدان میں سب کا مرجع بنی رہیں۔ جب بھی کوئی مشکل معاملہ درپیش ہوتا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس کے متعلق ایسی واقفیت ضرور ہوتی جس سے وہ حل ہو جاتا۔

---

(۱) السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ: از دکتور اکرم عمری: ۶۴۹/۲

(۲) الفتح الربانی: ۱۲۴/۲۲

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«مَا أَشْكَلَ عَلَيْنَا أَصْحَابَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيثٌ قَطُّ فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ إِلَّا وَجَدْنَا عِنْدَهَا مِنْهُ عِلْمًا»[۱].

ہم اصحابِ رسول پر کسی حدیث کے سلسلے میں کبھی کوئی ایسی مشکل نہیں پیش آئی جس کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہم نے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کا علم نہ پایا ہو۔

مسروق بن اجدع رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

«لَقَدْ رَأَيْتُ مَشْيَخَةَ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُونَهَا عَنِ الْفَرَائِضِ» قال الهيثمی: رواه الطبرانی وسنده حسن[۲].

میں نے مشائخ صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرائض کے سوالات کر رہے ہیں۔ہیثمی کہتے ہیں کہ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند ''حسن'' ہے۔

وہ ان سوالات کے جوابات پر بھی قادر تھیں جن کے جوابات دوسرا کوئی نہ دے پاتا، یہ اس لیے تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت قریب تھیں، اسود سے مروی ہے:
''لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے ذکر کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کب وصیت کی؟ میں اپنے سینے تک آپ کو سہارا دیے ہوئی تھی، (یعنی میری گود میں آپ کا سر تھا)، آپ نے طشت منگوایا، آپ کا سر میری گود میں ایک طرف کو جھک گیا، مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ آپ کی وفات ہو گئی، پھر آپ نے کس وقت وصیت کی؟[۳].

اسی طرح جوابات دینے میں وہ پوری مضبوطی سے کھڑی ہوتی تھیں، کچی بات نہیں کرتی تھیں، حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن ہی کے گھر بیمار ہوئے، اُن ہی کے ہاتھوں میں واصل بحق ہوئے، تو پھر یہ وصیت کب ہوئی!؟[۴].

---

(۱) ترمذی: رقم: ۳۸۸۳
(۲) مجمع الزوائد ہیثمی: ۹/ ۲۴۲
(۳) متفق علیہ: خ: ۲۷۴۱، م: ۱۶۳۶
(۴) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس بات کی تائید فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کچھ لکھا تھا، نہ کچھ وصیت فرمائی تھی، جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے۔ (خ: ۵۶۶۹، م: ۱۶۳۷)

ف: حضرت عائشہؓ حضورؐ کی فیضِ صحبت سے جس طرح علم و فضل میں اعلی مقام رکھتی تھیں اسی طرح فنا و نیستی کے مقامِ بلند پر بھی فائز تھیں گویا آپ بیک وقت اعلیٰ درجہ کی عالمہ، فاضلہ اور صوفیہ صافیہ دونوں تھیں۔ چنانچہ مرض وفات میں جب حضرت ابن عباسؓ نے آپ کے پاس آنے کی اجازت چاہی تو آپؓ کو تأمل ہوا کہ وہ آکر تعریف نہ کرنے لگیں؟ بھانجوں نے سفارش کی تو اجازت دے دی؛ لیکن حضرت ابن عباسؓ نے آتے ہی تعریف کرنا شروع کردیا اس پر آپؓ نے فرمایا: اے ابن عباس! مجھے اپنی اس تعریف سے معاف رکھو۔ مجھے تو یہ پسند تھا کہ میں معدوم محض ہوتی (کہ کسی کو پتہ بھی نہ چل پاتا کہ عائشہ کب دنیا میں آئی اور کب رخصت ہو گئی)۔ (1)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وفات رمضان المبارک ۵۸ سنہ ھ میں ہوئی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما:

حفصہ بنت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما، بعثت سے پانچ سال پہلے پیدا ہوئیں، ان کی ماں کا نام زینب بنت مظعون ہے۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کیا اور اپنے شوہر جلیل القدر صحابی خُنیس بن حُذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کی، جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے، اسی غزوہ میں انھیں کئی زخم لگے، جن کے نتیجے میں ان کی وفات ہو گئی۔

جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بیوہ ہو گئیں تو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس اپنی بیٹی کا پیغام بھیجا، پھر حضرتِ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا، دونوں میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۳ سنہ ھ میں ان سے شادی فرمالی، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بڑے اہتمام سے دنوں میں روزے رکھتیں اور راتوں کو عبادت کرتیں۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی وفات مدینہ منورہ میں ۴۵ سنہ ھ ہوئی۔

حضرت زینب ام المساکین رضی اللہ عنہا:

زینب بنتِ خُزیمہ بن حارث الہلالیہ رضی اللہ عنہا، یہ زمانۂ جاہلیت میں فقراء کو کھانا کھلانے کی وجہ سے ''ام المساکین'' کہلاتی تھیں۔

---

(1) اقوالِ سلف: ج۱، ص: ۱۴۱، از بخاری شریف رقم: ۴۷۵۳، (از مترجم: قمر الزمان)

یہ عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے لڑکے - کی زوجیت میں تھیں، جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے اور یہ بیوہ ہو گئیں۔

عدت گذرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے شادی کرلی، یہ آپ کے پاس صرف دو یا تین ماہ رہیں، آپ ہی کے پاس ان کی وفات ہوئی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا:

یہ ہند بنت ابی امیہ بن مغیرہ مخزومیہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ان کی شادی ابو سلمہ بن عبد الاسد رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوئی تھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے لڑکے تھے۔

یہ اور ان کے شوہر حبشہ ہجرت کرنے والوں میں سب سے پہلے ہیں، ان سے سب سے پہلے زینب تولد ہوئی، اس کے بعد سلمہ، عمر اور درۃ پیدا ہوئیں۔

پھر انہوں نے اور ان کے شوہر نے مدینہ منورہ ہجرت کی، ابو سلمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں شریک ہوئے، غزوۂ احد میں انھیں زخم آ گیا جس سے وہ شفایاب ہوئے؛ لیکن کسی فوجی مہم (سریہ) میں شرکت کی وجہ سے وہ زخم دوبارہ تازہ ہو گیا، اور جمادی الاخریٰ ۴ھ میں ان کی وفات ہو گئی۔[۱]

جب ان کی عدت ختم ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا؛ انھوں نے کہا:

«أَنَّهَا امْرَأَةٌ شَدِيدَةُ الْغَيْرَةِ، وَأَنَّهَا امْرَأَةٌ مُصْبِيَةٌ (أَيْ أَنَّ لَهَا أَوْلَادًا)، وَأَنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ مِنْ أَوْلِيَاءِهَا شَاهِدٌ فَيُزَوِّجُهَا. فَأَتَاهَا رَسُولُ اللهِ فَقَالَ: أَمَّا مَا ذَكَرْتِ مِنْ غَيْرَتِكِ فَإِنِّي أَدْعُو اللهَ أَنْ يُذْهِبَهَا عَنْكِ، وَأَمَّا مَا ذَكَرْتِ مِنْ صِبْيَتِكِ فَإِنَّ اللهَ سَيَكْفِيهِمْ، وَأَمَّا مَا ذَكَرْتِ مِنْ أَوْلِيَائِكِ فَلَيْسَ أَحَدٌ مِنْ أَوْلِيَائِكِ يَكْرَهُ ذٰلِكَ»[۲].

وہ بڑی غیرت و حمیت والی خاتون ہیں، بچے دار عورت ہیں، ان کے اولیاء میں سے کوئی موجود نہیں ہے جو ان کی شادی کر دے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے، اور فرمایا: جہاں تک تمھاری غیرت کی بات ہے تو میں دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ اسے ختم فرمادے اور جو تم نے اپنی اولاد کا ذکر کیا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے کافی ہے، اور جو تم نے اپنے اولیا کا ذکر کیا ہے تو تمھارے اولیا میں سے کوئی اس کو ناپسند نہیں کرے گا۔

---

(۱) شرح الزرقانی: ۲۳۹/۳

(۲) نسائی: رقم: ۳۲۵۴۔ سنن نسائی صغریٰ و کبریٰ و مسند احمد بن حنبل میں ''فَيُزَوِّجُهَا'' کا لفظ نہیں ہے۔ البتہ مسند ابو یعلیٰ: ۳۳۷/۱۲ حدیث نمبر: ۶۹۰۸ میں یہ الفاظ منقول ہیں: ''وَأَنَا امْرَأَةٌ لَيْسَ هَاهُنَا مِنْ أَوْلِيَائِي أَحَدٌ شَاهِدًا فَيُزَوِّجُنِي''۔ (از مصحح)

چنانچہ شادی ہوئی اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا بہت خوب صورت عورت تھیں، بڑی سمجھ دار، بڑی فقیہہ تھیں، ان کے قابلِ ذکر مواقف میں سے ان کا وہ موقف اور مشورہ ہے جو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح حدیبیہ کے دن پیش کیا، صلح حدیبیہ کا معاہدہ مکمل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

''اٹھو، قربانی کرو اور سر منڈوالو۔ راوی کہتے ہیں: اللہ کی قسم! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کہنے کے باوجود کوئی آدمی کھڑا نہیں ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات تین بار فرمائی، تو بھی ان میں سے کوئی کھڑا نہیں ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور صورتِ حال بتائی، ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے نبی! اگر آپ یہ پسند کرتے ہیں تو جائیے، ان میں سے کسی سے کوئی بات نہ کیجیے، خود جا کر اپنے قربانی کے جانور ذبح کر دیجیے اور اپنے حلاق کو بلا کر اپنا سر منڈوا لیجیے؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے، ان میں سے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور یہ کام کر ڈالا، آپ نے جانور ذبح کر دیا اور اپنے حلاق کو بلایا، اس نے آپ کا سر مونڈ دیا، جب لوگوں نے یہ سب دیکھا تو کھڑے ہو گئے، سب نے اپنی اپنی قربانیاں کر ڈالیں اور بعض نے بعض کے سر مونڈ دیے، یہاں تک کہ شدتِ غم میں ایسا لگتا تھا کہ سر مونڈتے وقت بعض بعض کو قتل کر دے گا۔''(۱)

حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں سب سے آخر میں فوت ہوئیں، ان کی تاریخِ وفات میں اختلاف ہے، بعض اقوال ۵۹ سنہ ھ کے ہیں، بعض ۶۳ سنہ ھ کے، وفات کے وقت حضرت امِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۸۴ سال تھی۔(۲)

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا:

زینب بنت جحش بن رئاب اسدیہ ہیں، ان کی ماں اُمیمہ بنت عبد المطلب ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے شادی کے لیے ان کا ہاتھ مانگا، خاندانی شرف کی وجہ سے انھیں یہ بات گراں گذری حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اسلامی معاشرے سے (اونچ نیچ کے) یہ امتیازات ختم فرمادیں۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲

(۲) شرح الزرقانی علی المواہب: ۲۴۱/۳

جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے شادی سے انکار کردیا تو یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ {الاحزاب: ۳۶}

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو کوئی حق اور اختیار نہیں رہ جاتا جب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملے کا فیصلہ کردیں۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے کہا: ''میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہیں کرسکتی۔'' چنانچہ شادی ہوگئی؛ لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے مزاج میں کچھ تیزی تھی، حضرت زید رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کرتے رہتے تھے۔

پھر زید رضی اللہ عنہ نے زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی، ان کی عدت ختم ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس نکاح کے لیے آدمی بھیجا؛ لیکن یہ آیاتِ کریمہ نازل ہوگئیں:

﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ﴾ {الاحزاب: ۳۷}

پھر جب زید نے ان سے اپنی حاجت پوری کرلی، ہم نے آپ سے اس کا نکاح کردیا؛ تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے شادی کرنے کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے۔

چنانچہ آپ ان کے پاس بلا اجازت اور بلا عقد و مہر کے چلے گئے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے سامنے فخریہ کہتی تھیں:

«إِنَّ اللهَ أَنْكَحَنِي فِي السَّمَاءِ»(۱). میرا نکاح آسمان پر اللہ نے کیا ہے۔

ان کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ۵ سنہ ھ میں ہوئی تھی، ان کی شبِ زفاف کی صبح پردے کا حکم نازل ہوا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضور کی ازواجِ مطہرات میں ان کی سب سے پہلے وفات ہوئی۔

۲۰ سنہ ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض بیویوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کے بعد آپ کی ازواج میں کون

---

(۱) بخاری: رقم: ۷۴۲۱

سی زوجہ آپ سے سب سے پہلے ملیں گی؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں جو سب سے لمبے ہاتھ والی ہے''، سب نے ایک بانس لیا اور ہاتھ ناپنے لگیں، حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ سب سے لمبا نکلا، لیکن لمبائی کی حقیقت ہمیں بعد میں معلوم ہوئی، ہاتھ کی لمبائی صدقے کے اعتبار سے تھی، چنانچہ ہم میں سب سے جلدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زینب رضی اللہ عنہا ملیں۔''

مسلم کی روایت میں ہے کہ ہم میں سب سے لمبے ہاتھ والی زینب رضی اللہ عنہا تھیں، کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں اور صدقہ دیا کرتی تھیں۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اُن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

''یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت کے درجے میں دوسری ازواج کی بہ نسبت میرے مقابلے میں رہتی تھیں، میں نے کوئی عورت دین کے معاملے میں زینب رضی اللہ عنہا سے اچھی نہیں دیکھی، سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والی، بات چیت میں سب سے زیادہ سچی، سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والی، سب سے زیادہ صدقہ دینے والی اور جس عمل کا وہ صدقہ کرتیں اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتیں اس عمل میں اپنے کو کھپا دیتی تھیں (یعنی اپنی شان و مرتبے کی کچھ پرواہ نہ کرتی تھیں)، بس ایک بات ان میں یہ تھی کہ ان میں غصہ کی تیزی تھی؛ لیکن اس سے جلد ہی پلٹ بھی آتی تھیں۔''[2]

اس طرح حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی جو حضرت زید رضی اللہ عنہ سے ہوئی اُس کے ذریعے سماجی و معاشرتی امتیازات کو ختم کیا گیا اور اس کے بعد جب ان کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تو منہ بولا بیٹا بنانے اور اس سے متعلق رائج غلط سماجی روایات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔[3]

حضرت جویریہ بنت حارث مُصطلِقیّہ:

۶ھ میں غزوۂ بنی مُصطلق ختم ہوا، غزوے کا مالِ غنیمت اور اس کے قیدی مسلمانوں پر تقسیم کیے گئے، جویریہ بنت حارث، ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئیں، انھوں نے ان سے مکاتبت

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۱۴۲۰، م: ۲۴۵۲

(۲) مسلم: رقم: ۲۴۴۲

(۳) اس شادی کی تفصیل اور اس کے نتیجے میں جو احوال و آثار سامنے آئے، اس کے لیے مؤلف کی کتاب ''من معین السیرۃ'' ط: ۲، ص: ۳۰۳ تا ۳۱۱ ملاحظہ کریں۔

کر لی (۱) اور بدلِ کتابت کی ادائیگی میں مدد کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں، عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں جویریہ بنتِ حارث ہوں، قوم کے سردار کی بیٹی ہوں جو مجھ پر امتحان پڑا ہے وہ آپ پر مخفی نہیں ہے، ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی ہوں، میں نے ان سے مکاتبت کر لی ہے، میں آپ کے پاس اپنے بدلِ کتابت کی ادائیگی میں آپ کی مدد طلب کرنے آئی ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ بہتر کوئی بات ہو تو کیا تمھیں اس میں رغبت ہے؟''

جویریہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! وہ کیا ہے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا بدلِ کتابت میں ادا کر دوں اور تم سے شادی کر لوں''۔

جویریہ نے جواب دیا: ''میں نے یہ سب قبول کر لیا''۔

لوگوں نے ایک دوسرے سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے جویریہ رضی اللہ عنہا سے شادی کر لی ہے، یہ سنتے ہی سب نے اپنے اپنے قیدیوں کو چھوڑ دیا اور سب کو آزاد کر دیا، اور کہنے لگے: یہ تو رسول اللہ ﷺ کے سسرالی لوگ ہیں، (ہم انھیں کیسے قید رکھ سکتے ہیں؟)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«فَمَا رَأَيْنَا امْرَأَةً كَانَتْ أَعْظَمَ بَرَكَةً عَلَى قَوْمِهَا مِنْهَا، أُعْتِقَ فِي سَبَبِهَا مِائَةُ أَهْلِ بَيْتٍ مِنْ بَنِي الْمُصْطَلِقِ» (۲).

ہم نے اپنی قوم کے حق میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ بابرکت عورت کوئی نہیں دیکھی، ان کے سبب بنو المصطلق کے ایک سو گھرانے آزاد کر دیے گئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی خوب صورتی بیان کرتی ہوئی فرماتی ہیں:

''وہ ایک خوب صورت جاذبِ نظر خاتون تھیں، جو بھی انھیں دیکھتا، ان کے دل میں جاگزیں ہو جاتیں، رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنے بدلِ کتابت کی ادائیگی میں مدد کے لیے آئیں، اللہ کی قسم! جب میں نے ان کو اپنے حجرے کے دروازے پر دیکھا تو میں نے ان کا آنا پسند نہیں کیا، میں جان گئی کہ

---

(۱) غلام یا باندی کا اپنے مالک سے کسی متعینہ رقم کی ادائیگی پر آزادی کا معاہدہ مکاتبت کہلاتا ہے اور اس رقم کو ''بدلِ کتابت'' کہتے ہیں۔ (از مترجم)

(۲) ابوداؤد: رقم: ۳۹۳۱، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۲۹۵

رسول اللہ ﷺ بھی وہی محسوس کریں گے جو میں نے دیکھا۔"[1]

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۵۰ھ میں ہوئی۔

حضرت امِّ حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہما:

شروع کے مسلمانوں میں سے ہیں، انھوں نے اور ان کے شوہر عبیداللہ بن جحش نے حبشہ کے لیے دوسری ہجرت کی؛ لیکن ان کا شوہر نصرانی ہو گیا اور مرتد ہو کر حبشہ میں مر گیا؛ لیکن حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا مسلمانوں کے ساتھ رہیں اور اپنے اسلام پر جمی رہیں۔

۶ھ میں رسول اللہ ﷺ نے نجاشی رضی اللہ عنہ کے پاس اطلاع بھیجی کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ان کے ساتھ کر دیں، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حبشہ میں ہی تھیں، نجاشی رضی اللہ عنہ نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی شادی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کر دی اور خود ہی آپ ﷺ کی طرف سے چار سو دینار مہر ادا کر دیا، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ولی خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۴۴ھ میں ہوئی۔

حضرت صفیہ بنت حُیَی رضی اللہ عنہا:

مسلمانوں نے خیبر ۷ھ میں فتح کیا۔ قیدیوں میں صفیہ بنت حُیَی بن اَخطب بھی تھیں، حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ آئے اور عرض کیا:

"اے اللہ کے نبی! قیدیوں میں سے ایک باندی مجھے عطا کر دیجیے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جاؤ! کوئی باندی لے لو"۔ انھوں نے صفیہ کو لے لیا، ایک شخص آئے اور کہنے لگے: اے اللہ کے نبی! آپ نے دحیہ رضی اللہ عنہ کو صفیہ بنت حُیَی دے دی، وہ بنو نضیر اور بنو قریظہ کے سردار کی بیٹی ہے، وہ آپ کے لیے ہی مناسب ہے۔ آپ نے فرمایا: "دحیہ کو بلاؤ"، چنانچہ وہ آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس کے علاوہ کوئی اور باندی لے لو، راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے انھیں آزاد کر دیا اور ان سے شادی کر لی"۔[2]

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۳۹۳۱، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۲۹۴

(۲) متفق علیہ: خ: ۳۷۱، م: ۱۳۶۵

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر اور مدینے کے درمیان تین دن قیام فرمایا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے (شادی اور) خلوت کی، میں نے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ولیمے کے لیے بلایا، ولیمے میں نہ روٹی تھی نہ گوشت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چمڑے کا دستر خوان بچھانے کا حکم دیا، اس پر کھجور، پنیر اور گھی رکھ دیا گیا، یہی آپ کا ولیمہ تھا۔“

”مسلمانوں نے آپس میں کہنا شروع کیا: یہ امہات المومنین میں سے ہیں یا باندیوں میں سے؟ کچھ لوگوں نے کہا اگر پردے میں رکھیں گے تو امہات المومنین سے ہیں اور اگر پردے میں نہیں رکھیں گے تو باندیوں میں سے ہیں، چنانچہ جب وہاں سے کوچ کرنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے اپنے پیچھے جگہ بنادی اور ان کے اور لوگوں کے درمیان پردہ کھینچ دیا۔“(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے کا حال ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ اور ابو طلحہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری پر آپ کے پیچھے صفیہ رضی اللہ عنہا تھیں، راستے میں ایک جگہ اونٹنی لڑکھڑائی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صفیہ رضی اللہ عنہا دونوں گر گئے، ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے اونٹ سے کود پڑے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی! میری جان آپ پر قربان ہو، آپ کو کچھ ہوا تو نہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، لیکن عورت کو دیکھو، ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنا کپڑا اپنے چہرے پر ڈال دیا اور صفیہ رضی اللہ عنہا کا قصد کیا، پھر ان پر بھی اپنا کپڑا ڈال دیا، وہ کھڑی ہو گئیں، پھر ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے دونوں کو سواری پر سوار کرنے میں مدد کی“۔(۲)

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کنانہ بن ابی الحُقَیق کے نکاح میں تھیں، جو خیبر کے دن قتل کر دیا گیا۔

زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تکلیف میں وفات پائی اس کے متعلق حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ”اللہ کی قسم! اے اللہ کے نبی! میں چاہتی ہوں کہ جو آپ کو ہو رہا ہے وہ مجھے ہو جائے،“ اس پر بعض ازواجِ مطہرات نے ایک دوسرے کو آنکھ سے اشارہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: ”تم سب کلی کرو“۔ انھوں نے پوچھا: کس وجہ سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہارے صفیہ کے بارے میں ایک دوسرے کو اشارہ کرنے کی وجہ سے۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۵۰۸۵

(۲) بخاری: رقم: ۳۰۸۶

اللہ کی قسم! یہ بالکل سچی ہیں"۔[1]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی وفات رمضان المبارک ۵۰ھ میں ہوئی۔

حضرت میمونہ بنت حارث ہلالیہ رضی اللہ عنہا:

غزوۂ خیبر کے بعد ۷ھ میں یہ سب سے آخری خاتون ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ القضاء کے موقع پر[2] شادی فرمائی۔

ان کی بہن ام الفضل لبابہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، اور ان کی اخیافی (ماں شریک) بہن اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، اور سلمیٰ بنت عُمیس رضی اللہ عنہا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے اپنا معاملہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا تھا، چنانچہ انھوں نے ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ مکے سے نکلنے کے بعد "سرف" نامی جگہ میں خلوت فرمائی، کیونکہ اس دن قریش نے آپ کو مکہ میں ٹھہرنے نہیں دیا کہ وہاں ان کے ساتھ خلوت فرماتے۔

ان کا نکاح پہلے ابو رہم بن عبد العزیٰ کے ساتھ ہوا تھا جو کہ مر گیا تھا۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۵۱ھ میں مقامِ "سرف" میں اُسی جگہ ہوئی جہاں شبِ زفاف ہوئی تھی۔

باندیاں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو باندیاں تھیں۔

حضرت ماریہ قبطیہ بنت شمعون رضی اللہ عنہا:

انھیں مصر و اسکندریہ کے بادشاہ مُقَوقس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ کیا تھا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۳۵، محقق اس کی تخریج کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس روایت کی ابن سعد نے تخریج کی ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں، لیکن یہ مرسل ہے۔

(۲) بخاری: رقم: ۴۲۵۹

(۳) المواہب اللدنیہ: ۲/۸۹

حضرت ریحانہ بنت شمعون رضی اللہ عنہا:

یہ بنو قریظہ سے تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے، جب آپ حجۃ الوداع سے واپس آرہے تھے، ان کی وفات ہوئی، بقیع میں دفن کی گئیں۔

بعض حضرات نے ایک تیسری باندی کا بھی تذکرہ کیا ہے، جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے ہبہ کیا تھا، چوتھی باندی آپ کو قیدیوں میں سے ملی تھیں۔

امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی زندگیوں کی کچھ جھلکیاں:

جس عورت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کر لی اس کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے، بہت بڑا اعزاز، بہت بڑا شرف، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اعزاز و تکریم کا یہ معاملہ کہ ان سب کو تمام مسلمانوں کی مائیں بنادیا۔

اس کے باوجود فطری میلانات غیرت کے تعلق سے عام عورتوں کی طرح ان کے نفوس کو بھی اپنی گرفت میں لیتے رہے۔

مضمون کے اس حصے میں ہمارے لیے بہتر ہے کہ ہم اس سلسلے میں امہات المومنین کی زندگیوں کے پہلو کے کچھ واقعات پیش کریں۔

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی بیوی کے پاس تھے، اتنے میں امہات المومنین میں سے کسی اور نے کھانے کا ایک پیالہ بھیجا، وہ بیوی جن کے گھر میں آپ تشریف فرما تھے، انھوں نے خادم کے ہاتھ پر مارا جس سے پیالہ گر گیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے کے ٹکڑے اکٹھا کیے اور کھانا اس میں پھر سے رکھنے لگے، اور آپ فرمارہے تھے: ''تمھاری ماں کو غیرت آگئی''۔ پھر خادم کو روکے رکھا، یہاں تک کہ دوسرا پیالہ ان بیوی کے پاس سے لایا گیا جن کے گھر میں آپ تشریف فرما تھے، پھر ان بیوی کو جن کا پیالہ ٹوٹ گیا تھا، صحیح پیالہ دے دیا گیا''۔[1]

شارحین کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن بیوی کے پاس تھے وہ حضرت

---

(۱) بخاری: رقم: ۵۲۲۵۔ یہاں پر ایک دوسرا واقعہ بھی ہے جو اسی سے ملتا جلتا ہے، جو حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما کے درمیان پیش آیا، اس کی تخریج نسائی نے کی ہے۔ حدیث نمبر: ۳۹۶۶

عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں، اور جنھوں نے پیالہ بھیجا تھا وہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا تھیں، جیسا کہ دوسری روایات میں آیا ہے۔

سیاقِ حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تھے، ان میں سے ایک حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ''تمھاری ماں کو غیرت آگئ'' (جمع کے صیغے) سے خطاب کیا۔

یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ قابل توجہ ہے کہ آپ نے (ٹوٹے پیالے کے ٹکڑے اکٹھا کرنے اور کھانا دوبارہ اس میں رکھنے میں) صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے کوئی حرج نہیں سمجھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انداز بالکل فطری تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے ان پیالہ توڑنے والی بیوی کی غیرت کو ایسا عذر پایا کہ جس کی وجہ سے انھیں ملامت نہ کی جائے؛ اگرچہ (ضابطے کے مطابق) اس کے بدلے میں صحیح پیالہ دلوادیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«مَا رَأَيْتُ صَانِعَةَ طَعَامٍ مِثْلَ صَفِيَّةَ، أَهْدَتْ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَاءً فِيهِ طَعَامٌ، فَمَا مَلَكْتُ نَفْسِي أَنْ كَسَرْتُهُ، فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كَفَّارَتِهِ فَقَالَ: «إِنَاءٌ كَإِنَاءٍ، وَطَعَامٌ كَطَعَامٍ»»(۱).

میں نے کوئی کھانا پکانے والی عورت صفیہ رضی اللہ عنہا کی طرح نہیں دیکھی، انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک برتن میں کھانا رکھ کر بھیجا، مجھے اپنے نفس پر قابو نہ رہا اور وہ برتن توڑ دیا، پھر میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس کا کفارہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''برتن کے بدلے برتن، کھانے کے بدلے کھانا''۔

اس طرح غیرت انھیں ضبطِ نفس سے بے قابو کرتی ہے؛ لیکن پھر وہ صحیح طریقے کی جانب لوٹتی ہیں اور اس سے نکلنے کا راستہ دریافت کرتی ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہمیں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی ایک دقیق تصویر دکھاتی ہیں، وہ کہتی ہیں:

«إِنَّ نِسَاءَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنَّ حِزْبَيْنِ، فَحِزْبٌ فِيهِ عَائِشَةُ وَحَفْصَةُ وَصَفِيَّةُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں دو گروپ تھیں، ایک گروپ میں عائشہ، حفصہ، صفیہ اور سودہ رضی اللہ

(۱) ابوداؤد: رقم: ۳۵۶۸، نسائی: رقم: ۳۹۶۷

وَسَوْدَةُ، وَالْحِزْبُ الْآخَرُ: أُمُّ سَلِمَةَ وَسَائِرُ نِسَاءِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ»(۱).

عنہن تھیں، دوسرے گروپ میں ام سلمہ اور بقیہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن تھیں۔

یہ صورتِ حال چاہتی ہے کہ ایک گروپ والی بیوی کو کوئی مشکل پیش آنے پر اپنے گروپ کے افراد کی مدد کرے، ورنہ اس جماعت بندی کا کیا فائدہ؟

یہاں بہتر یہ ہے کہ ہم کوئی ایسی صورت بیان کریں جس سے اس گروپ بنانے کا کوئی اثر ظاہر بھی ہوتا ہو؛ چنانچہ بخاری و مسلم کی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَمْكُثُ عِنْدَ زَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ، وَيَشْرَبُ عِنْدَهَا عَسَلًا، فَتَوَاصَيْتُ أَنَا وَحَفْصَةُ: أَنَّ أَيَّتَنَا دَخَلَ عَلَيْهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلْتَقُلْ: إِنِّي أَجِدُ مِنْكَ رِيحَ مَغَافِيرَ، أَكَلْتَ مَغَافِيرَ؟ فَدَخَلَ عَلَى إِحْدَاهُمَا، فَقَالَتْ لَهُ ذٰلِكَ، فَقَالَ: «لَا، بَلْ شَرِبْتُ عَسَلًا عِنْدَ زَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ، وَلَنْ أَعُودَ لَهُ»(۲).

رسول اللہ ﷺ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس ٹھہرتے اور وہاں شہد نوش فرماتے، میں نے اور حفصہ رضی اللہ عنہا نے آپس میں طے کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس بھی رسول اللہ ﷺ داخل ہوں وہ کہے کہ میں آپ سے مغافیر کی بو محسوس کرتی ہوں، آپ نے مغافیر کھایا ہے؟ چنانچہ آپ ﷺ اُن میں سے ایک کے پاس تشریف لائے تو انھوں نے وہی جملہ استعمال کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے تو زینب بنت جحش کے پاس شہد پیا ہے، اب کبھی نہیں پیوں گا“۔

تاہم یہ گروپ بندی مستقل اور لازمی کوئی عہد و پیمان نہیں تھا، جب مصلحت کا تقاضا ہوتا تو اُس گروپ پر ہی چڑھ دوڑتے، اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں! شاعر کہتا ہے:

وَأَحْيَانًا عَلَى بَكْرٍ أَخِينَا   إِذَا مَا لَمْ نَجِدْ إِلَّا أَخَانَا

کبھی ہم اپنے بھائی بنو بکر پر ہی چڑھ دوڑتے ہیں، جب اپنے بھائی کے علاوہ کسی اور کو نہیں پاتے۔

اس مرتبہ منصوبہ بندی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے خلاف کی جاتی ہے، حفصہ رضی اللہ عنہا پہلے واقعے میں جس گروپ کا ایک فرد تھیں، اب مناسب ہے کہ اس گروپ سے انھیں نکالا جائے تاکہ پالیسی ناکام نہ ہو۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۲۵۸۱

(۲) متفق علیہ: خ: ۵۲۶۷، م: ۱۴۷۴

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حلوا اور شہد پسند تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب عصر کی نماز پڑھ لیتے تو تمام ازواجِ مطہرات کے یہاں تشریف لے جاتے، ان سے قریب ہوتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل ہوئے اور وہاں اس سے زیادہ دیر تک رہے جتنی دیر رہا کرتے تھے، میں نے اس کی وجہ دریافت کی، مجھے بتایا گیا کہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھرانے کی ایک عورت نے حفصہ رضی اللہ عنہا کو شہد کا ایک مشکیزہ ہدیہ کیا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی پلا رہی تھیں۔

میں نے کہا: واللہ! ہم آپ کے لیے ایک حیلہ کریں گے، میں نے اس کا تذکرہ سودہ رضی اللہ عنہا سے کیا اور میں نے ان سے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے یہاں آئیں اور تم سے قریب ہوں تو کہنا "اے اللہ کے رسول! آپ نے مغافیر کھائی ہے؟" وہ ضرور کہیں گے: نہیں، تو ان سے کہنا یہ بو کیسی ہے؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بہت شاق تھی کہ آپ سے بدبو پائی جائے، اس پر وہ کہیں گے کہ مجھے حفصہ نے شہد پلایا ہے، تم کہنا: "لگتا ہے اس کی شہد کی مکھی نے عُرفُط درخت[1] سے رس چوسا ہے"۔ میں بھی اسی طرح کہوں گی اور اے صفیہ! تم بھی یہی کہنا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے، عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ سودہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں- اُس ذات کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دروازے پر تھے تو قریب تھا کہ میں وہ بات کہنا شروع کر دوں جو تم نے مجھ سے کہی تھی، تمھارے ڈر کی وجہ سے- چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریب ہوئے؛ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے مغافیر کھایا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، میں نے کہا: پھر یہ بو کیسی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حفصہ نے مجھے کچھ شہد پلایا ہے، میں نے کہا: "اس کی مکھی نے عُرفُط درخت سے رس چوسا ہے"۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے میں نے بھی اسی طرح کہا اور صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے تو انھوں نے بھی یہی کہا، پھر جب حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے تو انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کو شہد پلاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں، مجھے ضرورت نہیں ہے"۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ سودہ رضی اللہ عنہا بولیں: "سبحان اللہ! ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محروم کر دیا"، میں

---

(۱) ایک میٹھا گوند جس کی مہک بدبودار ہوتی ہے، عُرفُط درخت سے نکلتا ہے۔

نے ان سے کہا: ”خاموش رہو“۔ (۱)

اسی طرح حفصہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ ہوا جیسا کہ کہاوت ہے: ”بِالْكَأْسِ الَّذِي سَقَيْتَ أَنْتَ شَارِبٌ“۔ جس پیالے سے تم نے پلایا، تمھیں بھی اسی سے پینا ہے۔

اس گفتگو سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شخصیت کی قوت اور اپنے ساتھ والیوں پر ان کے دبدبے کا بھی اظہار ہوتا ہے، لیکن حالات ہمیشہ ایک طرز پر نہیں رہتے، زمانہ بدلتا رہتا ہے۔

جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی کامیابیوں کی خبریں دی ہیں، اسی طرح انھوں نے بعض اوقات جو انھیں ناکامیاں ہوئیں ان کا بھی قصہ بیان کیا ہے، وہ کہتی ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب آپ سفر کرتے تو آپ اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے تھے، ایک مرتبہ قرعہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کے نام پر نکلا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات میں چلتے تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بات کرتے ہوئے چلتے تھے، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ” اس رات ایسا کیوں نہ کیا جائے، میں تمہارے اونٹ پر سوار ہو جاؤں اور تم میرے اونٹ پر، تم بھی دیکھو، میں بھی دیکھوں، (کہ کیا ہوتا ہے)، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ٹھیک ہے؛ چنانچہ عائشہؓ حفصہؓ کے اونٹ پر سوار ہو گئیں اور حفصہؓ عائشہؓ کے اونٹ پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کے پاس آئے، -اس پر تو حفصہ رضی اللہ عنہا سوار تھیں- آپ نے ان کو سلام کیا پھر چل پڑے، یہاں تک کہ ایک جگہ پہنچ کر سواریوں سے اترے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پایا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اترنے کے بعد اپنے دونوں پاؤں اِذْخِر (گھاس) میں ڈال دیے، اور کہنے لگی: اے میرے رب! مجھ پر کوئی بچھو یا سانپ مسلط کر دے، جو مجھے ڈس لے، اس کے علاوہ کچھ اور کہنے کی مجھ میں طاقت نہیں“۔ (۲)

یہ کچھ واقعات ہیں جو ازواجِ مطہرات کی زندگیوں کے ایک پہلو کا ہمارے سامنے نقشہ پیش کر رہے ہیں، خواہ اس پر جس جذبے نے بھی ابھارا ہو، غیرت نے یا مزاج نے، ان کی واقعی صورتِ حال مختلف نہیں ہے۔

یہ سرگزشت ایک ایسی حقیقت کو واضح کر رہی ہے جو فکر و شعور سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے، وہ

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۲۶۹۷، م: ۱۴۷۴

(۲) متفق علیہ: خ: ۵۲۱۱، م: ۲۴۴۵

یہ کہ ازواجِ مطہرات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کی بشریت کے اعتبار سے معاملہ کرتی تھیں، نہ کہ نبوت کے اعتبار سے، چنانچہ کبھی آپ ﷺ کے لیے حیلہ کرتیں، کبھی آپ پر حیلہ کرتیں، اور رسول اللہ ﷺ کا بھی ان کے ساتھ طرزِ عمل بشریت کی پوری تصویر کشی کرتا ہے؛ تاکہ یہ تصویر شوہروں کے لیے اپنی بیویوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں نشانِ راہ بن جائے؛ یہ چیز ہماری اس بحث سے اور بھی زیادہ واضح و روشن ہو جائے گی جسے ہم اگلی فصل میں بیان کریں گے۔

اپنی اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات کا آپس کا معاملہ ایک دوسرے کے پورے پورے اعزاز و اکرام اور اصحابِ کمال کا اعترافِ کمال کرنے پر مشتمل تھا، اس طرح کا ایک واقعہ ہمارے سامنے اس وقت گذر چکا ہے جب ہم نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا قصہ نقل کیا کہ کس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کی تعریف کی تھی، جبکہ ان دونوں کے درمیان منافست کا رشتہ تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرماتی ہیں:

«مَا رَأَيْتُ امْرَأَةً أَحَبَّ إِلَيَّ أَنْ أَكُونَ فِي مِسْلَاخِهَا مِنْ سَوْدَةَ بِنْتِ زَمْعَةَ، مِنِ امْرَأَةٍ فِيهَا حِدَّةٌ»(۱).

میری پسندیدہ عورتوں میں حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا ایسی عورت ہیں کہ میں نے تمنا کی کہ میں ان جیسی ہو جاؤں۔ وہ سمجھ بوجھ والی تھیں۔

جب واقعۂ افک پیش آیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے معاملے میں زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا: ”میں اپنے کان اور آنکھ کو خطا سے بچاتی ہوں، واللہ! میں نے ان میں بھلائی ہی جانی پہچانی ہے“۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

«وَهِيَ الَّتِي كَانَتْ تُسَامِينِي مِنْ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ فَعَصَمَهَا اللهُ بِالْوَرَعِ»(۲).

یہ ازواجِ مطہرات میں میرے تقابل میں رہا کرتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں تقوے اور پرہیز گاری کی وجہ سے بچالیا۔“

یہ ہے ازواجِ مطہرات کی روشن، خوب صورت تصویر۔ رضی اللہ عنہن

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۴۶۳

(۲) متفق علیہ: خ: ۴۱۴۱، م: ۲۷۷۰

پانچویں فصل

رسول اللہ ﷺ ایک شریف شوہر

«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ»:

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے سب سے بہتر ہے:

عورت کی اسلام سے پہلے کیا حیثیت تھی؟ مختصر جملوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہمارے لیے اس کا خلاصہ ایسے انداز میں بیان کر دیا ہے، کہ اس میں بلاغت بھی ہے اور ایجاز بھی، وہ کہتے ہیں:

«وَاللهِ إِنْ كُنَّا فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَا نَعُدُّ لِلنِّسَاءِ أَمْرًا، حَتَّى أَنْزَلَ اللهُ فِيهِنَّ مَا أَنْزَلَ، وَقَسَمَ لَهُنَّ مَا قَسَمَ»(۱).

واللہ! ہم عورتوں کو زمانۂ جاہلیت میں کسی قطار وشمار میں نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وہ نازل کیا جو نازل کیا اور ان کا وہ حصہ مقرر کیا جو مقرر کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ جملے عورت کی حیثیت کا پورا تصور دینے کے لیے کافی ہیں کہ وہ کس طرح زندگی کے حاشیے پر تھی، کیونکہ یہاں بحث کا اہم موضوع اس پہلو کو وسعت کے ساتھ بیان کرنا نہیں ہے، اس لیے اختصار کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کی آیتیں اس لیے نازل ہوئیں کہ (مال واسباب وغیرہ میں) ان کا حصہ مقرر کر دیں اور جو ان کا حق ہے اسے بیان کر دیں۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرت، اس حقیقی صورت کا عملی بیان ہے جو اسلام، مردوں سے عورتوں کے متعلق چاہتا ہے۔

جس کسی کو حضور ﷺ کی عملی سیرت سے واقف ہونے کا موقع نہیں مل سکا، اس کے لیے آپ کا قولی بیان عملی سیرت کا خلاصہ ہے، چنانچہ فرمایا:

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۴۹۱۳، م: ۱۴۷۹

«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي»(۱). تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے سب سے بہتر ہے اور میں تم میں اپنی بیوی کے لیے سب سے بہتر ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک میزانِ حق رکھ دی ہے جس کے ذریعہ آدمی کی فضیلت اور اس کی بھلائی کو جانچا جا سکتا ہے اور وہ ہے اپنی بیوی کے ساتھ حسنِ معاشرت وحسنِ رفاقت۔ حسنِ معاشرت کا یہ معیار جتنا بلند ہوگا، بھلائی کا عنصر اس شخص میں اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

اور حدیث میں ''أَهْل'' سے مراد بیوی ہے۔(۲)

یہاں حدیث اگرچہ ''خبر'' کے صیغہ کے ساتھ ہے، لیکن یہ اپنے حقیقی معنٰی میں ایک بہترین رہنمائی ہے، اور مسلمانوں کے لیے ترغیب ومہمیز ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ احسان اور حسنِ معاملہ میں بھلائی کے اُس اعلیٰ معیار تک پہنچیں جو شوہر کی طرف سے حسنِ معاملہ میں اس آیت کی عملی تفسیر ہے:

﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ {الروم: ۲۱} اور اللہ تعالیٰ نے تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔

ہم اس فصل میں بعض اُن صورتوں کو بیان کریں گے جو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے اُن پہلوؤں کو ظاہر کریں گی جو ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپ کے گھر میں رہنے کے حالات سے متعلق ہیں؛ تاکہ ان لوگوں کو ایک واضح راستہ مل جائے جو آپ کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

ان صورتوں کا ایک بڑا حصہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا روایت کردہ ہے، یا پھر خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے ساتھ خاص ہے، اس لیے کہ ازواجِ مطہرات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سب سے زیادہ روایات نقل کرنے والی ہیں، چنانچہ انہوں نے ہی ان واقعات کو نقل کیا، دوسری کسی بیوی نے

---

(۱) ترمذی: رقم: ۳۸۹۲۔ اس حدیث کی تخریج دارمی، ابن حبان اور ابن ماجہ نے بھی کی ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، اور زاد المعاد: ۱/۱۵۲ کی تخریج وتحقیق کرنے والے کہتے ہیں: وہ ایسی ہی ہے جیسا کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔

(۲) کتبِ حدیث میں سے جس میں بھی یہ حدیث آئی ہے ہر ایک نے اس تخصیص پر زور دیا ہے، چنانچہ ترمذی میں یہ حدیث ''فَضْلُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ'' کے تحت آئی ہے، دارمی میں ''حُسْنُ مُعَاشَرَةِ النِّسَاءِ'' کے تحت، ابن حبان میں ''بَابُ عِشْرَةِ النِّسَاءِ'' کے عنوان سے اور ابن ماجہ میں ''حُسْنُ مُعَاشَرَةِ النِّسَاءِ'' کے تحت وارد ہوئی ہے۔

ایسا نہیں کیا۔

عدل وانصاف:

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات گزارنے، گھر دینے اور مصارف دینے میں برابری کرتے تھے، جہاں تک محبت کا معاملہ تھا تو اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِي فِيمَا أَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِي فِيمَا لَا أَمْلِكُ»[1].

اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے اُس چیز میں جس کا میں مالک ہوں، پس آپ اُس چیز میں میری گرفت نہ کیجیے گا جس کا میں مالک نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُفَضِّلُ بَعْضًا عَلَى بَعْضٍ فِي الْقَسْمِ فِي مُكْثِهِ عِنْدَنَا»[2].

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس اپنے ٹھہرنے کے سلسلے میں ہم میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وفات میں مبتلا ہوئے تو آپ نے ساری ازواج سے اجازت مانگی کہ ان کے مرض کی تیمارداری سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں کی جائے، سب نے اجازت دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ اندازی کرتے، جس کے نام قرعہ نکلتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن ہی کو سفر میں اپنے ساتھ لے جاتے۔[3]

جب ہدیہ آتا تو سب کے درمیان برابر تقسیم کر دیتے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

"ان کی ماں ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کھجور کا ایک طبق بھیج دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس میں سے ایک مٹھی بھر کھجور نکالا اور ایک زوجہ کے پاس بھیج دیا، پھر دوبارہ ایک مٹھی بھر نکالا اور دوسری زوجہ کے

---

(۱) زاد المعاد: ۱/۱۵۱، اس حدیث کی تخریج اصحابِ سنن وغیرہ نے کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے، اور ذہبی نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔

(۲) ابوداؤد: رقم: ۲۱۳۵

(۳) متفق علیہ: خ: ۴۱۴۱، م: ۲۷۷۰

پاس بھیج دیا، (اسی طرح بھیجتے رہے)، پھر جو باقی بچی خود بیٹھ کر تناول فرمایا، اس آدمی کے کھانے کی طرح جو (کھا رہا ہے اور) جانتا ہے کہ اُسے مزید کھانے کی خواہش ہے، (مگر اتنا بچا نہیں جتنی اُس کی خواہش ہے)[1]۔

اس طرح حضور ﷺ ہدایا تقسیم کرنے میں اپنے اوپر اپنی ازواج کو مقدم رکھتے۔ آپ ﷺ کے لیے بس اتنا ہی بچتا کہ اگر کوئی شخص اسے کھائے تو فوراً ختم ہو جائے اور اس کے کھانے کی خواہش باقی رہے۔

آپ اس واقعے میں دیکھ رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے کس طرح ساری ازواج کے درمیان برابری کی اور سب کو ایک ایک مٹھی کھجور دی۔

جب ہم عدل پر گفتگو کر رہے ہیں تو یہیں بخاری کی اس حدیث پر ٹھہرنا (غور کرنا) چاہیے کہ جس میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے گروپ والی ازواجِ مطہرات نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے معاملے میں عدل کی اپیل کی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کی ازواج کی دو گروپ تھیں: ایک گروپ میں حضرت عائشہ، حفصہ، صفیہ اور سودہ تھیں اور دوسرے گروپ میں حضرت ام سلمہ اور بقیہ ازواجِ مطہرات تھیں۔

مسلمانوں کو یہ علم ہو چکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بہت محبت کرتے ہیں؛ لہٰذا جب ان میں سے کوئی رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ بھیجنا چاہتا تو اسے اتنے دن تک ٹالتا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری آجاتی، جب حضور ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ہوتے تب وہ حضور ﷺ کے پاس ہدیہ بھیجتا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گروپ کی ازواجِ مطہرات نے حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا سے بات کی اور ان سے کہا: تم رسول اللہ ﷺ سے بات کرو کہ آپ لوگوں سے فرمادیں کہ جو رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ دینا چاہے وہ آپ کو جس زوجہ کے گھر میں بھی آپ ﷺ تشریف فرما ہوں، وہیں ہدیہ

---

(۱) الفتح الربانی للبنا: ۱۴۸/۲۲، اس حدیث کی تخریج کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے رجال صحیحین کے رجال ہیں، یہ حدیث امام احمد کی ثلاثیات میں سے ہے۔

دے دے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اسی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی، آپ نے کوئی جواب نہیں دیا، دیگر ازواج نے پوچھا کیا ہوا؟ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا، انھوں نے کہا کہ پھر بات کرنا، جب دوبارہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی باری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے یہاں تشریف لے گئے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پھر بات کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر کوئی جواب نہیں دیا، ازواجِ مطہرات نے پھر پوچھا کیا ہوا؟ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بتادیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں کہا، ازواجِ مطہرات نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: تم بات کرو یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تم سے کچھ کہیں، چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری والے دن پھر بات کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے عائشہؓ کے معاملے میں ایذاء نہ دو، اس لیے کہ سوائے عائشہؓ کے کسی کے کپڑے (بستر) میں میرے پاس وحی نہیں آئی۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ: حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں آپ کو ایذا پہنچانے سے اللہ سے توبہ کرتی ہوں۔

پھر ازواجِ مطہرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، انھوں نے جاکر کہا کہ آپ کی ازواج، ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے متعلق عدل کے معاملے میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتی ہیں، چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بات کی، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے میری پیاری بیٹی! کیا تم وہ پسند نہیں کرتی جو میں پسند کرتا ہوں؟ انھوں نے جواب دیا: کیوں نہیں؟ پھر وہ ازواجِ مطہرات کے پاس گئیں اور ساری بات بتادی، انھوں نے کہا: ''دوبارہ جاؤ''، مگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دوبارہ جانے سے انکار کر دیا۔

اب ازواجِ مطہرات نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو بھیجا، انھوں نے سخت انداز اختیار کیا اور کہا: ''آپ کی بیویاں ابنِ ابی قحافہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر آپ سے عدل مانگتی ہیں''۔ انھوں نے بلند آواز میں یہ بات کہی؛ یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آڑے ہاتھوں لیا جو وہیں بیٹھی تھیں اور ان کو برا بھلا کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں عائشہ کوئی جواب دیتی ہیں یا نہیں، راوی کہتے ہیں کہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی بولنا شروع کیا اور زینب رضی اللہ عنہا کی بات کا جواب دیتی رہیں؛ یہاں تک کہ ان کو چپ کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف دیکھا اور فرمایا: ''یہ ابو بکر کی بیٹی ہیں''۔[۱]

اگر ہم پوری حدیث پر گہرائی سے نظر ڈالیں تو ظاہر ہو گا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے گروپ کی ازواجِ مطہرات کے لیے مسئلہ اس زور و شور سے اٹھانے کا اصل سبب ہدایا کا معاملہ نہیں تھا؛ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جو درجہ تھا اُس پر اُن ازواجِ مطہرات کو رشک تھا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا، اسی طرح اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا وہ ہماری اس بات کی دلیل ہے، چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جو جواب دیا اُس میں یہ بات موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول اس حالت میں ہوا جب آپ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کے لحاف یا اُن کے کپڑے میں تھے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، دیگر ازواجِ مطہرات سے ممتاز ہو جاتی ہیں۔

اور جو جواب اپنی صاحبزادی کو دیا اُس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ محبت کا معاملہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہی وہ بات ہے جو اس سلسلۂ گفتگو کے آغاز میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں گذر چکی ہے۔

پھر جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا آئیں تو وہ اس مہم کے دائرے سے نکل گئیں جس کے لیے آئی تھیں، انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا؛ حالانکہ جس کام کے لیے وہ آئی تھیں اس معاملے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کوئی اختیار نہیں تھا۔

جہاں تک ہدایا کا معاملہ تھا وہ بھی آپ کا فعل نہیں تھا کہ اس میں برابری کا مطالبہ کیا جائے اور ازواجِ مطہرات کا یہ مطالبہ کہ ''آپ لوگوں میں اعلان کر دیں''، یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت اور عفت کے خلاف تھی، اس لیے کہ یہ کمالِ اخلاق میں سے نہیں ہے کہ آدمی، لوگوں کے سامنے اس طرح کی بات کرے؛ کیونکہ اس سے ایسا لگتا ہے کہ آدمی خود ہدیہ مانگ رہا ہے، جیسا کہ یہ توجیہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے (فتح الباری: ۵ /۲۰۸) میں فرمائی ہے۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۲۵۸۱

محبت:

شیخین نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَهُ عَلَى جَيْشِ ذَاتِ السَّلَاسِلِ، فَأَتَيْتُهُ، فَقُلْتُ: أَيُّ النَّاسِ أَحَبُّ إِلَيْكَ؟ قَالَ ﷺ: عَائِشَةُ، فَقُلْتُ: مِنَ الرِّجَالِ؟ فَقَالَ: أَبُوهَا»[۱].

رسول اللہ ﷺ نے انھیں لشکرِ ذات السلاسل کا امیر بنا کر بھیجا، جب میں آپ کے پاس آیا تو میں نے آپ سے عرض کیا: آپ کے نزدیک لوگوں میں سب سے محبوب کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ''عائشہ''۔ میں نے عرض کیا: مردوں میں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کے ابا''۔

اس طرح حضور ﷺ اپنی محبت کو صاف صاف بتاتے رہے ہیں؛ یہاں تک کہ یہ بات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں پھیل گئی۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کسی ایسی چیز کی خواہش کرتیں جس میں کوئی شرعی ممانعت نہ ہوتی تو آپ ﷺ بھی وہی کرتے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا برتن سے کوئی چیز پیتیں تو آپ اُس برتن کو لیتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پینے کی جگہ منہ لگا کر پیتے۔ جب عائشہ رضی اللہ عنہا ہڈی سے گوشت نوچ کر کھاتیں تو آپ بھی اسے لے کر اسی جگہ منہ رکھ کر گوشت نوچ کر کھاتے جہاں عائشہ رضی اللہ عنہا نے منہ لگایا تھا، نیز حضور ﷺ اُن کی گود کے سہارے ٹیک لگا کر آرام فرما ہوتے تھے۔[۲]

محبت کی یہ تصویر جو کمالِ انسانی کا پیکر ہے، اس کے نقوش میں رسول اللہ ﷺ کے افعال و تصرفات رنگ بھرتے ہیں، اسے ہم نے ان لوگوں کے لیے اختصار کے ساتھ بیان کرنا مناسب سمجھا جو اس طرح کی باتوں کا ذکر کرنا عیب اور نقص سمجھتے ہیں۔

حضور ﷺ کے یہ سارے افعال کمال بھی ہیں، جمال بھی، خیر بھی ہیں اور حق بھی، اس سلسلے میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا قول شاہد ہے:

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۶۶۲، م: ۲۳۸۴

(۲) زاد المعاد: ۱/ ۱۵۲۔ دیکھیے مسلم کی حدیث نمبر: ۳۰۰، جس میں اسی جگہ سے پینے اور اسی جگہ سے گوشت نوچ کر کھانے کا ذکر ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ {الاحزاب:۲۱}

تم لوگوں کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔

جو شخص اس کے علاوہ رائے رکھے اسے اپنے ایمان کا احتساب کرنا چاہیے۔ [1]

جب ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی محبت کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ بقیہ بیویوں سے محبت نہیں کرتے تھے؛ بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کے اندر اس سلسلے میں وہ سلیقہ مند اخلاقی جرأت نہیں تھی جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بہرہ ور تھیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے ساتھ حضور ﷺ کے سلوک و تعامل کو نقل نہیں کیا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا۔ آخر تھیں بھی تو وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا تھا۔

آپ ﷺ کی شبانہ روز زندگی کی جھلکیاں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: [2]

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَا مِنْ يَوْمٍ إِلَّا وَهُوَ يَطُوفُ عَلَيْنَا جَمِيعًا امْرَأَةً امْرَأَةً، فَيَدْنُو وَيَلْمِسُ مِنْ غَيْرِ مَسِيسٍ، حَتّٰى يُفْضِيَ إِلَى الَّتِي هُوَ يَوْمُهَا، فَيَبِيتَ عِنْدَهَا» [3]

کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جس دن رسول اللہ ﷺ ہم سب کے پاس نہ آتے ہوں، الگ الگ، ایک ایک بیوی کے پاس، ان سے قریب ہوتے، لمس کرتے بغیر مقاربت کے، یہاں تک کہ اس بیوی کے پاس پہنچ جاتے جس کی باری کا دن ہوتا تھا، رات وہیں گزارتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ساری ازواجِ مطہرات اُس بیوی کے گھر میں جمع ہو جاتیں جہاں

---

(۱) بعض حضرات کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ وہ بیوی کا نام لینے میں بھی پردہ کرتے ہیں جیسے کسی کے لیے مناسب نہیں کہ ان کی بیوی کا نام جانے۔

(۲) ابو داؤد کے الفاظ یہ ہیں: «كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَا يُفَضِّلُ بَعْضَنَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْقَسْمِ، مِنْ مُكْثِهِ عِنْدَنَا، وَكَانَ قَلَّ يَوْمٌ إِلَّا وَهُوَ يَطُوفُ عَلَيْنَا جَمِيعًا». (از مصحح)

(۳) امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تخریج کی ہے، الفتح الربانی: ۱۶ / ۲۳۸، صاحب الفتح الربانی عبد الرحمٰن البنا کہتے ہیں: اس کی تخریج ابو داؤد اور حاکم نے بھی کی ہے، حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے، امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تصحیح سے اتفاق فرمایا ہے۔ ابو داؤد میں یہ حدیث ۲۱۳۵ نمبر پر موجود ہے۔

آپ ﷺ کو رات گزارنی ہوتی، جب سونے کا وقت آتا، سب اپنے اپنے حجرے میں لوٹ آتیں، کبھی کبھی اس دوران ان کے درمیان کچھ کہا سنی بھی ہو جاتی، ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ کو سنتے ہیں، وہ اس سلسلے میں واقعہ بیان کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کی نو (۹) بیویاں تھیں، جب آپ ان کے درمیان باری مقرر کرتے تو جب تک ساری نو بیویوں کی باری مکمل نہ ہو جاتی، آپ پہلی کے پاس نہ پہنچتے۔ وہ سب ہر رات ان بیوی کے حجرے میں جمع ہوتیں جن کے یہاں آپ رات گزارنے آتے؛ چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تھے، کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا آئیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا (مصافحے کے لیے)، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "یہ زینب ؓ ہیں" تو آپ نے ہاتھ روک لیا، اس بات پر دونوں بیویوں میں کہا سنی ہونے لگی اور دونوں کی آواز بلند ہو گئی، اسی دوران نماز کا وقت ہو گیا، ادھر سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ گزرے، انھوں نے دونوں کی آواز سن لی، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نماز کے لیے چلیے اور اِن پر خاک ڈالیے۔

رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے چلے گئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ (میں نے دل میں سوچا کہ) اب رسول اللہ ﷺ نماز پوری کر لیں گے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئیں گے اور مجھے زجر و توبیخ کریں گے، چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی نماز پوری کر لی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور انھیں خوب سخت وسست کہا اور فرمایا: "تم یہ سب کرتی ہو؟""(۱)

کبھی کبھی ازواجِ مطہرات، رسول اللہ ﷺ کے سامنے آواز بلند کرنے لگتیں اور کبھی کبھی ان میں کی کوئی حضور ﷺ سے بات چیت ترک کر دیتیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"میں اپنی بیوی سے ناراض ہو گیا، وہ مجھ سے بحث کرنے لگی، مجھے اس کا بحث کرنا پسند نہیں آیا۔ وہ کہنے لگی: آپ کو میرے بحث مباحثے سے ناگواری کیوں ہو رہی ہے؟ جبکہ واللہ! رسول اللہ ﷺ کی

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۴۶۲

بیویاں آپ ﷺ سے بحث مباحثہ کر لیتی ہیں، اور ان میں کوئی کوئی تو پورے دن حضور ﷺ کو چھوڑے رہتی ہے، میں اس بات سے گھبرا گیا، میں نے اپنی بیوی سے کہا: ان میں سے جس نے بھی ایسا کیا وہ خسارے میں ہے۔ پھر میں نے اپنے کپڑے پہنے اور حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچا، میں نے اس سے کہا: اے حفصہ! کیا تم میں سے کوئی پورے پورے دن رسول اللہ ﷺ سے غصے میں رہتی ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں! میں نے کہا: تم ناکام ہو گئیں، تم خسارے میں ہو گئیں، کیا تم اس بات سے بے خوف ہو کہ اللہ کے رسول ﷺ کی ناراضگی سے اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہو جائے اور تم ہلاک ہو جاؤ؟ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرو، کسی معاملے میں آپ سے بحث مباحثہ نہ کرو، اور آپ کو نہ چھوڑو، مجھ سے مانگو تمھیں جو بھی ضرورت پیش آئے۔''(۱)

نبی اکرم ﷺ ازواجِ مطہرات میں سے ہر ایک کی ناراضگی اور خوشی کو بھانپ لیتے تھے، چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

''جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو اور جب تمھیں مجھ سے ناراضگی ہوتی ہے تو یہ دونوں حالتیں میں بھانپ لیتا ہوں''، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں، میں نے عرض کیا: ''آپ یہ کیسے جان لیتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو تو یوں کہتی ہو: ''لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ'' اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو یوں کہتی ہو: ''لَا وَرَبِّ إِبْرَاهِيمَ''، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: ''میں نے عرض کیا: جی ہاں، واللہ یا رسول اللہ! میں صرف آپ کا نام چھوڑتی ہوں''۔(۲)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اندر آنے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے سنا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا بلند آواز سے بول رہی ہیں، وہ جب اندر آئے تو عائشہ رضی اللہ عنہا کو پکڑنے لگے کہ انھیں طمانچہ ماریں اور کہنے لگے: ''کیا میں تمھیں دیکھ نہیں رہا ہوں کہ تم رسول اللہ ﷺ کے اوپر چیخ رہی ہو؟'' رسول اللہ ﷺ انھیں مارنے سے روکنے لگے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ غصہ میں بھرے ہوئے چلے گئے، جب وہ چلے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے دیکھا میں نے تمھیں آج اُن کی

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۵۱۹۱، م: ۱۴۷۹

(۲) متفق علیہ: خ: ۵۲۲۸، م: ۲۴۳۹

پٹائی سے کیسے بچایا؟''

راوی کہتے ہیں: کچھ دن گزرے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پھر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر آنے کی اجازت مانگی، اب انھوں نے دیکھا کہ دونوں میں صلح ہو گئی ہے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا: ''مجھے اپنی صلح میں داخل کرلو، جیسے اپنی لڑائی میں شامل کیا تھا''، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم نے کیا، ہم نے کیا''۔ (۱)

یہ وہ جھلکیاں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شریفانہ اخلاق، ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپ کی حسنِ معاشرت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن (کے معاملات) پر صبر کے متعلق آنکھیں کھول دیتی ہیں، یہی وہ حقیقی مردانگی ہے جو اپنی بلند ترین صورت میں جلوہ گر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ حسنِ معاشرت:

اس سلسلۂ کلام میں ہم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنی بیویوں کے ساتھ معاملات کو ایک دوسرے پہلو سے پیش کریں گے۔

شیخین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے:

«قَالَ رَسُولُ اللهِ : كُنْتُ لَكِ كَأَبِي زَرْعٍ لِأُمِّ زَرْعٍ» (۲).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہارے لیے ام زرع کے لیے ابو زرع کی طرح ہوں۔''

اس حدیث کا قصہ - جیسا کہ اس کی تفصیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کی ہے - یہ ہے: کہ گیارہ عورتوں نے آپس میں معاہدہ کیا کہ اپنے شوہروں کے متعلق کوئی بات نہیں چھپائیں گی، پھر ہر ایک نے اپنے شوہر کا سلوک اپنے گھر میں اور شوہر کا معاملہ بیوی کے ساتھ جو تھا اس کو بیان کرنا شروع کیا، ان شوہروں میں بعض ایسے تھے جو بہت اچھے سلوک والے تھے، بعض متوسط درجے کے تھے، بعض دوسری طرح کے تھے، اس حدیث میں ابو زرع بیوی کے ساتھ حسنِ معاشرت میں سب سے اعلیٰ درجہ پر نمایاں ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کو جو ابو زرع سے تشبیہ دی، تو یہ تشبیہ اعلیٰ کی ادنیٰ کے ساتھ تشبیہ

---

(۱) احمد وابوداؤد: رقم: ۴۹۹۹

(۲) متفق علیہ: خ: ۵۱۸۹، م: ۲۴۴۸

دینا ہے، یا یوں کہیے: یہ ایک تمثیلی تشبیہ ہے، چونکہ ابو زرع جس سماج میں رہتا تھا اس میں وہ دوسروں کی بہ نسبت حسنِ معاشرت کی بلند چوٹی پر تھا اور رسول اللہ ﷺ مسلم معاشرے کی نسبت سے - جو کہ سارے معاشروں میں سب سے ترقی یافتہ معاشرہ ہے - حسنِ معاشرت کی انتہائی بلند چوٹی پر تھے۔

یہ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعلق بات نہیں تھی، بلکہ آپ کا معاملہ ساری ازواجِ مطہرات کے ساتھ اسی طرح کا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نام اس لیے آیا کہ مخاطب وہی تھیں۔

یہ خادمِ رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں جو اس واقعے کی منظر کشی کر رہے ہیں جب رسول اللہ ﷺ، سواری پر سوار ہونے میں زوجہ محترمہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی مدد کر رہے تھے۔

وہ کہتے ہیں: ”پھر رسول اللہ ﷺ اپنے اونٹ کے پاس بیٹھتے ہیں اور اپنے گھٹنے کو (اس حالت میں) رکھتے ہیں کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اپنا پیر آپ کے گھٹنے پر رکھتی ہیں، یہاں تک کہ سوار ہو جاتی ہیں“۔ (۱)

جس وقت رسول اللہ ﷺ اپنی سواری سے گر گئے اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے ساتھ گر گئیں، اُس وقت حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ دونوں کے قریب تھے، انھوں نے کہا: یا نبی اللہ! میری جان آپ پر قربان ہو، آپ کو کچھ ہوا تو نہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، لیکن عورت کو دیکھو۔ پھر حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنا کپڑا اپنے چہرہ پر ڈالا، اس کے بعد انھوں نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی طرف رخ کیا اور اُن پر اپنا کپڑا ڈال دیا، تو وہ کھڑی ہو گئیں۔ (۲)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے سے زیادہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی فکر کر رہے ہیں اور ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو ان کا خیال رکھنے کے لیے متوجہ کر رہے ہیں۔ (۳)

رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف میں بیٹھے ہوئے ہیں، اعتکاف کے دوران حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ کی زیارت کے لیے آئیں، کچھ دیر آپ ﷺ کے پاس بیٹھ کر آپ

---

(۱) بخاری: رقم: ۲۸۹۳

(۲) بخاری: رقم: ۳۰۸۶

(۳) یہاں حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا فوری صحیح فیصلہ دیکھیے اور ان کا حسنِ تصرف ملاحظہ کیجیے کہ کس طرح اپنا کپڑا اپنے چہرہ پر ڈال لیا؛ تاکہ وہ عورت کو نہ دیکھیں (کہ کس حال میں ہیں)۔

سے بات کرتی رہیں، پھر گھر جانے کے لیے کھڑی ہوئیں، آپ بھی ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے؛ یہاں تک کہ ان کو گھر تک پہنچا دیا۔[1]

ازواجِ مطہرات میں سے اگر کوئی بیمار پڑ جاتیں تو آپ اُن کا بطورِ خاص خیال رکھتے تھے۔ حدیثِ افک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:۔

«وَيُرِيبُنِي فِي وَجَعِي، أَنِّي لَا أَرَى مِنَ النَّبِيِّ اللُّطْفَ الَّذِي كُنْتُ أَرَى مِنْهُ حِينَ أَشْتَكِي»[2]

مجھے اپنی (اس مرتبہ کی) تکلیف میں جو چیز ستاتی، یا شک میں ڈالتی، یہ تھی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عنایت و مہربانی نہیں دیکھ رہی تھی جو میں اپنی بیماری کے وقت دیکھا کرتی تھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خواہش ظاہر کی کہ حج کے بعد عمرہ کریں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خواہش کے مطابق انھیں ان کے بھائی عبدالرحمٰن کے ساتھ عمرہ کے لیے بھیج دیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«وَكَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا سَهْلًا، إِذَا هَوِيَتِ الشَّيْءَ تَابَعَهَا عَلَيْهِ»[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت نرم مزاج آدمی تھے، جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کسی چیز کی خواہش کرتیں تو آپ اُسے پورا فرما دیتے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کا ایک پہلو یوں بیان کرتی ہیں:

«مَا ضَرَبَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم شَيْئًا قَطُّ بِيَدِهِ، وَلَا امْرَأَةً، وَلَا خَادِمًا، إِلَّا أَنْ يُجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللهِ»[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا؛ نہ کسی عورت کو، نہ کسی خادم کو، اِلّا یہ کہ اللہ کے راستے میں جہاد کر رہے ہوں۔

اگر ہم ان مکارمِ اخلاق کے نقل کرنے میں ذرا وسعت سے کام لیں تو سلسلہ بڑا دراز ہو جائے

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۲۰۳۵، م: ۲۱۷۵

(۲) متفق علیہ: خ: ۴۱۴۱، م: ۲۷۷۰

(۳) مسلم: رقم: ۱۲۱۳

(۴) مسلم: رقم: ۲۳۲۸

گا اور اِس فقرے کے لیے متعین کردہ مقررہ حدود سے ہم آگے نکل جائیں گے، اس لیے ہم صرف مسلم شریف کی اگلی حدیث بیان کرکے سلسلہ ختم کرتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

کیا میں تمھیں اپنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیان نہ کروں؟ محمد بن قیس بن مخرمہ نے جواب دیا: کیوں نہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تھے، آپ پلٹے (نمازِ عشاء سے لوٹے)، آپ نے اپنی چادر رکھی، اپنے جوتے اتارے اور پیروں کے پاس رکھ لیے اور اپنی چادر کا ایک کنارہ بستر پر بچھا دیا اور لیٹ گئے، آپ تھوڑی دیر ہی لیٹے ہوں گے کہ اٹھے اور یہ سمجھا کہ میں سو گئی ہوں۔ آہستہ سے اپنی چادر اٹھائی اور آہستہ سے ہی اپنے جوتے پہنے، دروازہ کھولا اور نکل گئے اور آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔

(یہ سب منظر دیکھ کر) میں نے بھی اپنی چادر اپنے سر پر ڈالی، اوڑھنی اوڑھی، چادر لپیٹی اور آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع تک آئے اور کھڑے ہو گئے اور بہت دیر تک کھڑے رہے، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو تین بار اٹھایا، پھر واپس لوٹے، میں بھی واپس ہوئی، آپ تیز چلے تو میں بھی تیز چلی، آپ لپک کر چلے تو میں بھی لپک کر چلی، پھر آپ تیز دوڑے تو میں بھی تیز دوڑی، میں پہلے گھر میں داخل ہو گئی۔

میں لیٹی ہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور کہنے لگے: "اے عائشہ! تمھیں کیا ہوا؟ تمھارا سانس اور پیٹ کیوں پھول رہا ہے؟" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا: "کچھ نہیں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم بتاؤ، ورنہ مجھے اللہ لطیف وخبیر بتا دے گا"، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، پھر میں نے پوری بات بتا دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو انسانی سایہ میں اپنے آگے آگے دیکھ رہا تھا وہ تم ہی تھیں؟" میں نے کہا: "ہاں"، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے میں دھکا دیا جس سے مجھے درد ہوا تھا، پھر آپ نے فرمایا: "کیا تم یہ سمجھتی تھیں کہ اللہ اور اس کے رسول تم پر ظلم کریں گے؟" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: (میں نے اپنے دل میں کہا) لوگ چاہے جتنا چھپائیں، کیا حاصل؟ اللہ تو جانتا ہی ہے، (لہٰذا سچی بات بتا دینی چاہیے)، میں نے جواب دیا: "ہاں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم نے دیکھا تھا تو اس وقت جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے تھے، انھوں نے مجھے پکارا اور خود کو تم سے

چھپایا، اس لیے میں نے بھی اُن کو تم سے چھپایا، وہ تمھارے پاس نہیں آسکتے تھے؛ کیونکہ تم نے اپنے کپڑے اتار دیے تھے؛ میں نے سمجھا کہ تم سو چکی ہو، اس لیے میں نے تم کو جگانا پسند نہیں کیا، یہ سمجھ کر کہ تم گھبرا جاؤ گی، پھر آپ نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: آپ کا رب آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اہلِ بقیع کے پاس جائیں اور ان کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں ان کے لیے کیا کہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوں کہو:

«السَّلَامُ عَلَى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ، وَيَرْحَمُ اللهُ الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِينَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لَلَاحِقُونَ»[1].

سلامتی ہو اس گھر کے رہنے والوں پر! مومنین اور مسلمین میں سے، اللہ اُن لوگوں پر رحم کرے جو ہم سے پہلے چلے گئے اور جو بعد میں جائیں گے اور بے شک ہم تم سے ملنے والے ہیں۔

حدیث کا یہ حصہ ہمیں ٹھہرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرہ چھوڑتے وقت کتنی اچھی وضع اختیار کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گمان ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سو رہی ہیں، آپ کو اندیشہ ہوا کہ اگر انھیں جگائیں اور اپنے نکلنے کی جگہ اور سبب بتائیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وحشت میں مبتلا ہو جائیں گی۔ جگانے کو ناپسند کرنا اس لیے تھا کہ آپ چاہتے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنا آرام مکمل کر لیں، اسی لیے بآہستگی بغیر جگائے نکلنے کو ترجیح دی؛ لہٰذا چادر بھی آہستگی سے لی، جوتا بھی آہستگی سے پہنا، دروازہ بھی آہستگی سے کھولا، آہستگی سے نکلے اور آہستگی سے دروازہ بند کیا۔

غور کیجیے! یہ کیسا عظیم سلوک ہے۔

اگر کہیں کہ یہ لطف و کرم ہے، تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صفت ہے جس میں آپ کا کوئی ثانی نہیں اور اگر کہیں کہ یہ رحمت ہے، تو آپ نے خود ہی فرمایا:

«الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ».

رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے۔

اور اگر ہم کہیں کہ یہ محبت ہے تو یہ عظیم الشان جذبہ ہے۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۹۷۴

ہم ان سارے معاملات میں رسول اللہ ﷺ کا اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ سلوک و برتاؤ دیکھ رہے ہیں؛ بے شک آپ ﷺ کی بات بالکل سچی ہے کہ:

«وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي»[1]. میں تم سب میں اپنے اہلِ خانہ کے لیے سب سے بہتر ہوں۔

اپنے اہلِ خانہ کے کام میں:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسود سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: اپنے اہلِ خانہ کے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اپنے اہلِ خانہ کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔[2]. جب نماز کا وقت آتا تو نماز کے لیے چلے جاتے تھے۔[3].

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اس جملے "اپنے اہلِ خانہ کے کام میں لگے رہتے تھے" میں حضور ﷺ کی گھریلو زندگی کے تمام گوشوں کا پوری تفصیل کے ساتھ خلاصہ بیان کر دیا اور مخاطب کے لیے چھوڑ دیا کہ وہ گھر اور گھریلو لوازم کو جانتے ہوئے اس تصویر کے سارے گوشوں کو خود مکمل کرے۔

اس کے علاوہ کچھ دوسری روایتیں بھی ہیں جو بخاری کے علاوہ دوسری کتبِ حدیث میں ہیں جو اس کام کاج کی کچھ مثالیں بیان کرتی ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

"رسول اللہ ﷺ اپنا جوتا ٹانک لیتے تھے، اپنا کپڑا سی لیتے تھے اور اپنے گھر میں اسی طرح کام کرتے تھے جیسے تم میں سے کوئی اپنے گھر میں کام کرتا ہے۔"[4].

---

(۱) اس کی تخریج گذر چکی ہے۔ یہی حدیث امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: "أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَخِيَارُهُمْ خِيَارُهُمْ لِنِسَائِهِمْ"۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(۲) حدیث کا یہ مطلب: "وہ اپنے اہلِ خانہ کے کام کاج میں لگے رہتے تھے۔" فتح الباری کے مطابق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ آدم بن ایاس رحمۃ اللہ علیہ کا بتایا ہوا ہے۔

(۳) بخاری: رقم: ٦٧٦

(۴) مسند احمد، شمائل ترمذی، ابن سعد، یہ حدیث صحیح ہے، اس کے رجال ثقہ ہیں، ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھیے: الفتح الربانی للبنا: ج: ۲۲/ص: ۲۳.

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کیا کرتے تھے؟ جواب دیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان ہی تھے، اپنے کپڑے میں سے جوں نکال لیتے، اپنی بکری کا دودھ دوہ لیتے اور اپنا کام خود کرتے تھے۔(۱)

یہ انتہائی روشن اور اعلیٰ اخلاقی تصویریں ہیں جو بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کیسے رہتے تھے؟ اپنا کام خود کرتے جب تک اپنا کام خود کرنے پر قادر ہوتے، کسی دوسرے سے کسی کام کے لیے نہ کہتے جب تک خود اس کے کرنے پر قادر ہوں۔ ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے آپ نے بیعت لی، چنانچہ بیعت کے مضمون میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جملہ بھی تھا: ''وَلَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا'' (کسی سے کسی چیز کا سوال نہ کرنا)۔ راویٔ حدیث کہتے ہیں کہ: ''میں نے اس جماعت کے بعض حضرات کو دیکھا کہ اگر ان کا کوڑا گر جاتا تو وہ خود (گھوڑے سے اتر کر) اٹھاتے تھے، دوسرے سے نہیں کہتے تھے کہ مجھے کوڑا اٹھا کر دے دو''۔(۲)

اس میں شک نہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو کپڑا سینے یا پیوند لگانے والے مل جاتے اور خود ازواجِ مطہرات بھی بہت سے کام کر دیتیں۔

مگر اپنے گھروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ شریفانہ طرزِ عمل واضح کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں پر اپنی خدمت واجب نہیں سمجھتے تھے، بلکہ یہ چیز ایسی ہے جسے ازواجِ مطہرات اپنی طرف سے رضاکارانہ طور پر انجام دیتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خدمت خود کر کے - ہر چیز سے پہلے - اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ عورت نہ تو خادمہ ہے، نہ ہی خادمہ کے مفہوم میں ہے۔

یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہی ماخوذ نہیں ہے، بلکہ آپ کے اقوال بھی اس پر زور دیتے ہیں، چنانچہ بہت سی حدیثیں وارد ہیں جو بیوی پر شوہر کے حقوق بیان کرتی ہیں؛ لیکن ہمیں ان میں اس کا اشارہ بھی نہیں ملتا، اور نہ ان سے یہ معنیٰ نکالے جا سکتے ہیں۔

---

(۱) مسند احمد، دیکھیے: الفتح الربانی: ج: ۲۲، ص: ۲۴۔ شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ میں حدیث نمبر ۶۷۰ پر اس کو ذکر کیا ہے۔

(۲) مسلم: رقم: ۱۰۴۳

یہی بات ائمہ مذاہب میں سے تین ائمہ : امام مالک، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہی ہے، کہ بیوی پر اپنے شوہر کی خدمت واجب نہیں۔ (۱)

فقہاء کی ایک جماعت اس جانب بھی گئی ہے کہ گھر کے اندر بیوی پر خدمت واجب ہے، انھوں نے اس کی بنا اس عرف پر رکھی ہے جو معاشرے میں رائج ہے۔ اس اجتہاد کی علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تائید کی ہے، ان کا مذہب یہی ہے، انھوں نے اس مسئلے میں جس دلیل سے استدلال کیا ہے وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں ان کی خدمت کرنا ہے۔ اسی طرح حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی خدمت کی، وہ کہتی ہیں: ''میں زبیر رضی اللہ عنہ کے گھر کے سارے کام کرتی تھی''۔ (۲)

---

(۱) فقہ السنۃ از سید سابق: ۲/۱۸۴، زاد المعاد: ۵/۱۸۸

(۲) زاد المعاد: ۵/۱۸۷، امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے گھر میں عورت کی خدمت کے وجوب کی رائے ظاہر کی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح کیا ہے کہ: ''ابن حبیب نے (الواضحہ) میں کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے درمیان اُس وقت فیصلہ فرمایا جب اُن دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر خدمت (کام) کی شکایت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق یہ فیصلہ فرمایا کہ وہ گھر کے اندر کے کام انجام دیں گی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فیصلہ فرمایا کہ وہ باہر کا کام انجام دیں گے۔'' ابنِ حبیب کہتے ہیں کہ: ''خدمتِ باطنہ سے مراد آٹا پیسنا، پکانا، بستر بچھانا، جھاڑو دینا، پانی پلانا اور اندرونِ خانہ سارا کام۔''

صحیحین میں ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، چکی پیسنے سے ان کے ہاتھوں میں جو (چھالے) پڑ گئے تھے ان کی شکایت لے کر آئی تھیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خادم مانگنے آئی تھیں۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پایا، وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتا کر چلی گئیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے، اس وقت ہم لیٹ گئے تھے۔ آپؐ کو دیکھ کر ہم کھڑے ہونے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی جگہ رہو''۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان بیٹھ گئے، یہاں تک کہ میں نے آپؐ کے دونوں قدموں کی ٹھنڈک اپنے پیٹ پر محسوس کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو چیز تم دونوں نے مانگی ہے، کیا میں تم دونوں کو اس سے زیادہ بہتر چیز نہ بتادوں؟ سنو! جب تم دونوں سونے لگو تو ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو، یہ تم کی دونوں کے لیے خادم سے بہتر ہے''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: ''اس کے بعد سے میں نے اسے کبھی ترک نہیں کیا''، ایک شخص نے پوچھا: کیا صِفّین کی رات بھی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں! صِفّین کی رات میں بھی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مذہبِ اول کے قائلین کہتے ہیں: یہ ان دونوں کی طرف سے تبرع تھا، یہ تطوع اور مکارمِ اخلاق کے قبیل سے تھا۔

اگر ہم اس مسئلہ کو اصولِ فقہ کے میدان میں لاکر حل کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ان دونوں واقعات سے ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہما کی خدمت کو برقرار رکھا اور یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کسی بات کو باقی رہنے دینا اس کے جواز کا فائدہ دیتا ہے، وجوب کا نہیں، گویا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے شوہر کی خدمت کرے، یہ اس پر واجب نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل سے جو کچھ ہم نے پایا اور سمجھا، مناقشاتِ فقہیہ سے دور رہتے

=== ترک نہیں کیا۔'' علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی بات ختم ہوئی۔

میں کہتا ہوں: یہ پورا واقعہ اسی تفصیل کے ساتھ كِتَابُ أَقْضِيَةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: ص:۳۳۹ پر منقول ہے، اس کتاب کے مؤلف محمد بن فرج مالکی ہیں، اس کی تحقیق دکتور محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی نے کی ہے اور ابنِ حبیب محدث قرطبی مالکی کا سن وفات ۲۳۸ ہے۔

یہاں جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ابنِ فرج نے ابنِ حبیب سے نقل کیا ہے، پھر ان دونوں سے ابنِ قیم نے نقل کیا ہے، ابنِ فرج نے صحیحین کی حدیث کو اپنی بات کی دلیل بنایا ہے، ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس میں ان کی متابعت کی ہے۔

یہ واقعہ بخاری میں پانچ جگہوں پر آیا ہے، اسے مسلم نے بھی ذکر کیا ہے، لیکن ان میں سے کسی روایت میں اس کا تذکرہ نہیں کہ حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہوا تھا کہ حضور ﷺ کے فرمان کو اس کے بعد قضاء یا فیصلہ قرار دیا جائے۔(خ:۶۳۱۸، ۳۱۱۳، ۳۷۰۵، ۵۳۶۱، ۵۳۶۲، م:۲۷۲۷)۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی شرح کرتے ہوئے ابن بطال کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں: کہ ہم حدیث و آثار میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ''خدمتِ باطنہ'' کا فیصلہ فرمایا ہو۔ یہ چیز ان کے درمیان ایسی ہی تھی جیسے حسنِ اخلاق اور حسنِ معاشرت کے طور پر لوگوں میں متعارف ہے۔ رہی یہ بات کہ عورت کو کسی طرح کی خدمت پر مجبور کیا جائے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے، بلکہ اجماع اس بات پر ہے کہ شوہر کے ذمے عورت کا سارا خرچ اٹھانا ہے۔(فتح الباری:۹/ ۵۰۷)

میں نے وضاحتی نوٹ طویل کر دیا، مقصد ابنِ حبیب کے اس قول کا بطلان ہے کہ یہ معاملہ کوئی مقدمہ تھا جس کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کے درمیان کیا، وجہ یہ ہے کہ بعض حضرات صرف اسی قول کو نقل کر دیتے ہیں اور اس کی دلیل و استناد کو نہیں دیکھتے؛ حالانکہ اس بات کی نہ کوئی دلیل ہے، نہ کوئی سند۔

ہوئے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) عورت اپنے گھر میں نہ خادمہ ہے، نہ خادمہ کے مشابہ ہے۔

(۲) معمول یہ ہے کہ عورت یہ سارے کام رضا اور محبت سے کرتی ہے، جب معاملہ یہ ہے تو شوہر کے لیے اچھا نہیں کہ وہ بیوی پر بوجھ ڈال دے؛ بلکہ اس کو گھر کے کام میں شریک ہونا چاہئے جس طرح رسول اللہ ﷺ شریک ہوتے تھے۔

(۳) شوہر کے گھر میں بیوی کی خدمت کے وجوب پر فقہاء کا عدمِ اتفاق اور اُن میں سے اکثر کا رائے اول کی طرف جانا جو عدمِ وجوب کو ثابت کرتی ہے، اس سے ہمیں جس نفسیاتی بات کا فائدہ ملتا ہے - وہ میرے نزدیک بڑی اہم ہے، وہ شوہر کے ذہن میں جم جانی چاہیے - وہ یہ کہ شوہر اچھی طرح سمجھ لے کہ بیوی یہ خدمت اپنی مہربانی سے کر رہی ہے اور یہ چیز بذاتِ خود درجِ ذیل دو باتوں کا مطالبہ کرتی ہے:

۱۔ شوہر بیوی کی خدمات پر اس کا شکریہ ادا کرے اور اچھی بات ہمیشہ صدقے کا حکم رکھتی ہے۔

۲۔ اگر کسی دن کسی وجہ سے کوئی کوتاہی وہ کر دے تو نہ اُف کہے، نہ غضبناک ہو؛ اس لیے کہ وہ متبرع ہے، اور متبرع شخص اپنے تبرع میں کوئی کمی کر دے تو اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اس میدان میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ دو کام کرے:

پہلا : اپنا کام خود کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔

دوسرا : جب اپنے گھر میں ہو تو بیوی کے کام میں ہاتھ بٹائے جیسا کہ سید البشر ﷺ کیا کرتے تھے۔

گھریلو معاملات میں امہات المومنین کی شراکت داری:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

”ہم زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو کسی قطار وشمار میں نہیں سمجھتے تھے؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو

اس باب میں جو نازل کرنا تھا وہ نازل کر دیا اور ان کے لیے جو حصہ مقرر کرنا منظور تھا وہ مقرر کر دیا۔ ایک وقت میں کسی معاملے پر غور و فکر کر رہا تھا تو میری بیوی نے کہا: اگر ایسا ایسا کر لیتے (تو بہتر ہوتا)، وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا: تمہارا اس سے کیا مطلب؟ اور تم یہاں کیوں؟ جو کام میں کرنا چاہتا ہوں اس میں تمہارا کیا کام؟ بیوی نے مجھ سے کہا: اے ابنِ خطاب! آپ پر تعجب ہے؛ آپ مجھ سے مشورہ نہیں کرنا چاہتے؛ جبکہ آپ کی بیٹی رسول اللہ ﷺ سے بحث کرتی ہے؛ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اُس سے دن بھر غصہ رہتے ہیں، پھر بھی وہ آپ سے بحث کرتی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے، اپنے گھر سے اپنی چادر لی اور حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آکر کہنے لگے: اے میری پیاری بیٹی! تم رسول اللہ ﷺ سے بحث کرتی ہو؟ یہاں تک کہ آپ ﷺ دن بھر غصے میں رہتے ہیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا: واللہ! ہم بحث کرتے ہیں۔"[1]

لوگوں کی نظر میں عورت ایسی نہیں تھی جس سے کسی معاملے میں مشورہ لیا جائے؛ بلکہ اگر وہ اپنی رائے ظاہر کرے تو اس پر نکیر کی جاتی تھی؛ چہ جائیکہ اس کا کوئی نقطۂ نظر مانا جائے جس سے وہ اپنا دفاع کر سکے یا اپنے معاملے میں مردوں سے بحث کر سکے۔

یہ وہ صورتِ حال ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول میں گہری نگاہ ڈالنے سے، اپنے سارے نتائج کو قاری کے ذہن میں پیوست کر دیتی ہے۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کی سیرت ایک الگ ہی چیز ہے، وہ اپنی بیویوں کی پوری بات غور سے سنتے تھے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی بات سنتی تھیں، کبھی نقطہ ہائے نظر متفق ہوتے تو کبھی مختلف، کبھی رسول اللہ ﷺ اُن میں سے کسی سے پورے دن ناراض رہتے، کبھی بیوی پورے دن ناراض رہتی۔ حقیقی اور صحیح زندگی یہی ہے۔ عورت کی بھی رائے، رائے ہے، وہ بھی اس کی اہل ہے کہ بحث و مباحثہ کرے، اپنی رائے پیش کرے، خاص طور پر ان چیزوں میں (یعنی گھریلو معاملات میں) جو اس کے دائرے میں آتی ہوں۔

ہم نے گذشتہ صفحات میں رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل دیکھ لیا کہ آپ ازواجِ مطہرات کی آراء کا کس طرح احترام فرماتے تھے؛ یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے فرمایا: "مجھے پتہ چل جاتا ہے جب تم مجھ سے خوش رہتی ہو اور جب تم مجھ سے ناراض رہتی ہو"، جیسا کہ گذر چکا۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۴۹۱۳، مسلم میں قریب یہی الفاظ ہیں۔

بلکہ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گھریلو معاملات کے چھوٹے بڑے کام میں مداخلت کی کوشش پر بھی نکیر نہیں فرماتے تھے۔

حضرت ابواُمامہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''ہم ایک دن مسجدِ نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے،انصار ومہاجرین کی بھی ایک جماعت تھی، ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اجازت لینے کے لیے ایک آدمی بھیجا، چنانچہ ہم اُن کے حجرے میں گئے تو اُنھوں نے کہا: ایک مرتبہ ایک سائل میرے پاس آیا، میرے پاس رسول اللہ ﷺ بھی تھے، میں نے اس کے لیے کسی چیز کا حکم دیا، پھر میں نے اسے بلایا اور اسے دیکھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارے گھر میں تمہارے علم کے بغیر کوئی چیز نہ داخل ہو، نہ نکلے؟'' میں نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! چھوڑو، شمار مت کیا کرو؛ ورنہ اللہ عزوجل بھی تم پر (جو اس کی نعمتیں ہیں) شمار کرنے لگے گا''۔[1]

حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس بات پر نکیر نہیں کی کہ انھیں اُن کے گھر میں جو ہو رہا ہے اس کی واقفیت رہے؛ بلکہ صرف آپ ﷺ نے اس بات کی طرف متوجہ فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو تو اسے گنا مت کرو۔

بلکہ رسول اللہ ﷺ گھریلو معاملات میں اس اہتمام پر زور دیتے ہیں اور اسے عورت کی ذمے داریوں میں سے قرار دیتے ہیں جیسا کہ اس حدیث میں ہے جس میں عورت کی ذمے داریاں بیان کی گئی ہیں، اسی سلسلے کی یہ حدیث ہے:

«وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى أَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ مَسْؤُولَةٌ عَنْهُ»[2]

عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد کی نگراں ہے، وہ ان سب کی ذمے دار اور جواب دِہ ہے۔

نگرانی میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادی کے سلسلے میں اپنی رائے ظاہر کرے اور ان کے لیے بہتر شوہر کے انتخاب میں شریک ہو، یہ بات بیٹیوں اور اُن کے شوہروں کے درمیان زیادہ اُلفت

---

(۱) نسائی: رقم: ۲۵۴۸

(۲) متفق علیہ: خ: ۱۳۸۷، م: ۱۸۲۹

پیدا کرنے والی ہے؛ کیونکہ ماؤں کی رضامندی اور بیٹیوں کی موافقت بھی اس میں شامل رہے گی''۔[(۱)]

عورت کی فعالیت اور گھریلو معاملات میں اس کے حصہ داری کے سلسلے میں یہ ایک اہم دورانیہ ہے اور یہ اس کا پہلا میدان ہے، جو عورت کی قابلیت و اہلیت کے سبب مزید بہتر ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے قریش کی عورتوں کی، ان کی دو صفات کی وجہ سے تعریف فرمائی ہے، اگر عورت کو صرف انہی دو سے حصہ مل جائے تو یہ اس کی ذمے داری کی ادائیگی کے لیے کافی ہو جائے گی، آپ ﷺ نے فرمایا:

''سب سے اچھی عورتیں جو اونٹ پر سوار ہوتی ہیں قریش کی نیک عورتیں ہیں، جو بچوں کے حق میں بچپنے میں سب سے زیادہ مشفق اور شوہر کے مال میں سب سے زیادہ نگرانی رکھنے والی ہوتی ہیں''۔[(۲)]

امہات المؤمنین کی عام معاملات میں شرکت:

رسول اللہ ﷺ تاریخ میں سب سے مؤثر اور عظیم انسان تھے، اور چھوٹے بڑے سارے معاملات میں آپ ﷺ ہی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا؛ تاکہ آپ ان میں اپنی رائے پیش فرمائیں۔ آپ کی ازواجِ مطہرات کے گھر مسجد سے قریب تھے جس نے انھیں اُن سرگرمیوں کے میدانِ عمل کے بالکل قریب کر دیا تھا۔ اس سے وہ سارے امور کو شروع ہی میں جان لیتی تھیں۔

ازواجِ مطہرات کے اہتمام اور اُن کی ان جیسی چیزوں میں شرکت کے متعلق امام مسلم حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر میں تھیں، وہ کہتی ہیں: ایک مرتبہ لڑکی میرے کنگھی کر رہی تھی، اسی درمیان میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا: آپ فرما رہے تھے ''یَا أَیُّهَا النَّاسُ'' اے لوگو! میں نے لڑکی سے کہا: ''ذرا پیچھے ہو جا''۔ لڑکی کہنے لگی: رسول اللہ ﷺ نے مردوں کو بلایا ہے، عورتوں کو نہیں بلایا، تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ''میں بھی ''لوگوں'' میں

---

(۱) یہ ابوداؤد کی حدیث نمبر ۲۰۹۵ کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے ان کی بیٹیوں کے معاملے میں مشورہ لینے کا حکم دیا ہے: (آمِرُوا النِّسَاءَ فِي بَنَاتِهِنَّ)، شیخ البانی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

(۲) متفق علیہ: خ: ۵۰۸۲، م: ۲۵۲۷

داخل ہوں''۔[(۱)]

اس طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا شرکت کے لیے جلدی تیار ہو جاتی ہیں؛ حالانکہ وہ نہیں جانتی تھیں کہ آگے وہ کیا بات سنیں گی، بس انھوں نے صرف یہ سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں: ''یَاأَیُّھَا النَّاسُ'' (اے لوگو!) ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی لوگوں میں سے تھیں، یہ ان کی سمجھ داری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کرتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے تھے، جس کا نام نکلتا تھا وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں جاتی تھیں، بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئی بیویاں ہوتی تھیں۔ اس چیز نے بھی عام واقعات کے ساتھ ان کا مستقل سلسلہ جوڑ دیا تھا، مقیم ہونے کی حالت میں بھی اور سفر میں بھی، امن میں بھی اور جنگ میں بھی۔

یہ شرکت بہت سے موقعوں پر بڑا کام کرتی تھی۔ اس کی ہم بعض مثالیں ذکر کریں گے:

❖ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وحی نازل ہونے کے پہلے ہی دن سے بہت بڑا سہارا بنی ہوئی تھیں، وہ آپ کی تائید و حمایت کرتیں، مکے میں ان کی سماجی حیثیت و مرکزیت انھیں آپ کا ساتھ دینے میں معاون تھی، وہ اِس پہلو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب سے کم نہیں تھیں، وہ شِعب ابی طالب میں قیام کے زمانے میں بھی شریک تھیں، انھوں نے اپنا بہت سامال خرچ کیا؛ تاکہ مسلمانوں کا جو اقتصادی بائیکاٹ ہوا ہے اس میں کچھ آسانی ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد اس خلا کو بہت محسوس کیا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی وفات سے ہو گیا تھا؛ یہاں تک کہ اس سال کا نام ہی عام الحزن (غم کا سال) پڑ گیا۔

❖ غزوۂ احد کے موقعے پر جو کچھ ہوا، اس کے واقعات بیان کرتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ ہمیں بتاتے ہیں:

''میں نے حضرت عائشہ بنت ابی بکر اور حضرت ام سُلیم رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ وہ دونوں پائینچے چڑھائے ہوئے ہیں، دونوں کی پنڈلیوں کے پازیب مجھے نظر آرہے تھے، وہ دونوں اپنی کمر پر پانی کی مشکیں لیے ہوئے تیز چل رہی تھیں، لوگوں کے منہ میں پانی ڈال رہی تھیں، پانی پلا کر لوٹ

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۲۹۵

جاتیں، پھر پانی لے آتیں اور لوگوں کے منہ میں پانی ڈالتیں"۔(۱)

❖ حضرت امِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے حالات کے تحت گزر چکا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے (صلح حدیبیہ کے موقعے پر) سر منڈا کر حلال ہونے کا حکم دیا، تو صحابۂ کرام نے ایسا نہیں کیا، اس وقت حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جو مشورہ دیا اس میں سراسر خیر تھی، اس نے صحابۂ کرام کو حق اور صحیح کی طرف پھیر دیا اور وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔

❖ حجۃ الوداع کے موقعے پر رسول اللہ ﷺ غصے کی حالت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس یہ بتلانے کے لیے آئے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو جو حکم دیا ہے اس میں انھیں تردد ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

"ذی الحجہ کی ۴ یا ۵ تاریخ کا واقعہ ہے، رسول اللہ ﷺ میرے پاس غصے کی حالت میں آئے، میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کو کس نے غضبناک کر دیا؟ اللہ اُسے جہنم میں داخل کرے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم نہیں جانتیں کہ میں نے لوگوں کو ایک بات کا حکم دیا ہے اور وہ اس میں تردد کر رہے ہیں"۔(۲) اگر میں اپنے معاملے کو پہلے سے جانتا جو بعد میں پیش آیا تو قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا، بلکہ یہاں سے خریدتا، پھر میں بھی اسی طرح حلال ہو جاتا جس طرح لوگ حلال ہوئے"۔(۳)

صحابۂ کرام کے آپ ﷺ کے حکم پر عمل درآمد میں سبقت نہ کرنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو بڑا صدمہ ہوا، اس لیے رسول اللہ ﷺ کو اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ آپ زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جائیں اور واقعہ بیان کر کے اپنے غم کو ہلکا کریں۔

یہ چند نمونے ہیں جن سے امہات المؤمنین کی عام معاملات اور مختلف میدانوں میں شرکت ظاہر ہوتی ہے۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۴۰۶۴، م: ۱۸۱۱

(۲) رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ جو اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہیں لایا وہ طواف و سعی کر کے احرام سے حلال ہو جائے اور اسے عمرہ بنادے، یہی وہ چیز ہے جو "تمتع" کہلاتی ہے، صحابۂ کرام کے اعتبار سے یہ نئی چیز تھی، اس لیے کچھ لوگوں نے عمل کرنے میں قدرے دیر لگائی۔

(۳) مسلم: کتاب الحج: رقم: ۱۳۰

لیکن کبھی کبھی:

یہ بات رسول اللہ ﷺ نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے فرمائی تھی، جب انھوں نے آپ ﷺ سے اپنی یہ شکایت کی کہ وہ اپنی بیویوں اور اولاد کے ساتھ کھیل و تفریح میں لگ جاتے ہیں اور ذکر پر مداومت نہیں کر پاتے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”لیکن اے حنظلہ! کبھی (یہ) کبھی (وہ)“۔ (۱)

کھیل، تفریح، مزاح زندگی کے لیے ضروری ہے، جیسے کھانے کے لیے نمک ضروری ہے۔ تھوڑے سے نمک سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے، جب زیادہ ہو جائے گا تو کھانے کو خراب کر دے گا۔

چنانچہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ (ظرافت و ملاحت) کے اس پہلو سے (یکسر) خالی نہیں تھی، خواہ آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوتے، یا اپنے اصحاب (واحباب) کے درمیان۔

آپ کے اہلِ خانہ کے تعلق سے اس سلسلے کی بعض مثالیں ہم بیان کرتے ہیں:

❖ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھیں، وہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے دوڑ میں حضور ﷺ سے مقابلہ کیا، میں حضور ﷺ سے آگے بڑھ گئی، جب میرے بدن پر گوشت چڑھ گیا (اور بدن بھاری ہو گیا) اس کے بعد پھر دوڑ کا مقابلہ ہوا، اب کی بار رسول اللہ ﷺ آگے بڑھ گئے، تو آپ نے فرمایا: ”یہ اُس کا بدلہ ہے“۔ (۲)

آپ ﷺ کا فرمان: ”یہ اُس کا بدلہ ہے“، یہ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دل کو خوش کرنے کے لیے فرمایا تھا؛ کیونکہ وہ تو پچھڑ گئی تھیں اور حضور ﷺ آگے بڑھ گئے تھے۔

❖ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میرے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، اس وقت میرے پاس دو لڑکیاں جنگِ بُعاث کا گیت گا رہی تھیں، رسول اللہ ﷺ اپنے بستر پر سو گئے اور اپنا چہرہ گھما لیا، پھر جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ داخل ہوئے؛ انھوں نے مجھے ڈانٹا اور کہا: شیطان کی بانسری رسول اللہ ﷺ کے پاس؟ رسول اللہ ﷺ ان کی طرف متوجہ

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۷۵۰

(۲) ابوداؤد: رقم: ۲۵۶۸، ابن ماجہ: رقم: ۱۹۷۹، مسند احمد: ۳۹/۶

ہوئے اور فرمایا: انھیں چھوڑ دو، پھر جب رسول اللہ ﷺ کی آنکھ لگ گئی تو میں نے اشارہ کیا، چنانچہ وہ دونوں لڑکیاں چلی گئیں۔

عید کا دن تھا، حبشی ڈھال اور نیزے سے کھیل رہے تھے، یا تو میں نے خود کہا، یارسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دیکھنا چاہتی ہو؟'' میں نے کہا: ہاں، اس پر آپ نے مجھے اپنی پیٹھ پر سوار کیا، میرا رخسار رسول اللہ ﷺ کے رخسار پر تھا، آپ ﷺ فرما رہے تھے: شاباش! (کھیلتے رہو) اے بنی ارفدہ، جب میں اکتا گئی تو آپ نے فرمایا: ''کافی ہو گیا؟'' میں نے کہا: ہاں، آپ نے فرمایا: ''تب جاؤ''۔(۱)

❖ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے، براء بن عازب رضی اللہ عنہ مردوں کے اونٹوں کے حُدی خواں تھے اور انجشہ عورتوں کے اونٹوں کے حُدی خواں تھے۔ انجشہ نبی ﷺ کے غلام تھے، آواز اچھی تھی، اُن عورتوں میں نبی کریم ﷺ کی کچھ ازواجِ مطہرات اور حضرت ام سُلیم رضی اللہ عنہا تھیں، انجشہ نے اونٹوں کو تیز ہنکایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انجشہ! تمہارا ناس ہو! آہستہ چلاؤ اور آبگینوں (کی سواریوں) کو نرمی سے ہانکو۔(۲)

یہ جملہ لطافت اور حسن میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو نزاکت، لطافت اور قوتِ برداشت کی کمی میں شیشوں سے تشبیہ دی۔

ہم اِن ہی نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں، یہ نمونے رسول اللہ ﷺ کی، امہات المؤمنین کے ساتھ حیاتِ مبارکہ کے اِس پہلو کو اچھی طرح اجاگر کر دیتے ہیں۔

ازواجِ مطہرات کی باتوں پر رسول اللہ ﷺ کا صبر:

رسول اللہ ﷺ بہت کشادہ دل والے تھے، آپ نے اپنی بیویوں کی بہت سی باتیں برداشت کیں، ان پر مسلط باہمی غیرت ان کی زندگیوں میں ہلچل مچائے رکھتی تھی۔ اس قسم کی کچھ جھلکیاں ہمارے سامنے گزر چکی ہیں۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۹۴۹، ۹۵۰، م: ۸۹۲

(۲) بخاری و مسلم: حدیث انجشہ: خ: ۶۱۴۹، م: ۲۳۲۳

وہ سب بھی انسان ہی تھیں، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک انسان شوہر کا معاملہ کرتی تھیں، کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ کو تنگ کرنے کا معاملہ حد سے گزر جاتا، اسی طرح کی صورت اُس دن پیش آئی تھی جب آپ نے اُن سے ''ایلاء'' کیا تھا۔[1]

آپ ﷺ پر (منصبِ نبوت کی) بے انتہا ذمے داریاں تھیں اور ان پر مزید بیویوں کی شکر رنجیوں پر آپ کا مثالی صبر وضبط آپ کے حسنِ سلوک کی عظمت میں شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن رسول اللہ ﷺ یہ چیزیں اُسی وقت تک برداشت کرتے تھے جب تک خاندانی معاملات کے حدود کے اندر رہا کرتی تھیں؛ اور جب اس حد سے آگے بڑھ جاتیں تو آپ ﷺ باطل پر خاموش نہ رہتے تھے۔

ہم اس قسم کی بعض مثالیں پیش کرتے ہیں:

❖ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف میں بیٹھتے تھے، میں آپ کے لیے ایک خیمہ لگا دیا کرتی تھی، آپ صبح کی نماز پڑھ کر اس میں داخل ہو جاتے تھے، حفصہ رضی اللہ عنہا نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے اجازت طلب کی کہ وہ بھی خیمہ لگا لیں؟ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو اجازت دے دی، زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو انھوں نے بھی خیمہ لگا لیا۔

جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے کئی خیمے دیکھے، آپ نے پوچھا: یہ کیا؟ آپ کو بات بتائی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا ان خیموں کے ذریعے تم سب نیکی کا ارادہ رکھتی ہو؟'' (گویا آپ نے اظہارِ ناگواری کیا)، چنانچہ آپ ﷺ نے اس مہینہ کا اعتکاف ترک کر دیا۔ (پھر بطور قضا شوال میں دس دنوں کا اعتکاف فرمایا)۔ یہ شیخین کی روایت ہے۔[2]

ابو داؤد کی روایت میں ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے ایک بار رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کا ارادہ فرمایا، عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے خیمہ لگانے کا حکم دیا، چنانچہ لگا دیا گیا، جب میں نے دیکھا تو میں نے بھی اپنے لیے خیمہ لگانے کا حکم دیا، وہ بھی لگا

---

(۱) اس کے بیان کے لیے دیکھیے: مؤلف کی کتاب ''مِنْ مَعِينِ السِّيرَةِ'': ص: ۴۶۵

(۲) متفق علیہ: خ: ۲۰۳۳، م: ۱۱۷۲

دیا گیا، حضور ﷺ کی ازواج میں سے کسی اور نے خیمہ لگانے کا حکم دیا، وہ بھی لگا دیا گیا، جب رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھی تو کئی خیمے نظر آئے، آپ نے فرمایا: ''یہ کیا؟ کیا اس سے تم نیکی کمانا چاہتی ہو؟'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خیمے کے متعلق حکم دیا تو اسے اکھاڑ دیا گیا اور اپنی ازواج کے خیموں کے متعلق حکم دیا، چنانچہ وہ بھی اکھاڑ دیے گئے۔ (۱)

عبادت کے لیے مناسب ہے کہ خالص اللہ کے لیے ہونی چاہیے، اس کا باعث غیرت نہ ہو، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کا پوچھنا ''کیا تم اس سے نیکی کمانا چاہتی ہو؟'' استفہامِ انکاری کے طور پر تھا۔ یہ میدان ایسا ہے کہ اس میں ایسی باتیں داخل کرنا جو میدانِ اخلاص سے دور لے جائیں، مناسب نہیں ہیں۔

❖ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے نبیٔ پاک ﷺ سے عرض کیا: ''آپ کے لیے تو صفیہ ہی کافی ہے، جو ایسی ایسی (یعنی کوتاہ قامت) ہے''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر سمندر کے پانی میں ملا دی جائے تو اس کے کھارے پن پر غالب آجائے''۔ (۲)

یہ ایک دوسرا میدان ہے، اسے غیرت کا اسٹیج نہیں ہونا چاہیے؛ کیونکہ اس میں تمسخر اور ٹھٹول ہے؛ خصوصًا ایسے معاملے میں جس میں انسان کا کوئی اختیار نہیں؛ کیونکہ یہ تو (ایسا) اللہ کا پیدا کردہ ہے۔

❖ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بیان کی ہے، اس میں ہے:

رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کے ساتھ حج کیا، جب وہ لوگ راستے میں تھے تو حضرت صفیہ بنت حُیی رضی اللہ عنہا کا اونٹ بیٹھ گیا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے کہا: اے زینب! اپنی بہن صفیہ کو ایک اونٹ عاریت پر دے دو۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس سب سے زیادہ اونٹ تھے، انھوں نے جواب دیا: میں آپ کی یہودیہ کو عاریت پر دوں؟ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر نہایت غضبناک ہوگئے؛ حتّٰی کہ آپ ﷺ نے ان سے بات چیت کرنا بند کر

(۱) ابوداؤد: رقم: ۲۴۶۴

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۸۷۵

دیا، یہاں تک کہ مکہ آ گئے اور ایامِ منیٰ بھی آ گئے، آپ نے اپنے سفر میں بھی ان سے بات نہیں کی، جب مدینہ لوٹ کر آئے تو محرم اور صفر کے مہینے میں بھی ان کے پاس نہیں گئے، ان کی باری میں بھی ان کے پاس تشریف نہیں لے گئے، اس کے نتیجے میں وہ حضور ﷺ سے مایوس ہو گئیں۔ جب ربیع الاول کا مہینہ آیا تو آپ ان کے پاس گئے۔"[1]

یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ کسی شخص کو مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد "کفر" سے متصف کیا جائے، اسی وجہ سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا قطعِ تعلق کی سزا کی مستحق ٹھہریں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

"کوئی شخص کسی شخص کو فسق کی تہمت نہیں لگاتا، اسی طرح کفر کی تہمت نہیں لگاتا، مگر یہ کہ وہ تہمتیں تہمت لگانے والے کی طرف لوٹ آتی ہیں اگر وہ متّہم شخص ویسا نہ ہو۔"[2]

رسول اللہ ﷺ کے برتاؤ کے یہ وہ نمونے ہیں جہاں آپ ﷺ خاموش نہیں رہے اور آپ کے لیے صبر کی گنجائش نہیں تھی؛ کیونکہ یہ غیرت کے لیے محدود کردہ دائرے سے آگے بڑھنا ہے، لہٰذا اس موقعے پر رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل ہم نے دیکھ لیا کہ موقع کیا چاہتا ہے؟ ملامت، وضاحت یا سزا؟

رسول اللہ ﷺ کی گھریلو زندگی، امہات المؤمنین کے ساتھ برتاؤ وغیرہ سے متعلق یہ واقعات ہر موقف کے سلسلے میں آپ کا طرزِ عمل ظاہر کر دیتے ہیں، اس سے ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح اپنی ازواج کے لیے سب سے اچھے تھے؟ جیسا کہ آپ نے اپنے متعلق خود فرمایا تھا۔

---

(۱) الفتح الربانی: ۲۲/ ۱۴۴-۱۴۳

(۲) بخاری: رقم: ۶۰۴۵

چھٹی فصل

آپ ﷺ کے چچا، پھوپھیاں اور رضاعی بھائی بہن

چچا:

یہ سب بنو عبد المطلب ہیں۔اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نو چچا اور دسویں حضور ﷺ کے والد عبداللہ ہیں، چچا اس طرح ہیں: ۱۔حمزہ، ۲۔عباس، ۳۔ابو طالب-ان کا نام عبد مناف ہے-، ۴۔ابولہب-اس کا نام عبد العزّیٰ ہے-، ۵۔زبیر، ۶۔ضرار، ۷۔مُقوَّم، ۸۔مغیرہ، ۹۔غَیداق-ان کا نام مصعب ہے-، ۱۰۔حارث۔

بعض نے ''عبدالکعبہ'' کا اضافہ کیا ہے، کچھ لوگ مقوم کا ہی نام عبدالکعبہ بتاتے ہیں۔

کچھ لوگوں نے ''جحل''(۱) کا اضافہ کیا ہے؛ لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ مغیرہ ہی ہیں۔

بعض نے ایک نام ''قُثَم'' بھی بتایا ہے۔

ان میں سے حضرت حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ کوئی اسلام نہیں لایا۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شیر خدا، شیر رسولِ خدا، سید الشہداء ہیں، بعثت کے چھٹے سال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے تین دن پہلے اسلام لائے۔

مدینہ منورہ ہجرت کی، غزوۂ بدر میں شریک ہوئے، پھر غزوۂ احد میں شریک ہوئے، اسی میں وہ شہید ہوگئے، انھیں وحشی نے قتل کیا تھا، دور سے تاک کر ان کی طرف نیزہ مارا تھا۔

ان کا مثلہ(۲) کیا گیا، رسول اللہ ﷺ وہاں کھڑے ہو کر فرمایا: ''مجھے کبھی آپ جیسی تکلیف کا صدمہ نہیں اُٹھانا پڑے گا، میں کبھی اِس سے زیادہ غیظ و غضب میں ڈالنے والی کسی جگہ کھڑا نہیں

---

(۱) ابن دُرَید نے الاشتقاق: ۴۷ اور علامہ سہیلی نے: ۱/۱۳۱ پہ لفظ جَحْل (اول جیم بعدہٗ حاء) نقل کیا ہے۔اور دار قطنی، نووی، علامہ فیروز آبادی وابن حجر سے حَجْل (اول حاء بعدہٗ جیم) منقول ہے۔(از مصحح)

(۲) ناک، کان کاٹ کر، لاش کو بالکل بگاڑ دیا گیا۔(از مترجم)

ہوا"۔ انھیں اور ان کے بھانجے عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ (۱)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے میں تاخیر ہوئی، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں رہتے تھے، چنانچہ جب عقبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے بیعت لی تھی تو وہ وہاں موجود تھے اور انصار سے گفتگو بھی کی تھی۔

بدر کے دن زبردستی میدانِ جنگ میں لائے گئے تھے، مشرکین کی صف میں تھے، مسلمانوں نے انھیں غزوۂ بدر میں قید کر لیا تھا، پھر فدیہ دے کر مکہ واپس ہو گئے تھے۔

انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان فتحِ مکہ سے پہلے کیا اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے، مقامِ جحفہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اپنے گھر والوں کو مدینہ بھیج دیا اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکے کی طرف لوٹے؛ تاکہ فتحِ مکہ میں شریک ہوں، حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر ہجرت ختم ہو گئی؛ کیونکہ فتحِ مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں۔ (۲)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی وفات، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں، ان کی شہادت سے دو سال پہلے ہوئی۔

پھوپھیاں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھیاں عبد المطلب کی بیٹیاں تھیں، وہ چھ ہیں: ۱۔ صفیہ جو زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی ماں ہیں۔ ۲۔ عاتکہ۔ ۳۔ برّہ۔ ۴۔ اَروىٰ۔ ۵۔ اُمَیمَہ۔ ۶۔ بیضاء، جو امِ حکیم ہیں۔ عاتکہ اور اروىٰ کے اسلام لانے میں اختلاف ہے، لیکن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے اسلام میں اختلاف نہیں، انھوں نے ہجرت کی، غزوۂ خندق کے دن ایک یہودی کو قتل کیا، ۲۰ ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں مدینہ منورہ میں وفات پائیں اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔ رضی اللہ عنہا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رضاعی بھائی خود آپ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں، ان کے علاوہ ابو سلمہ بن

---

(۱) ان کے اسلام لانے اور شہید ہونے کا قصہ "مِنْ مَعِینِ السِّیرَۃ" ص: ۶۶، ۲۳۵، ۲۳۹ پر دیکھیے۔

(۲) یعنی وہ ہجرت جو مکہ سے مدینہ کی طرف تھی، وہ فتح مکہ کے بعد ختم ہو گئی؛ لیکن جو ہجرت کسی دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف ہے وہ باقی ہے، حالات و مصلحت پر منحصر ہے۔ (مترجم)

عبد الاسد رضی اللہ عنہ ہیں، ان سب کو ابو لہب کی باندی ثوبیہ نے دودھ پلایا تھا۔

علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں کہ ثوبیہ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا سے پہلے چند روز دودھ پلایا تھا۔ ثوبیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو دودھ پلایا تھا، اور آپ کے بعد حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کو دودھ پلایا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے متعلق فرمایا:

«لَا تَحِلُّ لِي هِيَ ابْنَةُ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ»[2]. وہ میرے لیے حلال نہیں ہے، کیونکہ وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔

اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی کے متعلق فرمایا تھا:

«إِنَّهَا ابْنَةُ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ، أَرْضَعَتْنِي وَأَبَا سَلَمَةَ ثُوَيْبَةُ»[3]. وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہیں، مجھ کو اور ابو سلمہ کو ثوبیہ نے دودھ پلایا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائیوں میں ابو سفیان بن حارث بن عبد المطلب بھی ہیں، اِنھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بچوں عبد اللہ، آسیہ، جدامہ - جو شیماء سے معروف ہیں - کے ساتھ دودھ پلایا تھا۔[4]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ / مُربّیہ، انّا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ ام ایمن رضی اللہ عنہا ہیں، جن کا نام برکہ بنت ثعلبہ بن حصن ہے، ان کی کنیت ان کے نام پر غالب ہے، ان کی کنیت ان کے بیٹے ایمن بن عبید کے نام سے ہے۔ حضرت امِ ایمن رضی اللہ عنہا حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی ماں ہیں، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے، ان کے پہلے شوہر عبید بن زید بن حارث خزرجی کے بعد ان سے شادی کی تھی۔

---

(۱) حاشیۃ الزرقانی علی المواہب: ۳/ ۲۹۳

(۲) متفق علیہ: خ: ۲۶۴۵، م: ۱۴۴۷

(۳) متفق علیہ: خ: ۵۳۷۲، م: ۱۴۴۹

(۴) المواہب اللدنیہ للقسطلانی: ۲/ ۱۱۶

بہت قدیم الاسلام ہیں، دونوں ہجرتیں کیں، حبشہ کی طرف بھی اور مدینہ کی طرف بھی۔[1]

رسول اللہ ﷺ اُن سے ملاقات کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ پر بہت ناز دکھاتی تھیں۔ مسلم میں ہے؛ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

«اِنْطَلَقَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، إِلٰى أُمِّ أَيْمَنَ، فَانْطَلَقْتُ مَعَهُ، فَنَاوَلَتْهُ إِنَاءً فِيهِ شَرَابٌ قَالَ: فَلَا أَدْرِي أَصَادَفَتْهُ صَائِمًا أَوْ لَمْ يُرِدْهُ، فَجَعَلَتْ تَصْخَبُ عَلَيْهِ وَتَذَمَّرُ عَلَيْهِ»[2]

رسول اللہ ﷺ حضرت امّ ایمن رضی اللہ عنہا کے گھر گئے، میں بھی آپ کے ساتھ چلا، حضرت امّ ایمن رضی اللہ عنہا نے ایک برتن میں پینے کی کوئی چیز دی، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ حضور ﷺ روزہ سے تھے، یا اُسے پینا نہیں چاہتے تھے، حضرت امّ ایمن رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے چلانے لگیں اور (نہ پینے پر) غصہ کرنے لگیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ماں نے رسول اللہ ﷺ کو کھجور کے کچھ گچھے دیے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی آزاد کردہ باندی حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی ماں کو دے دیے، جب رسول اللہ ﷺ خیبر سے لوٹے تو آپ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ انصار کو ان کے عطایا لوٹا دیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کے پاس مانگنے آئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا آئیں اور کپڑا میری گردن میں ڈال کر کہنے لگیں: ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، حضور ﷺ وہ تمھیں نہیں دیں گے، وہ تو مجھے دے چکے ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے: تم دے دو، تمھیں اس کے بدلے اِتنا ملے گا؛ مگر وہ یہی کہے جا رہی تھیں: ہرگز نہیں، واللہ ہرگز نہیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اس کا دس گنا دے کر راضی کیا''۔[3]

اور اسی ناز کی وجہ سے جو وہ رسول اللہ ﷺ پر کیا کرتی تھیں، حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما رسول

---

(۱) حوالۂ سابقہ: ۲/۱۱۷

(۲) مسلم: رقم: ۲۴۵۳

(۳) بخاری: رقم: ۲۶۳۰، ۴۱۲۰۔ مسلم میں اس کا کچھ حصہ ہے: رقم: ۱۷۷۱

اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ان کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔[۱]

مسلم میں ابن شہاب حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کے تعارف کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:

"حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا۔ جو کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی ماں ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کے والد عبد اللہ بن عبد المطلب کی خادمہ تھیں، حبشہ کی رہنے والی تھیں۔ جب حضرت آمنہ سے رسول اللہ ﷺ کی ولادت ہوئی اور آپ کے والد حضرت عبد اللہ کی وفات ہو چکی تھی، تو حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا ہی ان کی دایہ گیری کرتی تھیں؛ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے بڑے ہو کر انھیں آزاد کر دیا، پھر ان کا نکاح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کی وفات، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے پانچ ماہ بعد ہوئی۔[۲]

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۴۵۴

(۲) مسلم: رقم: ۱۷۷۱

ساتویں فصل

اہلِ بیت

اہلِ بیت کی تعریف:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۳۲ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝۳۳﴾

{الاحزاب: ۳۳-۳۲}

اے پیغمبر کی بیویو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو کسی اجنبی شخص سے نرم نرم باتیں نہ کرو؛ تاکہ وہ شخص جس کے دل میں کسی طرح کا مرض ہے کوئی امید نہ پیدا کرے، اور معقول بات کہو۔ اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور گذشتہ زمانۂ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار دکھاتی نہ پھرو، اور نماز پڑھتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتی رہو، اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی دور کر دے اور تمھیں بالکل پاک وصاف کر دے۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ فرمانِ باری: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ ازواجِ مطہرات کے اہلِ بیت ہونے میں نص ہے؛ کیونکہ وہی اس آیت کے نزول کا سبب ہیں۔ اور رہی یہ بات کہ کیا آیتِ کریمہ صرف ازواجِ مطہرات کے ساتھ خاص ہے یا عام ہے، یعنی ان کے ساتھ کچھ دوسرے افراد بھی داخل ہیں؟

تو حضرت عکرمہ مولی ابن عباسؓ اس بات کی طرف گئے ہیں کہ آیت: ازواجِ مطہرات کے لیے خاص ہے، ان سے پہلے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی یہی کہہ چکے ہیں۔

لیکن صحیح بات - جس کے قائل عام علماء ہیں - یہ ہے کہ اس میں ازواجِ مطہرات کے علاوہ دوسرے افراد بھی داخل ہیں، چنانچہ بہت سی احادیث اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں، ہم ان میں سے چند کا ذکر کرتے ہیں، مثلاً:

مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن صبح کے وقت نکلے، آپ کالے بالوں والی ایک منقش اونی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما آئے، آپ نے انھیں اس میں داخل کر لیا، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ آئے، وہ بھی ان کے ساتھ داخل ہو گئے، پھر فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بھی داخل کر لیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے، انھیں بھی آپ نے داخل کر لیا اور یہ آیتِ کریمہ پڑھی: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ {الاحزاب:۳۳}[۱].

مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

﴿فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ﴾ {آلِ عمران:۶۱}

پس آپ ان سے کہیے کہ آؤ! ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا: ''اے اللہ! یہ سب میرے اہل ہیں''۔[۲].

ان دونوں احادیث اور ان کے علاوہ بھی بہت سی احادیث کی وجہ سے حضرات علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح قول کی وجہ سے آیت میں داخل ہیں۔

اس سلسلے کی کچھ دوسری احادیث بھی ہیں جو ''اہلِ بیت'' کے مفہوم کے دائرے کو وسیع کرتی ہیں جو صدقے کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔

چنانچہ بخاری میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقے کی کھجوروں میں ایک کھجور حضرت حسن یا حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے منہ سے نکال لی اور فرمایا: ''کیا تم جانتے نہیں کہ آلِ محمد صدقہ نہیں کھاتے''۔[۳].

اس حدیث کی بنا پر وہ لوگ جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کی وجہ سے صدقہ کھانے سے منع کیا

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۴۲۴

(۲) مسلم: رقم: ۲۴۰۴

(۳) بخاری: رقم: ۱۴۸۵

گیا، وہ اس اصطلاح (اہلِ بیت) میں داخل ہیں۔

صحابۂ کرام نے یہی سمجھا تھا، چنانچہ غدیرِ خُم کی حدیث، جسے مسلم نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اس میں وہ کہتے ہیں کہ :

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک چشمے پر - جسے خُم کہا جاتا ہے - خطبہ دیتے ہوئے، اللہ کی حمد وثنا کی اور وعظ وتذکیر کے بعد فرمایا: امابعد، خبردار! اے لوگو! میں ایک انسان ہی ہوں، قریب ہے کہ میرے رب کا قاصد میرے پاس آئے اور میں اس کی دعوت پر لبیک کہہ دوں۔ میں تم میں دو اہم چیزیں چھوڑ کر جاتا ہوں، ان میں سے سب سے اول کتاب اللہ ہے جس میں ہدایت اور نور ہے؛ پس کتاب اللہ کو پکڑو اور مضبوطی سے تھامو، کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے پر خوب ابھارا اور ترغیب دلائی، پھر فرمایا: اور میرے اہلِ بیت ہیں؛ اپنے اہلِ بیت کے سلسلے میں تمھیں اللہ کی یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہلِ بیت کے سلسلے میں تمھیں اللہ کی یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہلِ بیت کے سلسلے میں تمھیں اللہ کی یاد دلاتا ہوں''۔

حُصین بن سَبُرہ جو حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو سن رہے تھے، انھوں نے کہا: اے زیدؓ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی بیویاں آپ کے اہلِ بیت نہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: آپ کی بیویاں آپ کے اہلِ بیت میں سے ہیں، ان کے بعد اہلِ بیت وہ لوگ بھی ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ حُصین نے کہا: وہ کون لوگ ہیں؟ جواب دیا: آلِ علیؓ، آلِ عقیلؓ، آلِ جعفرؓ اور آلِ عباسؓ۔ حُصین نے کہا: کیا ان سب پر صدقہ حرام ہے؟ جواب دیا: ہاں''۔ (۱)

یہ بات معلوم ہے کہ جن پر صدقہ حرام ہے ان کے لیے اس کے عوض میں خمس ہے، یہ لوگ بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب ہیں۔

حضرت جُبیر بن مُطعِم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ :

''میں اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، ہم نے کہا: یارسول اللہ! آپ نے بنی عبد المطلب کو دیا اور ہمیں چھوڑ دیا؛ حالانکہ ہم اور وہ آپ کے لیے ایک درجے میں ہیں، تو

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۴۰۸

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بنو عبد المطلب اور بنو ہاشم ایک ہی ہیں"۔[1]

مسلم کی حدیث جو عبد المطلب بن ربیعہ بن حارث سے مروی ہے، اس میں ہے کہ:

ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب اور عباس بن عبد المطلب جمع ہوئے، دونوں نے کہا: اگر ہم اِن دونوں لڑکوں۔ مجھے[2] اور فضل بن عباس کو۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیج دیتے کہ آپ ﷺ ان دونوں کو ان صدقات کا ذمے دار بنا دیتے، یہ دونوں بھی اسی طرح (تقسیمِ صدقات کی خدمت انجام) دیتے جس طرح دوسرے لوگ خدمت انجام دیتے ہیں، اور یہ دونوں بھی اسی طرح (خرچ اور معاش) پاتے جس طرح دوسرے لوگ پاتے ہیں، یہ لوگ یہی گفتگو کر رہے تھے تب تک حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ آ گئے، اور وہاں کھڑے ہو گئے، دونوں نے اُن سے بھی یہی بات کہی، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: ایسا نہ کرنا، واللہ! حضور ﷺ ایسا کرنے والے نہیں، یہ سن کر ربیعہ بن حارث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دور ہٹ گئے اور کہا: واللہ! تم یہ جو کر رہے ہو وہ صرف ہم سے حسد کی بنیاد پر کر رہے ہو، واللہ! تم نے رسول اللہ ﷺ کی دامادی کا شرف پایا، ہم نے اس پر تم سے حسد نہیں کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ٹھیک ہے بھیج دو، چنانچہ وہ دونوں آ گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ لیٹ گئے۔

عبد المطلب بن ربیعہ کہتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز پڑھ چکے تو ہم حجرے کے پاس آپ سے پہلے پہنچ گئے اور وہیں جا کر کھڑے ہو گئے، جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ہم دونوں کے کان پکڑے اور فرمایا: "بتاؤ! تمھارے دل میں کیا ہے؟" پھر حضور ﷺ حجرے میں داخل ہو گئے، اس دن آپ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے یہاں تھے۔

راوی کہتے ہیں: بات کرنے کے معاملے میں ہم ایک دوسرے پر ٹالتے رہے (کہ تم کہو، تم کہو) پھر ہم میں سے ایک نے بات کی اور کہا: یا رسول اللہ! آپ لوگوں میں سب سے زیادہ بھلائی کرنے والے ہیں، سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے ہیں، ہم لوگ نکاح کی عمر کو پہنچ گئے ہیں، ہم

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۱۴۰

(۲) "مجھے" سے مراد: عبد المطلب بن ربیعہ بن الحارث بن عبد المطلب ہیں۔ دیکھیے: نووی شرح مسلم: ۷ / ۲۵۲۔ (از مصحح)

آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں تاکہ آپ ہمیں ان صدقات میں سے کسی کا امیر و عامل بنادیں، ہم آپ کو اسی طرح ادا کریں گے جیسے دوسرے لوگ ادا کرتے ہیں اور اس طرح ہمیں بھی وہ ملے گا جو دوسروں کو ملتا ہے۔

راوی کہتے ہیں: یہ سن کر رسول اللہ ﷺ دیر تک خاموش رہے، یہاں تک کہ ہم نے ارادہ کیا کہ ہم پھر آپ سے بات کریں۔ لیکن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا پردے کے پیچھے سے ہمیں اشارہ کر رہی تھیں کہ ہم بات نہ کریں۔ راوی کہتے ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا: ''صدقہ آلِ محمد ﷺ کے لیے حلال نہیں، یہ تو لوگوں کا میل کچیل ہے، محمیہ کو بلاؤ۔- مَحمیہ رضی اللہ عنہ خمس پر مقرر تھے۔ اور نوفل بن حارث بن عبد المطلب کو بھی بلاؤ''۔ راوی کہتے ہیں: وہ دونوں آ گئے، پھر آپ ﷺ نے محمیہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: اپنی بیٹی کا نکاح اِس لڑکے۔ فضل بن عباس رضی اللہ عنہما۔ سے کر دو، تو انھوں نے نکاح کر دیا۔ اور نوفل بن حارث رضی اللہ عنہ سے میرے (یعنی عبد المطلب بن ربیعہ کے) متعلق فرمایا کہ: اپنی بیٹی کا نکاح اس لڑکے سے کر دو، انھوں نے میرا نکاح کر دیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے محمیہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اِن دونوں کا مہر خمس سے اتنا اتنا ادا کر دو''۔ (۱)

اس کا خلاصہ اگر ہم بیان کریں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ''اہلِ بیت'' کی اصطلاح میں رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور حضرات علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم داخل ہیں۔

جبکہ ''آلِ محمد'' کی اصطلاح میں وہ سب لوگ داخل ہیں جن کے لیے صدقہ حلال نہیں اور وہ بنو ہاشم، بنو عبد المطلب ہیں، یہی وہ ذوی القربیٰ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے:

﴿وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی﴾ {الانفال: ۴۱}

اور جان لو کہ جو کچھ تمھیں بطور غنیمت ملے اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کا اور رشتے داروں کا ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ذی القربیٰ (رشتے دار) بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب ہیں۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۰۷۲

اہلِ بیت کے متعلق نصیحت:

بہت سی احادیث میں حضور ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے اپنی امت کو نصیحت و وصیت کی کہ اہلِ بیت کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا، ان میں سے ایک وہ حدیث ہے جو ابھی مسلم شریف کے حوالے سے گزری، جس میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''میں تمھیں اپنے اہلِ بیت کے معاملے میں اللہ یاد دلاتا ہوں، میں تمھیں اپنے اہلِ بیت کے معاملے میں اللہ یاد دلاتا ہوں، میں تمھیں اپنے اہلِ بیت کے معاملے میں اللہ یاد دلاتا ہوں۔''

اُن ہی میں وہ حدیث بھی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی اولاد کے تذکرے میں گزری۔

اُن ہی میں وہ حدیث بھی ہے جو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے:

«إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ خَلِيفَتَيْنِ: كِتَابُ اللهِ، حَبْلٌ مَمْدُودٌ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، أَوْ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ، وَعِتْرَتِي أَهْلُ بَيْتِي، وَإِنَّهُمَا لَنْ يَتَفَرَّقَا[1] حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ»[2].

بے شک میں تم میں دو خلیفہ چھوڑ کر جا رہا ہوں: کتاب اللہ جو کہ ایسی لمبی رسی ہے جو آسمان و زمین کے درمیان یا آسمان سے زمین تک کھنچی ہوئی ہے اور میرا خاندان میرے اہلِ بیت، یہ دونوں جدا نہیں ہو سکتے، یہاں تک کہ وہ حوضِ کوثر پر (میرے پاس) آئیں۔

بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

''آپ کے اہلِ بیت کے سلسلے میں محمد ﷺ کا خیال رکھو۔''[3]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: ''اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! صلہ رحمی کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی قرابت مجھے اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے''۔[4]

---

(۱) الفتح الربانی: ۲۲/ ۱۰۴ پر یہ لفظ ''لَا يَتَفَرَّقَا'' منقول ہے۔(از مصحح)

(۲) الفتح الربانی: ۲۲/ ۱۰۴، شیخ احمد البنا کہتے ہیں: اس حدیث کی سند جید ہے۔(ملاحظہ: یہ شیخ البنا کا نہیں، علامہ ہیثمی کا قول ہے، وہ بس ناقل ہیں، خود حکم نہیں لگا رہے ہیں۔)

(۳) بخاری: رقم: ۳۷۱۳

(۴) متفق علیہ: خ: ۴۲۴۰، م: ۱۷۵۹

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ قول اِسی کی تاکید تھی جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سمجھا تھا، نیز ایک مؤمن کو اہلِ بیت کے ساتھ جو محبت ہونی چاہیے اس کی عملی تشریح تھی۔

کیا رسول اللہ ﷺ نے صرف اہلِ بیت کو کوئی خاص علم دیا تھا؟

رسول اللہ ﷺ سارے لوگوں کے لیے اللہ کی شریعت کے مبلغ بن کر آئے، رسول اللہ ﷺ نے کسی کو کوئی ایسا خاص علم نہیں دیا جو دوسرے لوگوں تک نہ پہنچایا ہو،(۱) لیکن تابعین کی نسل کے بعض حضرات نے یہ گمان کر لیا تھا، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کئی جگہوں پر اس کو واضح فرمایا۔

بخاری و مسلم کی حدیث جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ :

”ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں، صرف کتاب اللہ ہے جسے ہم پڑھتے ہیں، ہاں یہ صحیفہ ہے، چنانچہ وہ صحیفہ نکالا تو اس میں کچھ چیزیں لکھی ہوئی تھیں، مثلاً زخموں اور اونٹ کے دانتوں سے متعلق۔ راوی کہتے ہیں کہ اس میں یہ بھی تھا: مدینہ حرام ہے جبلِ عیر سے لے کر جبلِ ثور تک۔ اور یہ کہ جس نے مدینے میں کوئی نئی بات ایجاد کی یا کسی نئی بات ایجاد کرنے والے کو ٹھکانا دیا تو اس پر اللہ، فرشتوں اور سارے انسانوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے کسی فرض و نفل کو قبول نہیں کرے گا اور جس نے اپنے موالی کی اجازت کے بغیر کسی قوم سے موالات کی تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے کسی فرض و نفل کو قبول نہیں کرے گا۔ مسلمانوں کا ذمہ ایک ہے، اس کی ان میں کا ادنیٰ بھی کوشش کر سکتا ہے، جس نے کسی مسلمان کا ذمہ و عہد پامال کیا اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے کسی فرض و نفل کو قبول نہیں کرے گا“۔(۲)

بخاری میں حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا آپ کے پاس کوئی الگ سے وحی ہے، یا صرف وہی ہے جو

---

(۱) جہاں تک یہ بات ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے صرف حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو منافقین کے نام بتائے، تو اس کا تشریع سے کوئی تعلق نہیں، پھر یہ بات حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے دنیا سے جانے کے ساتھ ہی ختم بھی ہو گئی۔

(۲) متفق علیہ: خ: ۶۷۵۵، م: ۱۳۷۰

کتاب اللہ میں ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اس ذات کی قسم! جس نے دانے کو پھاڑ کر پودا نکالا اور جاندار کو پیدا کیا، میں ایسی کوئی چیز نہیں جانتا، مگر وہ فہم جسے اللہ قرآن کے متعلق کسی شخص کو عطا کر دے اور جو اس صحیفے میں ہے۔ میں نے کہا: صحیفے میں کیا ہے؟ فرمایا: دیت اور قیدیوں کو چھڑانا اور یہ کہ کوئی مسلمان کسی کافر کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا''۔ [1].

بلکہ اس طرح کا سوال حضرت علی رضی اللہ عنہ کو غضبناک کر دیتا تھا؛ کیونکہ یہ سائل کی جہالت ہوا کرتی تھی کہ وہ ایسا سوال کر بیٹھتا تھا جو شریعت کے عمومی احکام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت سے متصادم ہوتا تھا۔

چنانچہ ابو طفیل کہتے ہیں:

«كُنْتُ عِنْدَ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، فَأَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ: مَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُسِرُّ إِلَيْكَ؟ قَالَ: فَغَضِبَ وَقَالَ: مَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُسِرُّ إِلَيَّ شَيْئًا يَكْتُمُهُ النَّاسَ» [2].

میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس تھا، اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے کیا رازدارانہ بات کرتے تھے؟ راوی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس پر غصہ آ گیا اور فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے کوئی ایسی رازدارانہ بات نہیں کرتے تھے جسے اور لوگوں سے چھپاتے ہوں''۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے لیے وصیت کی تھی؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں ایسی کوئی بات نہیں کہی جس سے یہ مستفاد ہو کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ یا اہلِ بیت واہلِ قرابت میں سے کسی کے لئے اپنے بعد امر خلافت میں کوئی وصیت کی ہو، یا کوئی عہد لیا ہو۔

اس بات کی تائید اس گفتگو سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الوفات کے دوران ہوئی۔

صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۰۴۷

(۲) مسلم: رقم: ۱۹۷۸

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے نکلے جبکہ آپ اس تکلیف میں مبتلا تھے جس میں آپ کی وفات ہوئی، لوگوں نے پوچھا: اے ابوالحسن! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کس طرح کی؟ انہوں نے جواب دیا: الحمد للہ! صحت کی حالت میں صبح ہوئی۔ اس پر حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا: واللہ! تین دن کے بعد تم عصا کے بندے ہو جاؤ گے۔[1] میں واللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ عنقریب اسی بیماری میں وفات پائیں گے، میں موت کے وقت بنی عبد المطلب کے چہروں کو پہچانتا ہوں، چلو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلتے ہیں، ہم آپ سے پوچھ لیتے ہیں کہ امرِ حکومت کس کے پاس رہے گا؟ اگر ہم میں رہے گا تو ہم اسے جان لیں گے اور اگر دوسروں میں رہے گا تو اسے بھی جان لیں گے، پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے بارے میں وصیت کر دیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: واللہ! اگر ہم اس کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر دیں اور وہ ہمیں منع کر دیں تو آپ کے بعد لوگ ہمیں نہیں دیں گے، واللہ! میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں پوچھوں گا''۔[2]

اس گفتگو سے ہمارے لیے درج ذیل حقائق ثابت ہوتے ہیں:

(۱) جس زمانے میں یہ گفتگو ہوئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرضِ وفات کا زمانہ ہے۔

(۲) اس گفتگو سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں کوئی ایسی بات صراحتًا یا اشارۃً نہیں کہی جس سے یہ سمجھا جاتا کہ خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملے گی، کیونکہ اگر ان میں سے کوئی بات ہوتی تو حضرت علی، عباس رضی اللہ عنہ سے ضرور ذکر کرتے اور اگر اس طرح کی کوئی چیز حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے علم میں ہوتی تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایسی کوئی بات طلب نہ کرتے۔

(۳) اس سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی گفتگو کے بعد کوئی ایسی چیز ذکر کرتے جو اس معاملے سے تعلق رکھتی تو وہ پھیل جاتی اور لوگ اسے ایک دوسرے سے نقل کرتے، خصوصًا اس وجہ سے بھی کہ لوگ اس بات پر کان لگائے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی کی آخری ساعتوں میں کیا فرماتے ہیں؟

---

(۱) کنایہ ہے اس بات سے کہ تم عنقریب دوسرے کے تابع ہو جاؤ گے یعنی تین دن کے بعد تمہارے اوپر دوسرا حکم چلائے گا۔

(۲) بخاری: رقم: ۴۴۴۷

اگر ہم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی گفتگو پر پردہ ڈال دیں تو ہم ایسی نصوص پائیں گے جو اس کے علاوہ کی تائید کرتی نظر آئیں گی جس کی حضرت عباس رضی اللہ عنہ خواہش رکھتے تھے۔

شیخین رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا وقت قریب آیا اُس وقت گھر میں لوگ تھے، جن میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لاؤ! میں تمھارے لیے ایک تحریر لکھ دوں، تم اس کے بعد گمراہ نہ ہوگے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکلیف کا غلبہ ہے اور تمھارے پاس قرآن ہے، ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ تو گھر والوں میں اختلاف ہوا، آپس میں جھگڑنے لگے، کوئی کہتا: قلمدان قریب کردو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی تحریر لکھ دیں؛ تاکہ تم اس کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو، بعض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے قائل تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگوں نے زیادہ شور وغل اور اختلاف کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اٹھ جاؤ''۔[۱]

ایک دوسری روایت میں ہے: ''مجھے چھوڑ دو، جس حالت میں میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو'' اور تین باتوں کی وصیت کی: ''مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو، وفود کو اسی طرح انعام (ہدایا و تحائف) دیا کرو جیسے میں دیا کرتا تھا اور راویٔ حدیث ابن عیینہ تیسری چیز بھول گئے''۔[۲]

یہ حدیث اس بات کو مؤکد کرتی ہے کہ کوئی تحریر نہیں لکھی گئی، نہ خلافت سے متعلق، نہ کسی اور چیز سے متعلق؛ بلکہ یہاں ایک اور چیز ہے جو اس بات کی تائید کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معاہدہ لکھنے کا عزم کر لیا تھا، پھر خود ہی لکھنا ترک کر دیا، بغیر اس کے کہ کوئی آپ کو آپ کے عزم سے پھیرے۔

آخری بات:

حافظ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مواہب'' میں ذکر کیا ہے کہ مامون رشید نے ارادہ کیا کہ خلافت بنو فاطمہ میں منتقل کر دے، ان کے لیے ایک شعار بنایا اور ان کو سبز لباس پہنایا، پھر اپنے اس ارادے

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۵۶۶۹، م: ۱۶۳۷

(۲) متفق علیہ: خ: ۴۴۳۱، م: ۱۶۳۷

سے رک گیا۔ یہ لباس ان کے شعار کے طور پر باقی رہ گیا؛ لیکن انھوں نے اسے اور بھی مختصر کر کے ایک سبز ٹکڑے تک محدود کر دیا جسے وہ اپنے عماموں پر رکھتے تھے، پھر آٹھویں صدی کے آخر میں یہ بھی بند ہو گیا۔

پھر قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "إنباء الغمر بأبناء العمر" میں ۷۷۳ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سبز ٹکڑے کے بارے میں سلطان اشرف نے حکم دیا تھا کہ وہ ایک سبز پٹی اپنے عماموں پر باندھیں تاکہ ممتاز رہیں، مصر و شام وغیرہ میں اس پر عمل کیا گیا۔

سلطان اشرف کا نام شعبان بن حسن بن ناصر محمد بن قلاوون ہے۔(۱)

میں کہتا ہوں: لباس کا یہ امتیاز ایک ایسی چیز ہے کہ بنو فاطمہ کے لیے مناسب نہیں تھا کہ وہ اسے منظور کرتے، اس پر راضی ہوتے؛ کیونکہ یہ اسلام کے قواعدِ عامہ کے خلاف ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے کسی چیز میں ممتاز نہیں رہتے تھے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آنے والا پوچھتا تھا کہ تم میں ابنِ عبد المطلب کون ہیں؟ اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا التزام کرنے والے تھے، وہ لوگوں سے - سوائے اعمالِ صالحہ کی کثرت کے - کسی اور چیز میں ممتاز رہے۔

ہاں! اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک اور خاص امتیاز سے سرفراز فرمایا ہے، وہ یہ کہ اُن پر مالِ صدقہ حرام کر دیا، یہ اُن کے اعزاز کے لیے کیا، اس لیے کہ ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق صدقہ لوگوں کا میل کچیل ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں انھیں عمل اور عطا پر ابھارنا؛ تاکہ وہ زندگی میں مثبت عمل کرنے والے بنیں، ان کا ہاتھ اوپر رہے، اس لیے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

اس طرح ان کا امتیاز اُن اعمالِ خیر کے ذریعے ہوگا، جو ان کی دنیاوی زندگی کو محیط ہوں گے، ایسے ہی ان کے اعمالِ عبادت کے ذریعے امتیاز ہوگا جس کے آثار ان کے جسم اور ان کے چہروں پر منعکس ہوں گے، اس طرح وہ لوگوں کے پیشوا بن جائیں گے اور قیادت و سیادت کے اس مقام پر پہنچ جائیں

---

(۱) المواہب اللدنیہ للقسطلانی: ۳/ ۳۷۴

گے جوان کی اصل جگہ ہے، وہ کسی ایسے لباس یا کسی ایسے طرز وانداز کے محتاج نہیں ہوں گے جو انھیں ظاہری شکل میں ممتاز کرے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

جَعَلُوا لِأَبْنَاءِ الرَّسُولِ عَلَامَةً — إِنَّ الْعَلَامَةَ شَأْنُ مَنْ لَمْ يُشْهَرِ

انھوں نے ابنائے رسول ﷺ کے لیے ایک علامت مقرر کی — علامت تو اس کی ضرورت ہے جو مشہور نہ ہو

نُورُ النُّبُوَّةِ فِي كَرِيمِ وُجُوهِهِمْ — يُغْنِي الشَّرِيفَ مِنَ الطِّرَازِ الْأَخْضَرِ (۱)

نبوت کا نور اُن کے پاکیزہ چہروں پر نمایاں ہے — جو شریف (یعنی سید) کو سبز لباس سے بے نیاز کرتا ہے

اہلِ قبیلہ کو خبردار کرنا:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”جب اللہ عزوجل نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی:

﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿٢١٤﴾﴾ {الشعراء: ۲۱۴} اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے گروہِ قریش! یا اسی قسم کا جملہ ارشاد فرمایا، پھر فرمایا: اپنی جانوں کو آگ کے بدلے خرید لو، میں تمھیں اللہ کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

اے بنی عبد مناف! میں تمھیں اللہ کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

اے بنی عباس بن عبد المطلب! میں تمھیں اللہ کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

اے صفیہ رضی اللہ عنہا؛ اے اللہ کے رسول کی پھوپھی! میں تمھیں اللہ کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

اے فاطمہ؛ محمد کی بیٹی! مجھ سے میرا مال جتنا چاہو مانگ لو، لیکن میں تمھیں اللہ کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔“(۲)

---

(۱) یہ شاعر وادیب ابو عبد اللہ ابن جابر اندلسی ہیں۔ دیکھیے حوالۂ سابقہ۔

(۲) متفق علیہ: خ: ۲۷۵۳، م: ۲۰۶

ایک اور روایت میں ہے:

''اے بنی کعب بن لؤی! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

اے بنی مرہ بن کعب! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

اے بنی عبد شمس! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

اے بنی عبدِ مناف! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

اے بنی ہاشم! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

اے بنی عبد المطلب! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

اے فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، میں تمھارے لیے اللہ کے مقابلے میں کسی چیز کا بھی مالک نہیں، سوائے اس کے کہ تم سے میرا رشتہ ہے، میں صلہ رحمی کرتا رہوں گا''۔[1]

ایک اور روایت میں ہے:

''اے گروہِ قریش! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، اس لیے کہ میں تمھارے لیے اللہ کے مقابلے میں کسی نقصان یا نفع کا مالک نہیں''۔[2]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جس کا عمل اس کو پیچھے کر دے، اس کا نسب اس کو جنت میں لے جانے میں آگے نہیں کر سکتا''۔[3]

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۰۴

(۲) ترمذی: رقم: ۳۱۸۵

(۳) مسلم: رقم: ۲۶۹۹

آٹھویں فصل

اُن لوگوں کے بیان میں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اور پہرے داری وغیرہ کا شرف حاصل کیا

رسول اللہ ﷺ کی اولاد، آپ کی ازواج اور آپ کے چچاؤں کے بارے میں جب ہم گفتگو کر چکے تو مناسب ہے کہ ہم حضور ﷺ کے خادموں اور ان جیسے دیگر افراد کا تذکرہ کریں جو رسول اللہ ﷺ سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔

جب ہم اس فصل میں ان لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت یا پہرے داری وغیرہ کا شرف حاصل کیا، تو مناسب لگتا ہے کہ ہم یہ بتاتے چلیں کہ یہاں اس طرح کی صورتِ حال کا تصور ذہن میں نہ آئے جو حکام، امراء اور اس انداز کے لوگوں کے گھروں میں پائی جاتی ہے، ان لوگوں نے چوکیداروں اور نوکروں کو ایک طرف اپنے اور عام لوگوں کے درمیان فاصلہ رکھنے، تو دوسری طرف اُن پر اپنی بڑائی ظاہر کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔

جتنے چوکیدار زیادہ ہوں گے اتنی ہی یہ چیز ایسے لوگوں کی رونق اور ان کے بلندئ مرتبہ کی دلیل ہوگی۔

ہر گز نہیں، یہاں یہ صورتِ حال بالکل نہیں ہے، یہاں جب ہم رسول اللہ ﷺ کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں تو ایک دوسری صورت سامنے ہے، جو اس کے بالکل بر خلاف ہے جو لوگوں کے ذہنوں میں جمی ہوئی ہے، یہ ایک انوکھی اور نرالی صورت ہے جس میں خادم اپنی خدمت اور چوکیدار اپنی چوکیداری پر فخر کرتا ہے۔

ہمارے سامنے ایسے خادم اور ایسے چوکیدار ہیں جو اپنے کام کے بدلے مسلمانوں کے بیت المال سے کوئی چیز نہیں لیتے اور نہ اپنی ذمے داری کے عوض حکومت کے خزانے کو گراں بار کرتے ہیں؛ یہ لوگ رضاکارانہ از خود خدمت انجام دے رہے ہیں، کسی نے ان پر یہ ذمے داری نہیں ڈالی، بلکہ ان میں سے ہر ایک نے جس کام میں شریک ہونا پسند کیا، اسے محبت واحترام سے خود ہی اختیار کیا ہے۔ اس میں

ان کا مقصد صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا، رسول اللہ ﷺ سے دعا حاصل کرنا، آپ سے قربت کی امید اور آپ کے پاس بیٹھ کر سعادت حاصل کرنا ہے۔ یہ بڑی روشن تصویر ہے جو تعلق و محبت کی بنیاد پر ہے، اس کا بدلہ آخرت کا ثواب اور دنیاوی زندگی میں روحانی سعادت کا حصول ہے۔

خدمت وچوکیداری کے مفہوم کے ذیل میں ہم مجمل طور پر ان بعض حضرات کے متعلق گفتگو کررہے ہیں جنھوں نے یہ شرف پایا۔ رضی اللہ عنہم۔

وہ حضرات جنھوں نے خدمت کا شرف پایا:

❖ ان میں حضرت انس بن مالک انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ آنے کے بعد ان کی ماں انھیں لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انھیں خادم کی حیثیت سے پیش کیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"میری ماں امِ انس رضی اللہ عنہا مجھے لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں، انھوں نے اپنی آدھی اوڑھنی مجھے ازار کی طرح پہنا رکھی تھی اور آدھی چادر کی طرح اُڑھا رکھی تھی، اور کہا: یارسول اللہ ﷺ! یہ میرا پیارا بیٹا انس ہے، میں اسے آپ کے پاس لے کر آئی ہوں تاکہ آپ کی خدمت کرے، آپ اس کے لیے دعا کر دیجیے، آپ ﷺ نے فرمایا: "اے اللہ! اس کا مال اور اولاد زیادہ کر دیجیے"۔ (۱)

انھوں نے دس سال تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی، وہ بچپن میں ہی اسلام لے آئے تھے، انھوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی اور غزوۂ بدر میں حاضر رہے؛ لیکن بدریین میں ان کا ذکر نہیں کیا جاتا، کیونکہ ان کی عمر قتال کی نہ تھی۔ (۲)

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد دمشق چلے گئے تھے، وہاں سے بصرہ گئے، وہیں سنہ ۹۳ھ میں وفات ہوئی، بصرہ میں وفات پانے والے صحابہ میں سب سے آخری ہیں۔

❖ ان ہی میں حضرت عبد اللہ بن مسعود هذلی رضی اللہ عنہ ہیں، یہ رسول اللہ ﷺ کے تکیے، مسواک،

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۴۸۱

(۲) شرح الزرقانی علی المواہب: ۲۹۶/۳

نعلین اور وضو کے منتظم تھے؛ یہ حضور ﷺ سے بالکل ملے جلے رہتے تھے۔

❖ ائمۂ صحابہ میں سے ایک ہیں، دونوں ہجرتیں کیں، غزوۂ بدر اور دوسرے غزوات میں شریک ہوئے، مدینہ منورہ میں ۳۲ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ۔

❖ اُن ہی میں حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ ہیں، سفر میں حضور ﷺ کا خچر یہی لے کر چلتے تھے۔

❖ اُن ہی میں حضرت اسلع بن شریک رضی اللہ عنہ ہیں، جو آپ ﷺ کے اونٹ کے منتظم تھے۔

❖ اُن ہی میں حضرت ایمن بن ام ایمن رضی اللہ عنہما ہیں، آپ ﷺ کی لیے پانی کا انتظام کرنے والے تھے، حنین کے دن شہید ہوئے۔

❖ اُن ہی میں حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ، آپ ﷺ کے مؤذن بھی ہیں۔

❖ ان کے علاوہ بھی بہت سے صحابۂ کرام نے حضور ﷺ کی بعض خدمات انجام دی ہیں۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ۔

رسول اللہ ﷺ کے پہرے دار:

رسول اللہ ﷺ کے ایسے چوکیدار نہیں تھے، جو مستقل طور پر چوکیداری کریں، یہ حالات کے تحت متعین مواقع پر ہی ہوا کرتی تھی، جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حالات کی نزاکت سمجھتے تھے وہ ازخود اس ذمے داری کے لیے آگے آتے تھے، بغیر اس کے کہ انھیں اس کا مکلف بنایا جائے۔

❖ اُن ہی میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما ہیں، ان دونوں نے غزوۂ بدر کے دن عریش (سائبان و چھپر) میں پہرے داری کی۔

❖ اُن ہی میں حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ ہیں، انھوں نے غزوۂ احد کے موقعے پر چوکیداری کی۔

❖ اُن ہی میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہیں، اُنھوں نے ہجرت کے بعد ایک رات پہرے داری کی۔

بخاری و مسلم کی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

''اپنے مدینہ آنے کے موقع پر ایک رات رسول اللہ ﷺ جاگ رہے تھے، آپ نے فرمایا: ''کاش میرے صحابہ میں سے کوئی نیک شخص آج رات میری چوکیداری کرتا''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ابھی یہی بات ہو ہی رہی تھی کہ اچانک ہتھیاروں کے جھنکار کی آواز آئی،

حضور ﷺ نے پوچھا: ''کون ہے؟'' جواب دیا: سعد بن ابی وقاص، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیوں آئے ہو؟'' جواب دیا: میرے دل میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں خوف پیدا ہوا، اس لیے میں چوکیداری کرنے آیا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے انھیں دعا دی، پھر سو گئے۔''[۱]

❖ اُن ہی میں حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ ہیں، انھوں نے خندق کے دن آپ ﷺ کی پہرے داری کی۔

❖ اُن ہی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ حدیبیہ کے دن رسول اللہ ﷺ کے سرہانے تلوار لے کر کھڑے تھے۔

❖ اُن ہی میں حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما ہیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایسے تھے جیسے حاکم کی طرف سے پولیس انسپکٹر ہوتا ہے۔[۲]

حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام:

یہ رسول اللہ ﷺ کے وہ غلام ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ نے آزاد کر دیا؛ لہٰذا ان کی ولاء (میراث کی ایک قسم) حضور ﷺ کے لیے رہی۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: جاننا چاہیے کہ یہ سارے موالی رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک وقت میں موجود نہیں تھے، بلکہ ان میں سے ہر شخص الگ الگ وقت میں رہا ہے۔[۳]

جس بات کی طرف توجہ مبذول کرانا مناسب ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ غلاموں کو بہت کم بہ طور غلام اپنے پاس رکھتے تھے؛ بلکہ انھیں آزاد کرنے میں جلدی کرتے تھے، بسا اوقات غلام کو خریدتے ہی اس لیے تھے کہ آزاد کریں، اس طرح وہ سارے غلام آپ کی خدمت کرنے لگتے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آزاد کیے جانے اور آزادی مل جانے کے باوجود رسول اللہ ﷺ سے دور نہیں ہوتے تھے۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۷۲۳۱، م: ۲۴۱۰۔ اس حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں۔

(۲) بخاری: رقم: ۷۱۵۵

(۳) شرح المواہب اللدنیہ: ۳/۳۰۵

ان کے متعلق ہم نے جو بات کہی ہے بطور مثال کچھ کا تذکرہ کرتے ہیں:

❖ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ: انھیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آزاد کر دیا۔

❖ أبو رافع وهبه العباس رضی الله عنه للنبی فأعتقه. ابو رافع جنہیں حضرت عباس نے آپ کو ہبہ کیا تھا پھر آپ نے اُنہیں آزاد کر دیا تھا۔

❖ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ: جو کہ قبیلۂ مذحج سے تھے، زمانۂ جاہلیت میں قید کیے گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں خرید کر آزاد کر دیا اور انھیں اختیار دیا کہ وہ اپنی قوم میں چلے جائیں یا مدینے میں رہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولاء پر قائم رہے اور سفر و حضر میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں چھوڑا۔

❖ حضرت ضمرہ بن ابو ضمرہ: یہ بھی زمانۂ جاہلیت میں قید کیے گئے تھے، انھیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر آزاد کیا۔

❖ حضرت ابو مویہبہ رضی اللہ عنہ: یہ قبیلۂ مزینہ کے تھے، انھیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر آزاد کیا۔

بعض حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی میں کچھ ایسے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے جو موالی نہیں ہیں، بطور مثال ہم ان کا بھی تذکرہ کرتے ہیں:

❖ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ: ان کا قصہ مشہور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مدینے کے سفر میں قبیلۂ کلب کے تاجروں کے ساتھ تھے، انھوں نے ان کے ساتھ زیادتی کی اور انھیں مدینے کے ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا معاملہ دیکھا تو آپ نے اُن سے کہا: ''اپنے آقا سے مکاتبت کر لو، انھوں نے ایسا ہی کیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے اس مکاتبت کی ادائیگی میں مدد کی۔

❖ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ: یہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے، انھوں نے انھیں آزاد کیا اور یہ شرط رکھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کریں گے، انھوں نے اس کو قبول کر لیا اور کہا کہ اگر آپ یہ شرط نہ بھی رکھتیں تب بھی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر نہ جاتا۔

❖ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ: یہ غلاموں کی ایک جماعت کے ساتھ طائف کے محاصرے کے دوران طائف کی شہر پناہ سے کود کر آ گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو آزاد کر دیا تھا اور ان

کا نام عُتَقَاءُ اللہ (اللہ کے آزاد کردہ) رکھا۔[۱]

ہم اس موضوع پر جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ غلام جن کی ذمے داری حضور ﷺ کے سر آئی، وہ حضور ﷺ کے پاس دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے پہنچے:

- یا تو خریدنے سے؛ رسول اللہ ﷺ اس لیے خریدتے تھے تاکہ آزاد کریں، آپ انھیں بہ طور غلام اپنے پاس رکھنے کے لیے نہیں خریدتے تھے۔
- یا ہبہ کے طریقے سے، جنھیں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم پیش کرتے تھے، یہ بھی آزاد کر دیے جاتے تھے۔ ہمارے سامنے ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، غلام کے طور پر محفوظ رکھا ہو اور اس کا بھی تذکرہ نہیں ملتا کہ ان کے رہنے کے لیے کوئی مستقل جگہ تھی جہاں وہ نبی ﷺ کے قریب رہا کرتے ہوں، جبکہ غلام کے مالک پر واجب ہے کہ وہ ان کے لیے سکونت کا انتظام کرے، نیز ہم کوئی ایسی نص بھی نہیں پاتے جو اس بات پر دلالت کرے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن بھی وہ کام کیا ہو جو غلاموں کے مالک کیا کرتے ہیں یعنی ان کی آمدنی سے رقم کی وصولی اور کسی متعین آمدنی پر اتفاق جسے وہ حضور ﷺ کو ادا کرتے رہیں اور اپنی سکونت و زندگی گزارنے میں آزاد رہیں۔

رہے وہ غلام جو خمس پر متعین تھے اور صدقے کے اونٹ چرانے پر مقرر تھے یا اسی قسم کے دوسرے کام کرتے تھے وہ رسول اللہ ﷺ کے ذاتی غلام نہیں تھے، بلکہ وہ صدقہ اور خمس ہی کے لیے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے کاتبین:

قرآنِ کریم کی جب کوئی آیت نازل ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس کے لکھنے کا حکم دیتے تھے، یہ سلسلہ نزولِ وحی کے آغاز کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ شروع کے مسلمان یہ لکھے ہوئے اوراق خاموشی سے ایک دوسرے کو دے دیتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ منتقل ہوئے تو معاملات، معاہدے اور بادشاہوں و امرا وغیرہ کے خطوط لکھنے کی ضرورت پڑی، اس اہم کام کی انجام دہی میں کئی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم لگے ہوئے تھے، جن میں حضرات ابو بکر، عمر، عثمان، علی، زبیر، عامر بن فہیرہ، عمرو بن العاص، ابی بن کعب، عبد اللہ بن ارقم، ثابت بن قیس، حنظلہ بن ربیع، مغیرہ بن شعبہ، عبد اللہ بن رواحہ، خالد بن ولید، خالد بن سعید بن العاص اور معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

---

(۱) اس موضوع پر دیکھیے: البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۵/ ۲۲۵-۳۱۱، زاد المعاد: ۱/ ۱۱۶-۱۱۴

اس معاملے میں سب سے خاص اور التزاماً اس کو انجام دینے والے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے۔ (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چار افراد نے اذان دی؛ دو نے مدینے میں، ایک نے مکے میں اور ایک نے قباء میں اور وہ یہ ہیں:

❖ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ: یہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اذان دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انھوں نے خلفاء میں سے کسی کے لیے اذان نہیں دی۔ جب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لے گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اس موقع پر اذان دینے کے لیے کہا؛ چنانچہ انھوں نے اذان دی۔

حضرت اسلم، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس دن سے زیادہ کسی اور دن روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (۲)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وفات دمشق میں ۱۸ سنہ ھ میں ہوئی۔ (۳)

❖ حضرت عمرو بن ام مکتوم القرشی رضی اللہ عنہ: انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مدینہ ہجرت کی تھی۔

❖ مکے میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے اذان دی تھی، ان کا نام اوس بن مغیرہ جُمَحی ہے، فتح مکہ کے موقعے پر انھوں نے یہ ذمے داری سنبھالی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اذان کی تلقین کی تھی اور سکھائی تھی، یہ اپنی وفات تک مکے میں اذان دیتے رہے، ان کے بعد حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ اذان دینے لگے۔ (۴)

❖ قباء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حضرت سعد القرظي رضی اللہ عنہ نے اذان دی تھی جو حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے غلام تھے۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۵/۳۳۹، زاد المعاد: ۱/۱۱۷

(۲) المواہب اللدنیہ: ۲/۱۶۰

(۳) فتح الباری: ۷/۹۹

(۴) شرح الزرقاني علی المواہب: ۳/۳۷۱

خطبا و شعراء:

حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطیب تھے، غزوۂ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے، خلافتِ صدیقی میں جنگِ یمامہ میں شہید ہوگئے۔(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شعراء جو اسلام کی طرف سے دفاع کرتے تھے، یہ ہیں:

حضرت کعب بن مالک، حضرت عبد اللہ بن رواحہ، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم۔

ان میں سب سے سخت حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے، مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قریش کی ہجو کرو، اس لیے کہ ہجو اُن پر تیر کی باڑھ سے زیادہ سخت ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہی پیغام دے کر حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا، انھوں نے ہجو کی، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں آئی، پھر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس پیغام بھیجا، اس کے بعد یہی پیغام حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس بھی بھیجا، جب حضرت حسان رضی اللہ عنہ آگئے تو کہنے لگے: اب وقت آگیا ہے کہ آپ لوگ اس شیر (۲) کو آزاد چھوڑ دیں جو اپنی دُم (۳) سے مارنے والا ہے، پھر اپنی زبان نکالی اور حرکت دینے لگے؛ پھر کہا: اُس ذات کی قسم! جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اپنی زبان سے ان کی کھال اِس طرح کھینچوں گا جس طرح چمڑا ادھیڑا جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابھی جلدی نہ کرو، ابو بکر قریش کے نسب کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں اور میرا نسب بھی اُن ہی میں سے ہے، ان کے پاس جاؤ تاکہ وہ میرے نسب کا خلاصہ کردیں"؛ چنانچہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اُن کے پاس گئے، پھر واپس آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ کے نسب کا خلاصہ کردیا ہے، اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں آپ کو ان میں سے اس طرح نکال لوں گا جس طرح آٹے میں سے بال نکالا جاتا ہے۔ حضرت

---

(۱) اسد الغابہ: ۱/ ۲۷۵

(۲) شیر سے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے خود کو مراد لیا ہے۔ (از مصحح)

(۳) حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اپنی زبان کو "دُم" کے ساتھ تشبیہ دی، کیونکہ جس طرح شیر حملے کے وقت اپنی دُم کو حرکت دیتا ہے اسی طرح انسان اپنے دفاع کے لیے زبان کا استعمال کرتا ہے۔ (از مصحح)

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے متعلق فرماتے ہوئے سنا کہ: ”بے شک روح القدس تمھاری برابر مدد کرتے رہیں گے جب تک تم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دفاع کرتے رہو گے“۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا؛ آپ فرما رہے تھے: ”حسانؓ نے ان کی ہجو کی اور ”فَشَفٰی وَاشْتَفٰی“ مؤمنوں کے کلیجے ٹھنڈے کر دیے اور خود بھی سکون پا گئے۔“ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حُدی خواں اور رجز پڑھنے والے:

یہ وہ لوگ ہیں جو سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے حُدی پڑھتے ہوئے چلتے تھے:

- اُن میں حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہیں، جو عمرۃ القضاء میں مکے میں داخل ہوتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے رجز پڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔
- اُن ہی میں حضرت عامر بن اکوع رضی اللہ عنہ ہیں، یہ غزوۂ خیبر میں حُدی خواں (رجز پڑھ رہے) تھے اور اسی غزوے میں شہید ہوئے۔ [2]
- اُن ہی میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ ہیں، وہ خیبر سے واپسی میں حُدی خواں تھے۔ [3]
- اُن ہی میں حضرت انجشہ رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«كَانَ لِلنَّبِيِّ ﷺ حَادٍ يُقَالُ لَهُ أَنْجَشَةُ، وَكَانَ حَسَنَ الصَّوْتِ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ : رُوَيْدَكَ يَا أَنْجَشَةُ، لَا تَكْسِرِ الْقَوَارِيرَ» [4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حُدی خواں تھے، ان کو انجشہ کہا جاتا تھا، بہت اچھی آواز والے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے انجشہ! آہستہ آہستہ، اِن آبگینوں کو توڑ نہ ڈالنا“۔

---

(١) مسلم: رقم: ٢٤٩٠

(٢) متفق علیہ: خ: ٤١٩٦، م: ١٨٠٢

(٣) مسلم: رقم: ١٨٠٢

(٤) متفق علیہ: خ: ٦٢١١، م: ٢٣٢٣

دوسرا مقصد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف

اور آپ کی شکل وصورت

پہلی فصل

رسول اللہ ﷺ کی کمالِ خلقت اور جمالِ صورت کا بیان

شمائل تحریر کرنے والوں کی عادت ہے کہ وہ اپنی گفتگو، رسول اللہ ﷺ کے اوصاف سے شروع کرتے ہیں اور ان ہی اوصاف کے ذریعے آپ کی صورت کی منظر کشی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم بھی اسی بات کو پسند کرتے ہیں کہ لوگوں کی اس عام روش سے نہ نکلیں، لیکن ہم بحث کے اس میدان کو مختصر ہی رکھیں گے اور اتنی ہی مقدار پر اکتفا کریں گے جتنا بہت ضروری ہے اور اسے احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں بیان کریں گے۔

حضور ﷺ کے اوصاف بیان کرنے والوں کی قلت:

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ بڑی تعداد میں احادیث کے راوی ہیں، مگر جب ہم اس موضوع کو بیان کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ وہ لوگ جو اوصافِ نبی بیان کرتے ہیں کم ہیں، ہم اسے متعدد اسباب کی طرف لوٹا سکتے ہیں:

- ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اس قول اور فعل کو نقل کرنے کی طرف متوجہ رہے جو کسی حکمِ شرعی سے مربوط ہو، ان میں سے کوئی چیز رسول اللہ ﷺ کے اوصاف سے متعلق نہیں، اسی وجہ سے اس پہلو کی طرف ان کا اہتمام نہیں رہا اور یہ کر کے وہ کرتے بھی کیا؟ جبکہ رسول اللہ ﷺ اُن کے درمیان موجود تھے، ان میں سے ہر ایک جب چاہتا آپ کو دیکھ لیتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے یہاں اوصافِ نبوی بیان کرنا بذاتِ خود مقصود نہیں، وہ کسی حدیث کے ضمن میں اسے پیش کر دیتے ہیں، ہم کوئی ایسی صحیح حدیث نہیں پاتے جو اس غرض کو پورے طور پر ادا کر دے اور وہ کسی ایک صحابی نے روایت کی ہو، بلکہ اس طرح کی بہت سی حدیثیں ہیں جن میں ایک دو جملے آ گئے ہیں۔

- ان ہی میں ایک سبب وہ ہیبت بھی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے تئیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نفوس

میں جا گزیں تھی۔ جگہ کے اعتبار سے وہ حضور ﷺ کے بہت قریب تھے؛ لیکن ہیبت کا فاصلہ ان کو حضور ﷺ سے روکے رکھتا تھا، یہی وہ معاملہ ہے جو اوصاف کے بیان کرنے کی مہم -جیسی چاہیے تھی- اس میں حائل ہو گیا۔

اس حقیقت کی تفصیل حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہمارے سامنے اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا اور میری آنکھوں میں آپ سے زیادہ کوئی جلالتِ شان والا بھی نہیں تھا، آپ ﷺ کے جلال کی وجہ سے میرے اندر طاقت نہیں تھی کہ میں آنکھیں بھر کر آپ کو دیکھ سکوں۔ اگر مجھ سے حضور ﷺ کا حلیہ دریافت کیا جائے تو مجھ میں اس کی طاقت نہیں ہے، اس لیے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو آنکھیں بھر کر دیکھ ہی نہیں پاتا تھا اور یہی ہر صحابیٔ رسول کی حالت تھی۔''(۱)

➢ ایک سبب اوصاف بیان کرنے کی مشکلات تھیں، اس لیے کہ کسی بھی لفظ کی وہ انتہائی حد جہاں تک اس کا کہنے والا پہنچ سکتا ہے وہ بھی اس بات پر قادر نہیں کہ سوائے مجمل اوصاف کے جسمِ انسانی کی پوری کیفیت بیان کر دے، کیونکہ اجسام کے درمیان تفاوت ہوتا ہے، ہم اس کی ایک مثال بیان کرتے ہیں:

تین لفظ ہیں: طویل، قصیر اور متوسط۔ ہم طویل کا تذکرہ کرتے تو ہیں، لیکن طویل بذاتِ خود کئی طرح کا ہوتا ہے، ایسے ہی قصیر اور متوسط بھی۔

اسی طرح سفید رنگ ہے، دونوں آنکھوں کا سرگیں ہونا ہے، چہرے کا گول ہونا ہے، ان سارے اوصاف کی کیفیت بیان کرنے کے لیے کوئی دقیق معیار نہیں۔

چونکہ الفاظ اس پہلو سے پورا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں، اسی لیے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم (آپ ﷺ کی) صورت کا وصف، (دوسرے کی) صورت سے بیان کرنے پر مجبور ہوئے، چنانچہ جب حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا حلیہ بیان کرنے کا ارادہ کیا- جب ان سے سوال کیا گیا- تو وہ کہنے لگے:

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۲۱

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَكَانَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يُشْبِهُهُ»(۱). میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے، حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما، حضور ﷺ کے مشابہ ہیں۔

جو لوگ تابعین کی نسل کے تھے اور حضور ﷺ کی شکل و صورت کو جاننا چاہتے تھے ان کے لیے حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ انداز خوب بلیغ ہے۔

حضور ﷺ کے اوصاف بیان کرنے کی ضرورت:

جماعتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے رسول اللہ ﷺ کا حلیہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ حضور ﷺ اُن کے درمیان موجود تھے اور حجۃ الوداع، جس کا اعلان رسول اللہ ﷺ کی طرف سے پہلے ہی ہو چکا تھا کہ لوگ اس میں شرکت کریں، اس نے ان تمام مسلمانوں کو جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو اب تک نہیں دیکھا تھا، دیکھنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اسی حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو الوداعی کلمات کہے، پھر رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی اور تابعین کی نسل آ گئی، وہ لوگ ایسی فضا میں جی رہے تھے جو انھیں آپ ﷺ سے مربوط کیے ہوئے تھی، نماز، روزہ، آدابِ اکل و شرب، داخلۂ مسجد اور زندگی کی ہر چیز، خواہ وہ عبادت ہو یا عادت۔

اس جماعت کے لوگ رسول اللہ ﷺ کو جسمانی طور پر بھی جاننے کے خواہش مند تھے، وہ آپ ﷺ کے اخلاق و سلوک اور اسوہ (قابلِ تقلید زندگی و نمونے) سے تو واقف تھے ہی، لہٰذا سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اپنی طلب رکھیں، کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا، آپ ﷺ کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ ان حضرات نے تابعین کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی صورتِ مبارکہ کے نقوش بیان کیے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس قسم کے سوالات برابر ہوتے رہتے تھے، جیسا کہ حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے پتہ چلتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی صورتِ مبارکہ اور جسمانی کیفیت معلوم کرنے پر ابھارنے والا وہی جذبۂ محبت تھا، جو امتِ مسلمہ کے نفوس میں نسلاً بعد نسلٍ مسلسل پیوست (چلا آتا) ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۵۴۳، ۳۵۴۴، م: ۲۳۴۳

بات خود معلوم تھی کہ امت میں ایسا ہوگا اور امت کو آپ کے دیدار کا اشتیاق ہوگا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

«وَلَيَأْتِيَنَّ عَلَى أَحَدِكُمْ زَمَانٌ، لَأَنْ يَرَانِي أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ أَنْ يَكُونَ لَهُ مِثْلُ أَهْلِهِ وَمَالِهِ»(۱).

ضرور بالضرور تم میں سے کسی پر ایسا زمانہ آئے گا کہ میرا دیدار اس کے نزدیک اپنے مال اور اہل وعیال کی قیمت پر بھی محبوب ہوگا۔

دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

«مِنْ أَشَدِّ أُمَّتِي لِي حُبًّا، نَاسٌ يَكُونُونَ بَعْدِي، يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ رَآنِي بِأَهْلِهِ وَمَالِهِ»(۲).

میری امت میں مجھ سے شدید محبت کرنے والے ایسے لوگ بھی ہوں گے، جو میرے بعد ہوں گے، ان میں سے ایک یہ چاہے گا کہ کاش اپنے اہل اور مال کے بدلے مجھے دیکھ لیتا۔

صحابۂ کرام نے حضور ﷺ کے جسمانی اوصاف کبھی مجملاً بیان کیے، تو کبھی بعض جزئیات تفصیلاً بیان کیں۔

سچ ہے: ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے بعض بندوں پر ہر نسل میں یہ انعام رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنے کا موقع عنایت فرمایا: یہ دیدار بھی دیدارِ حقیقی ہی ہے جیسا کہ حدیث میں وراد ہوا ہے؛ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَخَيَّلُ بِي»(۳).

جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے حقیقتاً مجھے ہی دیکھا؛ کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۵۸۹، م: ۳۴۶۴۔ (مسلم شریف میں حدیث کا نمبر ۳۴۶۴ نہیں ہے۔ صحیح نمبر ۲۳۶۴ ہے۔ از مصحح)
(۲) مسلم: رقم: ۲۸۳۲
(۳) بخاری: رقم: ۲۵۵۲

روایاتِ صحیحہ میں رسول اللہ ﷺ کے اوصاف:

اس سلسلہ میں ہم صرف ان احادیث پر اکتفا کریں گے جو رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کے بیان میں وارد ہوئی ہیں، کیونکہ ان کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں وارد روایات، صحیحین کی روایات سے الگ نہیں۔ سب سے پہلے ترمذی نے اپنی شمائل میں اس قسم کی احادیث بیان کی ہیں، اس کی صحیح روایتیں لفظ یا معنی میں وہی ہیں جو صحیحین میں آئی ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ وہ کہتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ درمیانہ قد تھے، دونوں کندھوں کے درمیان کچھ دوری تھی۔ (1). آپ کے بال آپ کے دونوں کانوں کی لو تک پہنچتے تھے، میں نے آپ کو سرخ جوڑے میں دیکھا تھا، میں نے آپ سے زیادہ کوئی حسین نہیں دیکھا"۔

ایک اور روایت میں ہے:

"رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ حسین چہرے والے تھے، ان میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والے تھے، آپ نہ بہت زیادہ لمبے تھے اور نہ پستہ قد"۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

"میں نے کسی ایسے شخص کو جس کے بال کانوں سے متجاوز ہو کر کندھوں تک پہنچ رہے ہوں سرخ جوڑے میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا، آپ کے بال مونڈھوں پر آرہے تھے"۔

ایک روایت میں ہے:

"حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کا چہرہ تلوار کی طرح تھا؟ جواب دیا نہیں؛ بلکہ چاند کی طرح تھا"۔ (2).

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

(۱) جس سے سینۂ مبارک کا چوڑا ہونا بھی معلوم ہو گیا۔ (خصائلِ ترمذی: ۲۲) (از مترجم)

(۲) متفق علیہ: خ: ۳۵۴۹، ۳۵۵۱، ۳۵۵۲، م: ۲۳۳۷

”رسول اللہ ﷺ نہ بہت لمبے قد کے تھے نہ بہت پست قد اور رنگ کے اعتبار سے نہ چونے کی طرح بالکل سفید تھے نہ گندم گوں (بالکل سانولے)۔ رسول اللہ ﷺ کے بال نہ بالکل سیدھے تھے نہ بالکل پیچ دار“۔ (بلکہ ہلکی سی پیچیدگی اور گھنگریالا پن تھا۔)

ایک روایت میں ہے:

”رسول اللہ ﷺ کے دونوں ہاتھ اور دونوں قدم موٹے (پُر گوشت) تھے، آپ خوب صورت چہرے والے تھے، میں نے آپ سے پہلے اور آپ کے بعد آپ جیسا کسی کو نہیں دیکھا اور آپ کی دونوں ہتھیلیاں چوڑی تھیں“۔ (۱)

حضرت ابو طفیل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”رسول اللہ ﷺ گورے، ملیح (جاذب صورت، خوب رُو) اور درمیانی قد و قامت کے تھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ گورے رنگ کے، ملیح چہرے والے تھے“۔ (۲)

امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت سماک بن حرب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں:

«سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ سَمُرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ: «كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَلِيعَ الْفَمِ، أَشْكَلَ الْعَيْنِ مَنْهُوسَ الْعَقِبَيْنِ»، قَالَ: قُلْتُ لِسِمَاكٍ: مَا ضَلِيعُ الْفَمِ؟ قَالَ: «عَظِيمُ الْفَمِ»، قَالَ قُلْتُ: مَا أَشْكَلُ الْعَيْنِ؟ قَالَ: «طَوِيلُ شَقِّ الْعَيْنِ»، قَالَ: قُلْتُ: مَا مَنْهُوسُ الْعَقِبِ؟ قَالَ: «قَلِيلُ لَحْمِ الْعَقِبِ»» (۳)

میں نے حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے سنا؛ وہ کہہ رہے تھے: رسول اللہ ﷺ ضلیع الفم تھے، اشکل العین تھے، منہوس العقبین تھے۔ میں نے سماک رضی اللہ عنہ سے کہا: ضلیع الفم کا کیا مطلب؟ جواب دیا: فراخ دہن والے، میں نے پوچھا: اشکل العین کا کیا مطلب؟ جواب دیا: بڑی آنکھوں والے (۴)، میں پوچھا: منہوس العقب کا کیا مطلب؟ جواب دیا: ایڑی میں گوشت کم تھا“۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۵۹۰۰، ۵۹۰۷، م: ۲۳۴۷

(۲) مسلم: رقم: ۲۳۴۰

(۳) مسلم: رقم: ۲۳۳۹

(۴) حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: حضرت سماک بن حرب رضی اللہ عنہ نے ”أَشْكَلُ الْعَيْنِ“ کا ترجمہ ”طَوِيلُ شَقِّ الْعَيْنِ“ کیا ہے، جبکہ اس لفظ کا صحیح ترجمہ ”اَلْحُمْرَةُ فِي بَيَاضِ الْعَيْنِ“ ہے یعنی سفید سرخی مائل، اسی کو خمار آلود شربتی اور مخمور آنکھ کہا جاتا ہے۔ (خصائلِ نبوی: ص: ۳۹) (از مترجم)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛وہ کہتے ہیں کہ:
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے اگلے حصہ اور داڑھی کے سیاہ بالوں میں کچھ سفید بال آگئے تھے،جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیل لگاتے تھے تو بالوں کی سفیدی ظاہر نہیں ہوتی تھی اور جب آپ کے سر کے بال پراگندہ ہوتے تو بالوں کی سفیدی ظاہر ہونے لگتی،آپ کی داڑھی گھنی تھی۔ایک شخص نے عرض کیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تلوار کی طرح تھا؟جواب دیا: نہیں؛بلکہ سورج اور چاند کی طرح تھا اور آپ کا چہرہ گول تھا، میں نے مہرِ نبوت کو آپ کے مونڈھے پر کبوتر کے انڈے کی طرح دیکھا جو آپ کے جسمِ مبارک کے مشابہ تھی"۔(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛وہ کہتے ہیں:
"میں نے کوئی ریشم اور دیباج آپ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم نہیں چھوا، نہ میں نے کوئی خوشبو یا کوئی مہک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو اور مہک سے زیادہ خوشبودار سونگھی"۔

ایک روایت میں ہے:
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھلے رنگ والے تھے،آپ کا پسینہ صفائی اور سفیدی میں موتی کی طرح تھا، جب چلتے تو آگے کی طرف جھک کر چلتے تھے"۔(۲)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بچپن میں ان کے رخسار پر اپنا دستِ مبارک پھیرا تھا، وہ کہتے ہیں: میں نے اس کی ٹھنڈک یا مہک ایسے محسوس کی تھی کہ جیسے آپ نے اپنا دستِ مبارک عطار کی شیشی (کُپّی) میں سے نکالا ہو"۔(۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالِ صورت:

ساری روایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمالِ خلقت اور جمالِ صورت کے سلسلے میں متفق ہیں،سب روایتیں دو باتیں ثابت کر رہی ہیں؛اعتدال و توسط اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے اعضاء کا

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۳۴۴
(۲) متفق علیہ: خ: ۳۵۶۱،م: ۲۳۳۰
(۳) مسلم: رقم: ۲۳۲۹

متناسب ہونا، یہ بات سابقہ روایات سے واضح ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ لمبے ہونے کے اعتبار سے بھی متوسط تھے کہ آپ بہت زیادہ لمبے (جو عیب میں داخل ہو جاتا ہے) نہیں تھے اور پستہ قد بھی نہیں تھے۔

رنگ کے اعتبار سے آپ کا رنگ بھی متوسط تھا، چنانچہ آپ ﷺ چونے کی طرح سفید نہیں تھے اور نہ گندم گوں (سانولے) رنگ کے تھے؛ بلکہ آپ کھلے اور روشن رنگ کے تھے۔

آپ ﷺ کے بال بھی متوسط تھے؛ نہ بہت زیادہ گھنگریالے اور نہ بالکل سیدھے۔

خوب صورتی اور جمال اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک جسم کے اعضاء کے درمیان تناسب نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے اوصاف میں آئی ہوئی ساری روایات اس بات کو پوری قوت سے ثابت کر رہی ہیں کہ آپ ﷺ کے سارے اعضاء متناسب تھے۔

جن روایتوں میں دونوں کندھوں کے درمیان کچھ دوری، دونوں ہاتھوں اور دونوں قدموں کا موٹا ہونا یا اس سے ملتے جلتے الفاظ آئے ہیں، وہ جسم میں کسی خلل کی طرف اشارہ نہیں ہے؛ بلکہ ان سے بھی دوسری روایات کی طرح اعضاء کے متناسب ہونے کا ہی اظہار ہے۔ (۱)

خلاصہ یہ کہ آپ ﷺ جسم کے طول کے اعتبار سے متوسط تھے اور دبلے اور موٹے ہونے کے اعتبار سے بھی متوسط تھے، گویا تمام روایتیں بتاتی ہیں کہ آپ کا جسمِ مبارک بھرا ہوا اور صحت مند تھا، موٹاپے کے درجے کو پہنچا ہوا نہیں تھا۔

---

(۱) دونوں کندھوں کے درمیان تھوڑی دوری، سینے کے چوڑے ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ ''خصائلِ نبوی'' (ص: ۲۲) کے حوالے سے گزرا۔ دونوں ہاتھوں اور دونوں قدموں کا موٹا ہونا، ان کے پُر گوشت ہونے کی طرف اشارہ ہے، یہ صفات مردوں کے لیے قوت اور شجاعت کی علامت اور عورتوں کے لیے مذموم ہیں۔ (خصائلِ نبوی: ص: ۲۵) (از مترجم)

دوسری فصل

رسول اللہ ﷺ کا وقار اور ہیئت وصورت

تمہید:

صرف جسم اور اعضاء کا بیان واقع اور حقیقت کی تصویر کشی کے لیے کافی نہیں ہے؛ کیونکہ ملاحت (کشش) اور جمال اُسی وقت ظاہر ہوتے ہیں جب جسم کے اعضا اور ان کے کار منصبی و عمل کے درمیان ہم آہنگی اور تناسب پایا جائے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی چال بتانا چاہا تو فرمایا:

«فَأَقْبَلَتْ فَاطِمَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا تَمْشِي، وَاللهِ مَا تَخْفَى مِشْيَتُهَا مِنْ مِشْيَةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ»[1].

پھر فاطمہ رضی اللہ عنہا چلتی ہوئی آئیں، واللہ! ان کی چال رسول اللہ ﷺ کی چال سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ (یعنی مماثلت بالکل ظاہر تھی)۔

چنانچہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی چال جانتے تھے وہ اس وصف کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی چال کے وقار اور سنجیدگی کی کیفیت کو سمجھ سکتے تھے۔

اس لیے ہم اس فصل میں رسول اللہ ﷺ کے وقار و سنجیدگی اور آپ ﷺ کے وقار اور ہیئت وصورت کے اس پہلو کو درج ذیل امور کی روشنی میں مکمل کرنا چاہتے ہیں:

ہیبت:

لغت میں ہیبت کے دو معنیٰ ہیں: تعظیم اور خوف۔

جب ہیبت پہلے معنیٰ میں ہو تو اس کا باعث محبت، عزت اور احترام ہوتا ہے اور دوسرے معنیٰ میں ہو تو اس کا باعث ڈر ہوتا ہے۔ بعض ظالم (اسی ڈر کو حصار بنا کر) اپنے گرد مصنوعی گھیرابندی کیے رہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ معنیٔ اول کے اعتبار سے ہیبت رکھتے تھے جیسا کہ فصلِ سابق میں حضرتِ عمرو

---

(۱) بخاری: رقم: ۶۲۸۵، ۶۲۸۶

بن العاص رضی اللہ عنہ کے حوالے سے گزر چکا ہے۔

بہت سی حدیثیں اس معنی و مفہوم کو ثابت کرتی ہیں:

❖ ”ایک دن رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو صدقہ کا حکم دیا تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا پوچھنے آئیں کہ اگر وہ اپنا صدقہ اپنے شوہر کو دے دیں تو کیا صدقہ ادا ہو جائے گا؟ وہ رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر کھڑی ہو گئیں اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ ان کی طرف سے پوچھ لیں، وہ کہتی ہیں کہ (وہ خود اس لیے نہ پوچھ سکیں کہ) رسول اللہ ﷺ بہت پُر ہیبت لگ رہے تھے“۔[1]

❖ ایک مرتبہ حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہے تھے، وہ کہتے ہیں:

”میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی، ”اے ابو مسعود! جان لو کہ اللہ تم پر اس سے زیادہ قادر ہے جتنا تم اپنے اس غلام پر قادر ہو“۔ وہ کہتے ہیں کہ غصہ کی وجہ سے میں سمجھ نہ سکا کہ کس کی آواز ہے؟ پھر جب آپ ﷺ مجھ سے قریب ہوئے اور وہی جملہ آپ نے دہرایا تو میں اُدھر متوجہ ہوا؛ دیکھا تو رسول اللہ ﷺ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ آپ کی ہیبت سے کوڑا میرے ہاتھ سے گر گیا اور میں نے کہا: اللہ کی رضا کے لیے یہ آزاد ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمھیں جھلسا دیتی“۔[2]

❖ حضرت ذوالیدین رضی اللہ عنہ کی حدیث جو نماز میں سہو سے متعلق ہے، اس میں ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی، پھر دو رکعت پر سلام پھیر دیا اور مسجد میں ایک لکڑی رکھی ہوئی تھی اس کی طرف بڑھے اور اس سے ٹیک لگالی، لوگ کہتے ہوئے نکلے کہ نماز کم کر دی گئی ہے، ان میں حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے، مارے ہیبت کے یہ دونوں آپ سے بات نہ کر سکے، پھر حضرت ذوالیدین رضی اللہ عنہ نے آپ سے بات کی۔“[3]

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ جو حضور ﷺ سے قریب ترین تھے

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۱۴۶۶، م: ۱۰۰۰

(۲) مسلم: رقم: ۱۶۵۹

(۳) متفق علیہ: خ: ۴۸۲، م: ۵۷۳

آپ سے اور بھی ہیبت کھاتے تھے۔

لیکن یہ ہیبت جو محبت، عزت اور احترام کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی، اس بات میں مانع نہیں تھی کہ لوگ آپ سے گفتگو کریں، آپ سے قریب ہوں، خاص طور پر ازواجِ مطہرات کا معاملہ یہی تھا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اس سلسلے میں بتاتے ہیں:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت طلب کی، اس وقت آپ کے پاس قریش کی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، آپ سے بات کر رہی تھیں، اور زیادہ کا مطالبہ کر رہی تھیں، بلند آواز میں بول رہی تھیں۔[1] جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی تو کھڑی ہو گئیں اور جلدی سے پردے میں چلی گئیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آنے کی اجازت دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس رہے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! آپ کو اللہ ساری عمر ہنستا رکھے (آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ان عورتوں پر تعجب ہو رہا ہے، یہ سب میرے پاس تھیں؛ جب تمھاری آواز سنی تو جلدی سے پردے میں چلی گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کے رسول! آپ زیادہ حقدار تھے کہ یہ آپ سے ڈرتیں؛ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اپنے آپ کی دشمنو! مجھ سے ڈرتی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالمقابل کلام اور مزاج میں سخت[2] ہو۔''[3]

عورتوں کا یہ جملہ: ''تم کلام اور مزاج میں سخت ہو''، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں دوسرے معنی والی کچھ ہیبت پائی جاتی تھی، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت معنیٔ اول کے دائرے میں تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال اور رفتار:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال ایسے شخص کی چال کی طرح تھی جو زندگی اور نشاط سے بھرپور ہو، اس

---

(۱) یہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قریشی بیویاں تھیں، زیادہ کا مطالبہ کرنے سے مراد، ان کو جو نفقہ ملتا تھا وہ اس سے زیادہ کی طلبگار تھیں۔

(۲) ان عورتوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے أَفَظّ اور أَغْلَظ کے الفاظ استعمال کیے جو کہ اگرچہ اسم تفضیل کے صیغے ہیں، لیکن اپنے حقیقی معنی میں نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ فَظّ تھے نہ غَلِیظ۔ یعنی کلام اور مزاج میں سخت نہیں تھے۔

(۳) متفق علیہ: خ: ۳۲۹۴، م: ۲۳۹۶

لیے کچھ معتدل تیزی لیے ہوئے ہوتی تھی جیسا کہ بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''رسول اللہ ﷺ جب چلتے تھے تو آگے کو کچھ جھک کر چلتے تھے''۔[۱]

ابوداؤد میں حضرت لقلیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''وہ نبی ﷺ کو تلاش کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے، وہاں آپ کو نہ پایا؛ لیکن ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے، آگے کی طرف توازن کی چال چلتے ہوئے، کچھ جھکے ہوئے''۔[۲]

ترمذی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے:

''رسول اللہ ﷺ جب چلتے تو آگے کی طرف کچھ جھک کر چلتے تھے جیسے کسی اونچی جگہ سے نیچے کی طرف اتر رہے ہوں''۔[۳]

حضرت ابو طفیل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''رسول اللہ ﷺ جب چلتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ بلندی سے اتر رہے ہوں''۔[۴]

یہ اور اس طرح کی نصوص ہمارے لیے درج ذیل امور ثابت کرتے ہیں:

۱۔ قوت، نشاط اور کچھ تیزی، یہ بات حدیث میں منقول الفاظ: «كَأَنَّمَا انْحَطَّ مِنْ صَبَبٍ» (جیسے کسی اونچی جگہ سے نیچے کی طرف اتر رہے ہوں) سے سمجھ میں آتی ہے، اس لیے کہ جو بلندی سے نیچے کی طرف اترے گا اس کی یہی صفت ہوگی۔

۲۔ توازن کے ساتھ آگے کو جھکتے ہوئے یعنی چال میں قوت اور زمین سے قدم اٹھا کر چلنا۔

۳۔ آپ ﷺ اپنے قدم کو زمین سے اٹھاتے، پھر رکھتے تھے، قدموں کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے نہیں چلتے تھے، یہ حدیث کے لفظ: «يَتَكَفَّأُ» (آگے کی طرف کچھ جھک کر چلتے

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۳۳۰

(۲) ابوداؤد: رقم: ۱۴۳

(۳) ترمذی: رقم: ۳۶۳۷

(۴) ابوداؤد: رقم: ۴۸۶۴

تھے) کی تفسیر ہے۔

یہ چال دو چالوں کے درمیان تھی، نہ اس میں مردنی اور کمزوری ہوتی تھی، نہ بے چینی اور گھبراہٹ کے ساتھ چلنا اور نہ ہی غرور اور تکبر کی چال۔

یہی وہ چال ہے جو قرآن میں «عِبَادُ الرَّحْمٰنِ» (اللہ کے بندوں) کی چال بتائی گئی ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ {الفرقان: 63}	اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر بالکل نرم چال چلتے ہیں۔

سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اللہ کے بندے زمین پر سہولت کے ساتھ وقار کی چال چلتے ہیں، اس میں تکلف اور تصنع نہیں ہوتا، اس میں اکڑ اور تصنع نہیں پایا جاتا، اس میں غرور سے رخسار کو پھلانا بھی نہیں ہوتا، نہ سستی اور ڈھیلا پن ہوتا ہے؛ کیونکہ چال دوسری تمام حرکات کی مانند شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے، ان کے اندر دبے جذبات کا اظہار ہوتی ہے اور مستقیم و مطمئن اور حق و راستی پر چلنے والا نفس جو اُن میں پایا جاتا ہے، اس کی تعبیر ہوتی ہے۔ یہ ساری صفات اس چال کے چلنے والے پر بطور خلعت مزین معلوم ہوتی ہیں، وہ اطمینان و راستی کی چال چلتا ہے، حق کا طلبگار لگتا ہے، اس میں وقار اور سکینہ ہوتا ہے، اس میں قوت و طاقت نظر آتی ہے، ﴿يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مری مری چال چلیں؛ سروں کو جھکائے ہوئے، ایسا لگے جیسے اعضا ٹوٹ کر گرنے ہی والے ہیں، جسم کی عمارت ڈھانے ہی والی ہے، جیسا کہ بعض وہ لوگ سمجھتے ہیں جو تقویٰ اور صلاح کا اظہار کرنا چاہتے ہیں''۔[۱]

اسی آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

''یعنی سکینہ اور وقار کے ساتھ، نہ ایسا لگے کہ زبردستی جبریہ چلائے جارہے ہیں اور نہ ایسا لگے کہ متکبرانہ چل رہے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ ''اور مت چلو زمین میں اکڑ کر''۔[۲]

---

(۱) فی ظلال القرآن: آیت زیرِ بحث۔

(۲) سورۂ اسراء: آیت ۳۷ اور سورۂ لقمان: آیت: ۱۸

پس اللہ کے بندے زمین میں بغیر گھمنڈ اور اکڑ کے چلتے ہیں، ان کی چال میں اکڑ فوں نہیں ہوتی، آیت کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیماروں کی طرح تصنع اور ریا کے ساتھ چلتے ہیں۔ اولادِ آدم کے سردار حضرت محمد ﷺ اس طرح چلتے تھے جیسے بلندی سے نیچے کی طرف اتر رہے ہوں، مضبوط قدم رکھتے ہوئے، گویا زمین آپ کے لیے لپیٹ دی گئی ہو۔ (یہ سرعت اور مسافت جلد طے ہو جانے کی طرف اشارہ ہے)۔ بعض سلف نے کمزور اور بناوٹی چال کو ناپسند کیا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ دھیرے دھیرے چل رہا ہے، فرمایا: کیا تم بیمار ہو؟ نوجوان نے جواب دیا: نہیں امیر المؤمنین! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک درہ لگایا اور فرمایا: ''ایسی چال چلو جس سے قوت کا اظہار ہو''۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے چلنے کی دس صورتیں بیان کی، پھر فرمایا: ان چالوں میں سب سے مناسب و متوسط چال، وقار کے ساتھ آگے جھکتے ہوئے چلنا ہے، (۱) یعنی رسول اللہ ﷺ کی چال۔

رسول اللہ ﷺ کے بیٹھنے اور ٹیک لگانے کی کیفیت:

رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے ممتاز نہیں رہتے تھے، آپ اُن ہی میں سے ایک لگتے تھے، بیٹھنے اور ٹیک لگانے میں اُن ہی میں گھلے ملے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی اجنبی شخص آ جاتا تو پہچان نہ پاتا کہ ان میں رسول اللہ ﷺ کون ہیں؟ اُسے پوچھنا پڑتا، جیسا کہ یہ واقعہ ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا، جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو پوچھا: ''آپ لوگوں میں محمد ﷺ کون ہیں؟'' ہم نے جواب دیا: ''یہ گورے شخص جو ٹیک لگائے ہیں''۔ (۲)

رسول اللہ ﷺ زمین پر بھی بیٹھ جاتے اور چٹائی اور بستر پر بھی، کبھی کبھی مسجدِ نبوی میں اس طرح لیٹے رہتے کہ ایک پیر دوسرے پیر پر رکھے رہتے۔ (۳)

کبھی کبھی تکیے پر ٹیک لگاتے۔ (۴)

---

(۱) زاد المعاد: ۱ / ۱۶۹

(۲) بخاری: رقم: ۶۳

(۳) متفق علیہ: خ: ۴۷۵، م: ۲۱۰۰

(۴) ترمذی: رقم: ۲۷۷۱، یہ حدیث ابوداؤد میں بھی ہے۔

کبھی تکیہ آپ ﷺ کے بائیں طرف ہوتا تھا، آپ اسی پر ٹیک لگا لیتے۔[۱]

آپ کی حرکات و سکنات بالکل فطری، طبعی انداز پر ہوتی تھیں، ان میں تصنع نہیں ہوتا تھا، تکلف سے بہت دور ہوتی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ جب سونے کا ارادہ فرماتے تو اپنی دائیں کروٹ پر لیٹتے اور بسا اوقات اپنا ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھ لیتے۔[۲]

رسول اللہ ﷺ کے پسینے اور آپ کی مہک کی پاکیزگی و عمدگی:

رسول اللہ ﷺ اپنی عمدہ خوشبو کی وجہ سے معروف تھے، اگر آپ کسی راستے سے گئے گذرتے ہوتے تو پتہ چل جاتا کہ آپ اس راہ سے گزرے ہیں؛ کیونکہ آپ کی خوشبو کے آثار اس گذرگاہ میں باقی رہتے تھے اور راستہ مہکتا رہتا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

”میں نے رسول اللہ ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم کوئی ریشم و دیباج نہیں چھوا اور میں نے آپ کی خوشبو اور مہک سے زیادہ عمدہ کوئی خوشبو نہیں سونگھی“۔

دوسری روایت میں ہے کہ: ”میں نے نہ کوئی مشک سونگھا نہ کوئی دوسری خوشبو جو رسول اللہ ﷺ کی مہک سے بڑھ کر ہو“۔[۳]

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے میرے رخسار کو چھوا، پس میں نے آپ کے دستِ مبارک کی ٹھنڈک یا مہک ایسی محسوس کی گویا آپ نے اپنا دستِ مبارک عطار کی شیشی سے نکالا ہے“۔[۴]

”حضور ﷺ کو پسینہ بہت آتا تھا، حضرت ام سُلیم رضی اللہ عنہا، حضور ﷺ کا پسینہ جمع کرتی رہتی تھیں، کبھی وہ اپنی عطر کی شیشی میں رکھتیں، کبھی کسی عطر میں ملا دیتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے

(۱) ترمذی: رقم: ۲۷۷۰

(۲) بخاری: رقم: ۲۴۷، ۶۳۱۴

(۳) متفق علیہ: خ: ۱۹۷۳، ۳۵۶۱، م: ۲۳۳۰

(۴) مسلم: رقم: ۲۳۲۹

فرمایا: ''ام سلیم! یہ کیا ہے؟'' جواب دیا: آپ کا پسینہ ہے، اسے میں اپنی خوشبو میں ملاؤں گی، ہمیں امید ہے کہ اس سے ہمارے بچوں کو برکت حاصل ہو گی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے ٹھیک کیا''۔

دوسری روایت میں ہے کہ ''ہم اسے اپنی خوشبو میں ملائیں گے، یہ ساری خوشبوؤں میں سب سے عمدہ اور پاکیزہ ہے''۔(۱)

آپ ﷺ کی مہک کی یہ حالت اس وقت تھی جب آپ نے کوئی خوشبو لگائی بھی نہیں ہوتی تھی۔

قوت اور نشاط:

آپ اپنی نگاہ سیرتِ نبوی پر جب بھی ڈالیں گے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی صفاتِ قوت و نشاط - جس سے آپ بہرہ ور تھے - ٹھہرنے (اور سوچنے) پر مجبور کر دیں گی۔

جسم کی قوت، ارادہ کی قوت، مشقتوں پر صبر کرنے کی قوت، لگاتار روزہ رکھنے کی قوت، نماز میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے سامنے دیر تک کھڑے رہنے کی قوت اور مشکل امور کا مقابلہ کرنے کی قوت۔

یہ قوت زندگی کے مختلف میدانوں میں تھی، مادیات اور روحانیات دونوں میں یہ قوت بہت زیادہ تھی اور یہ قوت و طاقت عمر بڑھنے کے باوجود بھرپور اور تازہ تھی۔ زندگی کے ہر میدان کی مثالیں ہم پیش نہیں کر سکتے، کیونکہ اس میں بڑی طوالت ہے، لیکن ہم بعض مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں:

❖ دیکھیے! مسلمان ایک سرد صبح میں خندق کھود رہے ہیں، ایک سخت چٹان سامنے آگئی، جتنے لوگ تھے اور جو پھاوڑے تھے سب اس کے توڑنے سے عاجز ہو گئے، آخر کار رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر معاملہ پیش کیا گیا، آپ نے فرمایا:

''میں وہاں اترتا ہوں، چنانچہ آپ کھڑے ہوئے، جبکہ آپ کے شکمِ مبارک پر ایک پتھر بندھا ہوا تھا، تین دن سے کسی نے کھانا چکھا بھی نہیں تھا۔ آپ نے پھاوڑا لیا اور ایک بار چٹان پر مارا تو چٹان ریزہ ریزہ ہو گئی''۔(۲)

❖ اور میرے ساتھ یاد کیجیے! جب آپ ﷺ اپنے چچا اور اپنی بیوی کے انتقال کے بعد اکیلے طائف

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۲۸۱، م: ۲۳۳۱، ۲۳۳۲

(۲) بخاری: رقم: ۴۱۰۱

گئے، آپ دین کی تبلیغ کے معاملے میں حمایتی تلاش کر رہے تھے، پھر وہاں کیا کیا جسمانی وروحانی تکالیف اٹھانی پڑیں۔

❖ بیویوں کے سلسلے میں تخییر کے واقعے کو دیکھیے، رسول اللہ ﷺ مچان نما اپنی ایک بلند جگہ پر تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی حالت میں آپ سے ملاقات کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھجور کے ایک تنے کے سہارے اس پر چڑھے، گویا وہ سیڑھی ہے، حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"اللہ کے نبی ﷺ اس پر سے اترے اور میں بھی اترا، میں تنا پکڑ کر اترا اور حضور ﷺ اس طرح اتر گئے جیسے زمین پر چل رہے ہوں، آپ نے تنے کو چھوا بھی نہیں"۔[1]

جب ہم تخییر کا واقعہ دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ ۹ سنہ ھ میں پیش آیا تھا یعنی حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری دور میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے جسمِ مبارک میں نشاط و قوت آخری عمر تک باقی رہی۔

دیکھیے! رسول اللہ ﷺ اُس مچان سے تنے کی طرف آئے اور وہاں سے زمین پر آئے جیسے زمین پر چل رہے ہوں؛ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ - عمروں میں تفاوت کے باوجود- پہلے تنے کو پکڑتے ہیں کہ کہیں زمین پر نہ گر جائیں اور تنے سے چمٹ کر زمین پر اترتے ہیں۔

یہ ایسے مشاہد و مناظر ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی قوت و نشاط کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ کیوں نہ ہوتا جبکہ آپ نے خود ہی فرمایا ہے:

«اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ، خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ، اِحْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ، وَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَلَا تَعْجَزْ، وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ، فَلَا تَقُلْ: لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ "لَوْ" تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ»[2].

مؤمن قوی اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب اور زیادہ بہتر ہے مؤمن ضعیف سے اور ہر ایک میں بھلائی ہے، اس چیز میں حرص کرو جو تمھیں نفع دے اور اللہ سے مدد مانگو اور عاجز نہ بنو اور اگر تمھیں کوئی مصیبت پہنچ جائے تو یوں نہ کہو کہ اگر میں ایسا ایسا کرتا تو ایسا ہو جاتا، بلکہ یوں کہو کہ اللہ نے جو تقدیر میں لکھا تھا، اور جو چاہا وہ کیا؛ اس لیے کہ "اگر مگر" شیطان کے عمل دخل کا دروازہ کھول دیتا ہے"۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۴۷۹

(۲) مسلم: رقم: ۲۶۶۴

یہ فرمان ''طلبِ قوت'' پر ابھارتا ہے اور طلبِ قوت کے اسباب کو بیان کرتا ہے یعنی حرص، چاہت اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا، اور کمزوری کو نفس میں گھسنے اور سرایت نہ کرنے دینا، اسی طرح ماضی کے نقصان پر حسرت وافسوس نہ کرنا اور اس میں وقت ضائع نہ کرنا۔

یہ رسول اللہ ﷺ کی بلاغت ہے، تھوڑے سے کلمات ہیں، لیکن موضوع کے سارے گوشوں کا مادی اور روحانی ہر اعتبار سے احاطہ کر لیا، ہمیں ان پر غور کرنا چاہیے۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ قوت ونشاط سے بہرہ ور تھے، اس لیے آپ مسلمانوں سے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ قوی رہیں اور اسی پر آپ انھیں ابھار بھی رہے ہیں؛ لیکن اس کے معنی کمزوروں کو حقیر سمجھنا نہیں ہے؛ بلکہ آپ نے اسی حدیث میں فرمادیا کہ « وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ » ہر مؤمن میں بھلائی ہے۔

چنانچہ بعض موقعوں پر آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ اپنے ساتھیوں پر قوت وطاقت میں فائق ہیں تو آپ نے خود ہی ان سے فرمایا:

«هَلْ تُنْصَرُونَ إِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ»(۱).	تمھاری جو مدد کی جاتی ہے (اور تمھیں جو رزق دیا جاتا ہے) وہ تمھارے ضعفاء کی وجہ سے ہی دیا جاتا ہے۔

مؤمن میں قوت وطاقت کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسے غرور اور دوسروں پر برتری تک پہنچادے اور وہ گھمنڈ وتکبر میں مبتلا ہو جائے، یہ تو سراسر ہلاک کر دینے والی چیز ہے۔

اسلامی نہج توازن پر مبنی ہے، ایسی برتری سے کوئی فائدہ نہیں جو دوسروں کو کمزور کر دینے کی قیمت پر ہو، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''ہر مؤمن میں بھلائی ہے''۔

رسول اللہ ﷺ کی ہنسی اور آپ کی خوشی:

رسول اللہ ﷺ کی خوشی آپ کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی تھی، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بارے میں بتایا ہے اور آپ کی خوشی کی صورتیں نقل کی ہیں، مثلاً:

❖ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے قصے میں ہے کہ غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی تو اس کو بیان کرتے ہوئے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

---

(۱) بخاری: رقم: ۲۸۹۶

"جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا اُس وقت رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک خوشی سے چمک رہا تھا اور آپ ﷺ فرما رہے تھے: "خوش خبری ہو، جتنے دن تم پر گذرے ہیں ان میں یہ سب سے اچھا دن ہے"۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: جب رسول اللہ ﷺ خوش ہوتے تھے تو آپ کا چہرہ روشن ہو جاتا تھا جیسے چاند کا ٹکڑا ہو اور اس سے ہم رسول اللہ ﷺ کی خوشی پہچان لیتے تھے"۔(۱)

❖ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل ہونے کے واقعے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

"رسول اللہ ﷺ پر اُسی وقت آیتیں نازل ہونا شروع ہوئیں پھر یہ کیفیت ختم ہوگئی، رسول اللہ ﷺ کی خوشی میرے سامنے ظاہر ہو رہی تھی، آپ اپنی پیشانی سے پسینہ پوچھتے ہوئے فرما رہے تھے: "عائشہ! خوش خبری ہو، اللہ نے تمھاری براءت نازل کر دی ہے"۔(۲)

❖ حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ پر اپنی آخری نظر کے بارے میں بتاتے ہیں:

"پس نبی کریم ﷺ نے حجرے کا پردہ سرکایا، آپ نے اصحاب کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ کا چہرۂ مبارک ایسا لگ رہا تھا جیسے قرآنِ مجید کا ایک ورق ہو، پھر آپ تبسم فرماتے ہوئے ہنسے"۔(۳)

❖ آپ ﷺ کی ہنسی بھی اسی رعب کے مطابق تھی جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر پیدا فرمایا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی پورا ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ میں آپ کے حلق کا کوّا دیکھ لیتی، آپ صرف مسکراتے تھے"۔(۴)

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۴۴۱۸، م: ۲۷۶۹

(۲) اس روایت کو امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے "كِتَابُ الْأَنْوَارِ فِي شَمَائِلِ النَّبِيِّ الْمُخْتَار" میں نقل کیا ہے۔ حدیث نمبر: ۲۹۵، اور صحیحین میں یہ حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: "فَسُرِّيَ عَنْهُ وَهُوَ يَضْحَكُ"، آپ ﷺ کا غم دور ہوگیا اور آپ ہنس رہے تھے۔ (خ: ۴۱۴۱، م: ۲۷۷۰)

(۳) متفق علیہ: خ: ۶۸۰، م: ۴۱۹

(۴) متفق علیہ: خ: ۶۰۹۲، م: ۸۹۹

اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پورے طور پر کھل کر نہیں ہنستے تھے۔

❖ رسول اللہ ﷺ جب اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہوتے، اس وقت مجلس کا حال نقل کرتے ہوئے حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم گفتگو کرتے ہوئے زمانۂ جاہلیت کا تذکرہ چھیڑ دیتے، وہ لوگ ہنستے، مگر رسول اللہ ﷺ صرف تبسم فرماتے''۔(۱)

❖ بعض وقت ہنسنے میں رسول اللہ ﷺ کی داڑھیں دکھائی دینے لگتی تھیں، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں ہے جس میں انھوں نے اس شخص کا واقعہ نقل کیا ہے جس نے رمضان میں اپنی بیوی سے مقاربت کرلی تھی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے انھیں کھجوریں دیں اور فرمایا: ''انھیں صدقہ کر دو''، اس شخص نے کہا: ''اپنے سے بھی زیادہ محتاج پر؟ واللہ مدینے کے اِس کنارے کے پتھروں سے اُس کنارے کے پتھروں کے درمیان مجھ سے زیادہ محتاج کوئی گھر نہیں ہے''۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر ہنس پڑے، یہاں تک کہ آپ کی داڑھیں دکھائی دینے لگیں''۔(۲)

داڑھ کا دکھائی دینا پہلی حدیث کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ داڑھ کا دکھائی دینا حلق کا کوّا دکھائی دینے کو مستلزم نہیں ہے۔(۳)

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کا زیادہ تر ہنسنا تبسم تھا، بلکہ سارا ہی تبسم تھا، آپ کی انتہائی ہنسی یہ تھی کہ آپ کی داڑھیں دکھائی دینے لگتی تھیں، ہنسی کی بات سے آپ کو بھی ہنسی آتی تھی اور یہ وہ باتیں تھیں جن پر عموماً تعجب کیا جاتا ہے اور جن کا وقوع پذیر ہونا عجیب وغریب اور نادر سمجھا جاتا ہے''۔(۴)

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۳۲۲

(۲) متفق علیہ: خ: ۱۹۳۶، م: ۱۱۱۱

(۳) فتح الباری: ۸/ ۵۷۸

(۴) زادالمعاد: ۱/ ۱۸۲

لیکن جو اہم اور قابل اشارہ بات ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہنسنا کبھی بھی کسی بھی دن قہقہے تک نہیں پہنچا۔[1]

ہنسنا اور رونا انسان کی خاصیت ہے، یہ دونوں تکوینِ بشری کے اسرار میں سے ہے، کوئی نہیں جانتا کہ یہ دونوں کیا ہیں؟ اور اس پیچیدہ مرکب ڈھانچے میں کیسے وقوع پذیر ہوتے ہیں جس کی ترکیب اور نفسی پیچیدگی اس کی عضوی ترکیب و پیچیدگی سے کم نہیں اور یہ مؤثراتِ نفسیہ و مؤثراتِ عضویہ کیسے اس انسان میں داخل ہو کر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور ضحک و بکا کے وجود کا عمل کرتے ہیں۔[2]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَىٰ ﴾ {النجم: ۴۳}　　اور اُسی نے ہنسایا اور رُلایا۔

یعنی انسان کے لیے ہنسنے اور رونے کے دواعی واسباب پیدا کیے۔

یہ دواعی ہمیشہ نہیں پائے جاتے، بہت سے لوگ بلا سبب بھی ہنستے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے موقع بے موقع زیادہ ہنسنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: زیادہ مت ہنسو، اس لیے کہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے"۔[3]

رسول اللہ ﷺ کا ہنس مکھ چہرہ:

رسول اللہ ﷺ لوگوں سے ہنس مکھ چہرے اور کشادہ دلی کے ساتھ پیش آتے تھے، اس طرح

---

(۱) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اہل لغت کہتے ہیں کہ تبسم مبادئ ضحک کا نام ہے اور ضحک وہنسی چہرہ کا اس طرح کشادہ ہو جانا ہے کہ خوشی کی وجہ سے دانت دکھائی دینے لگیں، پس اگر آواز بھی ہو کہ دور سے سنی جائے تو قہقہہ ہے؛ ورنہ وہ ضحک وہنسی ہے۔ (فتح الباری: ۱۰ / ۵۰۴)

(۲) فی ظلال القرآن: سورۂ نجم: آیت: ۴۳ کے تحت۔

(۳) ترمذی: رقم: ۲۳۰۵، ابن ماجہ: رقم: ۴۱۹۳، ۴۲۱۷

کہ آپ کے ہر صحابی کو یہ تصور ہوتا تھا کہ وہی آپ کے سب سے زیادہ قریب ہے اور آپ کا سب سے زیادہ محبوب ہے، رسول اللہ ﷺ کا یہ سلوک سارے لوگوں کے ساتھ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل کے اس پہلو کو حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ ہمارے لیے یوں بیان کرتے ہیں:

''جب سے میں اسلام لایا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے پاس آنے سے نہیں روکا اور جب بھی آپ نے مجھے دیکھا تبسم آمیز چہرے کے ساتھ دیکھا''۔ (۱)

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ جو ذاتی ملاحظہ اور بات کہہ رہے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کا وہ سلوک ہے جو خود اُن کے ساتھ پیش آیا۔

لیکن حضرت عبد اللہ بن حارث بن جزء ہمیں بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ عام طریقہ تھا، آپ سب سے اسی طرح ملتے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مسکرانے والا کسی کو نہیں دیکھا''۔ (۲)

یہی بات رسول اللہ ﷺ کے سارے صحابۂ کرام آپ سے ملاقات کے وقت محسوس کرتے تھے۔

آپ کا یہ طرزِ عمل اور رویہ صحابۂ کرام اور ان کے بعد والوں کے لیے ایک طرح کی ہدایت و رہنمائی اور دعوت تھی کہ وہ آپ کی پیروی کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے صرف اپنے عمل کے ذریعے ہی اس کی ترغیب دینے پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ اپنے قول سے بھی اس کی طرف متوجہ کیا، چنانچہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئًا، وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ» (۳).

مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی نیکی کو حقیر مت سمجھو؛ اگرچہ یہی ہو کہ تم اپنے بھائی سے ہنس مکھ چہرے سے ملو''۔

اس طرح چہرے کا ہشاش بشاش اور ہنس مکھ ہونا صرف اجتماعی ادب و تہذیب نہیں ہے؛ بلکہ یہ ان اعمالِ خیر میں سے ہے جس کی جزا بندۂ مسلم ذخیرۂ ثواب کی شکل میں اللہ کے پاس پائے گا۔ یہ بات

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۰۳۵، م: ۲۴۷۵

(۲) مسند احمد: ۴/۱۹۱، ترمذی: رقم: ۳۷۲۱

(۳) مسلم: رقم: ۲۶۲۶

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ثابت ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں:

«قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ، وَإِنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ»[(۱)].

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ہر نیکی صدقہ ہے، اور نیکی یہ بھی ہے کہ تم اپنے بھائی سے ہنس مکھ چہرے سے ملو"۔

نیز حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

«تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ»[(۲)].

اپنے مسلمان بھائی کے سامنے تمھارا تبسم کرنا بھی صدقہ ہے۔

جب مسلمان اس شریفانہ طریقے کا عادی ہو جائے گا اور اس کے چہرے کی بشاشت اس کی دائمی علامت بن جائے گی تو یہ چیز اس کی ذات پر منعکس ہو گی، وہ روحانی و نفسیاتی سعادت و راحت محسوس کرے گا، وہ اس سلوکِ خیر سے بہت فائدہ اٹھائے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جسم کی صورتِ ظاہرہ اور جسم کی صورتِ باطنہ کے درمیان جو ارتباط اور ہم آہنگی رکھی ہے اس کا یہ یقینی ثمرہ و نتیجہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رونے اور غم کی کیفیت:

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا آپ کے ہنسنے ہی کی طرح تھا۔

آپ چیخ کر اور آواز کر کے نہیں روتے تھے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہنسی قہقہہ نہیں تھی، رونے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں، یہاں تک کہ آنسو بہنے لگتے۔[(۳)]

رونے کی کئی قسمیں ہیں:

- ان میں سے ایک رونا خوف و خشیت کا رونا ہے۔
- دوسرا محبت و شوق کا رونا ہے۔

---

(۱) ترمذی: رقم: ۱۹۷۰

(۲) ترمذی: رقم: ۱۹۵٦

(۳) زادالمعاد: ۱/۱۸۳

➢ تیسرا قرآن سننے کے وقت رونا ہے۔

➢ چوتھا کمزوری اور ضعف کا رونا ہے۔

➢ پانچواں غم کے وقت رونا ہے وغیرہ وغیرہ۔[1]

ہمارا یہ سلسلۂ کلام رونے کی صرف آخری قسم کی تفصیل بتانے پر محدود و موقوف ہے۔ رسول اللہ ﷺ اسی طرح روتے تھے جو فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔ جیسے کوئی شخص اپنے عزیز و قریب کی موت کے وقت روتا ہے، آپ بھی اس موقعے پر اسی طرح روتے تھے۔ کتبِ سنت میں اس طرح کے بہت سے واقعات موجود ہیں، بعض کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں:

❖ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ آپ کے سامنے نزع کی حالت میں ہیں، رسول اللہ ﷺ کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا: آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، دل غمگیں ہے؛ مگر پھر بھی ہم وہی بات کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو۔ بخدا اے ابراہیم! تیری وجہ سے ہم بہت غمگیں ہیں''۔[2]

❖ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''ہم رسول اللہ ﷺ کی ایک صاحبزادی کے انتقال کے موقعے پر حاضر ہوئے، ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ان کی قبر پر بیٹھے ہوئے اور آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہیں''۔[3]

❖ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''رسول اللہ ﷺ کی ایک صاحبزادی نے آپ کے پاس آدمی بھیجا کہ ان کے بیٹے کا انتقال قریب ہے، تو آپ ﷺ اپنے اصحاب میں سے بعض حضرات کے ساتھ تشریف لے گئے، بچے کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا گیا، اس کا سانس تیز تیز ایسے چل رہا تھا جیسے پرانی مشک ہو، اس

---

(۱) زاد المعاد: ۱/ ۱۸۵-۱۸۳

(۲) متفق علیہ: خ: ۱۳۰۳، م: ۲۳۱۵، حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں۔

(۳) بخاری: رقم: ۱۲۸۵

وقت آپ کی دونوں آنکھیں چھلک پڑیں، حضرت سعد رضی اللہ عنہ[۱] نے کہا: یا رسول اللہ! یہ کیا؟ آپ نے ارشاد فرمایا: یہ وہ رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرمائی ہے اور اللہ اپنے اُن ہی بندوں پر رحم فرماتا ہے جو رحم دل ہوتے ہیں''۔[۲]

❖ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں[۳] کی شہادت کی اطلاع کی، آپ فرمار ہے تھے:

''جھنڈا زید نے لیا وہ شہید ہوگئے، پھر اسے جعفر نے لیا وہ شہید ہوگئے، پھر اسے عبداللہ بن رواحہ نے لیا وہ بھی شہید ہوگئے، راوی کہتے ہیں کہ یہ کہتے ہوئے آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے''۔[۴]

❖ کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ غم ہوتا تھا اور آپ کے دل میں برابر اس کا صدمہ رہتا تھا جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سریۂ قراء کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب ان کی شہادت کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ کو بہت غم اور صدمہ ہوا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«فَمَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَدَ عَلَى شَيْءٍ مَا وَجَدَ عَلَيْهِمْ»[۵]. | میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی چیز پر اتنا غمگیں نہیں دیکھا جتنا ان حضرات پر آپ غمگیں تھے۔

---

(۱) اس سے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ [ع۔ر۔ بستوی] (دیکھیے: بخاری: حدیث نمبر: ۱۲۸۴) از مصحح۔

(۲) متفق علیہ: خ: ۱۲۸۴، م: ۹۲۳

(۳) یعنی حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر طیار اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم [ع۔ر۔ بستوی]

(۴) بخاری: رقم: ۳۰۶۳

(۵) متفق علیہ: خ: ۶۳۹۴، م: ۶۷۷

تیسری فصل
نبی ﷺ کے کلام کی صفت

بسا اوقات کلام انسان کی شخصیت کے تعارف کی تکمیل کرنے والی صفات میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے، ہم یہاں رسول اللہ ﷺ کے طور وطریق اور شکل وصورت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم اس موضوع پر بھی ٹھہریں اور اس پہلو پر بھی روشنی ڈالیں، یہ موضوع بہت وسیع ہے، کوئی ایک مصنف اس کا حق ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

لوگوں کے لیے بیان کی ذمہ داری:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝۴۴ ﴾
{النحل: ۴۴}

اور ہم نے آپ کی جانب یہ ذکر (قرآن) اتارا تاکہ آپ لوگوں کے لیے واضح کریں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے اور تاکہ وہ غور وفکر کریں۔

اِس آیتِ کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو اہم ذمے داریاں رسول اللہ ﷺ کے کاندھے پر ڈالی گئی تھیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہ اپنے اوپر نازل شدہ قرآن کو بیان کریں اور اس کی توضیح کریں۔

بیان کی کئی قسمیں ہیں: کبھی بیان قول کے ذریعے ہوتا ہے، کبھی فعل کے ذریعے، کبھی کسی فعل پر برقرار رکھنے کے ذریعے اور اس میں شک نہیں کہ ان ساری قسموں میں قول کے ذریعے بیان سب سے پہلے نمبر کی چیز ہے، قول کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ کسی مجلس میں کوئی بات بیان کی جائے، کبھی کسی مناسبت سے نصیحت کے طور پر ہوتا ہے اور کبھی خطبہ وخطاب کے ذریعے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی یہ ذمے داری ادا کرنے میں قول کی ان ساری قسموں کو استعمال کیا ہے۔

آپ ﷺ کے کلام کی صفت:

رسول اللہ ﷺ بالکل واضح اور صاف صاف جملوں میں بات کرتے تھے، آپ کا کلام سننے والا اسے خوب اچھی طرح اپنے دل میں اتار کر محفوظ کر سکتا تھا اور جو آپ کہنا چاہتے وہ سمجھ سکتا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ جب بات کرتے تھے تو اگر کوئی گننے والا گننا چاہتا تو گن لیتا''۔ (١)

پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ مسلسل اور اتنی جلدی نہیں بولتے تھے جیسے تم لوگ بولتے ہو، بلکہ آپ کے کلام میں فصل ہوتا تھا، ہر سننے والا اسے سمجھ لیتا تھا''۔ (٢)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ جب کوئی بات کہتے تو اسے تین مرتبہ دہراتے تھے؛ تاکہ اچھی طرح سمجھ لی جائے''۔ (٣)

اگر ہم آپ ﷺ کے کلام کے اس طریقے میں آپ کی فصاحت و بلاغت کو بھی شامل کر لیں تو یقیناً اس سے مطلوبہ ذمے داری احسن طریقے پر ادا اور پوری ہو جائے گی۔

آپ ﷺ کے مواعظ:

رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو نصیحت کیا کرتے تھے، لیکن (بہت) زیادہ نصیحت نہیں فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''نبی ﷺ ہمیں نصیحت کرنے میں دنوں کا انتظار کرتے تھے (روز روز نصیحت نہیں کرتے تھے) تاکہ ہم اکتا نہ جائیں''۔ (٤)

---

(١) متفق علیہ: خ: ٣٥٦٧، م: ٢٤٩٣

(٢) ترمذی: رقم: ٣٦٣٩، ابوداؤد نے اس کا کچھ حصہ روایت کیا ہے، حدیث نمبر: ٤٨٣٩

(٣) بخاری: رقم: ٩٥، ترمذی: ٢٧٢٣

(٤) بخاری: رقم: ٦٨

رسول اللہ ﷺ کے مواعظ بہت ہی مؤثر ہوتے تھے، دلوں میں گھر کر جاتے اور نفوس کو جگا دیتے تھے۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں جامع ومؤثر نصیحت کی جس سے آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور دل ڈر گئے''۔(۱)

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ ان مواعظ کا اثر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے تھے، آپ ہمارے سامنے جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے، ایسا لگتا جیسے ہم اپنی آنکھوں سے دونوں کو دیکھ رہے ہیں''۔(۲)

اس طرح یہ مواعظ بیان کی تاکید ہو جاتے تھے، ان کے ذریعے یاددہانی اور تذکیر ہو جاتی تھی، دین پر استقامت پر ابھارا جاتا تھا، نیز یہ مواعظ اہلِ ایمان کے درمیان باہمی تعلقات کی توثیق کا سبب بن جاتے تھے۔

نبی ﷺ کے خطبے:

تقریر و خطابت تاثیر و تبلیغ، جذبات میں جوش، ارادوں میں بلندی پیدا کرنے کے اعتبار سے اقسامِ کلام میں پہلے نمبر پر آتے ہیں۔ اسلام نے اسے ایک مستقل شعار بنا دیا ہے جو جمعہ و عیدین اور نمازِ استسقاء کے موقعے پر بار بار پیش آتا ہے۔

اہم حالات کے موقعے پر رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو اکثر جمع کرتے تاکہ انھیں خطاب کریں۔

خطابت میں امتیاز متکلم کے متاثر ہونے سے پیدا ہوتا ہے، متکلم کو سب سے پہلے اُس بات سے خود متاثر ہونا چاہیے جو وہ کہہ رہا ہے، تاکہ وہ مؤثر انداز میں سامعین تک تاثرات منتقل کر سکے۔ اور رسول اللہ ﷺ تو تمام خطباء اور بلغاء کے سردار ہیں۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۴۶۰۷، ترمذی: رقم: ۲۶۷۶، ابن ماجہ: رقم: ۴۲، دارمی: رقم: ۹۵

(۲) مسلم: رقم: ۲۷۵۰

''جب رسول اللہ ﷺ خطاب کرتے تو آپ کی دونوں آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی، غصہ زیادہ ہو جاتا، ایسا لگتا جیسے کسی لشکر سے ڈرا رہے ہیں، آپ فرماتے: دیکھو وہ لشکر، صبح کو تم پر حملہ کرنے والا ہے، شام کو حملہ کرنے والا ہے''۔(۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، رسول اللہ ﷺ کے ایک خطاب کا ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں جس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

''قیامت کے دن اللہ عزوجل آسمانوں کو لپیٹ دے گا، پھر انھیں اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے گا اور کہے گا: میں بادشاہ ہوں، کہاں ہیں وہ جو بڑے زبردست بنتے تھے؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو بہت گھمنڈ کرتے تھے؟ پھر ساری زمینوں کو لپیٹ کر اپنے بائیں ہاتھ میں لے لے گا اور کہے گا: کہاں ہیں وہ لوگ جو بڑے زبردست بنتے تھے؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو بہت گھمنڈ کرتے تھے؟''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جب آپ ﷺ یہ خطاب فرما رہے تھے تو میں نے منبر کی طرف دیکھا کہ نیچے سے کچھ حصہ حرکت کر رہا ہے؛ یہاں تک کہ میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ منبر کہیں رسول اللہ ﷺ کو لے کر گر تو نہیں جائے گا؟''(۲)

ایک دوسرے خطبے کے بارے میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپ خطبہ دیتے ہوئے فرما رہے تھے: ''میں تمھیں جہنم سے ڈراتا ہوں، یہاں تک کہ اگر کوئی آدمی بازار میں ہوتا تو میری اس جگہ سے (میری سے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ مراد ہیں) سن لیتا۔ راوی کہتے ہیں کہ یہاں تک کہ جو دھاری دار چادر آپ کے کندھے پر تھی آپ کے قدموں کے پاس گر گئی''۔(۳)

حضرت ام محصن رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

---

(۱) مسلم: رقم: ۸۶۷

(۲) متفق علیہ: خ: ۷۴۱۲، م: ۲۷۸۸، حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں۔

(۳) اس حدیث کو حافظ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں خطبۂ جمعہ میں نقل کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس روایت کو احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ مجمع الزوائد: ۵ / ۳۱۷۱ طبع دار المنہاج، مسند احمد: ۱۸۳۱۱/۱۴ طبع دار الحدیث۔ از مصحح۔

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع میں خطبہ دیتے ہوئے سنا، اس وقت آپ کے اوپر ایک چادر تھی جسے آپ نے بغل کے نیچے سے لپیٹ رکھا تھا (حج و عمرہ میں احرام پہننے کی مخصوص ہیئت)۔ راویہ کہتی ہیں: میں نے آپ کے بازو کے پٹھے کو دیکھا کہ وہ زور سے حرکت کر رہا ہے۔"(۱)

رسول اللہ ﷺ کا خطبہ ایسا ہی ہوتا تھا اور خطبے میں آپ کا طریقہ اور سنت یہی ہے۔(۲)

رسول اللہ ﷺ کے اندر اتنی طاقت اور قوت تھی کہ آپ خطبہ دیتے وقت دیر تک کھڑے رہ جاتے تھے، کبھی نمازِ عصر کے بعد خطاب کے لیے کھڑے ہوتے، تو سورج غروب ہونے تک لگاتار خطاب فرماتے۔(۳)

ایک دن تو رسول اللہ ﷺ نے نمازِ فجر کے بعد خطبہ دینا شروع کیا اور لگاتار دیتے رہے یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت ابو زید عمرو بن اخطب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور منبر پر چڑھے، آپ خطاب فرماتے رہے یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا، پھر اترے اور نماز پڑھی، پھر منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا، پھر اترے، عصر کی نماز پڑھی، پھر منبر پر چڑھے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، تو اس میں آپ نے اس کی بھی خبر دی جو ہو چکا اور اس کی بھی خبر دی جو ہونے والا تھا، پس جو ہم میں سب سے زیادہ جاننے والا تھا، وہ ہم میں سب سے زیادہ یاد رکھنے والا تھا"۔(۴)

---

(۱) ترمذی: رقم: ۱۷۰۶

(۲) رسول اللہ ﷺ کی سنت یہی ہے اور یہ جو جمعہ وغیرہ کے خطبوں میں ہر ملک میں اکثر مساجد میں تبدیلی پیدا کر دی گئی ہے کہ وہ لکھے ہوئے اوراق پڑھتے ہیں؛ خواہ خود لکھ کر لائیں یا کہیں سے نقل کر کے لائیں، یہ خطبے مردہ دلی پیدا کرتے ہیں، ان میں کوئی زندگی نہیں ہے، خطیب خود اس فکر سے ہم آہنگ نہیں ہوتا جو وہ پیش کرتا ہے، بسا اوقات لکھتا بھی نہیں، بلکہ فوٹو کاپی کرا کے لاتا ہے یا اس کے لیے لکھا جاتا ہے، اس طرح کے خطبے پڑھنے والے کے منہ سے آگے کہاں بڑھ پائیں گے؟!!

(۳) الفتح الربانی: ۲۶۸/۲۱

(۴) مسلم: رقم: ۲۸۹۲، الفتح الربانی: ۲۷۲/۲۱

ایسا لگتا ہے کہ یہ وہی خطاب ہے جس کے بارے میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ یوں بیان کرتے ہیں:

''ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا خطبہ دیا کہ اس میں قیامت تک ہونے والی کسی چیز کو نہیں چھوڑا جسے ذکر نہ کر دیا ہو، جاننے والے نے جان لیا اور ناواقف رہنے والا ناواقف رہ گیا۔ اگر میں کسی ایسی چیز کو دیکھتا ہوں جسے بھول چکا تھا تو اسے (دیکھتے ہی) پہچان لیتا ہوں جیسے آدمی کسی دوسرے آدمی کو جو اس سے غائب ہو گیا ہو اور وہ اسے پہلے سے جانتا ہو، دیکھتے ہی پہچان لیتا ہے''۔[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ یہ تو تبلیغ و بیان کے وسائل میں سے ایک ہے، جن کی ذمے داری رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالی گئی تھی۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن نکلے اور آپ نے تین بار پکارا اے لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ میری مثال اور تمھاری مثال کیسی ہے؟ سنو! اُس قوم کی طرح ہے جو کسی ایسے دشمن سے خوف زدہ ہو جو اس کے سامنے آ رہا ہو، انھوں نے ایک شخص کو بھیجا کہ وہ جا کر دشمن کو دیکھ کر انھیں خبر کرے، چنانچہ وہ گیا اور اس نے دشمن کو دیکھ لیا اور انھیں خبر دار کرنے کے لئے چلا، اسے اس کا خوف ہوا کہ کہیں دشمن خود اسی کو نہ پکڑ لے قبل اس کے کہ وہ اپنی قوم کو خبر کرے، تو اس نے دور ہی سے اپنے کپڑے سے اشارہ کیا اے لوگو! تم پر دشمن چڑھ آیا، اے لوگو! تم پر دشمن چڑھ آیا، تین بار اسی طرح کہا''۔[2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بلاغت:

میرا مقصد اس موضوع پر لکھنا نہیں ہے، میں اس کا اہل بھی نہیں ہوں، بہت سے لوگوں نے اس موضوع پر لکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس موضوع کا حق ادا کرے۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۶۰۴، م: ۲۸۹۱

(۲) مجمع الزوائد نے خطبۂ جمعہ میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس روایت کو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ مجمع الزوائد: ۵/ ۳۱۷۳ طبع دار المنہاج، مسند احمد: ۱۶/ ۲۲۸۴۴ طبع دار الحدیث۔ از مصحح۔

میرا ارادہ صرف یہ ہے کہ - چونکہ ہم رسول اللہ ﷺ کے کلام کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں، اس لیے - میں اس پہلو سے غفلت نہ برتوں۔ یہاں ہمارے لیے بہتر ہے کہ ہم ان منتخب جملوں کو پڑھ لیں جو جاحظ نے اس (بلاغتِ کلامِ نبوی کے) سلسلے میں کہے ہیں: ”آپ ﷺ کا کلام ایسا ہے جس کے حروف کم اور معانی زیادہ ہیں، وہ بناوٹ سے پاک اور تکلف سے بالا ہے“۔

وہ ایسا کلام ہے جس میں اللہ نے محبت ڈال دی ہے۔ (اسے عمومی) قبولیت سے ڈھانک لیا ہے اور جسے ہیبت و حلاوت کی ملی جلی کیفیت سے نواز دیا ہے، قلتِ کلام کے ساتھ اچھی طرح سمجھ میں آنے کی کیفیت بھی اس میں پیدا کر دی ہے۔

آپ سے کوئی لفظی غلطی سرزد نہیں ہوئی اور کبھی آپ کا قدم اس میں پھسلا نہیں، نہ آپ کی کوئی دلیل کمزور و بودی ثابت ہوئی، نہ کوئی مدِّمقابل آپ کے سامنے ٹک سکا، نہ کوئی خطیب آپ کو لاجواب کر سکا، بلکہ آپ چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعے بڑے بڑے لمبے لمبے خطبوں پر غالب آ گئے۔

کبھی لوگوں نے ایسا کلام نہیں سنا جو آپ کے کلام سے زیادہ نفع بخش ہو، الفاظ میں زیادہ معتدل ہو، وزن میں زیادہ برابر ہو، طریقہ میں زیادہ خوب صورت ہو، مطلب میں زیادہ شریفانہ ہو، موقع و محل کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہو، ادائیگی کے اعتبار سے زیادہ سہل ہو، معنی کے اعتبار سے زیادہ فصیح ہو اور مقصدِ کلام کو زیادہ بیان کرنے والا ہو، رسول اللہ ﷺ کے کلام کے سوا کسی شخص کے کلام میں یہ خصوصیت نہیں۔“ (۱)

ہم ضماد بن ثعلبہ ازدی (۲) رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا قصہ غور سے سنیں، یہ حقیقت کے زندہ گواہ ہیں، تکلف و تصنع سے دور، یہ ایک ایسے شخص ہیں جو لغت اور اسالیبِ لغت کو قلیل جملوں میں کیسے ادا کیا جاتا ہے اس سے واقف کار اور خبر دار شخص کی حیثیت سے رائے دے رہے ہیں، جو جملے انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنے تھے، وہ ہمیں اس کی تفصیل بتاتے ہیں:

---

(۱) البیان والتبیین للجاحظ: ۲/ ۱۷

(۲) یہ قبیلۂ ازد سے ہیں۔ حافظ ابن مندہ کہتے ہیں: ان کو ضماد اور ضمام دونوں کہا جاتا ہے اور یہ ان ضمام بن ثعلبہ کے علاوہ ہیں جو قبیلۂ سعد بن بکر سے ہیں۔ از مصحح۔ (الاصابہ: ۳/ ۳۹۴)

اس حدیث کو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مسلم نے روایت کیا ہے:

''ضماد مکہ آئے، وہ قبیلۂ ازد شَنُوءَۃ سے تعلق رکھتے تھے، وہ جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے، انھوں نے مکے کے کچھ بیوقوفوں سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ: محمد مجنون ہیں (ان پر کسی جن وغیرہ کا سایہ ہے)۔ ضماد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے دل میں سوچا کہ اگر میں اِن صاحب کو دیکھوں تو ہو سکتا ہے کہ اللہ انھیں میرے ہاتھ سے شفا دے دے۔

راوی کہتے ہیں: چنانچہ ضماد نے آپ سے ملاقات کی اور کہا: اے محمد! میں کوئی ہوا لگ جانے اور مسّ شیطان وغیرہ کا علاج کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے میرے ہاتھ سے شفا دے دیتا ہے، کیا آپ بھی علاج کرائیں گے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ، مَنْ يَهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَمَّا بَعْدُ»

بے شک ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، ہم اُسی کی حمد کرتے ہیں اور اُسی سے مدد طلب کرتے ہیں، جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے اُسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

راوی کہتے ہیں کہ ضماد نے کہا: آپ اپنے اِن کلمات کو دہرائیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کلمات کو ان کے سامنے تین مرتبہ دہرایا۔ راوی کہتے ہیں کہ ضماد نے کہا: میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے، جادوگروں کا کلام سنا ہے، شاعروں کا کلام سنا ہے، (لیکن) آپ کے اِن کلمات جیسا کوئی کلام نہیں سنا، یہ تو اپنے اندر سمندر کی موجوں کی طرح گہرائی لیے ہوئے ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر ضماد نے کہا: لائیے اپنا ہاتھ، میں آپ سے اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے بیعت کرلی۔''[(۱)]

کاش! حضرت ضماد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موقع دیا ہوتا کہ آپ اپنا کلام پورا کرتے، کیونکہ یہ تو ابھی اس چیز کا آغاز تھا جو آپ کہنا چاہتے تھے؛ لیکن چونکہ ضماد رضی اللہ عنہ نے ایسا کلام سنا

---

(۱) مسلم: رقم: ۸۶۸

کہ اس سے پہلے کبھی اس طرح کا کلام نہیں سنا تھا؛ لہٰذا یہ چیز کم کلمات کے باوجود اس بات کے لیے کافی ہوگئی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو مان لیں، لہٰذا اتنے ہی کلمات پر قناعت کر کے ایمان لے آئے۔

اِسی سے حضور ﷺ کی فصاحت و بلاغت کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہی کافی ہے۔

«أُعْطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ»[1]. مجھے جامع کلمات دیے گئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے کلام کی فہم اور اس کو سمجھنا:

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

«فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ لَيْسَ بِفَقِيهٍ»[2]. بہت سے فقہ (علمِ دین) کے حامل اپنے سے زیادہ فقیہ تک فقہ کو پہنچادیتے ہیں (جو اس سے احکام مستنبط کر لیتا ہے) اور بہت سے فقہ کے اٹھانے والے فقیہ نہیں ہوتے (اور اس سے احکام مستنبط نہیں کر پاتے)۔

«فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ»[3]. بہت سے وہ لوگ جن تک (بعد میں) فقہ پہنچایا گیا، (بلاواسطہ) سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔

دونوں احادیثِ شریفہ اس بات کو بتاتی ہیں کہ لوگ فہم میں برابر نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ کے کلام کے واضح ہونے اور بلیغ ہونے کے باوجود سب کو سمجھ میں آجائے یہ ضروری نہیں، کبھی کبھی فہم کی صلاحیت ہی سامع میں نہیں ہوتی اور کبھی مطلوب کے ادراک سے وہ قاصر ہوتا ہے، یا تو یہ خود اس کے اندر کی کمی ہوتی ہے یا کبھی اس کو درپیش حالت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۵۲۳، یہ حدیث بخاری میں ۲۹۷۷ نمبر پر ہے، الفاظ یہ ہیں: ’’بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ‘‘، مجھے جامع کلمات دیئے گئے ہیں۔

(۲) ابوداؤد: رقم: ۳۶۶۰، ترمذی: رقم: ۲۶۵۶، ابن ماجہ: رقم: ۲۳۰، دارمی: رقم: ۲۲۹

(۳) ترمذی: رقم: ۲۶۵۷، ابن ماجہ: رقم: ۲۳۲

اسی طرح کی حالت کے بارے میں قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾ {الانبیاء:7}

پس یاد رکھنے والوں سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی رائے کو ہی صحیح سمجھتے ہیں اور اپنے آگے کسی کو ترجیح نہیں دیتے۔

بعض اوقات نص ایک معنی سے زیادہ کا احتمال رکھتی ہے۔

اِس حالت میں ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ ہم اس طریقے سے رہنمائی حاصل کریں جسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد سلف صالحین نے اختیار کیا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«إِذَا حَدَّثْتُكُمْ عَنْ رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثًا، فَظُنُّوْا بِهِ الَّذِيْ هُوَ أَهْنَاهُ وَأَهْدَاهُ وَأَتْقَاهُ»(۱).

جب میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کروں تو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وہ گمان کرو جو آپ کے زیادہ موافق ہو، جو ہدایت کے زیادہ مناسب ہو، جو کمالِ تقویٰ کے زیادہ قریب ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی حدیث مروی ہے۔(۲).

امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں:

”انھوں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی، اس پر ایک آدمی نے کہا کہ کتاب اللہ اس حدیث کے خلاف ہے، انھوں نے جواب دیا: میں نہیں سمجھتا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی حدیث تم سے بیان کروں اور تم اس میں کتاب اللہ سے ٹکراؤ دکھا سکو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے زیادہ کتاب اللہ کو جانتے تھے“۔(۳).

---

(۱) ابن ماجہ: رقم: ۲۰، دارمی: رقم: ۵۹۲

(۲) ابن ماجہ: رقم: ۱۹، دارمی: رقم: ۵۹۱

(۳) دارمی: رقم: ۵۹۰

ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا بالکل صحیح ہے، بلا شبہ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ کتاب اللہ کو جاننے والے تھے، آپ کی حدیث کتاب اللہ کے کسی حکم سے معارض نہیں ہو سکتی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ قرآن کے بیان اور اس کی تفسیر کرنے والے تھے۔

شراحِ حدیث اور علمائے اصول نے ان سارے امور کو پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیا ہے جس سے یہ ساری باتیں سہل اور آسان ہو گئی ہیں۔

تیسرا مقصد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و خصائل

پہلی فصل
خُلق عظیم

اِس فصل میں ہم صاحبِ خلقِ عظیم ﷺ کے بارے میں گفتگو کریں گے، اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اوصاف کے ذریعے، یا خود آپ ﷺ کے اپنے بارے میں بیان کیے گئے اوصاف کے ذریعے، یا آپ کے بعض صحابہ کے بیان کے ذریعے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ:

بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں:

یقیناً یہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا ایسا ارشادِ گرامی ہے جس کی قدر و قیمت کی تعریف بیان کرنے سے ہر قصور وار قلم عاجز و درماندہ ہے اور یہ اللہ کے بندے کے لیے اللہ کی میزان (یعنی بندے کی رفعتوں اور عظمتوں کے تولنے کی ترازو) میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ {القلم: ۴} بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔

خلقِ عظیم کا مدلول وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے۔ یہ ان چیزوں میں سے ہے جس کی وسعت اور اس کے پھیلاؤ کے ادراک تک تمام کائنات میں کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا۔

حضرت محمد ﷺ کی عظمت پر اس عظیم جملے کی دلالت چند مختلف طرح سے ظاہر ہوتی ہے:

- محمد ﷺ کی عظمت اس کلام کے اللہ بلند و برتر کے کلام ہونے سے ظاہر ہوتی ہے۔ عالمِ وجود کا باطن اس کو محفوظ کیے ہوئے ہے اور وہ آپ ﷺ کی فطرت و طبیعت میں جا گزیں ہے اور ملاءِ اعلیٰ میں جب تک اللہ چاہے اس کو دہرایا جاتا رہے گا۔
- دوسری طرف یہ عظمت نمایاں ہوتی ہے محمد ﷺ کے اس کلام کو اخذ کرنے کی طاقت وصلاحیت رکھنے سے، وہ جانتے ہیں اس کے قائل اپنے رب کی طرف سے اس بات کو کہ اس

کلام کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی عظمت کیا ہے؟ اس کے کلمات کی دلالت کیا ہے؟ اس کی وسعت کیا ہے؟ اس کی گونج اور باز گشت کیا ہے؟ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس عظمتِ مطلقہ و کاملہ کے ساتھ وہ کون سی ذات ہے؟ اس ذات کی عظمت کو جتنا وہ جانتے ہیں دنیا میں کوئی دوسرا نہیں جانتا۔

❖ بے شک آپ ﷺ کا اس سر چشمے سے اس کلمے کو اخذ و قبول کی قوت رکھنا اور ثابت قدم رہنا، آپ کا اس کے بھاری دباؤ کے تحت نہ دبنا- اگرچہ وہ آپ کی مدح و ثناہی ہو- اور نہ اس کے دباؤ کے تحت آپ کی شخصیت کا ڈانواڈول اور مضطرب ہونا، اطمینان، مضبوطی و اعتماد اور توازن کے ساتھ آپ کا اس جملے و کلام کو اخذ و قبول کرنا خود ہر دلیل سے بڑھ کر آپ کی شخصیت کی عظمت کی دلیل ہے۔

بے شک آپ ﷺ کی سیرتِ پاک کے ضمن میں آپ کے خلقِ عظیم کا ذکر کیا گیا ہے، اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی زبانی (بھی) بہت سی روایات مروی ہیں اور آپ کی عملی سیرت اُن تمام روایتوں و حکایتوں سے بڑھ کر ایک عظیم شہادت ہے، لیکن یہ کلمۂ فرمانِ الٰہی اپنی دلالت کے اعتبار سے دوسری ہر چیز سے بڑا ہے، یہ عظیم تر ہے اس لیے کہ اللہ علی و کبیر کی جانب سے ارشاد ہوا ہے اور یہ کلمہ عظیم ترین ہے آپ ﷺ کے اس کو اپنانے کی وجہ سے اور وہ جانتے بھی ہیں کہ وہ بلند و برتر ذات کون ہے؟ اور یہ کلمہ بڑا ہے آپ ﷺ کا اس کلمے کو لینے کے بعد مضبوطی سے اور جم کر اطمینان کی حالت پر باقی رہنے کی وجہ سے، آپ اللہ کے بندوں پر تکبر نہیں کرتے اور بڑے نہیں بنتے، بڑائی نہیں جتاتے، حالانکہ آپ ہی نے سب کچھ اللہ بزرگ و برتر سے سنا جو بھی سنا۔

بے شک رسول اللہ ﷺ- درانحالیکہ بشر تھے- اپنے صحابہ میں سے کسی کی تعریف کرتے تو جس صحابی کی تعریف ہوتی ان کی اور دیگر صحابہ کی طبیعت میں ایک جوش سا پیدا ہو جاتا، وہ بشر تھے، اور ان کے ساتھی (صحابی) جانتے تھے کہ آپ بشر ہیں، اور آپ ﷺ کو آپ کے اصحاب سمجھتے تھے کہ وہ بشر ہیں، آپ نبی ہیں، جی ہاں! ایسا ہی تھا، لیکن معلوم حدود کے دائرے میں اور حدود والی بشریت کے دائرے میں رہ کر بہر حال آپ یہ کلمہ اللہ پاک سے لیتے ہیں اور جانتے بھی ہیں کہ اللہ کون ہے؟ آپ ﷺ اللہ عزوجل کی جانب سے وہ کچھ جانتے ہیں جو آپ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ پھر مضبوطی سے اس پر قائم رہتے ہیں اور اسی سے قوت کے ساتھ وابستہ اور عمل پیرا رہتے ہیں۔ بیشک یہ ہر تصور

سے مافوق اور اندازے سے ماورا ایک معاملہ ہے۔ [1]

یہ اس بیان کا کچھ حصہ ہے جو سید قطب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر کیا ہے، اللہ ان پر رحم فرمائے۔ وہ اس آیت کی گہرائی اور معنویت کو بیان کرتے ہیں۔ یہ بیان ہر اس شخص کے تدبر اور گہری نظر کا مستحق ہے جو اس کے کسی حصے کو سمجھنے کا ارادہ کرے، جس کی طرف یہ آیتِ کریمہ اشارہ کرتی ہے۔

آیتِ کریمہ اُن مشرکین کے رد کے سلسلے میں نازل ہوئی جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) جنون کے ساتھ متہم کیا۔ یہ مکے میں دعوت کے اعلان کے بعد ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝١ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝٢ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝٣ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝٤ ﴾

{القلم: ۴-۱}

''ن''، قسم ہے قلم کی اور اس کی جو (اس سے) لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں اور بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسا اجر ہے جو ختم ہونے والا نہیں اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہیں۔

پس یہ آیتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنون کی نفی کرتی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے اور اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مقام ثابت ہوتا ہے، وہ یہ کہ آپ کی ذات خلق عظیم والی ہے۔ یہ اُس اللہ رب العزت کی شہادت ہے جو پوشیدہ و ظاہر تمام باتوں کو جانتا ہے، نیز یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ عقل کی شہادت ہے، (حالانکہ) اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغمبری کس کو سپرد کریں۔

مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے ہی میری بعثت ہوئی:

امام بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث تخریج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک میری اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک حسین و جمیل گھر بنایا سوائے کنارہ کی ایک اینٹ کی جگہ کے، لوگ اس کے اِرد گرد گھومتے ہیں اور اس پر تعجب کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' پس میں ہی وہ اینٹ ہوں

---

(۱) فی ظلال القرآن: مذکورہ آیت کے تحت۔

اور سب نبیوں میں آخری نبی ہوں۔‘‘(۱)

آپ ﷺ وہ نبی ہیں جن پر نبوت ختم ہوئی اور اس کی عمارت مکمل ہو گئی، اس لیے اِس بات میں کوئی تعجب نہ ہو کہ آپ ﷺ کے ذریعے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کی گئی ہے؛ بلکہ یہ معاملہ ختم نبوت کے لوازم میں سے ہے۔ آپ ﷺ کا سلوک، آپ ﷺ کے اخلاق اور آپ ﷺ کے تصرفات وہ ترازو ہیں جس سے اعمال اور تصرفات کی درستگی کو تولا جاتا اور صحیح کیا جاتا ہے۔

آپ ﷺ کے اخلاق وہ پیمانہ ہیں جس کے ذریعے اخلاق کو ناپا جاتا ہے اور یہ ضروری بھی ہے، اس لیے کہ زمانے کے تغیرات اور نسلوں کے ادلنے بدلنے کے ساتھ اکثر معیار بدل جاتے ہیں تو اس طرح معروف منکر ہو جاتا ہے اور منکر معروف۔

یہاں ایک دوسری بات بھی ہے، اور وہ ہے تشدد کی طرف میلان، دشوار امور کو اختیار کرنا، حالانکہ یہ دوسرے (غلط) رخ کی طرف انحراف ہے، بسا اوقات اس کی ظاہری شکل نیکیوں کی زیادتی کی خواہش ہوتی ہے، لیکن اسلام کی ترازو میں یہ (جادۂ حق سے) انحراف ہے، اس طرح کی بات نبی ﷺ کے زمانے میں بھی پیش آئی تھی تو آپ ﷺ نے اس پر نکیر کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

’’رسول اللہ ﷺ نے ایک کام کیا اور اس میں رخصت پر عمل کیا، یہ خبر آپ ﷺ کے اصحاب میں بعض لوگوں کو پہنچی تو ایسا لگا جیسے انھوں نے ناپسند کیا اور اس سے دوری اختیار کی، اس کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ وعظ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: کیا حال ہے لوگوں کا، ان کو میری طرف سے ایسے معاملے کی خبر پہنچی جس میں میں نے رخصت پر عمل کیا اور انھوں نے اسے ناپسند کیا اور اس سے دوری اختیار کی، خدا کی قسم! میں ان میں سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔‘‘

ایک روایت میں ہے: ’’پس اس کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ غصہ ہوئے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کا غصہ آپ کے چہرے سے (بھی) ظاہر ہو گیا، پھر فرمایا...الخ۔‘‘(۲)

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۵۳۵، م: ۲۲۸۶

(۲) متفق علیہ: خ: ۶۱۰۱، م: ۲۳۵۶۔ روایت کے الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ ایسے معاملے میں غصہ ہوئے جس پر عمل کرنے والوں نے شاید اسے تقویٰ اور پرہیز گاری شمار کیا، لیکن - جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ظاہر فرمایا- یہ راہِ راست سے خروج ہے۔ جب ایسا ہے تو ہم ایک ایسی ترازو اور پیمانے کے محتاج ہیں جس کی طرف ہم ہمیشہ رجوع کیا کریں۔ آپ ﷺ کا طرزِ عمل ہی ترازو اور پیمانہ ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ کا مشن مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہے، ان کو صحیح مقام پر رکھنا ہے اور جو عیوب اور خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان سے ان کو صاف کرنا ہے۔ اس طرح آپ ﷺ نے مکارمِ اخلاق کو ہمارے لیے صاف ستھرا کر کے چھوڑا ہے۔

آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا:

«كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ»[(۱)]. آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا۔

یہ وہ جملہ ہے جس کو ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے اخلاق کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

یہ چیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سمجھ، ان کے علم اور ان کی بلاغت پر واضح دلالت کرتی ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ یہ وہ ہیں جو نبی ﷺ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب صحابی کے گھر پیدا ہوئیں، پلی بڑھیں اور پھر اس کے بعد کاشانۂ نبوت میں رہیں۔

بے شک یہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے لیکن یہ ضخیم کتاب سے بے نیاز کرنے والا ہے۔ جو کچھ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی نے رسول اللہ ﷺ کی عادت و اخلاق کی تعریف میں کہا وہ اس جملے کے معنی (کے دائرے) سے نہیں نکل سکے گا۔

قرآنِ کریم میں کچھ تو وہ احکام ہیں جن کا کرنا مطلوب ہے، کچھ ممنوع احکام ہیں جن سے دوری اختیار کرنا مطلوب ہے، ایسے فضائل بھی ہیں جن پر عمل کے لیے لوگوں کو دعوت دی گئی ہے اور اس میں ایسی بے حیائیوں کا بیان ہے جن سے دور رہنے کے لیے کہا گیا ہے۔

پس ''خُلُقُهُ الْقُرْآنُ'' کے معنی ہیں: رسول اللہ ﷺ مطلوبہ امور کو انجام دینے والے ہیں اور روکے گئے کاموں سے رکنے والے ہیں، فضائل کے حصول کے لیے کوشش کرنے والے

---

(۱) مسلم: رقم: ۷۴۶، نسائی: رقم: ۱۶۰۰، مسند احمد (الفتح الربانی: ۲۲/۱۷)

ہیں، ظاہر و باطن کی تمام بے حیائیوں سے دور رہنے والے ہیں۔ مفسر بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے (اس کا مطلب) بیان فرمایا:

"یعنی کل کے کل احکام جو قرآن میں وارد ہوئے، چنانچہ ہر وہ چیز جسے قرآن نے اچھا کہا، اس کی تعریف کی اور اس کی دعوت دی، اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آراستہ ہوئے اور ہر وہ چیز جسے قرآن نے بُرا کہا اور اس سے منع کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس سے بچے اور دور رہے۔"[1]

جس شخص کی یہ چاہت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق معلوم کرے تو اس کے لیے قرآنِ کریم کا مطالعہ لازم ہے، اس لیے کہ یہی وہ کتاب ہے جس کی آپ نے اپنے اقوال و اعمال سے تشریح و تفسیر بیان فرمائی۔

عادات و اخلاق کے اعتبار سے سب سے اچھے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْسَنَ النَّاسِ خُلُقًا»[2].

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عادات و اخلاق میں سب سے زیادہ اچھے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دس سال رات و دن رہے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریب سے دیکھا اور تمام احوال میں دیکھا، انھوں نے اپنے چشم دید احوال کا خلاصہ اِن تھوڑے سے کلمات کے ذریعے بیان کر دیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں سب سے اچھے ہیں، زندگی کے میدانوں میں سے ہر میدان (اور ہر شعبے) میں، لوگوں کے ساتھ پیش آنے میں تمام لوگوں سے زیادہ اچھے ہیں اور بہت سے صحابہ نے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے موضوع پر) ویسی ہی باتیں کہی ہیں جیسی حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہی ہیں۔

ہم ان اقوال کے ذکر سے بات لمبی کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ نے ان سب سے مستغنی کر دیا ہے۔

---

(۱) بلوغ الامانی شرح الفتح الربانی: ۱۷/۲۲

(۲) مسلم: رقم: ۲۳۱۰

دوسری فصل
حُسنِ خُلق کا مرتبہ

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

«لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا، وَكَانَ يَقُولُ: إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا»(۱).

نبی کریم ﷺ نہ تو عادتاً فحش کلام و بدگو تھے اور نہ خواہ مخواہ لوگوں کی تفریح کے لیے بدگوئی کرنے والے تھے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: تم میں سب سے بہتر، سب سے اچھے اخلاق والا ہے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا: آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ»(۲).

(اللہ کے حساب کی) ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہیں ہے۔

اُن ہی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا مِنْ شَيْءٍ يُوضَعُ فِي الْمِيزَانِ أَثْقَلُ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ، وَإِنَّ صَاحِبَ حُسْنِ الْخُلُقِ لَيَبْلُغُ بِهِ دَرَجَةَ صَاحِبِ الصَّوْمِ وَالصَّلَاةِ»(۳).

میزان میں جو بھی چیز رکھی جائے گی ان میں کوئی چیز حسن خلق سے زیادہ وزنی نہیں ہے اور بے شک حسن خلق والا آدمی اس کی وجہ سے روزہ اور نماز والوں کے درجے کو پہنچ جائے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۵۵۹، م: ۲۳۲۱

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۷۹۹، ترمذی: رقم: ۲۰۰۲

(۳) ترمذی: رقم: ۲۰۰۳

«سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ»[۱].

میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا: بے شک مؤمن اپنے حسن خلق کے ذریعے روزے دار اور شب گذار نمازی کے درجے کو بالضرور پالے گا"۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

«سُئِلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ، فَقَالَ: تَقْوَى اللهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ»[۲].

رسول اللہ ﷺ سے لوگوں کو سب سے زیادہ جنت میں داخل کرنے والی چیز کے بارے میں پوچھا گیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کا تقویٰ اور حسنِ خلق"۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا، وَإِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرْثَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ وَالْمُتَفَيْهِقُونَ»، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، قَدْ عَلِمْنَا الثَّرْثَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ فَمَا الْمُتَفَيْهِقُونَ؟ قَالَ: «الْمُتَكَبِّرُونَ»[۳].

"میرے نزدیک تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ اور قیامت کے دن سب سے زیادہ میرے قریب بیٹھنے والا تم میں سے سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہو گا۔ تم میں میرے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ نفرت اور قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ دور بیٹھنے والا، سب سے زیادہ بک بک کرنے والے، بات کرنے میں جھوٹ موٹ اپنی فصاحت ظاہر کرنے والے اور متفیہقون ہوں گے، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم نے اَلثَّرْثَارُونَ اور اَلْمُتَشَدِّقُونَ کو تو سمجھ لیا، لیکن یہ اَلْمُتَفَيْهِقُونَ کون ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تکبر کرنے والے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۴۷۹۸

(۲) ترمذی: رقم: ۲۰۰۴، ابن ماجہ: رقم: ۴۲۴۶

(۳) ترمذی: رقم: ۲۰۱۸

«إِنَّ مِنْ أَكْمَلِ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَأَلْطَفُهُمْ بِأَهْلِهِ»[1].

بے شک مومنین میں ایمان کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامل ان میں سب سے اچھے اخلاق والے اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ نرمی ومہربانی کرنے والے ہیں''۔

یہ کچھ حصہ ہے جو آپ ﷺ نے اپنے بیان میں حسنِ خلق کے مرتبے کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ یہ وہ مرتبہ ہے جسے پانے کا ہر مسلمان شوق رکھتا ہے اور دلائل اس کو مہمیز کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر اجر وثواب بھی ہے۔

''اچھے اخلاق'' ،اچھے اخلاق والے کو کمالِ ایمان تک پہنچاتے اور اس کو اچھے مسلمانوں میں سے بنا دیتے ہیں۔اور یہ -اسی کے ساتھ ساتھ -ایک ایسی عبادت ہے جو نماز اور روزہ کی برابری کرتی ہے۔

اور یہ قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کے قرب کا وسیلہ ہے اور یہ انسان کا ذخیرہ اور محفوظ سرمایہ ہے، قیامت کے میزان میں اس کا خاص وزن ہے اور کون ہے جو لالچ نہیں کرے گا ان امور کے پانے کا؟ یہ تو وہ منزلِ مقصود ہے جسکے لیے ایک ایسا مسلمان آدمی کوشش کرتا ہے جس کی بصیرت وبصارت کو اللہ نے روشن کیا، پھر اس نے وہ عمل کیا جس میں اس کے لیے بھلائی ہے۔

عبادات واخلاق:

عبادتیں اسلام کی ارکان ہیں، ان پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔عبادت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف خالص توجہ اور اسی کے لیے جھکنے کا نام ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان عبادتوں کے بہت سے آثار ونتائج مسلمان کی اسی دنیوی زندگی میں متعین کیے ہیں اس کی آخرت سے پہلے۔

منجملہ ان آثار کے یہ ہے کہ عبادات فی نفسہٖ اخلاقی عمارت کو مضبوط کرتی ہیں اور مختلف قسم کے دعائم سے اخلاقی عمارت کو مضبوطی میں ترقی عطا کرتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ درجۂ احسان کو پہنچادیتی ہیں، ہم یہاں اُن میں سے بعض کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے نماز کی بابت ارشاد فرمایا:

﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ ۖ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ {العنکبوت:۴۵}

نماز قائم کرو، بے شک نماز بے حیائیوں اور برائیوں سے روک دیتی ہے۔

(۱) ترمذی: رقم: ۲۶۱۲

یعنی نماز قائم کرنے اور اس کی پابندی کرنے کا نتیجہ ہے بے حیائیوں، برائیوں اور فواحش کا چھوڑنا اور نفس کا ان سے پاک ہونا اور یہی اخلاقی عمارت کی بنیاد واساس ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کے بارے میں فرمایا:

﴿ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمۡ وَتُزَکِّیۡہِمۡ بِہَا ﴾ {التوبۃ:۱۰۳}

آپ ان کے مالوں سے صدقہ (زکوۃ) وصول کیجئے اور اس کے ذریعے ان کو پاک وصاف کیجئے۔

بے شک صدقہ نفس کی خامیوں اور بخل کی گندگیوں کے میل کچیل سے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے روزہ کے بارے میں فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾ ﴾ {البقرۃ:۱۸۳}

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح فرض کیا گیا تھا اُن لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

روزہ نفس کو کھانے پینے اور شہوت سے محدود وقت کے لئے روکنا ہے۔ یعنی روزہ نفس کی ممنوع مرغوبات سے رکنے اور باز رہنے کی تربیت ہے۔

اِسی چیز کی تشریح حدیث شریف میں کی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنۡ لَمۡ یَدَعۡ قَوۡلَ الزُّوۡرِ وَالۡعَمَلَ بِہٖ فَلَیۡسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِیۡ أَنۡ یَّدَعَ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ» (۱).

جس شخص نے باطل اور جھوٹ بات کو اور اس پر عمل کرنے کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کو کوئی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

اللہ تعالیٰ نے حج کی بابت فرمایا:

﴿ اَلۡحَجُّ اَشۡہُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِیۡہِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِی الۡحَجِّ ؕ ﴾ {البقرۃ:۱۹۷}

حج کے چند معلوم (مقرر) مہینے ہیں؛ پس جس نے ان مہینوں میں (اپنے اوپر) حج لازم کر لیا تو اسے اپنی عورت سے میل ملاپ کرنا، گناہ کرنا اور جھگڑا کرنا حج کے زمانے میں جائز نہیں۔

اس طرح یہ عبادتیں اخلاق کے ستونوں کو مضبوط کرنے اور ان کو بڑھانے میں حصہ لیتی ہیں۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۱۹۰۳

طور وطریقہ میں اخلاق کی حیثیت:

یہ دین اپنے اجزاء وارکان پر مشتمل ایک اکائی ہے اور مضبوط عمارت ہے، اس کا ہر کنارہ دوسرے کناروں میں پھنس کر پھیلتا ہے۔

جب ہم اس کے کسی ایک ہی پہلو کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو یہ کسی ضرورت کے دباؤ کے سبب سے ہوتا ہے، کیونکہ بحث و تحقیق کے پیشِ نظر تجزیہ ضروری ہوتا ہے، یہ خیال رہے کہ اخلاقی احکام کو قضائی و عدالتی احکام سے جدا کرنا ممکن نہیں، جیسا کہ اقتصادی و معاشی احکام کو اجتماعی و معاشرتی احکام سے الگ کرنا ممکن نہیں، پس یہ باہم مرتبط و منتظم اجزاء کا ایک جامع نظام ہے۔

اس فقرے میں ہم جس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، وہ یہ کہ اسلامی طریقے میں نظامِ اخلاق کے تمام اجزاء مکمل ہو چکے ہیں، یہ اکمال واتمام دوسرے نظاموں میں موجود نہیں۔ مکی دور میں نازل شدہ قرآن پر ایک نگاہ ڈالیں تو یہ بات ثابت ہو جائے گی۔ مکی مرحلہ انتہا کو نہیں پہنچا جب تک کہ مسلمانوں کے نفوس میں اخلاقی طریقے کی بنا مکمل نہیں ہو گئی، پھر تشریعی احکام اس کے بعد مدینے میں آنے شروع ہوئے۔ [1] .اور یہ اولیت وقت کے اعتبار سے ہے۔

اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ احکام، اخلاقی منہج کو رتبے کے اعتبار سے اولیت دیتے ہیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے درمیان معاملہ کرنے میں اصل یہ ہے کہ وہ اخلاقی بنیادوں پر قائم ہو اور اسے عدالتی فیصلے کی طرف نہ لے جایا جائے، بجز اس حالت کے کہ متعلقہ لوگ اخلاقی معیار پر تصفیے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ اور رتبے کے اعتبار سے یہ دوسری اولیت ہے۔ اور ہم نے ان نصوص کو دیکھا جو اس فقرۂ اولیٰ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، وہ اس کی تائید کرتی ہیں اور یہ امر اخلاقی منہج اور اُس منہج کو لانے والے رسول ﷺ کے درمیان مکمل یکجہتی و ہم آہنگی کی جانب توجہ مبذول کرانے اور ظاہر کرنے والا ہے۔ پس اس عقیدے میں اخلاقی عنصر نمایاں ہے اور رسولِ کریم ﷺ کی شخصیت میں اخلاقی عنصر نمایاں ہونے کی وجہ سے اللہ کی طرف سے آپ کی ثنا وارد ہوئی۔

اور اس عقیدے پر غور کرنے والا اس عقیدے کے رسول ﷺ کی سیرت پر غور کرنے والے

---

(۱) السِّيرَةُ النَّبَوِيَّةُ تَرْبِيَةُ أُمَّةٍ وَبِنَاءُ دَوْلَةٍ: ۷۲-۶۶

کی مانند اخلاقی عنصر کو آپ کی سیرت میں نمایاں اور اصل پائے گا۔اسی اخلاقی عنصر پر اس عقیدے کے تشریعی اور اخلاقی اصول کی بنیاد یکساں طور پر قائم ہے۔اس عقیدے میں سب سے بڑی دعوت طہارت، صفائی، امانت، صدق، عدل، رحمت، بھلائی، عہد کی حفاظت اور قول و فعل میں مطابقت اور ان دونوں (قول و فعل) کی نیت اور دل کے ساتھ مطابقت، ستانے اور ظلم کرنے سے ممانعت، دھوکہ وغداری سے ممانعت، لوگوں کے اموال کو غلط طور پر کھانے سے ممانعت، مقدسات اور آبرو پر دست درازی سے ممانعت اور کسی بھی شکل میں بے حیائیوں کی اشاعت سے ممانعت (کی دعوت دی گئی ہے)۔اور اس عقیدے میں قوانین ان ہی بنیادوں اور ضابطوں کی حمایت و حفاظت کے لیے ہیں، نیز احساسات وجذبات، طرزِ عمل، ضمیر و باطن کی گہرائی، معاشرے وماحول، انفرادی واجتماعی زندگی اور حکومتی تعلقات میں یکساں طور پر اخلاقی عنصر کی حفاظت کے لیے ہیں''۔[1]

دوسرا امر جس کی طرف اشارہ کرنا بہتر ہے وہ یہ ہے کہ اخلاقی عمارت بذاتِ خود باہم گٹھی ہوئی، قوی اور اس کے اجزا باہم متحد ہیں، اس لیے اخلاص اور سچائی ہر اخلاقی عمل میں داخل ہیں، جب تم امانت کے بارے میں بات کروگے تو اپنے آپ کو صدق و وفا کے میدان میں پاؤگے۔اسی طرح فواصل اور فروق وامتیازی امور اکثر اوقات اعتباری ہوتے ہیں۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ کے کلمات عام، جامع اور اسی ارتباط واتحاد کی تعبیر کرنے والے وارد ہوئے ہیں اور اُن ہی کلماتِ نبویہ (عَلٰی صَاحِبِهَا الصَّلٰوةُ وَالتَّحِيَّةُ) میں سے ہے: ''اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ''[2] یعنی ''بھلائی حُسنِ خلق ہے''۔

حضور ﷺ کا ایسے موقع پر کلمہ ''بِر'' کا استعمال بہت جامع ہے اس لیے کہ کلمۂ خیر، نیکی اور استقامت کے لیے عام عنوان ہے۔اسی وجہ سے ہم جس وقت آپ ﷺ کے شمائل میں سے ہر ایک کو الگ الگ مستقل عنوان کی شکل میں بیان کریں گے، تو ہمارا ایسا کرنا ان امور کو ذہنوں سے قریب کرنے اور وضاحت کرنے کے لئے ہوگا۔

---

(۱) فی ظلال القرآن: ۳۶۵۷/۶

(۲) مسلم: رقم: ۲۵۵۳، ترمذی: رقم: ۲۳۸۹، مسند احمد: رقم: ۱۷۶۳۱، دارمی: رقم: ۲۸۳۱

حُسنِ اخلاق اور تزکیہ:

حدیث شریف میں نماز شروع کرتے وقت آپ ﷺ کی یہ دعا وارد ہوئی ہے:

«اَللّٰهُمَّ ...... وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ»[1].

اے اللہ! مجھے سب سے بہتر اخلاق کا راستہ دکھائیے اس لیے کہ سب سے بہتر اخلاق کی آپ کے علاوہ کوئی ہدایت نہیں کر سکتا اور مجھ سے بُرے اخلاق کو دور کر دیجیے، بُرے اخلاق کو مجھ سے آپ کے علاوہ اور کوئی دور کرنے والا نہیں۔

یہ حدیث شریف اخلاق کی دو انواع ثابت کرتی ہے:

- اخلاقِ حسنہ
- اخلاقِ سیئہ

آدمی اچھے اخلاق والا جب ہوتا ہے جب اس کا نفس اخلاقِ سیئہ سے پاک اور اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ پس یہاں دو عمل ہیں: اول طہارت، دوسرا تزیین۔ عملی ترتیب کا تقاضا ہے کہ طہارت مقدم ہو، جب طہارت حاصل ہو جائے تو تزیین، تجمل اور تزکیے کی طرف متوجہ ہو، پس طہارت[2] زینت کے اختیار کرنے پر غالب اور مقدم ہے۔[3]

منطقی ترتیب یہ ہے کہ ہم پہلے اخلاقِ سیئہ اور ان سے چھٹکارے کی کیفیت بیان کریں پھر اخلاقِ حسنہ کی طرف منتقل ہوں۔

جبکہ یہاں اکثر اوقات خلقِ حسن کے ساتھ آراستہ ہونے اور اخلاقِ سیئہ سے نجات پانے کے درمیان تلازم ہے، اس لیے میں نے اس باب میں اخلاقِ حسنہ سے متعلق گفتگو کو ترجیح دی، اس وعدہ کے ساتھ کہ اخلاقِ سیئہ کی جو گفتگو یہاں نہیں آسکی اس کو دوسرے باب میں ان شاء اللہ بیان کروں گا۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۷۷۱، ابوداؤد: رقم: ۷۶۰

(۲) طہارت سے مراد نماز کی تیاری کے لیے کیا جانے والا وضو ہے۔

(۳) مراد اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ {الاعراف: ۳۱} ہے۔

دعاء:

جناب رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے میں حُسنِ اخلاق پر توجہ دیتے تھے، آپ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے۔

«اَللّٰهُمَّ كَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِي فَحَسِّنْ خُلُقِي»(۱).

اے اللہ! آپ نے جیسے میری تخلیق کو خوب صورت کیا، اسی طرح میرے اخلاق کو بھی سنوار دیجئے۔

«اَللّٰهُمَّ ...... وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ»(۲).

اے اللہ! مجھے سب سے بہتر اخلاق کی راہ دکھایئے اس لیے کہ سب سے بہتر اخلاق کی طرف آپ کے علاوہ کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا اور بُرے اخلاق مجھ سے پھیر دیجئے، بُرے اخلاق مجھ سے آپ کے علاوہ کوئی پھیر نہیں سکتا۔

---

(۱) المواهب اللدنیۃ: ۱/۳۲۶

(۲) مسلم: رقم: ۱۷۷، ابوداؤد: رقم: ۷۶۰

تیسری فصل
اخلاقی عمل کے اصول

تمہید:

جناب رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، ایک صاحب مسجد میں آئے اور نماز پڑھی، پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو سلام کیا تو رسول اللہ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا:

«ارْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ» فَرَجَعَ الرَّجُلُ فَصَلَّى كَمَا كَانَ صَلَّى، ثُمَّ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «وَعَلَيْكَ السَّلَامُ» ثُمَّ قَالَ: «ارْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ» حَتَّى فَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ الرَّجُلُ: وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا أُحْسِنُ غَيْرَ هٰذَا»[1].

واپس جاؤ اور پھر نماز پڑھو،اس لیے کہ تم نے (درحقیقت) نماز نہیں پڑھی (ناقص ہونے کی وجہ سے نہ پڑھنے کے برابر ہے)، تو وہ صاحب واپس گئے اور پھر ویسی ہی نماز پڑھی جیسی پہلے پڑھی تھی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا تو آپ ﷺ نے ''وعلیکم السلام'' کہا اس کے بعد آپ نے فرمایا: واپس جاؤ اور پھر نماز پڑھو: اس لیے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی، یہاں تک کہ (اُن کے ساتھ) یہ (لوٹانے اور نماز دہرانے کا) معاملہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا، تو ان صاحب نے کہا: اُس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا (مجھے معلوم نہیں، اس لیے) اس سے اچھی نماز میں نہیں پڑھ سکتا۔

اس آدمی نے تین مرتبہ نماز پڑھی اور ہر مرتبہ آپ ﷺ فرماتے رہے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات انسان کوئی کام کرتا ہے اس کے باوجود اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے، اس لیے کہ اس عمل نے مطلوبہ صفات کے مکمل نہ کرنے کی وجہ سے متوقع نتیجہ نہیں دیا۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۷۹۳، م: ۳۹۷۔ حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں۔

اسی وجہ سے اسلامی طریقے نے عمل کے لیے کچھ اصول وضع کر دیے؛ تاکہ وہ اعمال صحیح اور مقبول ہوں۔

ہم اخلاقی نظام سے متعلق اِن اصولوں کو بیان کریں گے تاکہ پڑھنے والے کے سامنے ایسے پیمانے ہوں جن سے وہ اپنے اعمال کو ناپ سکے، تاکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کی امید ہو جائے۔

(۱) قول وعمل کے درمیان مطابقت:

نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے کبھی کوئی بات فرمائی ہو، پھر اس کے خلاف عمل کیا ہو، بے شک آپ ﷺ کے قول و فعل میں پوری پوری موافقت تھی، رسالت سے پہلے بھی اور بعد میں بھی، مکے میں بھی، مدینے میں بھی۔ اگر ایسی کوئی چیز واقع ہوتی تو وہ آپ ﷺ کے دشمنوں کے ہاتھ میں ایسی حجت ہوتی کہ وہ ثبوت میں پیش کرتے؛ لیکن (بحمد اللہ) یہ شکل پیدا ہی نہیں ہوئی۔ اور مسلمانوں کی زندگی کے تمدنی مرحلے کے آغاز کے ساتھ ہی بہت سی آیاتِ کریمہ نازل ہوئیں تاکہ حضراتِ صحابۂ کرام میں اخلاقِ کریمہ پیدا کر سکیں۔

چنانچہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے اللہ عزوجل کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل کے بارے میں دریافت کیا اور عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ کاش اللہ تعالیٰ افضل عمل بتلا دیتا تو ہم عمل کرتے تو آپ ﷺ نے ان کو بتایا کہ: وہ عمل ''جہاد'' ہے، تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض کو ناگوار ہوا تو ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا سخت غصہ اللہ کے اس قول میں آیا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ {الصف: ۳-۲}

اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس کو کرتے نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات انتہائی ناپسندیدہ اور قابلِ نفرت ہے کہ تم ایسی بات کہو جس کو خود نہ کرو۔

اس کے ساتھ ہی قرآنی تربیت حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی مکے میں نازل ہوئی؛ جبکہ اپنی قوم سے حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ﴾ {ھود: ۸۸}

اور میں یہ نہیں چاہتا کہ بعد میں وہ کام خود کروں جس سے تم کو روکوں۔

یعنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ میری شان یہ نہیں ہے کہ کسی چیز سے تم کو منع کروں اور پھر میں خود اس کو کرلوں۔ انبیاء علیہم السلام کی شان کے خلاف ہے کہ اس بُری صفت سے متصف ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے شعراء کی مذمت بیان فرمائی اور برائی کے، منجملہ اسباب کے اس بات کا بھی ذکر فرمایا:

﴿وَاَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا يَفۡعَلُوۡنَ﴾ {الشعراء:۲۲۶}

وہ لوگ ایسی بات کہا کرتے ہیں جس کو وہ کرتے نہیں۔

اس طرح کی بُری خصلت (دوغلا کردار) قول و فعل کے درمیان عدمِ مطابقت منافقین کی روش ہے جس میں وہ ممتاز اور نمایاں تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِذَا جَآءَكَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ‌ۘ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشۡهَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَـكٰذِبُوۡنَ‌ۚ﴾ {المنافقون:۱}

جب منافقین تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تو جانتا ہی ہے کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ ان کو جھٹلا رہا ہے، ان کے قول کو نہیں جو کہ ﴿اِنَّكَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ﴾ "بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں" ہے؛ بلکہ ان کو صرف اس لیے جھٹلا رہا ہے کہ ان کے قول اور فعل کے درمیان مطابقت نہیں ہے۔ یہ خرابی ایک پہلو سے ہوئی اور دوسرے لحاظ سے ان کا قول ان کی نیت کے مطابق نہیں ہے، یہ دوسرا خلل ہے۔ بے شک قول و فعل کے درمیان مطابقت؛ عمل کے صحت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی ہے۔

(۲) نیت:

عمل کی سلامتی کے لیے دوسرا قاعدہ ہے قول و فعل کا نیت کے ساتھ مطابق ہونا۔ اس کے بارے میں ہم اگلی فصل میں اخلاص کے عنوان کے ذیل میں بیان کریں گے۔

(۳) اسوۂ حسنہ کے خط پر چلنا:

صحتِ عمل کے لیے پہلا قاعدہ کلیہ، فعل اور قول کے درمیان مطابقت ہے اور دوسرا قاعدہ کلیہ قول و عمل کا نیت کے مطابق ہونا ہے۔ تو کیا یہ دونوں قاعدے کافی ہیں؟

جواب یہ ہے کہ (یہاں پر) ایک تیسرے ضابطے کی ضرورت ہے:

وہ یہ ہے کہ ''عمل پورا کا پورا یعنی قول، فعل اور نیت اپنے مجموعے کے ساتھ خطِ منہج یا خط ''اسوہ'' کے مطابق ہو''۔ اس باب کی فصلِ اول میں اس موضوع سے متعلق گفتگو گزر چکی ہے، جہاں ہم نے کہا ہے کہ: ''اخلاقِ نبی ﷺ ہی معیار ہے جس سے دوسروں کے اخلاق کی درستی کو ناپ تول کر دیکھا جائے گا''۔ ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ اس پیمانے کا وجود ضروری ہے؛ تاکہ (صحیح و غلط اخلاق کی شناخت میں) خلل واقع نہ ہو اور قرآنِ کریم نے بھی اس پہلو کو زور دے کر بیان فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ {الاحزاب:۲۱}

بے شک تمھارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی ذاتِ گرامی میں ایک عمدہ نمونہ و طریقہ ہے ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن سے امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔

آپ ﷺ پیشوا ہیں اور پیشوا کے نقشِ قدم کی اتباع کی جاتی ہے، پس عمل کا ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ خطِ اسوہ اور نقشِ قدم کے برابر برابر ہو جائے۔ آیتِ کریمہ کی مراد و مدلول میں سے بعض کو نبی ﷺ نے اپنے اس ارشادِ گرامی میں واضح کیا ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(۱).

جس نے کوئی ایسا عمل کیا جو ہماری شریعت میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔

اس کی مثال وہ ہے جو (اِس فصل کی) ''تمہید'' میں اچھی طرح نماز نہ پڑھنے والے صحابی کی حدیث میں گزری، چنانچہ وہ صحابی مسجد میں داخل ہوئے پھر نماز پڑھی، ان کا فعل و قول نیت کے مطابق تھا لیکن قول و فعل اور نیت اس اسوے کے مطابق نہ تھے جو نماز کی کیفیت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے پیش فرمایا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»(۲).

تم نماز ایسی پڑھو جیسا تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۲۶۹۷، م: ۱۷۱۸

(۲) بخاری: رقم: ۶۳۱

تو آپ ﷺ نے اُن صحابی سے فرمایا: ''واپس جاؤ پھر نماز پڑھو، اس لیے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی''۔

اس مثال میں پیروی اور اتباع کے فقدان نے عمل کو باطل کر دیا۔

خلاصہ:

اخلاقی عمل کے لیے: تا کہ اُسے اچھا عمل کہا جا سکے، بلکہ ہر عمل کے لیے تین امور کا پورا کیا جانا بے حد ضروری ہے۔[1]

(۱) عمل خواہ فعلی ہو یا قولی، ضروری ہے کہ وہ حَسَن ہو۔

(۲) یہ کافی نہیں ہے کہ صرف اس کا ظاہر حَسَن ہو، بلکہ ضروری ہے کہ اسکا باعث یعنی نیت بھی صحیح ہو اور ظاہر کے موافق ہو۔

(۳) حُسنِ عمل و حُسنِ نیت بھی کافی نہیں ہے بلکہ وہ منہجِ اسلامی (اور اسوۂ نبی ﷺ) کے موافق ہو، یہ بھی ضروری ہے۔

---

(۱) یہ ضوابط اخلاق ہی کے ساتھ خاص نہیں ہیں؛ بلکہ یہ منہجِ اسلامی کی خصوصیات میں سے ہیں، اسی وجہ سے منہجِ اسلامی کے تمام شعبوں میں یہ ضوابط کارفرما ہوں گے، اگر اس کی تفصیلات دیکھنی ہو تو دیکھیے: (اَلظَّاهِرَةُ الْجَمَالِيَّةُ فِي الْإِسْلَامِ: ۲۳۸-۲۰۵ اور اَلتَّرْبِيَةُ الْجَمَالِيَّةُ فِي الْإِسْلَامِ: ۱۶۸-۱۵۹)۔ یہ دونوں المکتب الاسلامی کی مطبوعات ہیں۔

چوتھی فصل

اخلاص

اخلاص کے معنیٰ:

ہر چیز خواہ مادی ہو یا معنوی اس میں کسی ملاوٹ یا گندگی وغیرہ کا مل جانا ممکن ہے، جب وہ چیز ان عیب دار چیزوں سے صاف ہو تو اس کا نام ''خالص'' رکھا جاتا ہے اور بے ملاوٹ صاف ستھرے فعل کو ''اخلاص'' کہا جاتا ہے۔[1]

اخلاص جب اپنے اسلامی معنوں میں بولا جاتا ہے تو مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسان جو کام کرتا ہے اُس کا باعث یعنی اُس پر ابھارنے والی چیز اللہ تعالیٰ کی مرضی کی تلاش ہو اور اس باعث میں نفسانی خواہشات وغیرہ کی کوئی آمیزش نہ ہونے پائے۔ اخلاص کا حکم بہت سی آیات میں وارد ہوا ہے جن میں سے بعض کو ہم ذکر کرتے ہیں:

❖ اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ {البینۃ: ۵}

اور ان کو یہی حکم ہوا کہ عبادت کریں اللہ کی، اُس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔

❖ اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ﴾ {الزمر: ۳-۲}

بے شک ہم نے یہ کتاب ٹھیک طور پر تمھاری طرف نازل کی ہے، سو اللہ کی فرماں برداری پر نظر رکھ کر اس کی عبادت کرو۔ سنو! اللہ ہی کے لیے ہے خالص بندگی۔

❖ اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ۝ ﴾ {الزمر: ۱۴}

تو کہہ، میں اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں خالص کر کے اپنی بندگی اس کے واسطے۔

---

(۱) احیاء علوم الدین للامام الغزالی (۳۷۹/۴)

❖ اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾﴾

{الانعام: ۱۶۳-۱۶۲}

تو کہہ کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو پالنے والا سارے جہاں کا ہے، کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔

نبی ﷺ کا اخلاص:

آپ ﷺ کے اخلاص میں ذرہ برابر شک نہیں، آپ ہی ہیں جنھوں نے اپنے طرزِ زندگی اور عمل کے ذریعے سابقہ آیات کے معانی کو اجاگر کیا، ایسے ہی اُن کے معنیٰ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کی عملی تربیت کے ذریعے اپنے اقوال سے بیان فرمائے۔

اور بہت سی آیات میں رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی تعریف آپ ﷺ کے اخلاص کی شہادت کے لیے کافی ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ میں اخلاص نہ ہوتا تو اس ذات کی طرف سے ۔جو ظاہر و پوشیدہ سب کو جانتا ہے۔ آپ ﷺ کی یہ تعریف نہ ہوتی۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آپ ﷺ کی شمائل میں لکھنے والوں نے اخلاص جیسی اہم چیز کا ذکر نہیں کیا، اس کا سبب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی نظر ان ظاہری امور پر مرکوز رہی کہ جن کے لیے وہ شواہد اور مثالیں پاتے تھے، مثلاً آپ ﷺ کی شجاعت اور داد و دہش، اور اخلاص قلب کا عمل ہے اور اس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سوا اور کوئی مطلع نہیں ہوتا اور آپ ﷺ کے حق میں جیسا کہ ہم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی شہادت کسی تائید کی محتاج نہیں۔

اس موضوع کے ضمن میں حضور ﷺ کے جو اقوال ہم لا رہے ہیں ان سے ہم آپ ﷺ کے مرتبۂ اخلاص کو جان لیں گے، ان میں وہ تفصیل ہے جس کے بعد کسی اور تفصیل کی حاجت نہیں۔

اخلاص کی بنیادیں اور اس کے لازمی اجزا:

اخلاص کو جاننے کے لیے دو امور کا وجود ضروری ہے:

(۱) نیت کو جاننا جس میں اخلاص کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔

(۲) اس نیت کو ملاوٹوں اور خرابیوں سے صاف کرنا اور ان ملاوٹوں اور خرابیوں کو جاننا تاکہ مسلمان ان سے بچے اور اس کے اعمال اکارت ہونے سے بچ جائیں۔ ہم ذیل کی سطور میں ان دونوں اجزاء کو حتی الوسع بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰہِ۔

نیت کی تعریف:

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''نیت قصد ہے اور یہ قلب کا مضبوط ارادہ کرنا ہے''۔ اور علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''قلب کا آمادہ ہونا اُس عمل کی انجام دہی کے لیے جسے وہ اپنی ضرورت کی تکمیل کے موافق پاتا ہو، فوری طور پر، یا انجامِ کار کے طور پر۔ یہ آمادہ ہونا خواہ کسی نفع رساں چیز کے حصول کے لیے ہو، یا کسی ضرر رساں چیز سے بچاؤ کے لیے۔'' اور شریعت نے اس کی تخصیص اُس ارادۂ فعل سے کی ہے جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول اور اس کے حکم کی تعمیل ہو۔[1]

اگر ہم نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی طرف رجوع کریں تو ہم محسوس کریں گے کہ اس میں اس کو بہت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ تمام مسلمانوں نے مکے سے مدینے کی طرف اپنے دین کے شعائر کو قائم کرنے کے لیے ہجرت کی، لیکن ایک آدمی نے ہجرت کی ام قیس نامی عورت سے نکاح کے لیے۔[2] پس اس کو مہاجر ام قیس کہا جانے لگا۔ حدیث شریف آرہی ہے جو اس پر تبصرہ اور اعمال کی حیثیت کو بیان کرتی ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوَىٰ، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: اے لوگو! اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے اور آدمی کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی، پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہو گی تو (اجر و ثواب کے اعتبار سے) اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف قرار پائے گی اور جس نے دنیا کے لیے (دنیا

---

(۱) فتح الباری: ۱/۱۳

(۲) فتح الباری: ۱/۱۰، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس کی سند بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔

هَاجَرَ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا، أَوِ امْرَأَةٍ يتزوَّجُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ»[1].

کو حاصل کرنے کے لیے) ہجرت کی یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کی تو (نتیجے کے اعتبار سے) اس کی ہجرت اسی طرف ہو گی جس کے لیے اس نے ہجرت کی ہے۔

اس موقع پر آپ ﷺ کا یہ ارشاد مبنی بر حقیقت عملی بیان ہے۔ اس سے دینِ اسلام کے اہم قاعدے اور اہم معنیٰ کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ دو مہاجر ہیں ان میں سے ہر ایک نے اپنا شہر چھوڑا، اپنی جائے پیدائش چھوڑی اور اپنے گھر والوں کو اور اپنے احباب کو اور اپنے پڑوسیوں کو چھوڑا اور مکے مدینے کے درمیان کی مسافت انتہائی دشوار حالات میں طے کی اور پھر مدینے میں قیام پذیر ہوئے؛ لیکن پہلے نے اللہ کے شعائر قائم کرنے کی غرض سے ہجرت کی اور دوسرے نے ایک عورت تک پہنچ کر اس سے نکاح کرنے کی خاطر ہجرت کی، پس دونوں آدمیوں نے عمل تو ایک ہی کیا ہے؛ لیکن سبب اور محرک مختلف ہے، یہی محرک اور سبب وہ چیز ہے جس کا نام رسول اللہ ﷺ نے "نیت" رکھا۔ اول کی نیت اس کے عمل کے موافق ہے اس لیے حقیقی مہاجر ہوا (حق کے ساتھ ہجرت کرنے والا ہوا)، جبکہ دوسرے کی نیت اس چیز کے مطابق نہیں تھی جس کے لیے ہجرت مشروع کی گئی تھی تو اس کے لیے نہ ہجرت کی فضیلت ہے نہ اس کے بلند رتبے کا کوئی حصہ۔ جب ہم نے وہ معنیٰ سمجھ لیے جس کو حدیث نے واضح کیا ہے تو اس کے بعد تعریفات ہمارے لیے اہم نہیں رہ گئیں۔

نیت میں پیدا ہونے والے عیوب:

وہ عیوب جو نیت میں پیدا ہو جاتے ہیں بہت ہیں، یہ وہ نقص اور عیوب ہیں جو نیت میں سرایت کرتے ہیں تو اس کے جمال کو ختم کر دیتے ہیں، اس کی صفائی اور نکھار پن میں گندگی پیدا کر دیتے ہیں اور اس کی شکل بدل دیتے ہیں۔ حاصل یہ کہ "اخلاص" نیت کو ان عیوب سے پاک کرنے کا نام ہے جو اس میں سرایت کر جاتے ہیں، نیز اس کے جمال اور صفات کی محافظت کرنے کا نام ہے اور یہ ایسی بات ہے جو غیر معمولی محنت و کوشش کی محتاج ہے، بہتر ہے کہ ہم ان عیوب میں سب سے سنگین عیب سے واقف ہوں۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۹۵۳، م: ۱۹۰۷

(۱) ریا:

ریا یہ ہے کہ انسان عبادت اور اس کے اظہار سے لوگوں کے قلوب میں مرتبہ حاصل کرنا چاہے۔ یہ منافقین کی صفات میں سے ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کی اِس صفت کا تذکرہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ {النساء: ۱۴۲}

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہیں، حالانکہ اللہ نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

اور ریا شرکِ اصغر ہے جیسا کہ آپ ﷺ کے ارشادِ مبارک میں وارد ہوا:

''مجھے تم پر سب سے زیادہ ڈر جس چیز کا ہے وہ شرکِ اصغر ہے، حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ریا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس وقت فرمائیں گے جبکہ بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیں گے: جاؤ اُن لوگوں کے پاس جن کو دکھانے کے لیے تم دنیا میں عمل کرتے تھے، دیکھو کیا تم کو ان کے پاس بدلہ ملتا ہے؟''[(۱)]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

''ارشادِ باری تعالیٰ ہے: میں شرکاء کے شرک سے بے نیاز ہوں، جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے علاوہ کسی کو شریک کیا تو میں اُس کو اور اس کے شرک (دونوں) کو چھوڑ دیتا ہوں''۔[(۲)]

رسول اللہ ﷺ اس خبیث مرض سے نفوس کی طہارت و پاکیزگی پر بے حد توجہ دیتے تھے جو عمل کو برباد اور ختم کر دیتا ہے اور ریاکار کے لیے حسرت وندامت کے سوا کچھ باقی نہیں رکھتا۔

آپ ﷺ نے اس کی وضاحت اور اس سے ڈراتے ہوئے فرمایا:

''سب سے پہلا آدمی جس کے خلاف قیامت کے دن فیصلہ کیا جائے گا وہ آدمی ہے جو راہِ خدا میں شہید ہوا ہوگا، اس کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا تو وہ پہچان لے گا، تب اللہ تعالیٰ

---

(۱) مسند احمد، بیہقی۔

(۲) مسلم: رقم: ۲۹۸۵

فرمائے گا: تم نے ان کے بارے میں کیا کیا؟ تو وہ کہے گا: آپ کے لیے میں نے قتال کیا یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم نے جھوٹ کہا؛ بلکہ تم نے قتال اس لیے کیا کہ تم کو بہادر کہا جائے سو وہ کہا جا چکا۔ پھر اس کے لیے حکم ہوگا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

دوسرا وہ آدمی ہے جس نے علم سیکھا اور اس کو سکھایا اور قرآن پڑھا، اس کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا تو وہ پہچان لے گا، تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ان کے سلسلہ میں تو نے کیا کیا؟ تو وہ کہے گا کہ میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور آپ کے لیے میں نے قرآنِ کریم کی تلاوت کی۔ اللہ فرمائے گا: تم نے جھوٹ کہا، بلکہ تم نے علم اس لیے سیکھا تا کہ تم عالم صاحب کہے جاؤ اور قرآن اس لیے سیکھا تا کہ قاری صاحب کہے جاؤ سو وہ تو کہا جا چکا۔ پھر حکم ہوگا اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے گا، یہاں تک کہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

تیسرا وہ آدمی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے وسعت (مالی) فرمائی اور ہر قسم کا مال اس کو عطا کیا، اس کو بھی لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں یاد دلائے گا تو وہ ان کا اقرار کرے گا، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم نے ان کے بدلے میں کیا کیا؟ تو وہ جواب دے گا کہ میں نے کوئی راستہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں خرچ کرنے کو تو پسند کرتا ہو، مگر میں نے تیرے لیے اس میں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم نے جھوٹ کہا، تم نے (یہ سب) اس لیے کیا تھا تا کہ تم سخی کہے جاؤ سو یہ (دنیا میں) کہا جا چکا، پھر اس کے لیے حکم کیا جائے گا اور اس کو منہ کے بل گھسیٹا جائے گا اور اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔‘‘[۱]

ف: یہ حدیث شریف غایت درجہ موجبِ عبرت و نصیحت ہے اس کو ملحوظ رکھنا چاہئے خواہ شہید ہو یا عالم ہو یا سخی ہو۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ۔[۲]

(۲) نفس کی خواہشات:

کبھی آدمی کوئی کام لوگوں کو دکھانے کے لیے تو نہیں کرتا، مگر وہ اس عمل سے لوگوں میں خوشنما بننے کی خواہش رکھتا ہے، ان سے تعریف کی خواہش کرتا ہے، یا اُن کی برائی سے بچنے کے لیے یا پھر اُن سے تعظیم کرانے کے لیے کرتا ہے۔ ان خواہشات پر وہ سوالات دلالت کرتے ہیں جو حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سلسلے میں بار بار کیے ہیں۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۹۰۵

(۲) قمر الزماں۔ مترجم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایک آدمی ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کا ارادہ رکھتا ہے، مگر اس کا مقصد دنیا کا سامان (مال و متاع) ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کے لیے کوئی اجر نہیں، تو لوگوں نے اس کو بڑی بات سمجھا اور اس آدمی سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لوٹ کر جاؤ (اور پھر پوچھو) شاید تم اپنی بات رسول اللہ ﷺ کو سمجھا نہیں پائے، تو وہ واپس گئے اور عرض کیا اے اللہ کے رسول! ایک آدمی اللہ کی راہ میں جہاد کا ارادہ کرتا ہے جبکہ وہ دنیا کے سامان کو طلب کرتا ہے[1]، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے لیے کوئی اجر نہیں۔ (ان صاحب نے لوگوں سے آکر آپ ﷺ کا جواب بتایا تو پھر) لوگوں نے کہا: تم رسول اللہ ﷺ کے پاس لوٹ کر جاؤ، تو آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ بھی یہی فرمایا کہ اس کے لیے کوئی اجر نہیں۔''[2]

یہ حدیث ہمارے سامنے صورت واضح اور نمایاں کرتی ہے کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو کتنی دلچسپی تھی کہ آپ ﷺ کا دوسرا جواب پہلے جواب کے علاوہ ہو، اسی وجہ سے انھوں نے اس آدمی سے بار بار لوٹ کر جانے کا مطالبہ کیا تاکہ وہ سوال کو دہرائیں تو شاید ان کو دربارِ نبوت سے دوسرا جواب مل جائے۔ واضح رہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی بشر ہی ہیں، ان کی بھی خواہشات اور مرغوبات ہیں، لیکن جب وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کا کلام سنتے تو اپنی رغبتوں اور خواہشات کو اس کے سامنے ختم کر دیتے تھے جس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ اُن سے مطالبہ کرتے۔

اس سائل نے اپنے سوال کو مادی دنیا کے سامان کے لیے خاص کیا تو ایک دوسرے سائل نے سوال میں تنوع پیدا کر کے سوال کیا، اس نے اس چیز کی بابت سوال کیا جو عموماً لوگوں کی پسند ہوتی ہے، یعنی ظاہری اور معنوی چیز کی بابت، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا:

''ایک دیہات کے رہنے والے صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو مالِ غنیمت کے لیے جہاد کرتا ہے، دوسرا آدمی جہاد کرتا ہے تاکہ مجالس میں اس کا ذکر ہو، ایک

---

(۱) اگر اس کی حقیقی نیت ابتدا سے مال حاصل کرنے کی ہو، جہاد کی نیت بالکل نہ ہو تو اس کو مطلق اجر نہیں ملے گا اور اگر جہاد کے ساتھ مال کی بھی نیت ہو تو کامل اجر نہیں ملے گا۔ دیکھیے: بذل المجهود: ۹/ ۴۷۔ از مصحح

(۲) ابوداؤد: رقم: ۲۵۱۶، نسائی: رقم: ۳۱۴۰

اور آدمی جہاد کرتا ہے تاکہ لوگ اس کا مرتبہ پہچانیں۔ اور ایک روایت میں ہے: ایک آدمی قتال کرتا ہے قبائلی حمیت کی خاطر، دوسرا بہادری دکھانے کے لیے اور تیسرا دکھاوے کے لیے، پس ان میں سے کون اللہ کی راہ میں ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے قتال اس لیے کیا تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو وہ اللہ کی راہ میں ہے''۔(۱)

یعنی جن چیزوں کا اوپر سوال میں ذکر ہوا ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ کی راہ میں نہیں ہے۔

اس طرح آپ ﷺ کی احادیث اور آپ ﷺ کے بیان سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سیکھا کہ اخلاص کیسے پیدا ہوتا ہے، وہ اپنے نفسوں سے کیسے جہاد کریں اور نفسوں کی خواہشات کا مقابلہ کیسے کریں؟ تاکہ ان کو ایسا صاف و خالص عمل حاصل ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہو سکے۔

اخلاص قلب کا عمل ہے:

گذشتہ بیان سے یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ اخلاص قلب کے اعمال میں سے ہے اور اسی لیے اس کا معاملہ خود صاحبِ عمل سے متعلق ہے، وہی ہے جو اپنے بارے میں اخلاص یا عدمِ اخلاص کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ لوگوں کے پاس ایسا پیمانہ نہیں ہے جس کے ذریعے وہ کسی شخص کے اخلاص کو ناپ سکیں، بلکہ اس کا تعلق خود آدمی کی اپنی ذات سے ہے۔

یہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان خصوصی معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ کریم میں منافقوں کی برائی بیان کی کہ انھوں نے اپنے آپ سے ایسے فیصل تجویز کر لیے جو لوگوں کی نیتوں اور محرکات پر فیصلے کرتے تھے۔

امام بخاری و مسلم نے حدیث بیان کی ہے جو حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ انھوں نے فرمایا:

''جب ہم کو صدقہ دینے کا حکم دیا گیا تو ہم سامان ڈھونے کی مزدوری کرتے(۲)، چنانچہ ایک

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۱۲۶، ۳۱۲۶، ۷۴۵۸، م: ۱۹۰۴

(۲) اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ ہمیں صدقہ کی ترغیب دیتے تھے تو جس شخص کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہ ہوتا وہ بازار جاتا اور مزدوری پر لوگوں کا سامان اٹھاتا اور آکر وہی مزدوری صدقہ کر دیتا، جیسا کہ حدیث کے راوی حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے کیا، ان کی حدیث بخاری میں ہے۔ (بخاری: رقم: ۲۲۷۳)

صحابی ابو عقیل رضی اللہ عنہ نصف صاع (غالباً کھجور) لے کر آئے اور ایک آدمی اس سے زیادہ لے کر آئے تو منافقین نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس کے صدقے سے مستغنی ہے اور اس دوسرے نے تو صرف دکھاوے کے لیے یہ (صدقہ) کیا ہے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ﴾ {التوبۃ:۷۹}(۱).

جو لوگ طعن کرتے ہیں اُن مسلمانوں پر جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور اُن پر جو اپنی محنت کے سوا طاقت نہیں رکھتے۔

پس اخلاص کا میدانِ عمل نیت ہے اور اس کی جگہ قلب ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”جان لو تم کہ جاہل اور ناواقف ہماری بیان کردہ تفصیل کے ساتھ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: ”إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“ کو سنتا ہے تو وہ اپنے دل میں سبق پڑھاتے وقت یا اپنی تجارت کے وقت یا اپنے کھانے کے وقت کہتا ہے میں نے نیت کی کہ میں اللہ کے لیے پڑھاتا ہوں یا اللہ کے لیے کھاتا ہوں اور اس کو وہ نیت گمان کرتا ہے، حالانکہ یہ نیت کہاں؟ یہ تو نفسانی بات ہے، یا زبانی بات ہے، یا ایک سوچ ہے، یا ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف انتقال ہے، جبکہ نیت ان سب سے الگ چیز ہے۔ نیت تو نفس کے میلان اور اس کے متوجہ ہونے کا نام ہے۔“(۲).

یہ انتہائی باریک بات ہے، نیت محض کلمۂ ”نَوَيْتُ“ کا نام نہیں، نہ یہ نفسانی بات ہے اور نہ محض خیال ہے کہ جلدی سے فکر پر گزر جائے؛ بلکہ نیت ایسا عمل ہے جس کا قلب عزمِ مصمم کرتا ہے۔

اخلاص تمام اعمال میں پایا جاتا ہے:

اخلاص کوئی مستقل قائم بذاتہ چیز نہیں ہے (اس کا اپنا الگ وجود نہیں ہے)؛ بلکہ دوسرے کے سہارے پایا جاتا ہے، اس لیے کہ اخلاص ایک معنوی چیز ہے جو قائم بذاتہ نہیں ہوتی، اسی لیے یہ نہیں کہا جاتا: ”عَمِلَ الْيَوْمَ فُلَانٌ إِخْلَاصًا“ (فلاں نے آج اخلاص کیا) اِلّا یہ کہ ہم یہ مراد لیں کہ فلاں نے ایک کام کیا اور اس میں اخلاص اختیار کیا۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ یوں

---

(۱) متفق علیہ: خ:۴۶۶۸، م:۱۰۱۸.

(۲) احیاء علوم الدین: ۴/۳۷۳

کہیں: ''أَخْلَصَ فُلَانٌ فِي عَمَلِهِ، وَأَخْلَصَ فِي صَوْمِهِ'' فلاں شخص نے اپنے عمل میں اخلاص اختیار کیا اور اپنے روزے میں اخلاص اختیار کیا۔

حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد وارد ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ خَالِصًا، وَابْتُغِيَ بِهِ وَجْهُهُ»(۱). اللہ تعالیٰ اُسی عمل کو قبول کرتا ہے جو خلوص والا ہو اور اس عمل سے اللہ کی رضا مطلوب ہو۔

پس آپ ﷺ نے اخلاص کو عمل کا ایک وصف قرار دیا۔ اخلاص تمام اعمال میں پایا جاتا ہے۔ یہ حُسنِ عمل کے ضوابط میں سے ایک ضابطہ ہے جیسا کہ ہم نے اس سے پہلی فصل میں ذکر کیا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جس نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو آمادہ کیا کہ اپنی کتاب ''الجامع الصحیح'' کو حدیث ''إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' سے شروع کریں، اسی طرح امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کو آمادہ کیا کہ اپنی کتاب ''ریاض الصالحین'' کو بَابُ الْإِخْلَاصِ وَإِحْضَارِ النِّيَّةِ (اخلاص کا تمام اعمال میں پایا جانا) سے شروع کریں۔

نیت پر ثواب:

اگلے سوال پر اب ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اگر نیت کسی عمل کی شکل اختیار نہ کرے تو وہ محلِ اجر و ثواب یا محلِ گناہ ہے یا نہیں؟

اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اگلی نصوص پڑھنا چاہیے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس ہوئے اور مدینے کے قریب پہنچ گئے تو فرمایا: بے شک مدینے میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے کوئی مسافت اور کوئی وادی طے نہیں کی مگر وہ تمھارے ساتھ تھے، حضراتِ صحابہ نے دریافت کیا: یارسول اللہ! حالانکہ وہ مدینے میں ہیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، (ان کو یہ فضیلت حاصل ہوئی) مدینے میں رہ کر، (اس لیے کہ) ان کو عذر نے روکے رکھا''۔(۲).

---

(۱) نسائی: رقم: ۳۱۴۰

(۲) متفق علیہ: خ: ۴۴۲۳، م: ۱۹۱۱

اس حدیث کو مفسرین اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں:

﴿وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ﴾ {التوبۃ: ۹۲}

اور نہ اُن لوگوں پر کوئی گناہ ہے کہ جب وہ تیرے پاس آئے کہ تو ان کو سواری دے، تو تُو نے کہا: میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ تم کو اس پر سوار کروں تو وہ لوٹ گئے اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے اِس غم میں کہ نہیں پاتے ہیں جو خرچ کریں۔

اس کی تفسیر میں ابن کثیر نے فرمایا: (عطیہ بن سعد) عوفی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ لوگ غزوے کے ارادے سے میرے ساتھ نکلیں، تو ایک جماعت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی جس میں حضرت عبد اللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ بھی تھے تو ان لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم کو سواری کا جانور عطا فرمایئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم! میرے پاس تمھارے لیے سواری کا جانور نہیں ہے تو یہ صحابہ روتے ہوئے واپس ہوئے اور ان پر بہت شاق گزرا کہ وہ جہاد میں نہ جاکر مدینے میں بیٹھے رہیں، ان کے پاس نہ نفقہ تھا نہ سواری، تو جب اللہ نے ان کے حب فی اللہ اور حبِ رسول کے جذبے کو دیکھا تو قرآن میں ان کا عذر نازل فرمایا۔

پھر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد روایات میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ذکر کیا ہے: جب نیت ان کے قلوب میں پختہ ہو گئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرنے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ جہاد کی سواری میں ان کی مدد فرمائیں، پھر یہ (بے چارے) اپنے قلوب اور جذبات کے ساتھ ہمہ دم مجاہدین کے ساتھ تھے، بے قراری کے ساتھ ان کی خبروں کا انتظار کرتے، اس لیے وہ اپنی نیتوں اور ارادوں کی وجہ سے پورے اجر کے مستحق ہو گئے جیسا کہ مسلم کی روایت میں آیا ہے: ”لیکن وہ تمھارے ساتھ اجر میں شریک ہیں“۔

دوسری طرف حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے فرماتے ہوئے سنا، ”جب دو مسلمان تلوار لے کر ایک دوسرے سے مقابلہ آرا ہوں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہیں“، میں نے کہا: یارسول اللہ! یہ تو قاتل ہے (اس کے بارے میں تو فیصلہ بجا ہے) لیکن مقتول کی خطا کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ بھی تو

اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا خواہشمند تھا''، مقتول کو اگر موقع ملتا تو اس کی بھی نیت اپنے ساتھی کو قتل کرنے کی تھی۔[1]

ایسی صورت میں نیت کے مقابلے میں اجر ہے اگر نیت خیر کی ہو اور اس کے مقابلے میں گناہ ہوتا ہے اگر نیت شر کی ہو؛ لیکن وہ معاملہ جس پر زور دینا اور توجہ دینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نیت - جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا- خیالِ محض یا وسوسۂ نفس یا لفظِ ''نَوَیْتُ'' نہیں ہے؛ بلکہ یہ در حقیقت قصد وارادہ ہے جیسا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یا وہ قلب کا میلان، رغبت اور متوجہ ہونا ہے جیسا کہ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ پہلی گزری ہوئی دونوں مثالوں میں جو باتیں آئی ہیں وہ اس کی تائید کرتی ہیں۔ پس جو لوگ واپس ہوئے اور ان کے آنسو بہہ رہے تھے انھوں نے عمل کرنے کا قصد کیا تھا لیکن رکاوٹیں حائل ہو گئیں اور جو قتل کیا گیا اس نے (بھی) تلوار اٹھائی، اگر اس کو بھی موقع ملتا تو ضرور قتل کرتا؛ لیکن اس کا مقابل پھرتیلا نکلا (پس یہ مغلوب و مقتول ہو گیا)۔

نیز حدیث میں ہے:

«مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ وَلَمْ يَعْمَلْهَا كُتِبَتْ لَهُ حَسَنَةٌ»[2]. جس نے ارادہ کیا کسی نیکی کا اور اس کو نہیں کر سکا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔

واضح رہے کہ ''هَمّ'' عزم کا ابتدائی درجہ ہے۔

اخلاص اور عمل:

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہر مسلمان آدمی پر لازم ہے کہ اپنے آپ سے اخلاص کا مطالبہ کرتا رہے، تاکہ اسے اپنے عمل کا ثمرہ حاصل ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر عمل میں اخلاص نہ ہو تو کیا وہ عمل کو ترک کر دے؟

ہم اس سوال کے جواب کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ پر چھوڑتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں:

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۱، م: ۲۸۸۸

(۲) متفق علیہ: خ: ٦٤٩١، م: ۱۳۰

”یہ مناسب نہیں ہے کہ ریا یا دیگر آفتوں کے خوف کی وجہ سے عمل چھوڑے، کیونکہ یہ تو شیطان کا مقصد ہی ہے۔ (شریعت میں مطلوب و) مقصود یہ ہے کہ اخلاص نہ چھوٹے اور جب اس نے عمل چھوڑ دیا تو عمل اور اخلاص دونوں کو ضائع کر دیا۔“

پھر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نصیحت نقل کی ہے جو انھوں نے اپنے کسی شاگرد کو کی تھی۔ انھوں نے کہا:

”اخلاص معاملے کو ختم نہیں کرتا ہے، تم عمل کی پابندی کرو اور اخلاص کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہو، میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ عمل چھوڑ دو؛ بلکہ میں نے یہ کہا کہ عمل میں اخلاص پیدا کرو“۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”لوگوں کی وجہ سے عمل چھوڑ دینا ریا ہے اور لوگوں کے لیے عمل کرنا شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ان دونوں سے محفوظ رکھے“۔ (۱)

مؤمن کی نقد خوش خبری:

ہم ماسبق سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اعمال کو ان عیوب سے جو ان میں در آتے ہیں جیسے شہرت وستائش وغیرہ کی خواہش، ان سے پاک وصاف رکھنے کی کوشش اور جد وجہد کرے، لیکن اگر کسی انسان کی لوگوں نے اس کے عمل پر تعریف کی تو کیا اس پر کچھ حرج و نقصان ہے؟

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ایک آدمی کوئی اچھا کام کرتا ہے اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ مؤمن کی نقد خوش خبری ہے“۔ (بعد میں آخرت میں اصل انعام ملے گا)۔ (۲)

ف: یہ مثال غالباً اس پر صادق آتی ہے۔

ع: ہم خرما و ہم ثواب۔ (۳)

---

(۱) المهذب من إحياء علوم الدين: ۲/ ۴۰۳

(۲) مسلم: رقم: ۲۶۴۲

(۳) قمر الزماں۔ مترجم

پانچویں فصل
صدق

صدق کی تعریف:

سچی خبر: وہ خبر ہے جو واقع کے مطابق ہو، اور جھوٹی خبر: وہ خبر ہے جو واقع کے خلاف ہو۔ اور آدمی کو سچا اُسی وقت کہا جاتا ہے جبکہ اس نے سچائی کا التزام کیا ہو اور اس کے بارے میں کبھی جھوٹ کا تجربہ نہ ہوا ہو اور قرآن نے صدق کے التزام کی طرف متوجہ کیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ {التوبۃ:۱۱۹}

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

اور جہاں قرآنِ کریم نے اُن لوگوں کو شمار کرایا ہے جن کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کیا ہے ان میں سے ﴿وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ﴾ {الاحزاب:۳۵} بھی ہیں۔

صادقِ مصدوق ﷺ:

نبی ﷺ صدق و سچائی میں بعثت سے پہلے بھی اور بعثت کے بعد بھی معروف و مشہور تھے اور آپ ﷺ کی صداقت کا معاملہ ایسا تھا جو مکے میں آپ کی بعثت سے پہلے ہی جانا پہچانا تھا، اس بات کو ہر چھوٹا اور بڑا جانتا تھا اور اسی لیے جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

”مجھے اپنی ہلاکت کا اندیشہ ہو چلا ہے اور پھر آپ ﷺ نے سارا واقعہ اُن سے بتایا، تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ہر گز نہیں؛ آپ ﷺ کو بشارت ہو، بخدا، اللہ آپ کو ہر گز رسوا نہ کرے گا؛ کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بات بولتے ہیں، کمزور کا بوجھ اٹھاتے ہیں، تہی دست و نادار کے لیے کماتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، قدرتی حوادث میں (لوگوں کی) آپ مدد کرتے ہیں“۔ (۱)

---

(۱) متفق علیہ: خ:۴۹۵۳، م:۱۶۰

اس طرح اس حقیقت کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ریکارڈ پیش کر دیا جس سے مکے کا ہر شخص واقف تھا اور یہ سب نبوت سے پہلے کا حال ہے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جو ذکر کیا ہے اس کے شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی راست گوئی کا ذکر ہے، اور اہلِ مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جنون اور سحر کی تو تہمت لگائی، لیکن کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کذب کی تہمت نہیں لگائی۔ ان کی تکذیب کا نشانہ وہ پیغام تھا جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو واشگاف کیا:

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۝۳۳﴾ {الانعام: ۳۳}

ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو رنجیدہ کرتی ہے وہ بات جو وہ کہتے ہیں، سو وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے، بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

کفار میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے آپ کے صدق کی گواہی دی ہے، چنانچہ ہِرَقل کے پاس ابوسفیان نے اسلام سے پہلے اس کی گواہی دی؛ جبکہ ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا تھا:

"کیا تم لوگ اُن پر جھوٹ کی تہمت والزام لگاتے ہو اِس بات کے کہنے سے پہلے جو انھوں نے کہی؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے جواباً کہا کہ: نہیں۔ (پورے تفصیلی سوال و جواب کے بعد) پھر ہرقل نے کہا: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تم لوگ ان پر جھوٹ کی تہمت والزام لگاتے تھے اس بات کے کہنے سے پہلے جو انھوں نے کہی؟ تو تم نے کہا کہ: نہیں۔ تو میں نے سمجھ لیا کہ وہ ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ لوگوں سے تو جھوٹ نہ بولیں اور اللہ کی شان میں جھوٹ بولنے لگیں"۔ (۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کفار کی تصدیق اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ارشاد کی تصدیق کرتے تھے؛ چاہے وہ مستقبل میں رونما ہونے والے کسی معاملے سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا:

"حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عمرہ کے لیے گئے تو امیہ بن خلف کے یہاں مقیم ہوئے۔ امیہ جب شام کا سفر کرتا اور مدینے سے گزرتا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے یہاں قیام کرتا۔ تو امیہ نے

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۴۵۵۳، م: ۱۷۷۳

سعد رضی اللہ عنہ سے کہا: دن آدھے ہونے تک انتظار کروتا کہ لوگ غافل ہو جائیں تو چلیں گے اور تم طواف کر لینا۔

پس حضرت سعد رضی اللہ عنہ طواف کر رہے تھے اسی درمیان اچانک ابوجہل آگیا اور اس نے کہا: یہ جو کعبے کا طواف کر رہا ہے کون ہے؟ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: میں سعد ہوں، ابوجہل نے کہا: تم اس طرح پُر امن اور بے خوف ہو کر کعبے کا طواف کر رہے ہو، حالانکہ تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو پناہ دی ہے؟ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں! تو دونوں آپس میں جھگڑنے لگے، تو امیہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہا: ابوالحکم سے اونچی آواز میں نہ بولو، اس لیے کہ یہ وادی کے سردار ہیں، پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: خدا کی قسم! اگر تم نے مجھ کو طواف کرنے سے روکا تو میں شام میں تمھاری خرید وفروخت (تجارت) کو بند کر دوں گا۔ راوی کہتے ہیں: امیہ پھر بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہتا رہا: اونچی آواز میں نہ بولو اور ان کو پکڑنے لگا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ غضبناک ہو گئے اور کہا: چھوڑو مجھے؛ کیونکہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ تم کو قتل کریں گے۔ تو امیہ نے کہا: مجھ کو؟ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں۔ امیہ بولا: خدا کی قسم! محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب کچھ کہتے ہیں جھوٹ نہیں کہتے۔ پھر امیہ اپنی بیوی کے پاس آیا اور کہا: تم جانتی ہو کہ میرے یثربی بھائی نے مجھ سے کیا کہا ہے؟ تو بیوی نے کہا: کیا کہا؟ اس نے کہا کہ سعد رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ مجھے (امیہ کو) قتل کریں گے، تو بیوی نے (بھی) کہا: خدا کی قسم! محمد صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ نہیں بولتے۔"[1]

اور اس طرح حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے مستقبل کے ایک معاملے کے بارے میں بیان کیا جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا؛ امیہ اور اس کی بیوی کی طرف سے اس کی کامل تصدیق میں کسی قسم کا تردد پیش نہیں آیا؛ بلکہ اُس نے اُس کو سنجیدگی اور واقعیت پر محمول کیا اور اس کی وجہ سے بہت گھبرایا جیسا کہ دوسری روایت میں ہے۔[2]

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۶۳۲

(۲) بخاری: رقم: ۳۹۵۰، اور امیہ سچ مچ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں غزوۂ بدر میں قتل ہوا۔

آپ ﷺ کا (لوگوں کو) سچائی پر ابھارنا اور جھوٹ سے ڈرانا:

صدق کے اپنانے میں آپ ﷺ صدق کے دقیق ترین معنی کا التزام کرتے تھے، یہی آپ ﷺ کی سیرت ہے اور آپ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کی اسی پر تربیت کی ہے، آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو صدق کے التزام، جھوٹ چھوڑنے اور اس سے دوری اختیار کرنے پر ابھارتے اور ترغیب دیتے تھے۔

اور صدق وسچائی اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک جھوٹ سے مکمل طہارت نہ ہو، اسی لیے دونوں پر گفتگو ساتھ ساتھ ہوتی ہے، کیونکہ ان کے درمیان تلازمِ تضاد کی نسبت ہے (دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں)، ان میں سے ایک دوسرے کے ہوتے ہوئے نہیں پایا جاسکتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"بے شک صدق بھلائی کی طرف لے جاتا ہے اور بھلائی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں وہ صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔

اور کذب (جھوٹ) بدکاری کی طرف لے جاتا ہے اور بدکاری جہنم کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں اس کو جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے"۔[1]

یہ دو راستے ہیں؛ ایک جنت تک پہنچاتا ہے اور وہ صدق سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا جہنم تک پہنچاتا ہے اور وہ جھوٹ سے شروع ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

"رسول اللہ ﷺ کو جھوٹ سے زیادہ کوئی عادت ناپسند نہ تھی اور آدمی رسول اللہ ﷺ کے سامنے کوئی بات جھوٹ کے ساتھ بیان کرتا تو آپ ﷺ کے دل میں وہ آدمی برابر (کھٹکتا رہتا) یہاں تک آپ ﷺ کو معلوم ہو جائے کہ اس نے اس سے توبہ کرلی ہے۔"[2]

اور صدق وسچائی ایسی عادت ہے کہ تمام معاملات میں اس کا التزام ضروری ہے، معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۰۹۴، م: ۲۶۰۷

(۲) ترمذی: رقم: ۱۹۷۳

حضرت عامر بن ربیعہ[1] رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا:

''ایک دن میری ماں نے مجھے بلایا، اس وقت رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے۔ ماں نے کہا: ارے! یہاں آؤ، میں تم کو کچھ دوں گی، تو ان سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے اس کو کیا دینے کا ارادہ کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا: میں اس کو کھجور دوں گی؛ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم اس کو کچھ نہ دیتی تو تمھارے خلاف تمھارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا''۔[2]

اور اس حدیث میں بچے کی پرورش کے بارے میں تربیتِ نبوی کے ایک بڑے قاعدے کا اثبات اور ذکر ہے؛ اس لیے کہ بچہ جب بڑے کو جھوٹ بولتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ اس کو جائز سمجھتا ہے، اس طرح اس کی پرورش جھوٹ پر ہوتی ہے۔

اگر یہ بچہ ماں کے پاس آتا اس کے یہ کہنے کے بعد کہ ''آؤ تم کو دوں گی''، پھر اس کو کچھ نہ دیتی تو اولاً تو جھوٹ اُس بچے کے لیے لقمۂ تر بن جاتا، ثانیاً: جب کبھی ماں اس کو دوبارہ بلاتی تو وہ اپنی ماں کو سچا نہ سمجھتا۔

اور رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ سے بچنے کی تاکید فرمائی یہاں تک کہ اُن امور میں بھی جن کو بعض لوگ کم درجے کی معمولی چیز سمجھتے ہیں اور ان کی پرواہ بھی نہیں کی جاتی، پس سچائی ہمیشہ سچائی ہی ہے۔

حضرت اسماء بنتِ یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا:

''رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ کھانا لایا گیا تو آپ ﷺ نے ہمیں دعوت دی، ہم نے کہا: ہمیں بھوک نہیں ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہر گز ہر گز بھوک اور جھوٹ کو جمع نہ کرنا''۔[3]

اور رسول اللہ ﷺ کے خواب میں - اور انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی کی ایک قسم ہوتے ہیں - جھوٹ کی سزا کا بیان وارد ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) یہ حضرت عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ ہیں، لفظ ''عبد اللہ'' اصل کتاب ''من معین الشمائل'' میں کتابت میں رہ گیا۔ دیکھئے: ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۹۹۱۔ از مصحح

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۹۹۱

(۳) ابن ماجہ: رقم: ۳۲۹۸

”رات میرے پاس دو آنے والے آئے، انھوں نے مجھے جگایا اور کہا: چلیے، تو ہم چل دیے، وہ دونوں ایک ایسے آدمی کے پاس آئے جو چت لیٹا ہوا تھا، اچانک دیکھا کہ ایک دوسرا آدمی آگ نکالنے والی سریے کی مڑی ہوئی ایک سلاخ (آنکس) لیے کھڑا ہے، وہ اچانک اس کے چہرے کی ایک شق کی طرف آتا ہے اور اس کے جبڑے کو پھاڑتا ہوا اس کی گدی کی جانب لے جاتا ہے اور اس کے نتھنے اور آنکھ کو بھی گدی کی طرف لے جاتا ہے، پھر گھوم کر دوسری طرف آتا ہے اور اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتا ہے جیسا کہ پہلی جانب کیا تھا، پس اس جہت سے وہ فارغ نہیں ہوتا یہاں تک کہ پہلی جہت صحیح ہو جاتی ہے جیسی تھی، پھر وہ دوبارہ وہی کرتا ہے جو پہلے کیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے کہا: سبحان اللہ! یہ دونوں کون ہیں؟ ان دونوں نے کہا: چلیے آگے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان دونوں نے مجھ سے کہا: ہم آپ کو بتائیں گے، بہر حال وہ آدمی جس کے پاس آپ کا گزر ہوا اور اس کے جبڑے، نتھنے اور آنکھ کو گدی کی طرف چیر کر لے جایا جاتا تھا، یہ وہ آدمی تھا جو صبح کو اپنے گھر سے نکلتا اور ایک جھوٹ بولتا جو پوری دنیا میں پھیل جاتا“۔ (۱)

اور وہ جھوٹ جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے بولا جائے وہ بھی جھوٹ کی تعریف سے خارج نہیں ہے، بلکہ وہ بدترین جھوٹ ہے، اس کے لیے سخت وعید وارد ہوئی ہے۔

حضرت معاویہ بن حیدہ قشیری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا:

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا: اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے، اس کے لیے ہلاکت ہے، اس کے لیے ہلاکت ہے“۔ (۲)

جو شخص صدق وسچائی اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اپنے آپ کو جھوٹ سے پاک کرلے، جھوٹ خواہ سنجیدہ بات میں ہو یا مذاق میں۔ یہی وہ استقامت ہے جس پر رسولِ کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کی تربیت فرمائی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جھوٹ منافقین کی صفات میں سب سے نمایاں صفت ہے، مسلمان کے لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔

---

(۱) آج کل کے ذرائع ابلاغ: اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن کے جھوٹ پر یہ حدیث پورے طور پر صادق آتی ہے۔ متفق علیہ: خ: ۷۰۴۷، م: ۲۲۷۵۔ (نوٹ): مسلم شریف میں یہ حدیث اس نمبر پر نہیں مل سکی۔ از مصحح

(۲) ترمذی: رقم: ۲۳۱۵، دارمی: رقم: ۲۷۰۲، ابوداؤد: رقم: ۴۴۹۰۔ (نوٹ): ابوداؤد کی حدیث کا نمبر ۴۹۹۰ ہے، ۴۴۹۰ نہیں ہے۔

نبیِ پاک ﷺ کی طرف نسبت کر کے جھوٹ بولنا:

جھوٹ کی تمام قسموں میں سب سے زیادہ قبیح جھوٹ رسول اللہ ﷺ کی شان میں جھوٹ بولنا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس جھوٹ کی سنگینی کو بہت سی احادیث میں زور دے کر بیان فرمایا ہے جو حدِّ تواتر کو پہنچتی ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ كَذِبًا عَلَيَّ لَيْسَ كَكَذِبٍ عَلَى أَحَدٍ، مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»(۱).

بے شک مجھ پر جھوٹ بولنا کسی عام آدمی پر جھوٹ بولنے کی طرح نہیں ہے، جس نے جان بوجھ کر مجھ پر (میری طرف نسبت کر کے) جھوٹ بولا، اُسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا:

«إِنَّهُ لَيَمْنَعُنِي أَنْ أُحَدِّثَكُمْ حَدِيثًا كَثِيرًا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِبًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»(۲).

بات یہ ہے کہ مجھ کو زیادہ حدیث بیان کرنے سے آپ ﷺ کا یہ فرمان روکتا ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے دیدہ ودانستہ مجھ پر جھوٹ بولا، پس اُسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

اس میں شک نہیں کہ نبی ﷺ پر جھوٹ - جیسا کہ حدیث میں آیا- اور لوگوں پر جھوٹ بولنے کی طرح نہیں ہے، کیونکہ آپ ﷺ کے اقوال اور افعال مسلمانوں کے لیے قابلِ عمل نمونہ ہیں۔

پس آپ ﷺ پر جھوٹ اللہ کے دین میں ایسی چیز داخل کرنا ہے جو اس میں سے نہیں ہے اور اسی وجہ سے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم حدیث بیان کرنے سے باز رہے محض اس خوف سے کہ کہیں وہ آپ ﷺ پر جھوٹ بولنے کی وعید میں داخل نہ ہو جائیں۔ اور اللہ نے اس امت کے علماء میں سے بعض کو منتخب فرمادیا ہے جنھوں نے آپ ﷺ کی احادیث کا دفاع کیا اور جھوٹی اور گڑھی ہوئی احادیث کو واضح اور بیان کر دیا۔

ف: بے شک بہت ہی اہم خدمت انجام دی۔ (مترجم)

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۱۲۹۱، م: ۴

(۲) متفق علیہ: خ: ۱۰۸، م: ۲

چھٹی فصل

وفا یعنی ادائیگی (وفاداری)، نباہ (وعدہ کا پورا کرنا)

اس عنوان کے تحت آتا ہے:

- وعدہ کا پورا کرنا
- عہد کا نباہنا
- اور اچھا عہد۔

وفا صدق کے دائرے سے خارج نہیں ہے، اسی لیے بہت سوں نے جب صدق کے بارے میں کلام کیا تو اس وفا کے سلسلے میں بھی کلام کیا؛ لیکن گہری نظر ڈالی جائے تو وفا صدق سے ممتاز اور الگ ہے، بایں طور کہ وفا پہلے سے کیے گئے کسی مادی التزام کا نتیجہ ہوتا ہے جیسا کہ وعدہ اور عہد کی پابندی میں ہے، یا یہ اخلاقی التزام و پابندی کی ایک تعبیر و بیان ہے جیسے حُسن عہد میں ہے۔ وفائے وعدہ اُسی وقت ہوتا ہے جب پہلے وعدہ کیا گیا ہو، ایسے ہی عہد کی پابندی کسی عہد کے وجود میں آنے کے بعد ہی ہو گی۔

وعدہ نباہنا:

حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ نے تعریف کی اور ان کی اس عادت و خُلُق کا ذکر فرمایا؛ چنانچہ فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ — یاد کرو کتاب میں اسماعیل کو، بے شک وہ سچے وعدے والے اور رسول نبی تھے۔

{مریم: ۵۴}

تو اللہ تعالیٰ نے وعدے کی سچائی کی وجہ سے ان کی تعریف کی؛ اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام ایسے ہی تھے؛ لیکن وہ اس میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور ان کے لیے یہی کافی ہے کہ انھوں نے اپنے والد سے ذبح

ہونے پر صبر کا وعدہ کیا تھا پس اس کو پورا کیا۔

اور اس سلسلے میں ہمارے نبی ﷺ (تو ہمارے لیے) لائقِ پیروی ایک مثال اور قابلِ اتباع ایک نمونہ ہیں۔

اور اس پر دلالت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے تمام مسلمانوں میں اعلان کیا کہ جس کسی کے ساتھ آپ ﷺ کا کوئی وعدہ ہو، یا آپ کے ذمے کسی کا قرض ہو، وہ میرے پاس آئے، اور ان کا (ابو بکر رضی اللہ عنہ کا) یہ فعل صرف اس لیے تھا تا کہ معلوم ہو جائے کہ آپ ﷺ وعدہ پورا کرنے کے کتنے فکر مند تھے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اگر بحرین کا مال آیا تو میں تم کو اس طرح، اس طرح، اس طرح دوں گا؛ لیکن بحرین کا مال نہیں آپایا کہ حضور ﷺ کی وفات ہو گئی۔ بعد میں جب بحرین کا مال آیا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا؛ چنانچہ (آپ کی طرف سے) اعلان ہوا کہ نبی ﷺ سے جس کسی کا کوئی وعدہ ہو یا آپ ﷺ پر قرض ہو اس کو چاہیے کہ وہ میرے پاس آئے، چنانچہ میں اُن (ابو بکر رضی اللہ عنہ) کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ نبی ﷺ نے مجھ سے ایسا ایسا کہا تھا، تو انھوں نے دونوں ہاتھوں کو بھر کر مجھے مال دے دیا، میں نے ان کو شمار کیا تو پانچ سو (درہم یا دینار تھے) اور فرمایا: اس کا دوگنا اور لے لو"۔[1]

اور ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ گورے رنگ کے تھے (اس وقت) آپ پر بڑھاپے کے آثار شروع ہو چکے تھے اور حسن بن علی رضی اللہ عنہما آپ کے مشابہ تھے؛ آپ ﷺ نے ہمارے لیے تیرہ جوان اونٹنیوں کا حکم فرمایا؛ پس ہم ان کو لینے گئے کہ ہم کو آپ ﷺ کی وفات کی خبر ملی؛ تو لوگوں نے ہم کو کچھ نہیں دیا، جب ابو بکر رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو انھوں نے فرمایا: جس کا حضور ﷺ سے کوئی وعدہ رہ گیا ہو تو اس کو (میرے پاس) آنا چاہیے، تو میں اُن کے پاس گیا اور ان کو پورا واقعہ بتایا، تو انھوں نے میرے لیے ادائیگی کا حکم کر دیا"۔[2]

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۲۲۹۶، م: ۳۳۱۴

(۲) متفق علیہ: خ: ۲۲۹۶، م: ۳۳۱۴

اس طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان وعدوں کو پورا کیا جن کو پورا کرنے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو نافذ کرنے اور آپ کی سنت کی پابندی کے لیے تھا۔

عہد کو نباہنا:

اور عہد بھی وعدے کی طرح ہے، لیکن یہ توثیق و پختگی کی وجہ سے وعدہ سے بڑھا ہوا ہے، عہد کرنے والا مضبوط قسموں اور تحریری دستاویز کے ذریعے اس کو پختہ کرتا ہے۔

اور عہد کو پورا کرنے کے حکم کے سلسلے میں وارد ہونے والی بہت سی آیتیں ہیں، ہم اُن میں سے کچھ کو ذکر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

❖ ﴿وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ {الانعام:۱۵۲}

اور اللہ کے عہد کو پورا کیا کرو، اس کا اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

❖ ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا﴾ {النحل:۹۱}

اور پورا کرو عہد اللہ کا جب آپس میں عہد کرو اور نہ توڑو قسموں کو پکا کرنے کے بعد۔

❖ ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ {بنی اسرائیل:۳۴}

اور پورا کرو عہد کو، بے شک عہد کی پوچھ ہوگی۔

اور اللہ تعالیٰ نے متقین کی تعریف بیان فرمائی، پس ان کے جملہ اوصاف میں عہد کو پورا کرنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

❖ ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ {البقرۃ:۱۷۷}

اپنے عہد کو نباہنے والے جب وہ عہد کریں۔

اور جب ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائلِ کریمہ کا مطالعہ کیا تو اس میں خود آپ کے ایفائے عہد

کے التزام کرنے اور اُس پر اپنے اقوال کے ذریعے ابھارنے اور ترغیب دینے کے ہمیں اتنے شواہد ملے کہ جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح بے وفائی اور بد عہدی سے بچنے اور دنیا و آخرت میں اُن کے انجامِ بد سے بچانے کے سلسلے میں بے شمار اقوال و شواہد موجود ہیں۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مسلم نے روایت کی ہے؛ انھوں نے فرمایا:

”مجھے غزوۂ بدر میں شریک ہونے سے اس بات نے روکا کہ میں اور میرے والد حُسَیل[1] نکلے تو ہم کو کفارِ قریش نے پکڑ لیا اور کہا کہ تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں، ہمارا ارادہ اُن کے پاس جانے کا نہیں ہے، ہم تو صرف مدینے کا ارادہ رکھتے ہیں، تو انھوں نے ہم سے اللہ کا عہد و میثاق لیا کہ ہم مدینہ جائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کریں، اس کے بعد ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس کی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم دونوں واپس جاؤ، ہم اُن سے کیا ہوا عہد پورا کریں گے اور ہم ان پر اللہ سے مدد طلب کریں گے۔“[2]

یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمان اپنی قلت اور دشمن کی کثرت کی وجہ سے افرادی قوت کے بہت حاجت مند تھے۔اور صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ قریش کا جو آدمی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے گا وہ اس کو واپس کر دیں گے اور مسلمانوں میں سے جو کوئی قریش کے پاس آئے گا وہ اس کو واپس نہیں کریں گے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ہی مدینہ پہنچے تو حضرت ابو بصیر عتبہ بن اسید ثقفی رضی اللہ عنہ مکے میں اپنی قید سے نکلنے اور مدینہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مشرکین نے ان کے لانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (دو) آدمیوں کو بھیجا، پس ان دونوں نے کہا: آپ نے ہم سے جو عہد لیا تھا اس کی بنا پر ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو ہمارے حوالے کیجیے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو بصیر! ہم نے ان لوگوں سے جو عہد کیا ہے اس کو تم جانتے ہو اور ہمارے دین میں ہمارے لیے عہد شکنی کرنا صحیح نہیں ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اور جو کمزور لوگ تمھارے ساتھ ہیں اُن کے لیے کشادگی اور نجات

---

(۱) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد کا نام حُسَیل اور لقب یمان ہے۔ دیکھیے: نووی شرح مسلم: ۱۲/ ۲۰۰۔از مصحح

(۲) مسلم: رقم: ۱۷۸۷

کی راہ پیدا کرنے والا ہے، پس تم اپنی قوم کی طرف چلے جاؤ، تو انھوں نے کہا: یارسول اللہ! کیا آپ مجھ کو مشرکین کے حوالے کر رہے ہیں کہ وہ میرے دین کے بارے میں مجھے ستائیں؟ آپ ﷺ نے پھر فرمایا اے ابو بصیر! تم چلے جاؤ، عنقریب اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اور جو کمزور لوگ تمھارے ساتھ ہیں ان کے لیے کشادگی اور نجات کی راہ نکالے گا اور ان کو ان دونوں کے حوالے کر دیا۔ (۱)

اور اگر ہم اس صورتِ حال کا تصور کر سکتے ہیں تو ذرا تصور اور خیال کر کے دیکھیں کہ حضور ﷺ کے لیے آسان نہیں تھا کہ اپنے ایک ساتھی کو مشرکین کے حوالہ کر دیں، لیکن وعدوں اور عہدوں کا التزام اللہ کی شریعت اور اُس کا دین ہے اور کسی چیز کے التزام کا پتہ مشکل اور نازک حالات میں اس پر عمل کرنے سے ہی چلتا ہے۔

ہم ابو رافع رضی اللہ عنہ سے اُن کے آغازِ اسلام کا قصہ سنتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

''قریش نے مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا، پس جیسے ہی میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، میرے قلب میں اسلام گھر کر گیا، تو میں نے کہا: یارسول اللہ! خدا کی قسم! میں اُن کے پاس کبھی واپس نہیں جاؤں گا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں عہد شکنی نہیں کرتا ہوں اور نہ ہی قاصدوں کو روکنا میرا طریقہ ہے، اس لیے تم واپس جاؤ، اگر تمھارے دل میں یہ ہی خیال باقی رہے جو نیک ارادہ تمھارا اس وقت ہو رہا ہے تو واپس آ جانا، حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں چلا گیا اور پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا''۔ (۲)

وعدوں اور عہدوں کے نباہنے کے التزام و پابندی پر ابھارنے کے سلسلے میں آپ ﷺ نے اپنے عملی سلوک پر بس نہیں کیا؛ بلکہ بہت سی حدیثیں اس بارے میں اس کی تاکید کے لیے وارد ہوئی ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''عہد شکن کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا، اور کہا جائے گا: یہ فلاں ابن فلاں کی غداری و عہد شکنی کی علامت ہے۔'' (۳)

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۳۲۳، بخاری: رقم: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲

(۲) ابوداؤد: رقم: ۲۷۵۸

(۳) متفق علیہ: خ: ۶۱۷۸، م: ۱۷۳۵

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛انھوں نے کہا:

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر دھوکے باز کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہوگا جس کو اس کی دھوکے بازی کے بقدر اونچا کیا جائے گا، خبردار! امیر و حاکم سے بڑا غدار اور دھوکے باز (۱)کوئی نہیں"۔(اگر وہ اپنے فرائض، رعیت پر شفقت اور ان کے مصالح کا لحاظ نہ کرے۔)(۲)۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تین لوگ ایسے ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا حریف و مقابل ہوں گا، ان میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے میری قسم کھا کر اور واسطہ دے کر عہد و پیمان کیا پھر اُسے توڑ دیا"۔(۳)۔

اور بہت سی ایسی حدیثیں وارد ہوئی ہیں جو منافقین کی صفات بیان کرتی ہیں،،اُن میں سے ایک حدیث میں یہ ہے:

"منافق کی نشانی تین ہیں: ا۔جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ ۲۔جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔ ۳۔اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے"۔(۴)۔

"چار خصلتیں ہیں: جس شخص میں وہ چاروں ہوں گی تو وہ پکا منافق ہوگا اور جس شخص میں ان میں سے ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے، ا۔جب اس کو امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ ۲۔جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ ۳۔جب معاہدہ کرے تو عہد شکنی کرے۔ ۴۔اور جب (کسی سے) جھگڑا کرے تو گالی بکے"۔(۵)۔

---

(۱) یہی ترجمہ اور قول مشہور ہے محدثین کے نزدیک،یعنی یہ حدیث امیر ظالم کی مذمت میں وارد ہوئی ہے۔اس میں دوسرا احتمال بھی ہے،یعنی "امیر کی طاعت سے خروج کرنا"۔لیکن یہ ترجمہ اور قول غیر مشہور ہے۔دیکھیے: نووی شرح مسلم:۱۲/۶۵۔از مصحح

(۲) مسلم:رقم:۱۷۳۸

(۳) بخاری:رقم:۲۲۲۷

(۴) متفق علیہ:خ:۳۳،م:۵۹

(۵) متفق علیہ:خ:۳۴،م:۵۸

اس طرح رسول اللہ ﷺ اپنے فعل اور اپنے ارشادات کے ذریعے عہد اور وعدے کو پورا کرنے کا مقام و مرتبہ اور ایمان سے اس کا تعلق بیان فرماتے تھے۔

حُسنِ عہد:

اچھا عہد و برتاؤ، تعلق و محبت کی حفاظت، دوست اور ساتھ رہنے والے کی عزت کی حفاظت اس کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی اور اپنے شناسا لوگوں کی عزت و تکریم، جب وفا کا لفظ بولا جائے تو اس سے یہی سب چیزیں مراد ہوتی ہیں۔

اور رسول اللہ ﷺ کو ان سب میں سبقت حاصل تھی (ان امور میں آپ سب سے آگے تھے)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں سے مجھے کسی پر اتنی غیرت نہیں آئی، جتنی کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آئی، حالانکہ ان کی وفات آپ ﷺ کے مجھ سے شادی کرنے سے پہلے ہو چکی تھی، اس وقت (مجھے غیرت آتی) جب میں آپ ﷺ کو ان کا ذکر کرتے سنتی اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو جنت میں ایک موتی کے محل کی خوش خبری سنادیں۔ اور اگر آپ بکری ذبح کرتے تو ان کی سہیلیوں کے پاس اس میں سے اتنا ہدیہ بھیجتے جو ان کے لیے کافی ہو تا۔''(1)

اور آپ ﷺ کے بارے میں آیا ہے کہ ایک بڑھیا آپ ﷺ کے پاس آئی تو آپ ﷺ نے اس کی عزت کی، اس کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ ہمارے یہاں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے زمانے میں آیا کرتی تھیں، اور تعلقات کی پاسداری کرنا بھی دین کا جز ہے''۔(2)

اور اسی طرح دن گزرتے گئے اور زمانہ دراز ہوتا گیا، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ ہمیشہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یاد فرماتے اور ان کے زمانے کو یاد کرتے؛ یہاں تک کہ اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری وقت تک یہ یاد باقی رہی، اسی کا نام وفا ہے۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۸۱۶، م: ۲۴۳۵

(۲) المهذب من إحياء علوم الدين: ۱/۴۰۳

کیا کعب (ابن اشرف) کا قتل غدر (دھوکا) تھا؟

کعب بن اشرف کا باپ قبیلۂ طے کا عربی تھا اور اس کی ماں عقیلہ بنت ابوالحُقَیق بنو نضیر (یہودی) قبیلے سے تھی۔ کعب کے باپ نے معاہدہ کر لیا تھا اور ان ہی میں شادی کر لی تھی۔ اور یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ مدینہ ہجرت کرنے کے بعد نبی ﷺ نے ایک دستاویز لکھ دی تھی جس میں مدینے کے رہنے والے مسلمانوں اور مشرکین و یہود کے درمیان تعلقات کے حدود متعین کر دیے تھے۔ اور وثیقے کی منجملہ دفعات میں سے ایک دفعہ یہ تھی کہ: ''اس وثیقہ والوں کے درمیان اُن لوگوں کے خلاف جو اُن سے لڑیں گے، باہمی امداد و تعاون رہے گا اور آپس میں خیر خواہی ہو گی اور مظلوم کی مدد کی جائے گی۔''

اور اس وثیقے میں یہ بھی تھا: ''جو مدینے سے نکل جائے وہ بھی امن میں ہے اور جو (مدینے میں ہی) بیٹھا رہے وہ بھی امن میں ہے، مگر جو ظلم کرے یا گناہ کا ارتکاب کرے''۔

اس کے بعد غزوۂ بدر پیش آیا جس میں مسلمان فتح مند ہوئے، اس فتح سے یہود سخت غصے میں آ گئے اور جس وقت کعب بن اشرف نے مشرکین کے مقتولین کے نام سنے تو کہنے لگا: کیا یہ سچ ہے؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ محمد نے ان کو قتل کر دیا ہے؟ یہ لوگ تو عرب کے اشراف اور لوگوں کے بادشاہ ہیں، خدا کی قسم! اگر محمد نے ان کو قتل کر دیا ہے تو زمین کا اندرونی حصہ اوپری حصہ سے بہتر ہے۔ (موت بہتر ہے)۔

اور جب اسے واقعے کا یقین ہو گیا تو کھلی جارحیت اور دشمنی پر اتر آیا، چونکہ یہ شاعر بھی تھا، اس لیے نبی ﷺ کی ہجو کرنے لگا۔ پھر یہ مکہ پہنچا اور مطلب ابن ابو وداعہ کے گھر ٹھہرا اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف (لوگوں کو) بھڑکانے لگا اور (ہجو کے) اشعار پڑھتا اور بدر میں قتل کیے گئے مشرکین پر نوحہ کرتا تھا۔ پھر مدینہ واپس آیا اور مسلمانوں کی عورتوں سے متعلق (عداوتاً) عشقیہ اشعار کہنے لگا۔[1]

اور آپ ﷺ کعب کی ایذارسانی، اپنی ذات سے متعلق (ہجو وغیرہ) کو برداشت کر لیتے، لیکن

---

(۱) اس قصے، صحیفے اور معاہدے کی پوری تفصیلات کے لیے دیکھیے: مؤلف کی کتاب ''من معین السیرۃ'': ص: ۱۶۵-۱۶۲، ۲۱۹ اور دکتور اکرم ضیاء العمری کی کتاب: ''السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ'': ۱/ ۲۸۶-۲۸۲، ۳۰۴-۳۰۲۔

جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا اور شخصی کینے کے دائرے سے نکل کر قریش کے کینوں کو ابھارنے اور بھڑکانے تک جا پہنچا؛ حالانکہ وہ اہلِ وثیقہ کی خیر خواہی کا پابند تھا، مگر وہ اپنی اس حرکت کی وجہ سے دشمنوں کی صف میں شامل ہو چکا تھا۔ اس لیے تسامح اور چشم پوشی کے اس موقف کو چھوڑ کر۔ جس کا التزام نبی ﷺ نے (اب تک) کرر کھا تھا۔ دوسرا موقف اختیار کرنا ضروری تھا۔

تیسری اور آخری خون کھولا دینے والی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی آبروؤں سے کھیلنے لگا تھا، ان کی عورتوں سے متعلق (عداوتاً) عشقیہ اشعار کہتا۔ اس کے سابقہ جرائم سے چشم پوشی بھی کر لی جاتی تو اس کا تنہا یہ جرم قبل از اسلام زمانۂ جاہلیت میں معروف پڑوسی کے حقوق پر کھلا وار ہے اور اس سے نکلنے کا اعلان ہے، پس اسلام کے آنے کے بعد جو کہ مقدسات اور عزت و آبرو کا محافظ ہے، ایسی حرکت (اور قبیح جرم) کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ اس نے اور اس کی قوم نے دستاویز پر عمل پیرا رہنے کا عہد کیا تھا۔

کوئی بھی انصاف سے کام لینے والا اگر اس قضیے پر خواہشات و نفسانیت سے دور رہ کر غور کرے گا تو اسے یقین ہو جائے گا کہ ان تینوں جرائم میں سے، جن کو کعب نے کیا، کوئی ایک حرکت بھی اس کو قرار واقعی سزا دینے کے لئے کافی تھی۔

نبی ﷺ نے اس کو مہلت دی (لیکن وہ باز نہیں آیا)، یہاں تک کہ آپ ﷺ اُس سے تنگ ہو گئے، حالانکہ آپ ﷺ وسیع الظرف تھے۔ تب آپ ﷺ نے محمد مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اس کے قتل کا حکم دے دیا اور وہ طریقہ جس کو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا اس کو بظاہر غدر (دھوکہ) کہا جا سکتا ہے، مگر "اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ" (جنگ تو ایک چال اور چکما دینے کا نام ہے) اور کعب خود اپنی عہد شکنی کی وجہ سے محارب (دشمن) بن چکا تھا، اس لیے اس کو قتل کرنا جائز تھا۔ آپ بتائیے کہ اس واقعہ میں غدر کہاں ہے؟ بعض دشمنانِ اسلام نے کوشش کی ہے کہ اس واقعے کو حضور ﷺ کی عہد شکنی (معاذ اللہ) قرار دیں، لیکن وہ ان اسباب کو ذکر نہیں کرتے جنھوں نے اس حادثے تک نوبت پہنچائی اور یہ حقائق کے نقل کرنے میں انتہائی کمینہ پن اور بدترین جھوٹ ہے۔

ہم اِن نئے دشمنوں کو چھوڑتے ہیں اور حضورِ پاک ﷺ کے زمانے کے مسلمانوں کے دشمنوں

کی رائے کی طرف رجوع کرتے ہیں: تاکہ ہم اس حادثے میں ان کی رائے پر غور کریں۔

صلح حدیبیہ ٦ سنہ ہجری کے آخر میں ہوئی جس کے بعد ابوسفیان شام کے علاقوں میں تجارت کے لیے نکلے اور اس کی وہاں موجودگی کے دوران وہ اور اس کے بعض ساتھی ہرقل کے پاس لے جائے گئے۔ ہرقل نے ابوسفیان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا۔ اس کے سوالات میں ایک سوال یہ تھا کہ کیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں؟ ابوسفیان کہتے ہیں: میں نے کہا: نہیں اور ہم اِس مدت میں ان کی طرف سے نہیں جانتے کہ وہ کیا کریں گے؟

ابوسفیان کہتے ہیں کہ: ''خدا کی قسم! میرے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ میں اس کلمے کے علاوہ اس میں کوئی اور بات داخل کر سکوں۔''[۱]

باوجودیکہ ابوسفیان حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ کو مسخ کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بعد میں اُن سے جھوٹ منسوب ہو، پس جب ہرقل نے اُن سے پوچھا کہ کیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں؟ تو کہا: نہیں۔ لیکن انھوں نے چاہا کہ زبردستی کوئی ایسی چیز اس میں داخل کر دیں جو مستقبل سے تعلق رکھتی ہو، اس لیے کہا کہ ہمارے اور ان کے درمیان اِس وقت ایک اتفاق ہے (معاہدہ ہے یعنی صلح حدیبیہ) تو ہم یہ نہیں جانتے کہ اس میں وہ وفا کریں گے یا غدر۔ یہ ہیں ابوسفیان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی کے سربراہ تھے، جس وقت یہ سوال پوچھا گیا تو جواب دیا کہ: ''وہ عہد شکنی نہیں کرتے''۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے اور قریش کے دوست کعب بن اشرف کے حادثے سے باخبر تھے اور اس حادثے پر تقریباً چار سال گزر چکے تھے، انھوں نے موقع غنیمت سمجھ کر یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہاں! انھوں نے کعب بن اشرف کے ساتھ غدر کیا ہے، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا، اس لیے کہ انھوں نے جھوٹ بولنا نہیں چاہا اور کعب کے قتل کا قضیہ غدر تھا ہی نہیں؛ بلکہ خود اس کی قوم یہود نے بھی غدر کی بات نہیں کہی، اُن کے سامنے یہ آواز بلند کرنے میں اُس وقت کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے ساتھ عہد شکنی کی ہے، لیکن انھوں نے کوئی آواز نہیں اُٹھائی، اس لیے کہ وہ قضیے کے اسباب اور اس کے متعلقات سے واقف تھے۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۷، ۴۵۵۳، ۱۷۷۳

خلاصہ یہ کہ وہ (یہودی) نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمارے ساتھی کے پاس رات کے وقت کوئی آیا اور اسے قتل کر گیا، تو نبی ﷺ نے اُن کے سامنے اس کی باتوں کا ذکر فرمایا جو وہ کہا کرتا تھا اور اُن کو ایک عہد نامہ لکھنے کی دعوت دی، تاکہ یہ سابقہ وثیقے کی تاکید ہو اور ایسا ہی ہوا، عہد نامہ لکھا گیا۔ [1]؛ لیکن ان لوگوں نے اپنی عادت کے مطابق اس کا التزام نہیں کیا جیسا کہ اُن کی ہمیشہ کی عادت تھی۔

آنکھ کی خیانت:

جب فتحِ مکہ کا دن ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو امان دے دی، صرف چار آدمیوں کو امان نہیں دی اور فرمایا: ''ان لوگوں کو قتل کر دو، چاہے تم ان کو غلافِ کعبہ سے لٹکا ہوا پاؤ۔'' اُن ہی چار لوگوں میں عبداللہ بن سعد بن ابو سرح بھی تھا اور یہ حکم اُن کے بڑے جرائم کی وجہ سے صادر ہوا۔

عبداللہ بن سعد نے یہ حکم سنا تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس چھپ گیا، جب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا تو عثمان رضی اللہ عنہ ان کو لے کر آئے اور نبی ﷺ کے سامنے اس کو کھڑا کر دیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! عبداللہ سے بیعت فرمالیجئے۔ راوی نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور تین مرتبہ ان کی طرف دیکھا، اِن تین مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ نے اس سے بیعت نہیں لی، پھر تین مرتبہ کے بعد آپ نے اسے بیعت فرمالیا۔

پھر اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''کیا تم میں کوئی سمجھ دار آدمی نہیں تھا کہ وہ اس کی طرف لپک کر اسے قتل کر دیتا، جبکہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا کہ میں اس کو بیعت کرنے سے رک رہا ہوں''، تو صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمیں کیا معلوم کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟ آپ نے اپنی آنکھوں سے ہم کو اشارہ کیوں نہیں کر دیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''کسی نبی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ آنکھ کی خیانت کرے''۔ [1]

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۳۰۰۰

(۱) ابوداؤد: رقم: ۲۶۸۳، ۴۳۵۹، نسائی: رقم: ۴۰۷۸

اور جب آپ ﷺ نظر سے اشارہ کرنے کو خیانت اور دھوکہ دہی سمجھتے تھے تو آپ ﷺ کی وفا اور امانت کے ثبوت کے لیے یہی کافی ہے اور آپ ﷺ کے اخلاق کی مدح سرائی میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد : ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ {القلم : ۴} کے بعد کوئی آدمی ہر گز کسی وصف وخوبی کا اضافہ نہیں کر سکتا۔

ساتویں فصل

امانت

امانت کی ادائیگی اور اس کی حفاظت کا حکم:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

❖ ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا﴾ {النساء:۵۸}

بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتے ہیں کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچادو۔

❖ ﴿وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾﴾ {المعارج:۳۲}

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں۔

❖ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۲۷﴾﴾ {الانفال:۲۷}

اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حقوق میں خیانت مت کرو، نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو، اور تم جانتے ہو۔

امانت کی تعریف:

حضور ﷺ کو بعثت سے پہلے ’’امین‘‘ کہا جاتا تھا، تو یہ کہا جانا کیا آپ ﷺ کی ذات میں کسی ایک وصف کی وجہ سے تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کو ’’امین‘‘ کے لقب سے پکارا جانا آپ کی ذات میں موجود متعدد اوصاف کی وجہ سے تھا؛ چنانچہ آپ ﷺ اپنے کلام میں بھی سچے تھے اور جب آپ کے پاس امانت رکھی جاتی تو اُس کی حفاظت کرنے والے بھی تھے اور آپ عادل بھی تھے جب کسی معاملے میں حکم بنائے جاتے۔ اور قرآنِ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصف میں بڑے بزرگ کی بیٹی کی زبانی ذکر کیا ہے:

﴿يَاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡاِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴾ {القصص:۲۶}

ابا جان! آپ اِن کو نوکر رکھ لیجئے، کیونکہ اچھا نوکر وہ ہے جو طاقت ور امانت دار ہو۔

لڑکی نے اُن (موسیٰ علیہ السلام) کے طاقت ور ہونے کو تو اس طرح پہچانا کہ اُن پر تھکا دینے والے سفر کے آثار کے واضح ہونے کے باوجود انھوں نے اس لڑکی کے جانوروں کو طاقت کا استعمال کر کے پانی پلوا دیا۔ سوال یہ ہے کہ اس نے ان کی امانت کو کیسے پہچانا؟ اس نے ان کے پاس اپنی کوئی چیز امانت تو نہیں رکھی تھی کہ جس کی انھوں نے اس کے لیے حفاظت کی ہو۔ اس نے ان کی امانت کو ان کی اس نخوت (مروّت وحمیّت اور بڑے پن) سے پہچانا جس کے سبب انھوں نے ان دونوں بہنوں کے مویشی کو پانی پلایا، نیز ان کی امانت کو ان کی زبان کی پاکیزگی اور نظر کی پاکیزگی سے پہچانا جب وہ ان کو بلانے کے لئے آئی، اس لیے کہ عزت وآبرو کا امین دیگر چیزوں کا بدرجۂ اولیٰ امین ہوگا۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ امانت نفس میں موجود ایک صفت ہے اور زندگی کے مختلف چھوٹے بڑے کارزار میں وہ اپنا اثر دکھاتی ہے، لفظ امانت، چیزوں کی حفاظت کے تنگ معنی میں محدود و منحصر نہیں ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ لفظِ امانت آیات میں جمع کے صیغے کے ساتھ آیا ہے، شاید اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ امانت کی مختلف قسمیں ہیں۔

امانت کے میدان:

ہم نے گذشتہ سطور میں دیکھا کہ عملِ امانت صرف ایک میدان میں منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ حیات کے تمام میدانوں میں موجود ہے۔

اور عنقریب ہم بعض مواقع کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کی روشنی میں پیش کریں گے۔

(۱) امانت اور سلطنت کے کار گزاروں (عہدہ داروں) کا انتخاب:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میدانِ (امانت برداری) کے (پُرخطر) راستوں کی خوب اچھی طرح نشان دہی کر دی ہے، جس میں کوئی شبہ اور پوشیدگی باقی نہیں رہی، اور ایسا اس لیے کیا کہ امت کی زندگی میں یہ راہ گزر سخت پُرخطر ہے۔ پس یہ امر (یعنی امانت کی ذمے داری) اس کو نہیں دی جاتی جو اسے طلب کرتا ہے، اس لیے کہ اس کا طالب اس کی ذمے داری کو پورے طور پر نہیں سمجھتا، اگر وہ سمجھتا تو اس سے اس

طرح دور بھاگنے کی کوشش کرتا جیسے کہ شیر سے بھاگتا ہے اور اس کو آپ ﷺ نے بیان فرمایا:

«إِنَّكُمْ سَتَحْرِصُونَ عَلَى الإِمَارَةِ، وَسَتَكُونُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَنِعْمَتِ الْمُرْضِعَةُ وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ»(۱).

بے شک تم عنقریب امارت کی حرص کروگے اور وہ قیامت کے دن ندامت ہوگی۔ پس کیا ہی اچھی ہے دودھ پلانے والی اور کتنی بُری ہے دودھ چھڑانے والی۔ (یعنی امارت دنیا میں منفعت بخش ہے، جبکہ آخرت میں محاسبے کی وجہ سے مشکلات میں پھنسانے والی ہے)۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

''بے شک ہم یہ ذمے داری اس کے سپرد نہیں کرتے جو اسے طلب کرے اور نہ اس کو جو اس کی طمع رکھے''۔(۲).

اور آپ ﷺ نے امارت وذمے داری طلب کرنے والے اور زبردستی امارت وذمے داری مل جانے والے کے درمیان فرق بیان فرمایا، چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''اے عبدالرحمٰن بن سمرہ! امارت مت مانگنا، اس لیے کہ اگر وہ تم کو مانگنے سے دی گئی تو تم کو اس کے حوالہ کر دیا جائے گا اور اگر وہ تم کو بلا مانگے ملی تو اس پر تمھاری مدد کی جائے گی۔''(۳).

یہ اس شخص کے لیے بہترین رہنمائی ہے جو امارت طلب کرنے کا خیال رکھتا ہو۔

اور یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ہیں، ہمیں اپنا طلبِ امارت کا قصہ بیان کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا:

''یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے عامل نہیں بنائیں گے؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ میرے مونڈھے پر مارا، پھر فرمایا: اے ابوذر! تم ضعیف ہو اور یہ ایک امانت ہے اور یہ قیامت کے دن رسوائی وندامت ہے؛ سوائے اس شخص کے جس نے اس کو حق کے ساتھ لیا اور ان حقوق کو ادا کیا جو اس پر امارت میں لازم ہوتے ہیں''۔(۴).

---

(۱) بخاری: رقم: ۷۱۴۸

(۲) متفق علیہ: خ: ۷۱۴۹، م: ۱۷۳۳

(۳) متفق علیہ: خ: ۶۶۲۲، م: ۱۶۵۲

(۴) مسلم: رقم: ۱۸۲۵

اور اس طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو اس امر کی اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے والی نہیں بنایا۔اور رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ امانت کا فقدان قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم امانت کے فقدان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی تفسیر و تشریح کو بغور سنیں:

دیہات کے رہنے والے ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"قیامت کب آئے گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب امانت ضائع کی جانے لگے تو تم قیامت کا انتظار کرنا، اس نے کہا: اس کا ضیاع کس طرح ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب بارِ امانت نااہل کے سپرد کر دیا جائے تو تم قیامت کا انتظار کرو"۔(۱)

اور اسی وجہ سے امارت کے سلسلے کی خیانت؛ سب سے بڑی خیانت ہے۔آپ ﷺ نے اس کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

خبر دار! امیر و حاکم سے بڑا غدار اور دھوکے باز کوئی نہیں (اگر وہ اپنے فرائض، رعیت پر شفقت اور ان کے مصالح کا لحاظ نہ کرے)۔"(۲)

(۲) امانت اور امانت رکھی ہوئی چیزیں:

جس وقت لفظِ امانت بولا جاتا ہے تو عام لوگوں کا ذہن اسی (امانت رکھی ہوئی چیزوں) کی طرف جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ امانت کے باب میں یہی اصل میدان ہے۔آپ ﷺ کی امانت تاریخ میں ایک منفرد شکل کی حامل ہے، جیسا کہ دوسرے ابواب میں بھی آپ ﷺ کے اوصاف ایسے ہی تھے۔ اہلِ مکہ جنھوں نے آپ ﷺ سے ،اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے کے بعد عداوت ٹھان لی تھی، اور انھوں نے آپ ﷺ کے متبعین پر ظلم ڈھایا، اور آپ ﷺ کو بہت سے امور پر مجبور کیا، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کو مجبور ہو کر دعوت کے مواقع کی تلاش میں طائف جانا پڑا، پھر انھوں نے آپ ﷺ کو مدینہ ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ان اہلِ مکہ کو اپنی

---

(۱) بخاری: رقم: ۵۹

(۲) مسلم: رقم: ۱۷۳۸

امانتیں رکھنے کے لیے آپ ﷺ کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ملی، اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے آپ ﷺ کی ہجرت کے بعد اہم کاموں میں سے ایک اہم کام امانت رکھی ہوئی چیزوں کو ان کے مالکوں تک پہنچانا تھا؛ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تین دن کے لیے رک گئے اور تمام امانتیں اہلِ امانت کو واپس کردیں۔ (۱). یہ امانت کی ادائیگی کا سب سے اعلیٰ مقام ہے۔

(۳) راز محفوظ رکھنے میں امانت:

یہ دوسرا میدان ہے جس کو اسلام امانت کے میدانوں میں سے ہی قرار دیتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ بِالْحَدِيثِ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ أَمَانَةٌ» (۲).

جب کوئی آدمی (کسی سے) کوئی بات بیان کرے، پھر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگے تو یہ (بات) امانت ہے۔

اِلْتَفَتَ (اِدھر اُدھر دیکھنے) کے معنیٰ - واللہ اعلم - یہ معلوم ہوتے ہیں کہ وہ شخص اس بات سے ڈر رہا ہے کہ کوئی دوسرا اُس کی بات نہ سن لے، پس "اُس کا التفات" (اِدھر اُدھر دیکھنا) اس بات کا اظہار ہے کہ یہ راز ہے، اس کو محفوظ رکھنا۔ اور اِسی باب میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"بے شک اللہ کے نزدیک قیامت کے دن یہ بھی عظیم ترین امانت ہے کہ آدمی اپنی بیوی سے خلوت کرے اور بیوی اُس سے خلوت کرے، پھر مرد اس کے راز کو پھیلادے"۔ (۳).

(۴) مشورے میں امانت:

حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد آیا ہے:

«اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ» (۴).

جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے۔

جس آدمی نے کسی سے مشورہ لیا تو اس نے اُس پر اعتماد کیا اور اس کو اس چیز کے بارے میں امین

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۴۹۳

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۸۶۸، ترمذی: رقم: ۱۹۵۹

(۳) مسلم: رقم: ۱۴۳۷

(۴) ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ۔

سمجھا جو اس کے سامنے پیش کی، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کا اہل ہو جس سلسلے میں اس کو امین بنایا گیا ہے اور یہ اس کی مصلحت کے مطابق اسے مشورہ دے، اس کے لیے کوشش کرے، اگر اس نے غلط مشورہ دیا اور مصلحت کو چھپایا تو یہ بالکل خیانت ہے۔ ہم امانت کے سلسلے میں اسی قدر گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں۔

امانت اور ایمان:

رسول اللہ ﷺ نے بہت سی احادیث میں امانت کو ایمان کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ اور ہم نے گذشتہ فصل میں منافقین کی صفات میں آپ ﷺ کا یہ قول جو بہت سی احادیث میں بار بار آیا ہے «وَإِذَا أُتُمِنَ خَانَ» (جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے) پڑھا ہے اور اسی میں آپ ﷺ کا یہ قول ہے:

«لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ»(1). — اس شخص کا ایمان نہیں جس میں امانت نہیں، اور اس شخص کا دین نہیں جس کے اندر عہد کی پاسداری نہیں۔

اس لیے امانت انسان کی ذات کے ساتھ لازمی طور پر رہنے والی صفت ہے، اور یہ کسی بھی ردِّ عمل سے، خواہ اس کا حجم کیسا ہی ہو، متاثر نہیں ہوتی۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعے واضح فرمایا:

«أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ، وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ»(2). — جس نے تم کو امین بنایا اس کی امانت ادا کرو اور جس نے تم سے خیانت کی تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔

اور اسی طرح امانت کسی طرح کی تقسیم قبول نہیں کرتی اور آپ ﷺ کی بہت سی احادیث میں واضح طور پر یہ حقیقت آئی ہے، ان میں سے ایک حدیث یہ ہے:

”تم میں سے جس کسی کو ہم نے کسی کام کا عامل بنایا، پھر اس نے اگر ایک سوئی یا اس سے بھی گئی

(۱) مسند احمد، بیہقی عن انس رضی اللہ عنہ۔

(۲) ابوداؤد: رقم: ۳۵۳۵، ترمذی: رقم: ۱۲۶۴، دارمی: رقم: ۲۵۹۷

گزری چیز چھپائی تو یہ مالِ غنیمت میں خیانت ہے، قیامت کے دن وہ اس کو لے کر آئے گا"۔ [۱]

اور یہاں سوئی سے زیادہ چھوٹی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کو ذکر کیا جاتا، پس یہ چیز یا تو امانت کہلائے گی یا خیانت (درمیان میں کوئی چیز نہیں)۔

سب سے بڑی امانت:

اگر ہم سب سے بڑی امانت کے سلسلے میں گفتگو کرنا چاہیں تو یہ وہ امانت ہے جس کا رسول اللہ ﷺ نے رسالت کی تبلیغ، وحی کی حفاظت اور اس کے نقل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے میں بار اٹھایا اور اللہ تعالیٰ نے اس امانت کی جلالتِ شان کو اپنے اس قول کے ذریعہ بتلایا:

﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝﴾ {المزمل: ۵}

بے شک ہم آپ پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔

آپ ﷺ نے اپنے اوپر نازل شدہ وحی اور احکام پہنچا دیے اور حجۃ الوداع میں جب آپ نے جامع و مؤثر خطبہ ارشاد فرمایا تو اس پر (تبلیغِ رسالت پر) اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا، پھر (حاضرین سے) پوچھا: کیا میں نے رسالت کو تم تک پہنچا دیا؟ اصحاب رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! آپ گواہ رہیے۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث بیان کی ہے۔ اس حدیث میں یہ بھی ہے:

«وَمَنْ زَعَمَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَمَ شَيْئًا مِنْ كِتَابِ اللهِ، فَقَدْ أَعْظَمَ عَلَى اللهِ الْفِرْيَةَ، وَاللهُ يَقُولُ: ﴿يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ {المائدۃ: ۶۷}» [۲]

اور جس نے یہ گمان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی کتاب میں سے کچھ چھپالیا (بیان نہیں کیا) تو اس نے اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا؛ جبکہ اللہ فرماتا ہے: اے رسول! آپ پر آپ کے رب کی طرف سے جو نازل کیا گیا ہے اس کو پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت کو نہیں پہنچایا"۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۸۳۳

(۲) متفق علیہ: خ: ۴۸۵۵، م: ۱۷۷

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

«وَلَوْ كَانَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاتِمًا شَيْئًا مِمَّا أُنْزِلَ عَلَيْهِ لَكَتَمَ هٰذِهِ الْآيَةَ: ﴿وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۭ﴾ {الاحزاب:۳۷}»[۱].

اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اوپر نازل شدہ آیات میں سے کچھ بھی چھپانے والے ہوتے تو وہ اس آیت کو چھپا لیتے: ترجمہ: ”(اور اے پیغمبر!) یاد کرو جب تم اس شخص سے جس پر اللہ نے بھی احسان کیا تھا اور تم نے بھی احسان کیا تھا یہ کہہ رہے تھے کہ: اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں رہنے دو اور اللہ سے ڈرو اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھول دینے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔“

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں:

”حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ (اپنی بیوی کی) شکایت کرنے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: ”اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو“، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ بھی چھپانے والے ہوتے تو اس کو چھپا لیتے۔“[۲].

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کے تفسیری اقوال میں درجِ ذیل آیات کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝١ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۝٢ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝٣ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝٤ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝٥ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝٦ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنْ جَاۗءَكَ يَسْعٰى ۝٨ وَهُوَ يَخْشٰى ۝٩ فَاَنْتَ عَنْهُ

(پیغمبر نے منہ بنایا اور رخ پھیر لیا، اس لیے کہ ان کے پاس وہ نابینا آ گیا تھا اور (اے پیغمبر!) تمھیں کیا خبر؟ شاید وہ سدھر جاتا، یا وہ نصیحت قبول کرتا اور نصیحت کرنا اسے فائدہ پہنچاتا۔ وہ شخص جو بے پروائی دکھا رہا تھا اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۷۷

(۲) بخاری: رقم: ۷۴۲۰

تَلَهّٰى ۝ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ ﴾ {عبس: ۱۱-۱}

سدھرے تو تم پر کوئی ذمے داری نہیں آتی اور جو محنت کر کے تمھارے پاس آیا ہے اور وہ دل میں اللہ کا خوف رکھتا ہے تم اس کی طرف سے بے پروائی برتتے ہو، ہر گز ایسا نہیں چاہیے! یہ قرآن تو ایک نصیحت ہے۔

اگر آپ ﷺ قرآن میں سے کچھ چھپانے والے ہوتے تو اس آیت کو چھپا لیتے، کیونکہ یہ آیت پہلی آیت سے کم نہیں ہے۔

دعا:

اور چونکہ امانت کا ایک عظیم اور خاص مرتبہ ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ اپنے مسافر صحابی کو رخصت کرتے تو فرماتے:

«أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ»[1].

میں تمھارے دین کو، تمھاری امانت کو، تمھارے اعمال کے انجام کو اللہ کی امانت اور حفاظت میں دیتا ہوں۔

بے شک یہ دعا بھی ہے اور وصیت بھی۔

اور چونکہ خیانت کا امانت کو توڑنے اور ختم کرنے میں بُرا اثر ہے تو آپ ﷺ کی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی تھی:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُوعِ، فَإِنَّهُ بِئْسَ الضَّجِيعُ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخِيَانَةِ، فَإِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ»[2].

اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں بھوک سے، اس لیے کہ وہ برا ساتھی ہے اور پناہ مانگتا ہوں خیانت سے، اس لیے کہ وہ برا مصاحب و ہم نشیں ہے۔

---

(۱) ترمذی: رقم: ۳۴۴۳

(۲) ابوداؤد: رقم: ۱۵۴۷، نسائی: رقم: ۵۴۸۳

آٹھویں فصل

بہادری اور دست گیری

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: حضور ﷺ بہادری اور دست گیری کے اس مقامِ بلند پر فائز تھے جس کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ آپ بہت سے سخت حالات میں شریک ہوئے اور متعدد مرتبہ بہادر و سورما بھاگ کھڑے ہوئے جبکہ آپ ﷺ ثابت قدم رہے، پیش قدمی کرتے رہے، نہ پیٹھ دکھائی نہ اپنی جگہ چھوڑی۔ آپ ﷺ کے علاوہ ہر بہادر کا راہِ فرار اختیار کرنا اور اپنی جگہ چھوڑ جانا معلوم و محفوظ ہے۔ (۱)

جنگوں میں آپ ﷺ کی شجاعت:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”جب جنگ بہت سخت اور شباب پر ہوتی تو ہم آپ ﷺ کے ذریعے اپنا بچاؤ کرتے (آپ کی پناہ میں آتے) اور ہم میں سے سب سے بہادر وہ ہوتا جو آپ یعنی نبی ﷺ کے برابر میں ہوتا“۔ (۲)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْسَنَ النَّاسِ، وَأَشْجَعَ النَّاسِ، وَأَجْوَدَ النَّاسِ» (۳)

رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے اچھے (خوب صورت)، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”جب جنگ بہت سخت تیز ہو جاتی اور فوج فوج کے سامنے ہوتی تو ہم رسول اللہ ﷺ سے

---

(۱) الشفاء: ۱/۱۴۸

(۲) مسلم: رقم: ۱۷۷۶

(۳) متفق علیہ: خ: ۳۰۴۰، م: ۲۳۰۷

بچاؤ حاصل کرتے (آپ کی پناہ میں آتے) اور کوئی بھی آپ سے زیادہ دشمن کے قریب نہ ہوتا"۔ (۱)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"بدر کے دن میں نے اپنے آپ کو اس حال میں دیکھا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پناہ حاصل کر رہے تھے اور آپ ہم میں دشمن کے سب سے زیادہ قریب تھے اور اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ سخت جنگ جوئی سے لڑ رہے تھے"۔ (۲)

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی میدانِ جنگ کے مواقع کی چند شہادتیں ہیں۔

اور کافی ہے کہ ہم غزوۂ حنین کے بعض مناظر نقل کر دیں جس میں مسلمانوں کو سخت مصیبتیں اور پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ جو غزوۂ ذاتِ قرد (۳) میں تربیت یافتہ شہسوار تھے، اپنا حال بیان کرتے ہیں؛ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے پیٹھ پھیر دی، میں ہارا ہوا لوٹنے لگا، میرے اوپر دو دھاری دار چادریں تھیں، ایک کو میں ازار کے طور پر پہنے ہوئے تھا اور دوسری کو اوڑھے ہوئے تھا، میرا تہبند کھلنے لگا تو میں نے ان دونوں کو سمیٹا۔ میں ہارا ہوا؛ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چتکبرے خچر پر سوار تھے؛ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابن الاکوع نے زیادہ خوف و گھبراہٹ کی چیز دیکھ لی ہے"، پھر جب دشمنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خچر سے اتر گئے۔ (۴)

اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہمارے لیے ایک دوسرے منظر کا حال نقل کرتے ہیں:

"پس جب مسلمان اور کفار آمنے سامنے ہوئے تو مسلمان پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے

---

(۱) أخرجه الإمام أحمد: ۱/۱۵۶، وأبو الشيخ في أخلاق النبي: ص: ۵۷، والبغوي في الأنوار: ۲۵۶

(۲) أخرجه الإمام أحمد: ۱/۸۶، وأبو الشيخ في أخلاق النبي: ص: ۵۷، والبغوي في الأنوار: ۲۵۷

(۳) غزوۂ ذاتِ قرد میں دشمن (غطفان و فزارہ کے لوگ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دودھ کی اونٹنیاں (جو ذاتِ قرد مقام پر چر رہی تھیں) لے بھاگے۔ حضرت سلمہ ابن الاکوع رضی اللہ عنہ نے تنِ تنہا ان کا پیچھا کر کے اونٹنیاں چھڑا لیں۔ (بخاری: ۴۱۹۴، مسلم: ۱۸۰۶)

(۴) مسلم: رقم: ۱۷۷۷، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی مٹی لی اور "شَاهَتِ الْوُجُوْهُ" پڑھ کر دشمنوں کی طرف پھینک دی اور دشمن شکست کھا گئے۔ از مصحح

ہوئے، (لیکن) رسول اللہ ﷺ اپنے خچر کو کفار کی طرف بڑھانے لگے، جبکہ میں اس کی لگام پکڑ کر روک رہا تھا کہ وہ آگے نہ بڑھے۔ [1]

اور ایک آدمی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے ابو عمارہ! کیا آپ غزوۂ حنین کے دن بھاگے تھے؟ انھوں نے کہا: خدا کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے پیٹھ نہیں پھیری، میں نے ان کو دیکھا کہ وہ اپنے سفید خچر پر ہیں اور ابو سفیان بن حارث اس کی لگام پکڑے ہوئے ہیں اور نبی ﷺ فرما رہے ہیں: ''میں نبی ہوں، اس میں کچھ بھی جھوٹ نہیں، میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں''۔ [2]

حضرت ابن الاکوع رضی اللہ عنہ کی حالت معرکے کی ہولناکی کا نقشہ کھینچتی ہے کہ اپنے کپڑوں کو ہاتھ سے پکڑے ننگے دوڑ رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ کبھی اپنے خچر سے اتر کر زمین پر لڑ رہے تھے اور کبھی دشمن کے مقابلے میں تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے اور آپ کی تیز پیش قدمی کی وجہ سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ پر خوف محسوس کر رہے تھے، اس لیے خچر کو تیزی سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے اور موقف کی شدت و صعوبت کے باوجود آپ ﷺ اپنے آپ کو (دشمن سے) چھپا نہیں رہے تھے، جبکہ آپ ﷺ ہی اصل نشانہ تھے، بلکہ آپ ﷺ اعلان کر رہے تھے کہ: ''میں نبی ہوں، اس میں کچھ بھی جھوٹ نہیں، الخ''۔ نبی ﷺ کے الفاظ یہ ہیں: ''اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ'' أَنَا ابنُ عَبْدِ الْمُطَّلِب.

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ آپ ﷺ اس جنگ میں خچر پر (سوار ہو کر) سر گرمِ معرکہ ہوئے اور خچر گھوڑوں جیسے نہیں ہوتے جنگی مہمات میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی ﷺ کی شجاعت کے سامنے تمام شجاعتیں ہیچ ہیں۔ جس نے آپ ﷺ کی سیرت کا بغور مطالعہ کیا وہ اس بات کو یقینی طور پر جانتا ہے۔

جنگ کے علاوہ آپ ﷺ کی ہمہ گیر شجاعت:

اور شجاعت و بہادری کا اظہار جنگ کے علاوہ (دیگر مقامات) پر بھی ہوتا ہے، مثلاً گھبراہٹ، خوف اور خطرہ کے وقت؛ نبی ﷺ اس میدان میں بھی ہمیشہ سب سے آگے (اور نمایاں) تھے جیسا کہ

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۷۷۵

(۲) متفق علیہ: خ: ۲۸۶۴، ۲۹۳۰، م: ۱۷۷۶

آپ ﷺ کی ہمیشہ کی یہی شان ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ سب سے اچھے، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ بہادر تھے، وہ کہتے ہیں: ایک رات مدینے والے ایک آواز سن کر گھبرا گئے، راوی کہتے ہیں کہ اُن کو نبی ﷺ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار سب سے آگے ملے اور آپ ﷺ اپنی تلوار لٹکائے ہوئے تھے، پس فرمایا: ''لَمْ تُرَاعُوا، لَمْ تُرَاعُوا'' (ڈر کی کوئی بات نہیں ہے!)، پھر فرمایا: ''وَجَدْتُهُ بَحْرًا'' ۔اس کو یعنی گھوڑے کو[1] میں نے بحر (تیز رفتار) پایا۔[2]

اور یہ شجاعت کی ایک نادر و نایاب صورت ہے، لوگ ایک آواز سنتے ہیں اور خبر معلوم کرنے کے لیے نکلتے ہیں، اچانک دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اکیلے اس کی طرف جا کر حقیقتِ حال معلوم کر چکے ہیں اور لوگوں کو اطمینان دلا رہے ہیں، گھوڑا ننگی پیٹھ تھا اس لیے کہ زین کسنے کے لیے وقت میں گنجائش نہیں تھی، اس لیے آپ ﷺ اپنی تلوار لے کر اس پر ننگی پیٹھ ہی سوار ہو گئے اور ایسے مواقع میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ گھوڑے نے آپ کی خواہش کے مطابق اپنی تیز رفتاری خوب دکھائی، پس وہ دریا کی روانی کی مانند تیز رفتار ثابت ہوا۔

آپ ﷺ نے لوگوں کے گھر سے نکلنے کا انتظار نہیں کیا کہ خبر لانے میں کوئی آپ کے ساتھ ہو جائے جیسا کہ سبھی لوگ اس جیسے موقع پر کیا کرتے ہیں۔

بے مثال بہادری:

بہت سے حالات و واقعات ایسے (پُر خطر اور حوصلہ شکن) ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے جنگی حالات

---

(۱) حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا یہ گھوڑا سست روی کے لیے مشہور تھا؛ لیکن آپ ﷺ کی برکت سے وہ انتہائی تیز رفتار ہو گیا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ '' اس کو میں نے انتہائی سبک رفتار پایا''، بعد میں بھی وہ گھوڑا تیز رفتار ہی رہا۔ {از: ط.ق}

(۲) متفق علیہ: خ: ۳۰۴۰، م: ۲۳۰۷

بھی کم خطرناک ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی شجاعت کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک بڑی کتاب تیار ہو جائے، ہم ان مواقع میں سے صرف ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

معراج واسراء کا واقعہ:

معراج اور اسراء کا واقعہ مکے میں ہوا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات کے بعد پیش آیا۔ یہ دونوں مشرکین کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھڑے رہتے تھے۔(واقعۂ معراج کے بعد) رسول اللہ ﷺ نے باہر نکل کر صحابہ کو سنانے سے پہلے مشرکین کو (یہ واقعہ) بتایا، تو کوئی تالی بجاتا، کوئی استہزاء کرتا تو کوئی جھٹلاتا، کوئی تعجب سے ہاتھ سر پر رکھتا، پھر لوگوں نے آپ ﷺ سے بیت المقدس کا حلیہ بیان کرنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے بیان فرمادیا۔ اور دوسری طرف یہ بھی ثابت ہے کہ بعض مسلمان اُس دن مرتد ہو گئے۔ اس موقف کے پہلوؤں کو اگر ہم اپنے ذہن میں سوچیں تو دیکھیں گے کہ معرکوں میں بہادری وشہ سواری کے تمام مواقف اس سے کم تر ہیں، آپ ﷺ تنہا کھڑے ہیں، آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کوئی آپ کے ساتھ نہیں ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو خبر (ہی) نہیں دی تھی، آپ ﷺ جھٹلانے والے مشرکین کو ایسی خبر دے رہے ہیں جس کے سمجھنے سے ان کی عقلیں قاصر تھیں۔

لیکن آپ ﷺ اپنے بیان پر بیت المقدس کی کیفیت اور راستے کے بعض مشاہدات کے ذریعے دلیل پیش فرماتے ہیں، آپ ﷺ نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بتائیں اور وہ اس موقع پر آپ کے معین و مددگار ہوں، حالانکہ آپ ﷺ پہلے ہی سے جانتے تھے کہ قریش اس کو جھٹلائیں گے لیکن آپ ﷺ ایمانی حقیقت کا اعلان فرما رہے ہیں اور یہ کسی کے سہارے اور تعاون کی محتاج نہیں ہے اور اس کے مقابلے میں کسی جھٹلانے والے کا جھوٹ اور کسی منکر کا انکار ٹک نہیں سکتا۔

اور اسی طرح معراج کی خبر کو ابو جہل نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے پہلے جانا اور اسی دن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صدیق کا لقب حاصل کیا، یہی حقیقی شجاعت ہے اور یہی نبوت ہے۔[1]

---

(۱) مزید تفصیل مصنف کی کتاب ''من معین السیرۃ'' کے صفحات (۱۰۵-۱۲۰) پر دیکھیے۔

بزدلی سے پناہ چاہنا:

بہت سی احادیث بزدلی سے پناہ مانگنے کے بارے میں نبی ﷺ سے وارد ہوئی ہیں، ان میں سے آپ ﷺ کا یہ قول ہے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْهَرَمِ......... الحديث»[1].

اے اللہ! میں پناہ مانگتا ہوں بے بسی سے، سستی سے، بزدلی سے اور فانی بڑھاپے سے۔

بے شک بزدلی مسلمان کی زندگی کے جہادی فرائض کے ساتھ اور زندگی کے مختلف مواقع میں خواہ جنگی حالات ہوں یا غیر جنگی، موزوں نہیں ہے۔

اسلام میں جہاد بھی ایک فرض ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ، مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ»[2].

جو جہاد کیے بغیر مر گیا اور اس کے دل میں اس کا خیال بھی نہ آیا تو وہ نفاق کے شعبوں میں سے ایک شعبۂ نفاق پر مرا۔

اور نبی ﷺ بچوں کی پرورش جہادی تربیت کے ساتھ کرتے تھے تاکہ ان کے قلوب سے بزدلی اور خوف ختم ہو جائے۔ آپ ﷺ ان کو جنگی معرکوں میں نکلنے کی اجازت مرحمت فرماتے تاکہ وہ اس کا مشاہدہ کریں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اگرچہ وہ جہاد میں شریک نہ ہوں، حالانکہ اس کی وجہ سے وہ خطروں کے دہانے پر رہتے تھے۔

چنانچہ غزوۂ بدر جو کہ سب سے بڑا غزوہ ہے مسلمانوں کے بچے مدینہ سے نکلے تاکہ وہ وہاں پیش آنے والے حالات دیکھیں۔ بدر کے مدینے سے دور ہونے اور نکلنے میں عجلت کے باوجود۔ ان میں سے ایک حارثہ بن سراقہ بھی تھے، ان کو ادھر اُدھر سے آکر کوئی تیر لگا اور وہ ان کی شہادت کا سبب بن گیا، تو ان کی ماں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور عرض کیا:

''اے اللہ کے نبی! کیا آپ حارثہ کے بارے میں مجھ سے کچھ بیان فرمائیں گے؟ پس اگر وہ جنت

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۳۶۷، م: ۲۷۰۶

(۲) مسلم: رقم: ۱۹۱۱۔ یہ حدیث نمبر ۱۹۱۰ ہے، اصل عربی نسخے میں ۱۹۱۱ درج ہے۔

میں ہے تو میں صبر کروں گی اور اگر معاملہ کچھ اور ہے تو میں اس پر خوب روؤں گی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے حارثہ کی ماں! جنت میں بہت سے باغات ہیں اور تمہارا بیٹا فردوسِ اعلیٰ میں ہے''۔[1]

ہمیں بزدلی، کمزوری اور سستی سے پناہ مانگنے کی کس قدر ضرورت ہے اور اپنی اور اپنے بچوں کی بہادری پر تربیت کے لیے اسباب کو اختیار کرنے کی بھی شدید ضرورت ہے جیسے کہ نبی ﷺ نے کیا۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۲۸۰۹، ۳۹۸۲

نویں فصل

سخاوت وکرم

نبی ﷺ کی سخاوت وکشادہ دلی:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

''میں نبی ﷺ کے ساتھ حرۂ مدینہ (مدینے کی پتھریلی زمین والا علاقہ) میں جارہا تھا تو اُحد پہاڑ ہمارے سامنے آیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! میں نے کہا: حاضر ہوں اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے فرمایا کہ مجھ کو خوشی نہ ہوگی کہ میرے پاس اس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور اس پر تیسری رات گزرے اور میرے پاس ایک دینار (بھی) باقی رہے، سوائے کچھ تھوڑے مال کے کہ میں اس کو قرض کی ادائیگی کے لیے محفوظ رکھوں، لیکن یہ کہ میں اس کے بارے میں اللہ کے بندوں پر دائیں بائیں پیچھے خرچ کرنے کے لیے کہہ دوں کہ اس طرح اس طرح اس طرح''۔(۱)

یہ ہے آپ کی سخاوت کی حقیقت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جس کو آپ اپنے ارشاد کے ذریعے ظاہر فرمارہے ہیں اور وہ صادق ومصدوق ﷺ ہیں، یہ بات مبالغوں سے دور ہے اور بے شک آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کے سلوک اور طرزِ زندگی سے یہ جانا کہ آپ کچھ بھی جمع نہ فرماتے تھے۔

حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں نے نبی ﷺ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی، جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو جلدی سے اٹھے اور ازواجِ مطہرات میں سے کسی کے یہاں داخل ہوئے، پھر آپ باہر تشریف لائے اور آپ کی عجلت کی وجہ سے قوم میں جو تعجب کے آثار تھے ان کو دیکھا تو فرمایا: مجھے نماز میں سونے (یا چاندی) کی ایک ڈلی یاد آگئی جو ہمارے یہاں تھی، تو میں نے ناپسند کیا کہ وہ ہمارے پاس شام تک رہے، اس لیے میں نے اس کو تقسیم کردینے کا حکم دیا''۔(۲)

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۴۴۴، م: ۹۴

(۲) بخاری: رقم: ۱۲۲۱

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَدَّخِرُ شَيْئًا لِغَدٍ»(۱). نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئندہ کل کے لیے کچھ جمع نہیں فرماتے تھے۔

اور حضراتِ صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کے بعض مشاہدات نقل کیے ہیں، اور یہ چند نمونے ان واقعات پر اضافہ ہیں جو اس سے پہلے مذکور ہوئے، ان سے یہ ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کی کچھ حقیقت ہمارے سامنے آجائے، اس لیے کہ قلم کے لیے مشکل ہے کہ وقائع کی مکمل تصویر کشی کر سکے، کیونکہ ہر واقعے کے ایسے حالات و متعلقات ہوتے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوں تو اکثر واقعہ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور اس کا حق ادا نہیں ہوتا۔

❖ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کی بنیاد پر کسی چیز کا سوال کیا گیا تو آپ نے ضرور عطا فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہت ساری بکریاں جو دو پہاڑوں کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں؛ عطا فرمائیں، پھر وہ اپنی قوم کی طرف واپس ہوا اور کہا: اے قوم! اسلام لے آؤ اس لیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنا دیتے ہیں کہ اس کے بعد فاقے کا اندیشہ نہیں"۔(۲)

❖ اور غزوۂ حنین کے دن صفوان بن امیہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سو اونٹ عطا فرمائے، پھر سو، پھر سو، صفوان نے کہا: خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت دیا، وہ میرے نزدیک تمام لوگوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ تھے مگر وہ مجھ کو مسلسل دیتے رہے یہاں تک کہ وہ تمام لوگوں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں"۔(۳)

اور باوجود اس کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، تاہم آپ بھلائی کے مواقع میں اور زیادہ رغبت و نشاط و عمل کے ساتھ خرچ کرتے تھے۔

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۳۶۲، الانوار للبغوی: ۲۶۱

(۲) مسلم: رقم: ۲۳۱۲۔ بعض روایات کے الفاظ سے یہ ترجمہ و مطلب نکلتا ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دینا ایسے شخص کا دینا ہے جو فاقہ سے نہیں ڈرتا یعنی جو کچھ اس کے پاس ہو سب دے دیتا ہے۔ [ط.ق]

(۳) مسلم: رقم: ۲۳۱۳

❖ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کی بھلائی میں سب سے زیادہ فیاض تھے اور رمضان میں تو اور بھی زیادہ فیاض ہو جاتے تھے جبکہ آپ سے جبرئیل علیہ السلام ملاقات کرتے اور جبرئیل علیہ السلام رمضان کی ہر رات میں ملاقات کرتے یہاں تک کہ رمضان ختم ہو جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قرآنِ پاک زبانی سناتے تھے تو آپ تیز ہوا سے زیادہ مال و دولت میں (یا ہر بھلائی میں) سخی ہوتے“۔(۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایثار:

ایثار یہ ہے کہ آدمی کوئی ایسی چیز دے دے جس کا وہ خود محتاج ہو۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے:

”ایک عورت (صحابیہ رضی اللہ عنہا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دھاری دار اوڑھنے کی ایک چادر لے کر آئی، اس میں گوٹ لگی تھی، پھر عرض کیا کہ اس کو میں نے اپنے ہاتھ سے بُنا ہے، میں اس لیے لے کر آئی ہوں تاکہ آپ اس کو زیبِ تن فرمالیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس طرح لیا جیسے آپ کو اس کی ضرورت ہو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے اور وہ چادر آپ کی تہبند تھی، پھر کسی (صحابی) کو وہ چادر پسند آگئی تو انھوں نے کہا: اس کو آپ مجھے عنایت فرمادیجیے، یہ کتنی اچھی ہے! صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: تم نے اچھا نہیں کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضرورت کی وجہ سے پہنا پھر تم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگ لیا اور تم جانتے ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انکار نہیں فرمائیں گے۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم! میں نے اس کو پہننے کے لیے نہیں مانگا، میں نے اس کو اس لیے مانگا ہے تاکہ وہ میرا کفن ہو۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ (راوی) کہتے ہیں کہ وہی چادر اُن (صحابی) کا کفن ہوئی۔(۲)

اور حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اخلاق اس سے پہچانے کہ آپ کسی سائل کو محروم واپس نہیں کرتے تھے اور اسی وجہ سے اس صحابی کو ملامت کی جس نے اس چادر کی تعریف کی اور مانگ لی۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۱۹۰۲، م: ۲۳۰۸

(۲) بخاری: رقم: ۱۲۷۷

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

«مَا سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ قَطُّ فَقَالَ: لَا»[1].

جب بھی نبی ﷺ سے کوئی چیز مانگی گئی تو آپ نے انکار نہیں فرمایا۔

ایثار سے بڑھا ہوا درجہ:

جب ایثار یہ ہے کہ انسان کوئی چیز جو اس کے پاس ہو دوسرے کو دے دے اپنی حاجت وضرورت کے باوجود، تو سنو! یہاں وہ درجہ بھی ہے جو ایثار سے بڑھ کر ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ دیتے اس حال میں کہ وہ شئے آپ کے پاس نہ ہوتی تو آپ دینے کے لیے قرض لے لیتے۔

اور یہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا اور ہم حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث طویل ہونے کے باوجود بیان کرتے ہیں، اس لیے کہ اس میں اس معنیٰ (ایثار سے بڑے درجے) کا بیان ہے۔

حضرت عبداللہ ہوزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

"حلب میں رسول اللہ ﷺ کے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے میں نے ملاقات کی، میں نے کہا: اے بلالؓ! مجھے یہ بتایئے کہ رسول اللہ ﷺ کا خرچ کیسا تھا؟ تو انھوں نے فرمایا: آپ ﷺ کے پاس کچھ نہیں ہوتا تھا، آپ کی بعثت سے وفات تک آپ کی جانب سے خرچ کی ذمے داری کی خدمات میں ہی انجام دے رہا تھا، آپ کا حال یہ تھا کہ جب کوئی انسان آپ کے پاس مسلمان ہو کر آتا اور آپ اس کو برہنہ تن دیکھتے، تو مجھ کو حکم فرماتے، میں جاتا، قرض لیتا، اس کے لیے چادر خریدتا، پھر اس کو پہناتا اور اس کو کھانا کھلاتا۔

یہاں تک کہ مشرکین میں کا ایک آدمی مجھے راستے میں ملا اور کہنے لگا: اے بلال! میرے پاس مالی وسعت ہے، تم میرے علاوہ کسی سے قرض مت لیا کرو، میں نے ہاں کر لی، پھر ایک دن میں نے وضو کیا، پھر اذان دینے کے لئے اٹھا تو اچانک وہ مشرک تاجروں کی ایک جماعت لیے سامنے آیا، جب اُس نے مجھ کو دیکھا، کہا: اے حبشی! میں نے کہا: موجود ہوں، پھر اُس نے مجھ سے بدکلامی کی اور مجھ کو سخت باتیں کہیں اور مجھ سے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ تمھارے اور مہینے کے پورا ہونے کے درمیان کتنا

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۰۳۴، م: ۲۳۱۱

وقت ہے؟ میں نے کہا: قریب ہے، اُس نے کہا: چار دن ہیں، تو میں تجھے اور جو تجھ پر (قرض) ہے اس کے لیے گرفتار کروں گا، اور تجھے بکری چرانے پر واپس کروں گا جیسے تو پہلے تھا۔

میرے دل میں اس کا اسی طرح اثر ہوا جو لوگوں کے دل میں (ایسے موقع پر) ہوتا ہے، یہاں تک کہ جب میں نے عشاء کی نماز پڑھی اور رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں میں واپس ہوئے تو میں نے آپ کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے مجھے اجازت عطا فرمائی، پھر میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، بات یہ ہے کہ جس مشرک سے میں قرض لیا کرتا تھا اس نے مجھ کو ایسا ایسا کہا اور آپ کے پاس مال نہیں ہے جو میری طرف سے ادا کر دیں اور نہ میرے پاس ہے، وہ مجھ کو رسوا کرنے کا ارادہ کر رہا ہے تو مجھے اجازت دیں کہ میں ان قبیلوں کی طرف بھاگ جاؤں جہاں کے لوگ اسلام لا چکے ہیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو مال عطا فرما دے جو میری طرف سے ادا ہو جائے۔

پھر میں نکلا یہاں تک کہ میں اپنے گھر آگیا، پھر میں نے اپنی تلوار، تھیلا، اپنے جوتے، اپنی ڈھال اپنے سر کے پاس رکھ لیے، یہاں تک کہ جب صبح کاذب ہوئی تو میں نے چلنے کا ارادہ کر لیا، اچانک ایک آدمی دوڑتا ہوا (نظر آیا جو) پکار رہا تھا: اے بلال! رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤ، تو میں چلا اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

پس اچانک چار بار بردار اونٹ بیٹھے جن پر سامان لدا تھا نظر آئے، میں نے آپ ﷺ سے اجازت چاہی تو مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خوش ہو جاؤ، اللہ نے تمھارے ادائے قرض کا انتظام فرما دیا''، پھر فرمایا: ''کیا تم چار بار بردار سامان سے لدے ہوئے اونٹ نہیں دیکھ رہے ہو؟'' میں نے کہا: کیوں نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم ان کے مالک ہو اور جو کچھ ان پر لدا ہوا ہے اس کے بھی مالک ہو، ان پر کپڑے اور غلے ہیں، فدک کے رئیس نے میرے پاس ہدیہ بھیجا ہے؛ لہٰذا ان کو لے لو اور اپنا قرض ادا کرو''، میں نے ایسا ہی کیا۔

پھر میں مسجد میں گیا تو دیکھا کہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف فرما ہیں، میں نے سلام کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم پر جو قرض تھا اس کا کیا ہوا؟'' میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سب ادا کرا دیا، آپ ﷺ کا سب قرض ادا ہو گیا، کچھ باقی نہیں رہا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کچھ مال بچا؟'' میں

نے کہا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: ''دیکھو! اس سے بھی مجھے راحت دلاؤ۔ (یعنی اسے بھی ضروریات میں خرچ کردو)، میں اندر گھر میں نہیں جاؤں گا جب تک تم مجھے اس سے راحت نہیں دوگے''۔

پھر جب آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھی تو مجھ کو بلایا اور فرمایا: ''جو مال باقی تھا اُس کا کیا ہوا؟'' میں نے کہا: وہ میرے ساتھ ہے، میرے پاس کوئی (لینے کے لیے) آیا ہی نہیں، تو آپ ﷺ نے رات مسجد میں گزاری، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ نے (دوسرے دن) عشاء کی نماز پڑھی تو مجھ کو بلایا اور فرمایا: ''جو باقی مال تھا اُس کا کیا ہوا؟'' حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ نے آپ کو اس سے راحت عطا فرمائی، تو آپ ﷺ نے اللہ اکبر کہا اور اللہ کی تعریف کی (یعنی الحمد للہ پڑھا) اس خوف سے کہ کہیں آپ ﷺ کو موت آجائے اور آپ کے پاس یہ مال موجود رہے۔''(۱)

اور اس طرح جیسا کہ اِس حدیث کے آغاز سے واضح ہے آپ ﷺ کے قرضوں کا بڑا حصہ اُن عطایا کی وجہ سے ہوتا جو آپ ﷺ مانگنے والوں کو عطا فرماتے یا ان کے علاوہ جن کو دینے کی آپ ﷺ ضرورت محسوس کرتے اور اسی حدیث سے سابقہ احادیثِ صحیحہ کی تائید ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کچھ جمع نہ کرتے تھے۔

خریداری یا داد و دہش؟:

اور یہاں کچھ دوسرے طریقے اور اسلوب بھی ہیں جن سے آپ ﷺ کی سخاوت ظاہر ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کبھی کوئی چیز خریدتے اور پھر وہ چیز بیچنے والے ہی کو ہدیہ کر دیتے۔ یہ واقعہ حضرت

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۳۰۵۵۔ کتبِ شمائل میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک آدمی نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا، آپ نے جواب دیا کہ: ''میرے پاس (فی الحال) کچھ نہیں ہے (جو تم کو دوں)، لیکن تم میری طرف سے خرید لو، جب میرے پاس کچھ مال آئے گا تو میں ادا کر دوں گا''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایسی چیز کا بار نہیں ڈالا جس پر آپ قدرت نہیں رکھتے۔ حضور ﷺ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات سے ناگواری ہوئی، ایک انصاری صحابی کہنے لگے: یا رسول اللہ! آپ خرچ کیجیے اور عرش والے سے کمی کا اندیشہ نہ رکھیے۔ آپ ﷺ مسکرا دیے اور انصاری صحابی کی بات سے آپ کے چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ پھر آپ نے فرمایا: ''مجھے اِسی کا حکم دیا گیا ہے''۔ شمائلِ ترمذی: ۳۰۵۔ مختصر الألباني، الأنوار للبغوي: ۳۶۷۔ قال الألباني: إسناده ضعيف۔

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ پیش آیا جبکہ وہ غزوۂ تبوک سے لوٹ رہے تھے اور اس سفر میں ان کے (کمزور) اونٹ نے انھیں بدحال کر دیا تھا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستے میں جو اُن پر بیت رہی تھی اس کو دیکھا تو آپ نے اونٹ کو مارا، پھر وہ آگے آگے چلنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس شرط پر خرید لیا کہ جابر رضی اللہ عنہ اس کو مدینے میں آپ کے حوالے کر دیں گے۔

جابر رضی اللہ عنہ (مدینہ) آئے، ان کے ساتھ ان کا اونٹ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قیمت ہاتھ کے ہاتھ ادا فرمادی اور ایک قیراط زیادہ (الگ سے) دیا، اور یہ زیادہ قیراط حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے جدا نہیں ہوئے۔ (حکایتِ حال کی وجہ سے یہ استعمال کیا، غالباً برکت کے طور پر ہر وقت ساتھ رکھتے تھے)۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور اونٹ کو گھوم کر (پلٹ کر) دیکھ رہے تھے، پھر جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”قیمت اور اونٹ دونوں تمھارے ہیں“۔ (۱)

اور اسی سے ملتے جلتے ایک دوسرے واقعے میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے اور میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک جوان سرکش و ضدی اونٹ پر سوار تھا تو وہ مجھ پر غالب آ جاتا اور قوم سے آگے بڑھ جاتا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس کو ڈانٹتے اور لوٹاتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”اس کو میرے ہاتھ بیچ دو“، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ آپ کا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرے ہاتھ اس کو بیچ دو“، تو عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو آپ کے ہاتھ بیچ دیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے عبد اللہ بن عمر! یہ تمھارا ہے، اس کے ساتھ جو چاہو کرو“۔ (۲)

صاف ظاہر ہوتا ہے (واللہ اعلم) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جابر اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو نوازنا چاہتے تھے اور براہِ راست ان کو مال دینا مناسب نہ سمجھتے تھے، تو پہلے خرید لیا پھر ہدیہ دے دیا، اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۲۳۰۹، ۲۴۷۰، ۲۷۱۸، م: ۷۱۵

(۲) بخاری: رقم: ۲۱۱۵

دعا:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ ۗ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٦﴾﴾ {التغابن: ٢١}

اور خرچ کرو اپنے بھلے کو اور جس کو بچا دیا گیا اپنے جی کے لالچ سے، سو وہ لوگ وہی ہیں جو مراد کو پہنچے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لالچ سے بچو، اس لیے کہ لالچ نے تم سے پہلے والوں کو ہلاک کر دیا۔ اس نے ان کو ابھارا کہ وہ خون بہائیں اور اپنے محارم کو حلال کر لیں''۔

اور چونکہ لالچ اور بخل کا فرد اور امت کی زندگی پر بہت بُرا اثر ہوتا ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ اس سے پناہ مانگتے تھے، آپ ﷺ کی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی تھی:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ، وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ، وَضَلَعِ الدَّيْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ»[1].

اے اللہ! آپ کی پناہ مانگتا ہوں رنج و غم سے، بے بسی اور سستی سے اور بزدلی سے، بخل سے اور قرض کے دباؤ سے اور لوگوں کے غلبے سے۔

---

(۱) متفق علیہ۔

دسویں فصل

حیا

نبی ﷺ کی حیا:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے اس خلق کریم کا وصف بیان فرمایا:

﴿ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ﴾ {الاحزاب: ۵۳}

تمہاری یہ بات نبی کے لیے ایذارساں تھی اور وہ تم لوگوں سے شرماتے ہیں اور اللہ شرم نہیں کرتا ٹھیک بات بتلانے سے۔

اور بخاری و مسلم نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا؛ انھوں نے فرمایا:

"نبی ﷺ پردے میں بیٹھی ہوئی کنواری لڑکی سے زیادہ باحیا تھے، جب آپ ﷺ کسی ایسی چیز کو دیکھتے، جس کو آپ ﷺ ناپسند کرتے تو ہم آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے اس کو پہچان لیتے"۔(۱)

بخاری و مسلم نے آیتِ کریمہ کے سببِ نزول کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ انھوں نے فرمایا:

"جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو آپ ﷺ نے لوگوں کو دعوت دی، لوگوں نے کھانا کھایا، پھر پیٹھ پھیر کر بات کرنے لگے، آپ اٹھنے کی تیاری کرنے لگے (اندر جانے کے لیے)، تب بھی لوگ کھڑے نہیں ہوئے۔

جب آپ نے لوگوں کی یہ حالت دیکھی تو آپ کھڑے ہوگئے، آپ کے کھڑے ہوتے ہی کچھ کھڑے ہوگئے اور تین آدمی بیٹھے رہے، نبی ﷺ گھر میں داخل ہونے کے لیے تشریف لائے تب بھی لوگ بیٹھے رہے، پھر بعد میں لوگ کھڑے ہوئے تو میں بھی داخل ہونے لگا، تو آپ ﷺ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال لیا، پس یہ آیت نازل ہوئی: "اے ایمان والو! نبی

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۱۰۲، م: ۲۳۲۰

کے گھر میں مت داخل ہو''۔[۱]

پس آپ ﷺ کی حیا ان کے بیٹھنے کی وجہ سے تھی، لیکن آپ نے اُن سے کھڑے ہونے یعنی اٹھنے کے لیے نہیں فرمایا۔

اور ہمارے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی حیا کا ایک منظر نقل کرتی ہیں:

''انصار کی ایک عورت نے آپ ﷺ سے عرض کیا: میں حیض سے (فراغت کے بعد) کیسے نہایا کروں؟ آپ نے فرمایا: ''مشک میں لگا ہوا کوئی کپڑا لے لو اور اس کے ذریعہ طہارت حاصل کرو''۔ کہنے لگی: کیسے طہارت حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا: ''اس سے طہارت حاصل کر لو''، اس نے کہا: کیسے؟ آپ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! پاکی حاصل کر لو''۔ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:) میں نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا پھر کہا: اس کے ذریعے خون کے اثرات کو ختم کرو''۔

اور ایک روایت میں ہے کہ: ''پھر نبی ﷺ کو شرم آگئی اور اس کی طرف سے چہرہ پھیر لیا''۔[۲]

اور حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات ناپسند تھی کہ ان سے کوئی ایسی چیز صادر ہو جو آپ ﷺ کی حیا کا سبب بن جائے۔

(ایک مرتبہ) یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے اور خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ آئے اور داخل ہونے کی اجازت چاہی، پھر اجازت کے انتظار میں ٹھہر گئے اور ان سے پہلے ایک عورت پہنچ چکی تھی، وہ آپ ﷺ کے سامنے اپنا معاملہ پیش کر رہی تھی، تو اس نے کہا:

''میں رفاعہ قُرظی کے نکاح میں تھی، انھوں نے مجھے طلاقِ مغلّظہ دے دی، اس کے بعد عبد الرحمٰن بن زبیر نے میرے ساتھ نکاح کر لیا، بخدا اُن کے پاس اس کپڑے کی جھالر کے پھندنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اُس نے اپنی چادر کا پھندنا دکھلایا۔''

جب خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے اس کی بات سنی تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پکارنے لگے: اے ابو بکر! تم اس کو ایسی بات سے روکتے نہیں ہو جو وہ کھلم کھلا رسول اللہ ﷺ کے سامنے کہہ رہی ہے۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۴۷۹۱، م: ۱۴۲۸

(۲) متفق علیہ: خ: ۳۱۴، ۳۱۵، م: ۳۳۲

رسول اللہ ﷺ بس مسکرا دیے۔ (۱)

حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ کی حیا کو سمجھ رہے تھے، اسی لیے عورت کو اس سے باز رکھنے کے لیے (حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو) آواز دینے لگے۔

حیا اور ایمان:

حضورِ پاک ﷺ نے اپنے اخلاقِ حمیدہ و کریمہ میں سے حیا کے اپنانے کے لیے ابھارنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس بارے میں آپ ﷺ کے بہت سے ارشادات ہیں، آپ نے ہمارے لیے حیا کے رتبے کو واضح کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ» (۲). — ایمان کے ساٹھ سے زیادہ شعبے ہیں اور حیا ایمان کا ایک (اہم) شعبہ ہے۔

اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ذکر فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ ایک انصاری آدمی کے پاس سے گزرے، وہ اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ تم حیا کرتے ہو جبکہ حیا نے تم کو نقصان پہنچایا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس کو چھوڑ دو اس لیے کہ حیا ایمان کا حصہ ہے"۔ (۳)

اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ» (۴). — حیا صرف خیر ہی لاتی ہے۔

اس طرح پے در پے مکرر ہو کر آپ ﷺ کے ارشادات و اقوال حیا کے سلسلے میں وارد ہیں تاکہ مسلم کی بنیاد میں یہ خُلقِ حیا اچھی طرح راسخ ہو جائے اور اس کا ایمان اور اچھائی پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۰۸۴، م: ۱۴۳۳

(۲) متفق علیہ: خ: ۹، م: ۳۵

(۳) متفق علیہ: خ: ۲۴، ۶۱۱۸، م: ۳۶

(۴) متفق علیہ: خ: ۶۱۱۷، م: ۳۷

اللہ تعالیٰ سے حیا کرنا:

ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے؛ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ سے حیا کرو جیسا کہ حیا کرنے کا حق ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! الحمد للہ ہم حیا کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ نہیں، بلکہ اللہ سے شرمانا جیسا کہ شرمانے کا حق ہے، وہ یہ کہ تم سر کی حفاظت کرو اور اس کی جو اس میں محفوظ ہے اور پیٹ کی اور اس کی جس کو وہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور موت کو اور فنا ہونے کو یاد کرو اور جو آخرت کا طالب ہوتا ہے وہ دنیا کی زندگی کی زینت کو چھوڑ دیتا ہے، پس جس نے یہ کرلیا تو وہ اللہ سے شرمایا جیسا کہ اس سے شرمانے کا حق ہے"۔[1]

جب حیا رخصت ہو جاتی ہے:

حیا ایک آڑ ہے جو مؤمن کی عزتِ نفس کو محفوظ رکھتی ہے اور اس کے چال چلن کی بے حیائی سے دور رکھنے میں اور اس کے اقوال کی بدزبانی سے دور رکھنے میں حفاظت کرتی ہے اور اس طرح وہ ادنیٰ اور خراب اور گھٹیا کاموں سے بچ جاتا ہے اور جب یہ آڑ ختم ہو جاتی ہے اور حیا رخصت ہو جاتی ہے تو تمام معیار و پیمانے خلل رسید ہو جاتے ہیں اور تب انسان سے ایسے امور صادر ہونے لگتے ہیں جو اس کی انسانیت کے ساتھ اور اُس اعزاز کے ساتھ جو اللہ نے اس کو بخشا ہے، میل نہیں کھاتے۔

اور اسی معنی میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان روایت کرتے ہیں:

«إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولَى: إِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ»[2].

ابتدائی زمانۂ نبوت کے کلام میں سے جو لوگوں نے پایا اس میں یہ ہے: جب تم میں حیا نہ رہے تو جو چاہو کرو۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
"بے حیائی جس چیز میں در آتی ہے اس کو عیب دار کر دیتی ہے اور حیا جس چیز میں بھی رہتی ہے اس کو خوش نما و آراستہ بنا دیتی ہے۔"[3].

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۴۵۸

(۲) بخاری: رقم: ۶۱۲۰

(۳) ترمذی: رقم: ۱۹۷۴، ابن ماجہ: رقم: ۴۱۸۵

گیارہویں فصل

تواضع/انکساری

تواضع/انکساری:

تواضع روح کی بلندی اور نفس جھکانے کا نام ہے، کیونکہ یہ اعلیٰ مفاہیم کے ساتھ تعامل اور مادی دنیا سے اوپر اٹھنے کا نام ہے اور امور کے حقائق تک پہنچنا ہے جہاں ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی جاتی ہے۔اور تواضع نفسِ امارہ کو گرانے اور اس کو اس کی جگہ پر لوٹانے کا نام ہے۔

پس تواضع یہ ہے کہ تم اپنے آپ کی دوسروں پر کوئی فضیلت نہ سمجھو کیونکہ یہ کبر کا مقابل ہے اور تواضع نفس کو نیچے لانا ہے بغیر ذلت اور اس کی عزت کی اہانت کے۔ تواضع اطمینان و سکون اور اپنے کو حقیر و ذلیل ظاہر کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ صرف انسان کے اس طور طریقے کا نام ہے جس کا اثر انسان کے اپنے نفس کے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ طرزِ عمل کے دوران ظاہر ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تواضع کے چند مناظر:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ {الشعراء:۲۱۵}

اور اپنے بازو نیچے کر ان کے واسطے جو تیرے ساتھ ہیں ایمان والے۔

اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا یہ وصف بیان فرمایا جو اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے:

﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ {الشعراء:۲۱۵}

نرم دل ہیں مسلمانوں پر، زبردست ہیں کافروں پر۔

اور بے شک رسول اللہ ﷺ ایسے ہی تھے اور یہ آپ ﷺ کی روزمرہ کی زندگی کے آنکھوں دیکھے چند واقعات ہیں؛ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا لوگوں کے ساتھ معاملہ

کیسا تھا؟ آپ ﷺ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم پر اپنے آپ کو ممتاز و نمایاں نہیں کرتے تھے؛ چنانچہ مسجد میں داخل ہونے والا آپ کو پہچان نہ پاتا تھا، یہاں تک کہ پوچھتا تھا کہ محمد ﷺ کون ہیں؟(۱).

اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ انھوں نے فرمایا:

''میرے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ کے لیے چمڑے کا ایک تکیہ جس کا بھراؤ کھجور کی چھال تھی، رکھ دیا تو آپ زمین پر بیٹھ گئے اور تکیہ میرے اور آپ کے بیچ میں ہو گیا''۔(۲).

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کو نماز پڑھتے ہوئے پایا، آپ ایک چٹائی پر نماز پڑھ رہے تھے، اسی پر سجدہ کر رہے تھے''۔(۳).

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''ایک عورت نے جس کی عقل میں کچھ (فتور) تھا کہا: یا رسول اللہ! مجھے آپ سے کچھ ضرورت ہے، آپ نے فرمایا: اے فلاں کی ماں! دیکھ لو! کس گلی یا راستے کے کنارے میں تمھاری بات پوری کروں، آپ اس کے ساتھ ایک راستے پر ٹھہر گئے اور اس نے اپنی بات پوری کر لی''۔(۴).

اور حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے:

''ان سے پوچھا گیا کہ نبی ﷺ اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ جواب دیا: وہ اپنے گھر والوں کے کام میں ہوتے تھے۔ ان کی مراد گھر والوں کی خدمت تھی''۔(۵).

اور دوسری روایات بھی آئی ہیں جو بخاری کی روایت کی وضاحت کرتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ نبی ﷺ اپنا جوتا مرمت کر لیتے تھے اور اپنا کپڑا سی لیتے تھے اور دوسری روایت میں ہے کہ

---

(۱) بخاری: رقم: ۶۳
(۲) متفق علیہ: خ: ۱۹۸۰، م: ۱۱۵۹
(۳) مسلم: رقم: ۶۶۱
(۴) مسلم: رقم: ۲۳۲۶
(۵) بخاری: رقم: ۶۷۶

اپنے کپڑے میں پیوند لگا لیتے تھے اور تیسری روایت میں ہے کہ اپنے کپڑے سے جوئیں وغیرہ صاف کر لیتے اور اپنی بکری کا دودھ نکال لیتے تھے۔[(۱)]

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پرانے کجاوے اور گدے کے ساتھ حج کیا، ایسا گدا جس کی قیمت چار درہم کے برابر یا اس سے بھی کم تھی، پھر فرمایا: اے اللہ! یہ حج ہے جس میں دکھاوا اور شہرت نہیں''۔[(۲)]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہی تخریج کی:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی اونٹ پر حج کیا اور اسی پر آپ کا سامانِ سفر بھی تھا''۔[(۳)]

اور اُن ہی سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا: میں نے نہیں دیکھا کسی آدمی کو جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر ہٹا لیا ہو، یہاں تک کہ وہ آدمی ہی اپنا سر ہٹا لے اور میں نے کسی آدمی کو نہیں دیکھا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک پکڑا ہو تو آپ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا ہو، یہاں تک کہ وہی آدمی پہلے آپ کا ہاتھ چھوڑتا''۔[(۴)]

اور ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا اور بات کرنے لگا تو اس کے مونڈھے اور سینے کے درمیان کا گوشت خوف کی وجہ سے حرکت کرنے لگا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم خاطر جمع رکھو، (اطمینان رکھو)، اس لیے کہ میں بادشاہ نہیں ہوں، میں تو ایک ایسی عورت کا لڑکا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھاتی تھی''۔[(۵)]

اگر ہم ان ساری چیزوں کو بیان کرنے لگیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع پر دلالت کرتی ہیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر سلوک آپ کی تواضع کا مظہر تھا اور شاید کہ آپ کی

---

(۱) الأنوار للبغوی: ۳۸۸، ۳۹۰۔ الأدب المفرد للبخاری، شمائل ترمذی۔

(۲) ابنِ ماجہ: رقم: ۲۸۹۰، ترمذی فی الشمائل: ۳۲۷، ۳۳۳، البغوی فی الأنوار: ۴۰۲

(۳) بخاری: رقم: ۱۵۱۷

(۴) ابوداؤد: رقم: ۴۷۹۴، البغوی فی الأنوار: ۳۸۱

(۵) ابن ماجہ: رقم: ۳۳۱۲، البغوی فی الأنوار: ۴۱۳

تواضع کے بیان میں اس خصوصی واقعے کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہے۔ وہ خصوصی واقعہ آپ ﷺ کا مکے میں فاتحانہ داخل ہونا ہے۔

رسول اللہ ﷺ مکے سے ہجرت کے دن اس حالت میں نکلے کہ خوف کا ماحول تھا اور آپ کا تعاقب کیا جارہا تھا، قریش آپ ﷺ کے قتل کے درپے تھے، اگر اُن کے بس میں ہوتا اور اس کے بعد بہت سی جنگیں (بھی) ہوئیں، جن میں قریش کا ارادہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کو ختم کرنے کا تھا اگر ان کے لیے (ایسا کرنا) ممکن ہوتا۔

(مگر) دیکھو کہ آج آپ ﷺ کامیابی اور فتح مندی کے ساتھ مکہ واپس لوٹ رہے ہیں۔ آپ کو یہ حق تھا کہ سر کو بلند کر کے پوری تمکنت، شان و شوکت، شیخی، بڑائی اور اونچائی کے مظاہرہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں اور اگر ایسا کرتے تو کوئی آپ کو ملامت نہ کرتا؛ لیکن آپ ﷺ عاجزی اور خشوع و خضوع کے ساتھ داخل ہوئے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ آپ کی داڑھی کے بال کجاوے کا اگلا حصہ چھو جائیں [۱]، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کر رہے تھے اُس فتح و نصرت پر جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی۔

تواضع کے بارے میں آپ ﷺ کے ارشادات:

اور جن چیزوں سے نبی ﷺ کی تواضع کی صورت اور بیان مکمل ہوتا ہے وہ اس موضوع پر وارد ہونے والے آپ کے اقوال ہیں:

❖ ”اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ ایک دوسرے کے ساتھ تواضع کرو یہاں تک کہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے“۔

«وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ» [۲]. اور جس کسی نے بھی تواضع اختیار کی اللہ کے لئے تو اللہ نے اس کو بلند کر دیا۔

❖ ”بے شک اللہ تعالیٰ متقی غنی (غنی النفس) اور خوف کرنے والے بندے کو پسند

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲ / ۴۰۵

(۲) مسلم: رقم: ۲۵۸۸

کرتے ہیں''۔(۱).

❖ اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

''انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری مبالغہ آمیز (حد سے زیادہ) تعریف مت کرو، جس طرح نصاریٰ نے ابنِ مریم علیہ السلام کی مبالغہ آمیز تعریف کی، میں تو اس کا بندہ ہوں، لہٰذا مجھ کو عبد اللہ اور رسول اللہ کہو''۔(۲).

اور حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بات کا التزام کیا جس کا اُن کو حکم دیا گیا تھا قول سے بھی اور عمل سے بھی؛ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

''صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبوب نہ تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: صحابہ رضی اللہ عنہم جب آپ کو دیکھتے تو کھڑے نہ ہوتے، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ آپ اُسے ناپسند کرتے ہیں''۔(۳).

کبر اور خود پسندی کی برائی:

تواضع اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ دل کبر اور خود پسندی سے پاک صاف نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام نے مسلمانوں کی تربیت کے سلسلے میں کبر کے عنوان پر بمقابلہ تواضع کے زیادہ اور طویل کلام کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس جب اس رذیلے (بُری خصلت) سے - جس کا نام کبر ہے - اور اُس کے ملحقات عُجب اور شیخی وغیرہ سے چھٹکارا پالیتا ہے، تو تواضع آسانی اور سہولت کے ساتھ نفس میں جانے کا راستہ پالیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ {القصص: ۸۳}

یہ آخرت کا گھر ہم اُن کے لیے کرتے ہیں جو زمین میں تکبر نہیں چاہتے اور نہ فساد، اور عاقبت پرہیز گاروں ہی کی ہے۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۹۶۵

(۲) بخاری: رقم: ۳۴۴۵

(۳) ترمذی: رقم: ۲۷۵۴، والبغوی فی الأنوار: ۳۹۲

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿١٨﴾﴾ {لقمان:۱۸}

اور اپنے گال مت پھلا لوگوں کی طرف اور مت چل زمین پر اتراتا، بے شک اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اتراتا بڑائیاں کرنے والا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٣٥﴾﴾ {المؤمن:۳۵}

اللہ تعالیٰ ہر ایک متکبر سرکش کے دل پر اسی طرح مہر کر دیا کرتے ہیں۔

یہ بعض آیاتِ کریمہ ہیں جنھوں نے ہمارے لیے کبر کی بعض صورتوں کو بیان کیا ہے، جیسا کہ کبر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے غصہ کو (بھی) بیان کیا ہے۔

اور جب نفس کی آفات میں سے اِس آفت یعنی کبر و خود پسندی میں انسان اور اس کے خاتمے کے لیے خطرات ہیں تو آپ ﷺ کی احادیث اور تنبیہات اس کے بُرے انجام میں گرنے سے بچانے کے سلسلے میں کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ انھوں نے کہا:

«قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: قَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي، وَالْعَظَمَةُ إِزَارِي، فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا، قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ»(۱).

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میرا ازار ہے؛ تو جس نے ان دونوں میں سے کسی ایک کو مجھ سے جھگڑ کر لینے کی کوشش کی تو میں اس کو جہنم میں ڈال دوں گا۔

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَدْخُلُ النَّارَ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِنْ إِيمَانٍ، وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرِيَاءَ»(۲).

کوئی بھی جہنم میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہوگا اور کوئی بھی جنت میں نہیں داخل ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر کبر ہوگا۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۶۲۰، ابوداؤد: رقم: ۴۰۹۰، ابنِ ماجہ: رقم: ۴۱۷۴

(۲) مسلم: رقم: ۹۱

اور خود پسندی اور اکڑ، یہ کبر کے شعبوں میں سے دو شعبے ہیں اور یہ دونوں وہیں پہنچانے والے ہیں جہاں کبر پہنچاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک شخص ایسا لباس پہن کر چلا جارہا تھا جس سے اس پر خود پسندی کی کیفیت طاری تھی، مانگ پٹھے کاڑھے ہوئے تھا، اچانک اس کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں دھنسا دیا، وہ قیامت تک زمین میں دھنستا رہے گا۔"(۱)

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے تکبر سے اپنا کپڑا گھسیٹا تو اللہ تعالیٰ رحمت کی نظر قیامت کے دن اس کی طرف نہیں کرے گا"۔(۲)

کبر کی آفت و مصیبت:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جان لو! کہ "کبر" کی دو قسمیں ہیں: ظاہری و باطنی۔ پس باطنی کبر نفس کا ایک ذاتی وصف اور عادت وسیرت کا نام ہے اور ظاہری کبر وہ اعمال ہیں جو انسان کے اعضائے ظاہریہ سے صادر ہوتے ہیں اور کبر کو باطنی وصف و عادت کہنا زیادہ صحیح ہے اور رہے اعمال تو یہ اسی باطنی وصف و عادت کے ثمرات ہیں۔"(۳)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے یہ واضح ہے کہ کبر ایسا وصف و عادت ہے جو دل میں قائم ہوتا ہے اور ظاہری اعمال اُس عادت و اخلاق کی بازگشت اور گونج ہے جو دل میں پیوست ہے اور اسی وجہ سے اس باطنی اخلاق کا علاج ظاہری اعمال کے علاج سے نہیں ہو سکتا، اس کا علاج تو اصل مرض کا علاج کرنے سے ہی ہوگا۔

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۵۷۸۹، م: ۲۰۸۸

(۲) متفق علیہ: خ: ۳۶۶۵، م: ۲۰۸۵

(۳) المہذب من احیاء علوم الدین: ۲/ ۱۹۹

اسی لیے احادیث نے اس معاملے کو خوب واضح اور روشن کر دیا ہے؛ چنانچہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا:

"وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے قلب میں رائی کے دانے کے برابر کبر ہوگا، ایک صحابی نے عرض کیا کہ آدمی کو یہ پسند ہوتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، جوتا اچھا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، کبر تو تکبر کی وجہ سے حق سے انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے"۔[1]

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: ظاہری حالت کی کوئی قیمت (اعتبار) نہیں ہے جبکہ اس کے پیچھے خبیث نفس کے عوامل کارفرما ہوں اور سابقہ احادیث اس معاملے کی اچھی طرح وضاحت کر رہی ہیں۔

"جس نے تکبر سے اپنا کپڑا گھسیٹا اس کے نفس پر خود پسندی کی کیفیت طاری تھی"، اور آخری حدیث نے کبر کی تفسیر "بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ" سے فرمائی، اور بَطَرُ الْحَقِّ: حق کو دفع کرنا اور انکار کرنا ہے اپنے کو بڑا اور اونچا سمجھتے ہوئے، اور غَمْطُ النَّاسِ: لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔ اور اسی لیے ظاہری حالت ہمیشہ کبر کی دلیل نہیں ہوتی ہے اور ہم کو یہ حق نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر صرف بعض ظاہری حالات کی وجہ سے کبر کی تہمت لگا دیں۔

اور ایسی بات حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کو پیش آئی جب ان پر لوگوں نے کبر کی تہمت لگائی تو انھوں نے کہا:

"لوگ کہتے ہیں: مجھ میں کبر ہے جبکہ میں نے گدھے پر سواری کی ہے اور ایک ہی چادر اوڑھی ہے اور بکری کو دوہا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس نے یہ کام کیے تو اس میں بالکل بھی کبر نہیں ہے"۔

شخصی ذاتی پیمانہ:

(گذشتہ تفصیلات سے) ظاہر ہوتا ہے - واللہ اعلم - کہ سابقہ احادیث کا مقصد خود پسندی اور تکبر کی علامات کو بیان کرنا ہے؛ تاکہ انسان کے پاس ایسا پیمانہ ہو جس سے وہ اپنے آپ کو ناپ سکے، اور نفس

---

(۱) مسلم: رقم: ۹۱

کی اصلاح کرکے نفس کو فلاح کے راستہ تک پہنچا سکے، اس لیے کہ انسان ہی اپنے دل کی باتوں کو (بہتر طور پر) جانتا ہے، دوسرا اس کے دل کی باتوں کو نہیں جان سکتا اور وہ خود ہی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اس نے کپڑے آراستہ ہونے اور اللہ کی نعمتوں کو ظاہر کرنے کے لیے پہنے ہیں یا اس کو کبر و غرور اور اکڑ دکھانے کے لیے پہنے ہیں۔

اور اسلام نے ان علامات کو لوگوں کے ہاتھ میں اس لیے نہیں دیا ہے کہ وہ اس سے دوسروں کو ناپیں اور ان کے ذریعے لوگوں پر حکم لگائیں، اس لیے کہ کسی کو لوگوں کی نیتوں پر حکم لگانے کا اختیار نہیں، جیسا کہ ظاہر پر حکم لگا سکتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا (نیت پر حکم لگانا) کرے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے گناہ میں مبتلا کرلے جس سے وہ اس گناہ سے اپنے نامۂ اعمال میں درج کرانے سے بچ سکتا تھا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”جان لو! کہ کبر ہلاک کرنے والی چیزوں میں سے ہے اور لوگوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس میں کچھ نہ کچھ کبر نہ ہو، اس کا ازالہ فرضِ عین ہے اور یہ صرف آرزو اور نری تمنا سے زائل نہیں ہوتا، بلکہ علاج کرانے سے زائل ہوتا ہے۔“[1]

اس کا علاج وہی ہے جس کو حضرات صحابۂ کرام اور سلفِ صالحین رحمۃ اللہ علیہم نے کیا ہے؛ چنانچہ وہ ہمیشہ اپنی نفسیات کو شریعت کی ترازو میں تولتے رہتے تھے، جب بھی اس میں کوئی خلل پاتے تو مرض کے بڑھنے سے پہلے ہی اس کے علاج میں جلدی کرتے۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا ان کی گردن پر پانی کا چرمی مشکیزہ رکھا ہوا تھا تو میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! آپ کے لیے یہ مناسب نہیں ہے، تو انھوں نے کہا: جب میرے پاس سمع و طاعت لیے ہوئے وفود آئے تو میرے دل میں نخوت داخل ہو گئی تھی، میں نے اس کے توڑنے کا ارادہ کیا (جس کے لیے یہ عمل کر رہا ہوں)۔[2]

یہ ایک مثالی اور اعلیٰ نمونہ ہے، دیکھیے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نفس میں جو بات پیدا ہوئی تھی اس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا، (حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا اندازہ کیا) اور (خود ہی) علاج کی

---

(۱) المھذب من احیاء علوم الدین: ۲/ ۲۰۹

(۲) مدارج السالکین: ۲/ ۳۳۰

طرف سبقت کی۔

اور جب کوئی معاملہ خود انسان کی ذات سے متعلق ہو تو اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان احادیث کو دھیان میں رکھے جو ''ظاہر'' کے بارے میں آئی ہیں، اس لیے کہ ظاہر بھی نفس کی اندرونی کیفیت پر دلالت کرتا ہے اور اس معنی کی روشنی میں ہم آنے والی حدیث شریف کو سمجھتے ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ أَلْبَسَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَوْبًا مِثْلَهُ. وَفِي رِوَايَةٍ: أَلْبَسَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ ثُمَّ تُلَهَّبُ فِيهِ النَّارُ»(۱).

جس نے شہرت کا لباس پہنا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن اُسی جیسا لباس پہنائیں گے۔ اور ایک روایت میں ہے: قیامت کے دن اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے، پھر اس میں آگ دہکا دی جائے گی۔

پس جو انسان ایسے نفیس و بے مثال کپڑے پہننے کی حرص کرتا ہے جو اسی کے ساتھ خاص ہوں، تو اس کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں کہ اس کے نفس کے اندر یہ بات چھپی ہے کہ وہ لوگوں میں امتیازی شان کا مالک ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسان کی دوسری ضروریات رہائش اور سواری وغیرہ کو بھی لباس پر قیاس کرنا چاہیے۔

تواضع کی طرف لے جانے والا راستہ:

یہاں صحیح و حقیقی تواضع کی طرف لے جانے والا ایک ہی راستہ ہے اور وہ تمام معاملات و حالات میں آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنا ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے طریقے کا جاننا ایسی ضرورت ہے جس پر انسان کی دنیا و آخرت میں نجات موقوف ہے۔

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۴۰۲۹، ۴۰۳۰، ابن ماجہ: رقم: ۳۶۰۶، ۳۶۰۷

بارہویں فصل

رحمت

رسول اللہ ﷺ پر اللہ کی تعریف:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ﴾ {الانبیاء:۱۰۷}

اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ﴾ {التوبۃ:۱۲۸}

تمھارے پاس رسول آئے تم میں کے، بھاری ہے ان پر جو تم کو تکلیف پہنچے، حریص ہیں تمھاری بھلائی پر، ایمان والوں پر نہایت شفیق و مہربان ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ﴾ {آل عمران:۱۵۹}

سو اللہ ہی کی رحمت کے سبب تم ان کے لیے نرم دل ہو گئے اور اگر تم ہوتے تند خو سخت دل تو متفرق ہو جاتے تمھارے پاس سے۔

پہلی آیت ظاہر کرتی ہے کہ لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ ﷺ کو بھیجنا، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہی ہے۔ اور دوسری آیت سے رسول اللہ ﷺ کا شفقت و مہربانی کے ساتھ متصف ہونا ثابت ہوتا ہے، یہ آپ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت ہے۔ اور تیسری آیت پہلی آیت کے بیان کی تاکید کر رہی ہے یعنی یہ نبی ﷺ کی نرمی اللہ کی رحمت کی وجہ سے ہے اور اسی طرح آپ کی بعثت اللہ کی طرف سے رحمت ہے اور آپ کا سلوک (طرز و طریقہ) مؤمنین کے ساتھ رحمت سے پیش آنا ہے اور (ہمیں آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق و اوصاف کو ثابت کرنے کے لئے کسی اور کی شہادت کی ضرورت نہیں، بلکہ) اللہ تعالیٰ کی شہادت کافی ہے''۔

رحمت کے بارے میں عام قواعد:

رحمت کے سلسلے میں نبی ﷺ کی بہت سی احادیث ہیں، لیکن ان میں سے بعض زندگی کے متعین گوشوں سے بحث کرتی ہیں اور بعض عام قاعدوں کے طور پر وارد ہوئی ہیں جو (زندگی کے) بہت سے میدانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم مضمون کے اس حصے میں ان قواعد میں سے بعض کا ذکر کریں گے۔

(۱) لوگوں پر رحم کرنا:

نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ»[۱]. — اللہ اُس پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔

اس طرح انسان پر اللہ کا رحم کرنا اس بات پر موقوف اور مربوط ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرے۔ اور " النَّاسَ " کا لفظ اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں کو شامل ہے، اس میں جنس، رنگ اور دین کی قید نہیں ہے۔

(۲) نرمی:

نرمی پر ابھارنے کے لیے بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

«مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ، يُحْرَمِ الْخَيْرَ»[۲]. — جو آدمی نرمی سے محروم ہوتا ہے وہ بھلائی سے محروم ہوتا ہے۔

«إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ، وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ»[۳]. — نرمی جس چیز میں پائی جاتی ہے اُسے چار چاند لگا دیتی ہے اور جس چیز سے نرمی نکال لی جاتی ہے تو وہ اُس چیز کو عیب دار کر دیتی ہے۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! بے شک اللہ تعالیٰ نرم ہیں اور نرمی کو پسند کرتے ہیں

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۷۳۷۶، م: ۲۳۱۹

(۲) مسلم: رقم: ۲۵۹۲

(۳) مسلم: رقم: ۲۵۹۴

اور نرمی پر وہ عطا فرماتے ہیں جو سختی پر عطا نہیں فرماتے"۔(۱)

اور رفق مہربانی اور نرمی کا نام ہے اور یہ دونوں رحمت کے نتائج و ثمرات میں سے ہیں۔

(۳) آسانی پیدا کرنا اور سہولت دینا:

اس بارے میں بھی بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں جو آسانی پیدا کرنے کے راستے پر چلنے پر ابھارتی ہیں؛ خواہ وہ آسانی اپنی ذات سے متعلق ہو یا لوگوں سے متعلق ہو۔ ان احادیث میں سے ایک یہ ہے:

"بے شک یہ دین آسان ہے اور کوئی اپنے اوپر سختی کر کے دین میں غالب ہونے کی کوشش کرے گا تو دین ہی اس پر غالب آجائے گا، لہٰذا سیدھے چلو اور میانہ روی اختیار کرو اور خوش خبری سناؤ"۔(۲)

اور فرمایا:

"آسانی کرو، تنگی مت کرو، سکون اور آرام پہنچاؤ اور (ڈرا کر) دور مت کرو"۔(۳)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو معاملوں میں اختیار دیا گیا تو آپ نے ان میں سے آسان کو اختیار کیا؛ جب تک کہ وہ گناہ نہ ہوتا، اور اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ اُس سے دور رہنے میں سب لوگوں سے زیادہ دور ہوتے"۔(۴)

(۴) پردہ پوشی:

اور لوگوں کی پردہ پوشی کرنا بھی رحمت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو کوئی بندہ کسی بندے کی دنیا میں پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۵۹۳

(۲) بخاری: رقم: ۳۹

(۳) متفق علیہ: خ: ۶۱۲۵، م: ۱۷۳۴

(۴) متفق علیہ: خ: ۳۵۶۰، م: ۲۳۲۷

پوشی فرمائیں گے''۔[۱]

(۵) مصیبتوں کو دور کرنا اور کام آنا:

یہ ایک کشادہ اور وسیع میدان ہے۔ رحمت اس میدان میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ عمل کر سکتی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی مؤمن کو دنیا کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت سے چھٹکارا دلایا تو اللہ اس کو قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی بڑی مصیبت سے چھٹکارا دلائے گا اور جس نے کسی مبتلائے تنگی ودشواری کے حق میں آسانی پیدا کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا و آخرت میں آسانی پیدا کرے گا اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا اور اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد میں رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے''۔[۲]

اور حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور جو اپنے بھائی کی حاجت روائی میں رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی میں رہتا ہے اور جس نے کسی مسلمان کی ایک مصیبت کو دور کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مصیبتوں میں سے کسی بڑی مصیبت کو دور کرے گا اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا''۔[۳]

(۶) احسان:

یہ عام اخلاقی قدر ہے جو زندگی کے تمام میدانوں میں داخل ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے احسان (اچھی طرح کرنے) کو تمام چیزوں میں لازم قرار دیا ہے، پس جب تم قتل

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۵۹۰
(۲) مسلم: رقم: ۲۶۹۹
(۳) متفق علیہ: خ: ۲۴۴۲، م: ۲۵۸۰

کرو[۱] تو قتل کے عمل کو اچھے طریقے سے کرو، اور جب ذبح کرو تو اچھے انداز میں کرو اور تم میں سے ہر کسی کو چاہیے کہ چھری کی دھار تیز کر لے تاکہ اپنے ذبیحے کو راحت پہنچائے''۔[۲]

یہ عام احسان ہے اور نبی ﷺ ایسا میدان اور طریقہ پسند فرماتے تھے کہ شاذ و نادر ہی لوگ اس میں احسان پر غور و فکر کرتے ہیں؛ تاکہ آپ اپنی طرف سے احسان کی مثال قائم کر دیں، پس ذبیحے کے ساتھ احسان اس کو تکلیف نہ پہنچانا ہے اور تکلیف نہ پہنچانا جلدی ذبح کرنے میں ہے اور یہ اس وقت ہوگا جب اپنی چھری کو تیز کر لیا جائے۔ اور جب اس موقعے پر بھی احسان مطلوب ہے تو اس کا حاصل کرنا بقیہ مواقع میں بدرجۂ اولیٰ مطلوب ہے۔

یہ بعض عام قواعد ہیں جن کو نبی ﷺ نے طے کر دیا ہے تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر اسلامی معاشرے میں رحمت کو وجود میں لایا جائے۔

نبی ﷺ کی رحمت کا آنکھوں دیکھا حال (چند واقعات):

بے شک تم جب بھی نبی ﷺ کی سیرت معلوم کرنے کی کوشش کرو گے تو تمھیں آپ کے ہر طور طریقے میں رحمت اور نرمی نظر آئے گی اور ہم مضمون کے اس حصے میں بعض منتخب چیزوں کو ذکر کرتے ہیں۔

(۱) بچوں کے لیے رحمت:

نبی ﷺ جب کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تھے تو اپنی نماز مختصر فرما دیا کرتے تھے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''میں نماز میں داخل ہوتا ہوں اور میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس کو لمبی کروں، اس کے بعد میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں اس وجہ سے کہ میں بچے کے رونے سے ماں کی سخت بے خودی کو جانتا ہوں''۔[۳]

---

(۱) امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اچھی طرح قتل کرنے کی شرح میں لکھا ہے: مثلاً ذبح میں، قصاص میں [یعنی جب قتل ہی کرنا ہو تو کم سے کم اذیت دے کر قتل کرو۔ اضافہ از مترجم] یا حد میں قتل کرنا۔ یہ حدیث ہر طرح کے قتل کو عام ہے۔ (نووی شرح مسلم: ۱۳؍۱۵۷)

(۲) مسلم: رقم: ۱۹۵۵

(۳) متفق علیہ: خ: ۷۰۹، م: ۴۷۰

اور اسی طرح جماعت کی نماز کو جس میں آپ ﷺ مسلمانوں کی امامت کر رہے ہوتے، کسی بچے کے رونے کی وجہ سے مختصر کر دیتے تھے۔

ایک دیہاتی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا:

''آپ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں؟ ہم تو بچوں کو بوسہ نہیں دیتے، تو نبی ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمھارا مالک ہوں (یعنی میں تمھارے دل میں رحمت نہیں ڈال سکتا جبکہ اللہ نے اسے تم سے چھین لیا) کہ اللہ نے تمھارے قلب سے رحمت چھین لی ہے''۔(۱)

(۲) بڑوں کے ساتھ رحمت:

اس کی بہت سی مثالیں ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

''ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں صبح کی نماز میں پچھڑ جاتا ہوں فلاں شخص کی وجہ سے، اس لیے کہ وہ ہمارے ساتھ نماز کو طویل کر دیتے ہیں، راوی نے کہا کہ میں نے نبی ﷺ کو وعظ میں کبھی اس دن سے زیادہ سخت غضبناک نہیں دیکھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! بے شک تم میں سے کچھ نفرت دلانے والے ہیں، پس تم میں سے جو بھی لوگوں کو نماز پڑھائے تو اس کو چاہیے کہ ہلکی نماز پڑھائے، اس لیے کہ نمازیوں میں بوڑھے اور کمزور اور حاجت مند بھی ہوتے ہیں''۔(۲)

اور حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

''میں نبی ﷺ کے پاس اپنی قوم کے ایک وفد کے ساتھ آیا تو ہم آپ ﷺ کے پاس بیس راتیں ٹھہرے، آپ ﷺ نہایت رحم کرنے والے اور نہایت نرم خو تھے، جب آپ ﷺ نے ہمارے اندر اپنے اہل و عیال کی طرف (لوٹ جانے کا) شوق دیکھا تو آپ نے فرمایا: (اب) تم لوگ واپس جاؤ اور ان میں رہو اور ان کو سکھلاؤ''۔(۳)

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۵۹۹۸، م: ۲۳۱۷

(۲) متفق علیہ: خ: ۷۱۵۹، م: ۴۶۶

(۳) متفق علیہ: خ: ۶۲۸، م: ۶۷۴

اور حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا:

”ہم دن کے ابتدائی حصے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، راوی کہتے ہیں: اچانک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ننگے پیر، ننگے بدن ایک قوم آئی، جنھوں نے دھاری دار چادر یا کمبل کو پھاڑ کر اپنے اوپر ڈال رکھا تھا، تلواریں لٹکار کھی تھیں، ان میں سے زیادہ تر لوگ قبیلۂ مضر کے تھے؛ بلکہ سب ہی مضر کے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی غربت و محتاجی کو دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکان میں تشریف لے گئے، پھر باہر تشریف لائے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو انھوں نے اذان اور تکبیر کہی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور وعظ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ٱلَّذِى تَسَآءَلُونَ بِهِۦ وَٱلْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ①﴾ {النساء:١}

اے لوگو! تم اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیے، اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو اور رشتہ داروں (کی حق تلفی) سے ڈرو، بے شک اللہ تعالیٰ تم سب کی نگرانی کر رہے ہیں۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آیت تلاوت فرمائی جو سورۂ حشر میں ہے:

﴿ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ﴾ {الحشر:٨}

اللہ سے ڈرو اور آدمی کو چاہیے کہ وہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرو۔

صدقہ کرے آدمی دینار سے، درہم سے، کپڑے سے اور گیہوں کے صاع سے اور کھجور کے صاع سے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چاہے کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعے ہو، راوی کہتے ہیں: انصاریوں میں سے ایک آدمی ایک تھیلی لے کر آئے، (اس کی کثرت کی وجہ سے) وہ ان کے ہاتھ میں نہیں آپا رہا تھا، بلکہ ان کا ہاتھ عاجز ہو چکا تھا، پھر یکے بعد دیگرے لوگ آنے لگے، یہاں تک کہ ہم نے غلے اور کپڑے کے دو ڈھیر دیکھے، اس وقت میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو دیکھا خوشی سے

چمک رہا ہے جیسے اس پر سونے کا ملمع کیا ہوا ہو''۔[۱]

(۳) کمزوروں کے ساتھ رحمت:

نبی ﷺ نے فرمایا:

'' غریبوں اور بیواؤں کے لیے کوشش کرنے والا اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے، یا تہجد پڑھنے والے اور روزہ رکھنے والے کی طرح ہے''۔[۲]

نیز فرمایا:

''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اِس طرح ہوں گے اور آپ نے کلمے والی اور بیچ والی انگلی سے اشارہ کیا اور دونوں کے درمیان ذرا سی کشادگی کر دی''۔[۳]

(۴) بچیوں کے ساتھ رحمت:

لڑکیاں اور عورتیں عام طور پر ہمیشہ مظلوم، بے یار و مددگار اور دبی کچلی چلی آرہی تھیں یہاں تک کہ اسلام آیا اور اس نے ان کو سہارا دیا تو ان کو (مظلومانہ زندگی سے باہر آنے اور) اٹھنے کا موقع ملا، وہ رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرتیں اور آپ سے سوال و جواب بھی کر لیا کرتیں اور یہ صورتِ حال قرآنِ کریم کی اِن آیتوں کے سایہ میں تھی:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ﴾ {الإسراء: ۷۰} اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی۔

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمٰتِ ... الآية﴾ {الاحزاب: ۳۵} بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں... الخ[۴]

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۰۱۷

(۲) متفق علیہ: خ: ۵۳۵۳، م: ۲۹۸۲۔ حدیث شریف کے الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔

(۳) بخاری: رقم: ۵۳۰۴

(۴) پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت خدا کی یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے''۔

اس کے باوجود جاہلیت کی باقیات بعض لوگوں میں جمی ہوئی تھیں، اس لیے نبی کریم ﷺ کی وصیت تھی: ''اُن پر رحم کرو، اُن کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور ان کے ساتھ انصاف کرو''۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

'' ایک عورت جس کی دو بچیاں تھیں وہ آئی اور سوال کرنے لگی اور میرے پاس ایک کھجور کے علاوہ کچھ نہ تھا، تو میں نے اُسے وہی دے دی، اس نے اُس کو اپنی دونوں بچیوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور خود اس میں سے نہیں کھایا۔ پھر کھڑی ہوئی اور چلی گئی، اس کے بعد نبی ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ ﷺ کو بتایا تو آپ نے فرمایا: ''جس نے ان لڑکیوں کی مدد کی اس طور پر کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے لیے جہنم سے حجاب ہوں گی''۔ (۱)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ جوان ہو گئیں تو قیامت کے دن میں اور وہ اس طرح آئیں گے'' اور آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں ملالیں۔ (۲)

(۵) غلاموں کے ساتھ رحمت:

غلام کے ساتھ حیوانوں کا سا معاملہ کیا جاتا تھا، جب اسلام آیا تب جا کر اس کے ساتھ انسانیت کا (شریفانہ معاملہ) شروع ہوا۔ آپ ﷺ نے ان کے حق میں ارشاد فرمایا:

''تمھارے یہ خدام تمھارے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمھارا ماتحت بنایا ہے، پس جب کوئی بھائی اس کی ماتحتی میں ہو اس کو اس چیز سے کھلانا چاہیے جو وہ خود کھاتا ہے اور اس کو وہ پہنانا چاہیے جو وہ خود پہنتا ہے اور ان پر ایسی چیز کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کو عاجز کر دے، پس اگر تم ان کو کسی کام کے انجام دینے کا مکلف بناؤ تو ان کی مدد کر دیا کرو''۔ (۳)

اس طرح نبی ﷺ نے غلاموں کو اخوت کے مقام کی بلندی تک پہنچا دیا اور آپ ﷺ کے اس ارشاد: «فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ» میں اس کی تاکید اور زندگی میں عملی برتاؤ کی طرف توجہ

(۱) متفق علیہ: خ: ۵۹۹۵، م: ۲۶۲۹

(۲) مسلم: رقم: ۲۶۳۱

(۳) متفق علیہ: خ: ۳۰، م: ۱۶۶۱

دلائی گئی ہے کہ اگر کسی کا سگا بھائی ہو جو اس کے کام میں اس کی مدد کرتا ہو تو پھر اس کا معاملہ اور رویہ اس بھائی کے ساتھ کیسا ہوگا؟ پس یہ غلام کا معاملہ بھی سگے بھائی کے معاملے کی طرح ہے۔ اسلام نے غلام کو مارنے کا کفارہ اس کا آزاد کرنا متعین کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے ایک غلام کو مارا پھر فرمایا:

"میں نے تم کو تکلیف و درد میں مبتلا کیا؟ تو غلام نے کہا: نہیں، تو ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اچھا تم آزاد ہو، پھر زمین سے کوئی چیز (یا تنکا) اٹھایا پھر فرمایا: میرے لیے (اس آزاد کرنے میں) اتنا بھی اجر نہیں ہے جو اِس چیز (یا تنکے) کے برابر ہو، (کیونکہ میں نے تبرعًا آزاد نہیں کیا، کفارے میں آزاد کیا ہے)، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا: جس نے اپنے غلام کو مارا سزا کے طور پر جس کا جرم اس نے نہیں کیا یا اس کو تھپڑ مارا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دے"۔ [1]

اور حضرت سوید بن مقرن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے کہا:

"میں نے اپنے آپ کو دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، اور میں اپنے بھائیوں کا ساتواں تھا اور ہمارے پاس صرف ایک ہی خادم تھا، ہم میں سے ایک نے اس کو تھپڑ مارا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس کے آزاد کرنے کا حکم دیا"۔ [2]

اور غلاموں کے ساتھ اسلام کی رحمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے آقاؤں کو "غلام اور باندی" کہہ کر پکارنے سے منع کیا؛ بلکہ یہ کہنا چاہیے: "اے لڑکے! اے لڑکی!" [3]

اور اس طرح غلامی صرف ایک وقتی قید اور بندش ہو گئی کہ جس میں غلاموں کے ساتھ بھائی چارگی کا معاملہ کیا جاتا ہے اور جب بھی غلام اس قید سے نکلنا چاہے تو وسائل آسانی سے حاصل ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اور تمھارے غلاموں میں سے جو لوگ مکاتب بننے

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۶۵۷

(۲) مسلم: رقم: ۱۶۵۸

(۳) متفق علیہ: خ: ۲۵۵۲، م: ۲۲۴۹

اَیۡمَانُکُمۡ فَکَاتِبُوۡهُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡهِمۡ خَیۡرًا ﴾{النور:۳۳} (مال دے کر آزاد ہونے) کا معاملہ کرنا چاہیں، تو اگر ان میں بھلائی کے آثار دیکھو تو ان کو مکاتَب بنادیا کرو۔ (یہ معاملہ طے کرلیا کرو)۔

حضرت ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت سے آقا پر مکاتب بنانے کا وجوب ثابت ہوتا ہے اگر غلام عقدِ کتابت کا مطالبہ کرے اور یہ رحمت کی انتہا ہے۔

(٦) جانوروں کے ساتھ مہربانی:

اور جب ہم انسان کو چھوڑ کر حیوانات پر نظر ڈالتے ہیں تو اسلام کا رحم حیوانات کو بھی ایسا ہی عام ہے جس طرح انسان کو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا، اس عورت نے اس کو قید کر دیا تھا (کھانا پینا نہیں دیا) یہاں تک کہ وہ مر گئی۔ یہ عورت اس کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوئی''۔(۱)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک آدمی راستے پر چلا جارہا تھا، اس دوران اس کو سخت پیاس لگی تو اُس کو ایک کنواں ملا، وہ اس میں اترا، پانی پیا اور نکل آیا تو اچانک ایک کتے پر نظر پڑی جو ہانپ رہا ہے اور پیاس کی وجہ سے زمین سے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے تو اس آدمی نے سوچا کہ یقیناً یہ کتا پیاس کی اسی صورتِ حال کو پہنچا ہوا ہے جو مجھ کو لاحق ہوئی تھی تو وہ کنویں میں اترا، اپنے موزے کو پانی سے بھرا، اور اس موزے کو منہ سے پکڑا، پھر کتے کو پانی پلادیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اس فعل کی قدر کی اور اس کی مغفرت فرمادی''۔(۲)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کے بارے میں اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبکہ آپ ایسے اونٹ کے پاس سے گزر رہے تھے جس کی پیٹھ اس کے پیٹ سے لگ رہی تھی۔

'' بے زبان جانوروں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان پر اچھی حالت میں (یعنی طاقت ور

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۴۸۲، م: ۲۲۴۲

(۲) متفق علیہ: خ: ۶۰۰۹، م: ۲۲۴۴

ہونے کی حالت میں) سواری کرو اور ان کو اچھی حالت میں (یعنی موٹا و فربہ ہونے کی حالت میں) کھاؤ''۔[(۱)]

جس طرح نبی ﷺ نے جانوروں کو (بے فائدہ) نشانہ بنانے یا نشانے کی مشق کے لیے انھیں استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے؛ نبی ﷺ نے فرمایا:

''ایسی چیز کو نشانہ مت بناؤ جس میں روح ہو یعنی جاندار چیز کو نشانہ مت بناؤ''۔[(۲)]

اور حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

''میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس تھا تو وہ چند نوجوانوں کے پاس سے گزرے جو ایک مرغی کو گاڑ کر اس پر نشانہ لگا رہے تھے، جب انھوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا تو اِدھر اُدھر ہو گئے (تتر بتر ہو گئے) یہ دیکھ کر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے پوچھا: یہ کس نے کیا؟ جس نے ایسا کیا اس پر نبی ﷺ نے لعنت فرمائی''۔[(۳)] (حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اُس مرغی کو پھر آزاد کر دیا تھا)۔

جانوروں کے ساتھ مہربانی کرنے کے سلسلے میں جو احادیث آئی ہیں یہ اس کا کچھ حصہ ہے اور ہمارے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گزرا ہے: ''بے شک اللہ نے احسان کو ہر چیز کے بارے میں فرض و لازم کیا ہے''۔

مہربانی کا معاشرہ:

ان قواعد کو نافذ کرنے اور رسول اللہ ﷺ کے ان عملی نمونوں پر عمل کرنے کی وجہ سے مسلم معاشرہ اس تصور (اور منزل) تک پہنچ گیا جو رسول اللہ ﷺ نے مقرر کیا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

''مسلمانوں کی مثال آپس میں محبت کرنے، ایک دوسرے پر رحم کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی کرنے میں ایک جسم کی مانند ہے، اگر اس کا کوئی عضو تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو اسکے لیے

---

(۱) اَبوداؤد: رقم: ۲۵۴۸

(۲) مسلم: رقم: ۱۹۵۷

(۳) متفق علیہ: خ: ۵۵۱۵، م: ۱۹۵۸

باقی جسم بھی بے خوابی (جاگنا) اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے"۔[1]

جی ہاں! مسلم معاشرہ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے میں بالفعل کامیاب ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ آیت گواہ ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ﴾ {الفتح:۲۹}

محمد، اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت وزور آور ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔

یہ ہے اسلامی معاشرے کی صفت (وہ آپس میں مہربان ہیں)۔

سخت مزاجی اور دل کی سختی کا مرض:

دلوں میں نرمی ومہربانی ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ دلوں سے سختی وقساوت دور ہو جائے اور اس کو سابقہ آیات نے سراہا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَھُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾

{آل عمران:۱۵۹}

سو اللہ ہی کی رحمت ہے کہ تم ان کے لیے نرم ہو گئے اور اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ متفرق ہو جاتے تمھارے پاس سے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے سخت دلی کی نفی فرمائی ہے اور سخت دلی کے بعد کبھی زیادہ سخت درجہ بھی ہوتا ہے اور یہ درجہ وہ ہے جس کو قرآنِ کریم نے "قسوۃ القلوب" قساوتِ قلب (سورۂ بقرہ: ۷۴) سے تعبیر کیا ہے۔

پھر قساوتِ قلب کے درجات ہیں۔ اور یہ قساوتِ قلب اخلاقی امراض میں سے ایک مرض ہے، یہ مرض دوسروں کی ضرورتوں اور ان کی تکلیفوں کے احساس کے جذبے کو نفسِ انسانی کے اندر خشک کر دیتا ہے اور یہ مرض بڑھتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ مزاج کی بے حسی اور بے مروتی بھی بڑھتی رہتی ہے؛ یہاں تک کہ فطری اور اخلاقی ذمے داری کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے اور نفس کی اس بے حسی وبے مروتی کی حالت میں دل پتھر ہو جاتے ہیں جن سے کوئی خیر وبخشش نمودار نہیں ہوتی، بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ پتھر میں تو بعض کی ظاہری سختی پھٹ جاتی ہے

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۶۰۱۱، م: ۲۵۸۶

تو باطنی نرمی سے بخشش میٹھے صاف پانی کی شکل میں پھوٹ پڑتی ہے، لیکن بعض سخت دل والوں کے قلوب کی تہوں میں فیض وعطا کے چشمے بالکل خشک ہو جاتے ہیں۔[1]

اور مسلمان آدمی سخت دلی کی اس حد کو نہیں پہنچ سکتا اس لیے کہ اس حالت میں ایمان کے تمام سوتے اس کے قلب سے خشک ہو جائیں گے۔

ہاں! مسلمان کے قلب سے کبھی رحمت کا جذبہ کم ہو سکتا ہے لیکن وہ قلب کی سختی تک نہیں پہنچتا، چہ جائیکہ وہ قساوتِ قلبی تک پہنچے اور جس وقت اس کو محسوس ہو کہ رحم کے جذبے کی دھڑکنیں کمزور ہونا شروع ہو گئی ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ مرض سنگین ہونے سے پہلے علاج کرے۔

آیتِ کریمہ ہماری نظر کو ظاہر و باطن میں توافق پیدا کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ پس جب قلب کی سختی -جو ایک باطنی چیز ہے- نہیں رہے گی تو ضروری ہے کہ دوسری چیز -جو ظاہری ہے- یعنی زبان کی سختی وہ بھی نہیں رہے گی، جس کو آیت نے ''فظاظه'' سے تعبیر کیا ہے۔

اور آخری بات یہ ہے کہ جو اللہ کی رحمت کا اپنے اوپر نزول چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ زمین والوں پر رحم کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ ارْحَمُوا أَهْلَ الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ» [2].

رحم کرنے والوں پر ''رحمٰن'' رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

---

(۱) الأخلاق الإسلامية للأستاذ عبد الرحمٰن حبنكه: ۲/۷۶

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۹۴۱، ترمذی: رقم: ۱۹۲۴

تیرہویں فصل

شفقت

شفقت کا معنیٰ:

علماء نے فرمایا ہے: شفقت: رحمت اور رقتِ قلب کا نام ہے اور اس چیز پر ناپسندیدہ چیز کے لاحق ہونے کا خوف ہے جس پر یہ شفقت و مہربانی کرتا ہے۔[1]

اپنی امت پر نبی ﷺ کی شفقت:

آپ ﷺ کی شفقت اس قدر تھی کہ اس کا بیان کرنا ممکن نہیں؛اس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

"نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے متعلق وارد ہے:

﴿رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضۡلَلۡنَ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ‌ۚ فَمَنۡ تَبِعَنِىۡ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡ‌ۚ﴾ {ابراہیم:۲۱}

اے میرے پروردگار! بے شک انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا، پس جس نے میری اتباع کی وہ مجھ سے ہے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ‌ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝۱۱۸﴾ {الانعام:۱۱۸}

اگر آپ ان کو عذاب دیں تو (آپ کو اس کا اختیار ہے کہ) بے شک وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو بخش دیں تو آپ غالب حکمت والے ہیں۔

تو آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: اے اللہ! میری امت (پر رحم فرما)، میری امت (پر رحم فرما) اور آپ ﷺ رونے لگے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبرئیل! محمد کے پاس جاؤ،

---

(۱) نسیم الریاض للخفاجی: ۲؍ ۸۲۔ مطبعۃ عثمانیہ ۱۳۱۷ھ

(اگرچہ تمھارا رب خوب جاننے والا ہے) ان سے پوچھو کہ آپ کو کس چیز نے رلایا؟ تو جبرئیل علیہ السلام آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہا تھا اس کو بتایا (اور وہ خوب جاننے والا ہے)، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبرئیل! محمد کے پاس جاؤ اور ان سے کہو: میں آپ کو آپ کی امت کے بارے میں راضی کر دوں گا اور آپ کو تکلیف نہ دوں گا''۔[1]

اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی رحمت اور اس پر شفقت کے لیے روئے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت یہ بھی ہے کہ آپ نے ان کے لیے نجات کا راستہ واضح فرمایا؛ تاکہ وہ اپنے امور میں واضح دلیل پر قائم ہوں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میری مثال اور اُس چیز کی مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس آدمی کی مثال کی طرح ہے جو ایک قوم (لوگوں) کے پاس آیا اور کہا: اے لوگو! میں نے ایک فوج اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور میں کھلم کھلا[2] ڈرانے والا ہوں، پس اُس (دشمن فوج) سے بچو، تو ایک جماعت نے اس کی اطاعت کی اور وہ رات کے پہلے حصے میں چل پڑے اور ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے چلے تو وہ نجات پا گئے اور ان میں سے ایک گروہ نے اس کو جھٹلایا اور اپنی جگہ پر ہی رہے اور علی الصبح فوج نے ان کو آن لیا اور ان کو نیست و نابود کر دیا، یہ اس کی مثال ہے جس نے میری اطاعت کی اور میں جو کچھ لے کر آیا اس کی اتباع کی اور اس کی مثال ہے جس نے میری نافرمانی کی اور جو حق و صداقت میں لے کر آیا اس کو جھٹلایا''۔[3]

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے ان رکاوٹوں کو بیان فرمایا جو ان کے راستے میں پیش آتی ہیں تاکہ تیاری، بچاؤ اور احتیاط کر لیں۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۰۲

(۲) «أَنَا النَّذِيرُ الْعُرْيَانُ» : علماء فرماتے ہیں: اس کی اصل یہ ہے کہ کوئی انسان جب اپنی قوم کو پیش آنے والے خوف زدہ واقعے سے ڈرانا اور اس کی خبر کر دینا چاہتا تھا تو اپنے کپڑے اتار دیتا اور اگر وہ لوگ دور ہوتے تو وہ اسی کپڑے سے ان کو اشارہ کر دیتا، تاکہ لوگوں کو پیش آمدہ آفت کی خبر ہو جائے اور عموماً یہ کام ہراول دستہ اور پیش رو جماعت انجام دیتی تھی۔

(۳) متفق علیہ: خ: ۷۲۸۳، م: ۲۲۸۳

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے؛ انھوں نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی (اعلان کرنے والے) نے اعلان کیا: ''اَلصَّلٰوۃَ جَامِعَۃً''، تو ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں جمع ہو گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیشک مجھ سے پہلے جتنے بھی نبی آئے ان پر یہ حق واجب تھا کہ وہ اپنی امت کو وہ بات بتائیں جو ان کے لیے بھلی ہو اور جس چیز کو ان کے لیے برا جانیں اس سے ان کو ڈرائیں۔

اور بے شک تمھاری اِس امت کی عافیت اس کے شروع کے طبقہ میں رکھ دی گئی ہے اور اس کے آخر والوں کو آزمائشیں اور ناپسندیدہ امور لاحق ہوں گے، پس جو چاہتا ہو کہ اس کو جہنم کی آگ سے دور رکھا جائے اور جنت میں داخلہ نصیب ہو تو اس کی موت اس حالت میں آنی چاہیے کہ وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسا کہ اپنے ساتھ کیا جانا پسند کرتا ہے''۔[1]

بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اپنے اُن ہی صحابہ رضی اللہ عنہم کی فکر نہیں تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام نسل در نسل آنے والی پوری امت کے لیے بھی تھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت ہمیشہ آپ کو بیان کرنے پر اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اور بعد میں آنے والوں کو ڈرانے پر مجبور کرتی تھی، اس لیے کہ سبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

''ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو وعظ فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں قیامت تک پیش آنے والی کوئی چیز ذکر کیے بغیر نہیں چھوڑی، جس نے یاد رکھا اس کو یاد رہ گیا اور جو ناواقف رہا وہ لاعلم رہ گیا۔ بیشک میں ایک چیز بھول چکا ہوتا ہوں، پھر اس کو پہچان لیتا ہوں جیسے کوئی آدمی کسی کو پہچانتا ہو، پھر وہ اس غائب شدہ کو دیکھ کر پہچان لیتا ہے''۔[2]

یہ ہے امت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام و وسیع شفقت، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی خاص جماعتوں

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۸۴۴

(۲) متفق علیہ: خ: ۶۶۰۴، م: ۲۸۹۱

اور گروہوں کے بارے میں خصوصی شفقت کے بیان میں بہت سی نصوص وارد ہوئی ہیں؛ اُن ہی میں سے یہ ہیں:

- آپ ﷺ کی شفقت امت پر گمراہ کرنے والے سرداروں سے۔
- آپ ﷺ کی شفقت علماء پر جادۂ حق سے بہک جانے سے۔
- آپ ﷺ کی شفقت قاضیوں پر غیر حق کی اتباع سے۔
- آپ ﷺ کی شفقت مردوں پر خواہشاتِ نفسانی کی اتباع سے، جبر و قہر سے، اور قرض کے غلبے سے۔
- آپ ﷺ کی شفقت عورتوں پر شوہر کی ناشکری سے اور فخر و مباہات کے لیے جھوٹی شان و شوکت کے اظہار سے، بے حیائی، کشفِ ستر اور ننگے پن سے۔

اس بحث کا مقصد اس سلسلے کی زیادہ تفصیل بیان کرنا نہیں ہے، اس لیے ہم اتنے ہی ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

چودہویں فصل
حلم اور عفو

تمہید:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”حلم (بردباری) غصہ پی جانے سے افضل ہے، اس لیے کہ غصے کا پی جانا؛ بہ تکلف بردباری اختیار کرنے کا نام ہے اور غصے کو پی جانے کی ضرورت اُس شخص کو ہوتی ہے جس کا غصہ بھڑک اٹھے (وہ مشتعل ہو جائے) اور اس حالت میں سخت مجاہدے کی ضرورت ہوتی ہے؛ لیکن جب تم اس کو ایک مدت تک کروگے تو عادت بن جائے گی، پھر غصہ نہیں بھڑکے گا، اور اگر کبھی بھڑک بھی اٹھے تو پی جانے میں مشقت نہیں ہوگی اور یہی طبعی حلم و بردباری ہے اور یہ عقل کے کمال اور غصہ کی قوت کے ٹوٹ جانے اور اس کے تابعِ عقل ہو جانے کی دلیل ہے؛ لیکن اس کی ابتدا بہ تکلف بردباری اختیار کرنے اور غصے کو تکلف کے ساتھ پی جانے سے ہوتی ہے“۔[1]

اور جب ہم نے حلم (بردباری) اور کظم غیظ (غصہ پی جانے) کے درمیان فرق کو جان لیا تو اب یہ بھی جان لیں کہ ان دونوں کے مقابل اور ضد غضب اور عفو یعنی معاف کر دینا ہے۔ لہٰذا اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

حلم اور عفو کی تعریف:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۝۱۹۹﴾ {الاعراف:۱۹۹}

آپ عفو و درگذر کیا کیجئے، بھلائیوں کا حکم کرتے رہیے اور جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کیجیے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

(۱) المھذب من إحیاء علوم الدین: ۲/۱۰۵

﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴾ {الحجر:۸۵}
سو آپ خوبی کے ساتھ درگذر کیجیے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَسَارِعُوٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ {آل عمران:۱۳۳-۱۳۴}

اور اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو اور جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین ہے، جو پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے، جو خرچ کرتے ہیں خوشی میں اور تکلیف میں، اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں، اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں، اور اللہ نیکی کرنے والوں کو چاہتے ہیں۔

آیتِ کریمہ نے غصہ پی جانے کا ذکر کیا ہے اور غصہ پینا حلم کا آغاز ہے، اس لیے حلم و بردباری کی مدح و تعریف بدرجۂ اولیٰ اس سے ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اشج عبد القیس کو فرمایا:

"بے شک تمھارے اندر دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں: ۱۔ بردباری۔ ۲۔ وقار و تمکنت"۔(۱)

رسول اللہ ﷺ کے حلم اور عفو و درگذر کی چند مثالیں:

اس عنوان کے تحت ہم نبی ﷺ کی بردباری کی بعض مثالوں سے آگاہ ہوں گے۔ اس لیے کہ ان سب کا احاطہ کرنا ایک دشوار امر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے ہر دن میں ایسا واقعہ پیش آتا تھا جس سے آپ کا حلم ظاہر ہوتا ہے۔

امام بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے تخریج کی؛ انھوں نے فرمایا:

"میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا، آپ پر ایک دھاری دار نجرانی چادر تھی جس کا کنارہ دبیز تھا، آپ کو ایک بدوی نے پکڑ لیا اور آپ کو سختی کے ساتھ کھینچا؛ یہاں تک کہ میں نے نبی ﷺ کی گردن کے سامنے کے حصے کو دیکھا کہ اس پر اس کے سختی کے ساتھ کھینچنے کی وجہ سے چادر کے حاشیے کا نشان پڑ گیا تھا، پھر اعرابی نے کہا: اللہ کا وہ مال جو آپ کے پاس ہے اس کو

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۷

مجھے دینے کا فرمان جاری کر دو، تو آپ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ہنس دیے، پھر آپ ﷺ نے اسے دینے کا حکم فرمایا''۔

اس اعرابی کا کھینچنا اس قوت اور شدت کے ساتھ تھا جس کی وضاحت مسلم شریف کی ایک روایت سے ہوتی ہے؛ چنانچہ مسلم شریف کی ایک روایت میں آیا ہے:

''اُس نے آپ ﷺ کو اپنی طرف ایسی سختی سے کھینچا کہ نبی کریم ﷺ اُس اعرابی کی گردن کے پاس پہنچ گئے۔''

اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس نے آپ ﷺ کو کھینچا یہاں تک کہ چادر پھٹ گئی اور اس کا کنارہ رسول اللہ ﷺ کی گردن میں باقی رہ گیا''۔(۱)

اس واقعے میں صورتِ حال کا تصور ہی ظاہر کر رہا ہے کہ آپ ﷺ کا حلم کتنا عظیم تھا۔

نیز بخاری و مسلم نے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ: انھوں نے نبی ﷺ سے عرض کیا:

''کیا آپ پر یوم احد سے بھی زیادہ کوئی سخت دن آیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں نے تمھاری قوم سے جو پایا وہ پایا (یعنی ناقابل بیان سرگذشت ہے) اور سب سے زیادہ سخت بات جوان سے مجھ کو پیش آئی وہ یوم عقبہ ہے جبکہ میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یالیل بن عبد کلال کے سامنے پیش کیا، تو اس نے میری بات کو قبول نہیں کیا، میں سیدھا چل پڑا اور میں غم زدہ تھا مجھے قرن الثعالب میں جا کر ہوش آیا میں نے اپنا سر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ایک بادل مجھ پر سایہ کیے ہوئے ہے میں نے دیکھا کہ اس میں جبرئیل علیہ السلام ہیں مجھ کو انھوں نے پکارا اور کہا: اللہ نے تمھاری قوم کی بات جو اس نے تم سے کی، سنی اور جو جواب انھوں نے تمھیں دیا وہ بھی سنا۔

اور اللہ تعالی نے آپ کے پاس پہاڑوں کے فرشتے کو بھیجا ہے تاکہ آپ ان کے بارے میں جو چاہیں حکم فرمائیں، پھر پہاڑوں کے فرشتے نے مجھ کو پکارا اور مجھ کو سلام کیا پھر کہا: اے محمد! پھر کہا یہ اس کے بارے میں ہے جو آپ چاہیں؛ اگر آپ چاہیں تو میں ان پر دونوں پہاڑوں کو ملا دوں؟ تو نبی ﷺ نے فرمایا: نہیں؛ بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالی ان کی پشتوں اور سینوں سے ایسے

---

(۱) متفق علیہ: خ: ۳۱۴۹، م: ۱۰۵۷

لوگوں کو نکالے گا جو اللہ وحدہ کی عبادت کریں گے، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گے۔"(۱)

یہ دن نبی ﷺ پر یوم احد سے زیادہ سخت تھا اور احد کے دن مسلمانوں کو جو مصیبت پہنچی اور نبی ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہوا اور آپ ﷺ کے سامنے کے چار دانت شہید ہوگئے اور خود آپ کے سر مبارک پر ٹوٹ گئی آپ کے صحابہ میں سے ستر صحابہ شہید ہوگئے اس کے باوجود طائف کی طرف جانے کا دن آپ ﷺ پر احد کے دن سے زیادہ سخت تھا، اس لیے کہ آپ ﷺ قریش سے تمام امیدیں ختم ہونے کے بعد مکہ سے تنہا اپنی دعوت کی جگہ کی تلاش پر نکلے تھے اور طائف والوں کا جواب (رد عمل) اس سے بھی برا تھا جس کا تصور کیا جا سکتا ہے، انھوں نے آپ ﷺ کو جھٹلایا اور آپ سے ٹھٹھے بازی کی اور آپ کے پیچھے اپنے شر پسندوں اور لڑکوں کو لگا دیا کہ آپ کو پتھروں سے ماریں یہاں تک کہ آپ نکل گئے اور اس سخت نفسیاتی کیفیت، مکہ والوں سے مایوسی، اہل طائف سے مایوسی، تھکاوٹ، مشقت اور زخموں کے درمیان آپ کے پاس ایک فرشتہ آتا ہے تاکہ آپ کی خواہش پر لبیک کہے، اگر آپ چاہیں کہ مکہ والوں پر دونوں پہاڑوں کو ملا دیں تو وہ ایسا کر دے۔ اور الاخشبان دو ایسے پہاڑ ہیں جن کے درمیان مکہ ہے اور ان کا اطباق (آپس میں ملا دینا) لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم معاف فرماتے ہیں اور اپنے زخموں اور تکلیفوں سے تجاوز کرتے ہیں اور آپ کے دل میں جو رنج و غم چھایا ہوا تھا اس سے درگزر کرتے ہیں اس امید پر کہ اللہ تعالی ان کی پشتوں سے ایسے لوگوں کو نکالیں گے جو اللہ تعالی کی عبادت کریں گے اور یہی عفو ہے۔

نیچے ہم زید بن سعنہ کے واقعہ میں حضور ﷺ کا عفو و درگزر بیان کرتے ہیں۔

"اسلام لانے سے پہلے زید بن سُعْنہ آئے، وہ آپ سے قرض کا تقاضا کر رہے تھے، انھوں نے آپ ﷺ کے کندھے سے کپڑا کھینچا اور آپ کے کپڑے کو خوب اچھی طرح پکڑ لیا اور آپ پر سختی کی، پھر اس نے کہا: اے بنو مطلب! تم ٹال مٹول کرنے والے لوگ ہو، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے اس کو ڈانٹا اور اس کو سخت باتیں کہیں؛ جبکہ نبی ﷺ مسکرا رہے تھے، پھر رسول اللہ ﷺ نے

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۲۳۱، م: ۱۷۹۷

فرمایا: اے عمر! ہم اور وہ تم سے اس کے علاوہ کے محتاج تھے، کہ تم مجھ کو اچھے انداز میں ادا کرنے کا حکم کرتے اور اس کو اچھے انداز میں تقاضا کرنے کا حکم کرتے، پھر فرمایا (حالاں کہ متعینہ مدت میں تین دن باقی تھے اور حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ اس کا مال ادا کریں اور بیس صاع اس کو ڈرانے گھبرا دینے کی وجہ سے زیادہ دیں۔ پس یہی اس کے اسلام لانے کا سبب ہو گیا۔

زید کہتے ہیں حالانکہ وہ یہودی تھے، علامات نبوت میں سے کوئی علامت باقی نہیں رہی تھی جس کو میں نے محمد (ﷺ) میں پہنچان نہ لیا ہو، سوائے دو کے جن کو میں نے آزمایا نہیں تھا، وہ دو یہ تھیں کہ ان کی بردباری ان کے جہل پر سبقت لے جائے اور جہالت کی شدت ان کے حلم کو بڑھائے پس میں نے اس طریقے پر آپ ﷺ کی آزمائش کی تو میں نے ان کو ویسا ہی پایا جیسا کہ بیان کیا گیا تھا"۔ (۱)

معاملہ تحقیق و آزمائش کا تھا، اسی لیے وہ اپنی بات میں اور اپنے فعل میں سخت تھا اور پھر اس کا یہ مطالبہ میعاد مقررہ سے پہلے تھا، اس کے باوجود نبی ﷺ کا حلم اس کو اپنے احاطے میں کر لیتا اور برداشت کرتا ہے، آپ ﷺ عمر کے قول کی وجہ سے جو اس کو صدمہ پہنچا تھا اس کا بدلہ دینے کا بھی حکم فرماتے ہیں اور یہی ہے بردباری اور عفو و کرم، یہ چند مثالیں ہیں جن کو نبی ﷺ کا حلم اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان مثالوں سے جس طرح آپ کے حلم و بردبادی کی مقدار کا علم ہوتا ہے اسی طرح اس سے آپ ﷺ کا عفو اور آپ کی چشم پوشی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

اور ذیل کے واقعے میں ہم اس عفو اور اس کی وسعت کی بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال ذکر کرتے ہیں، حضرت عمر بن الخطابؓ بیان کرتے ہیں:

"جب عبداللہ ابی بن سلول مرا تو رسول اللہ ﷺ کو اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے بلایا گیا، پس جب رسول اللہ ﷺ اس کے سامنے کھڑے ہو گئے تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ ابن ابی کی نماز پڑھانے جا رہے ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ مسکرانے لگے اور فرمایا: ارے ہٹو، اے عمر! پھر جب میں نے آپ ﷺ پر سوال زیادہ کیا تو آپ نے فرمایا: مجھ کو اختیار دیا گیا ہے، تو میں نے (نماز

---

(۱) أخرجہ البغوی فی الأنوار برقم: ۲۲۶ والحاکم فی المستدرک ۳/۶۰۴ و أبو نعیم فی الدلائل: وزوائد ابن حبان ۲۱۰۵، ہیثمی نے مجمع الزوائد میں ذکر کر کے طبرانی کی طرف منسوب کر کے کہا: رجالہ ثقات۔

پڑھنا) پسند کیا، اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ اگر میں ستر سے زیادہ (مرتبہ استغفار) کروں تو اس کی مغفرت ہو جائے تو میں ضرور اس سے زیادہ کروں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی، پھر آپ ﷺ ہٹ گئے تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ سورۂ براءۃ کی دو آیتیں نازل ہو گئیں : وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا " ان میں سے جو مر جائے ان کے جنازے کی نماز آپ کبھی نہ پڑھیے"۔ (۱)

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس دن رسول اللہ کے ساتھ میں اپنی اس جسارت پر تعجب کرتا تھا۔" اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔

اس واقعے میں رسول اللہ ﷺ کے در گزر کی وسعت سے واقف ہونے کے لیے مناسب ہے کہ ہم اپنے حافظہ میں گذشتہ نو سال کے واقعات کو تازہ کریں۔ یعنی آپ ﷺ کی ہجرت سے لے کر ابن سلول کی نویں سال کے آخر میں موت واقع ہونے تک۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عبداللہ بن ابی نے تادم حیات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مشکلات پیدا کرنے اور یہودیوں اور مشرکین کے ساتھ تعاون کرنے کی کوشش میں کمی نہیں کی اللہ تعالی کے راستے سے روکنے میں اور نبی ﷺ کو تکلیف پہنچانے میں بھی کمی نہیں کی۔ اور واقعۂ افک کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے اور اپنے متبعین کے ساتھ اس کا احد سے لوٹنا کوئی معمولی بات نہیں ے اور غزوۂ بنی مصطلق میں اس کا یہ کہنا:

«لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ» (۲) "اگر ہم مدینہ لوٹے تو بالضرور عزت والا ذلت والوں کو مدینے سے نکال دے گا۔"

کھلے ہوئے کفر سے کم نہیں ہے، بلاشبہ اس کی کتاب زندگی ان مذموم حرکتوں سے بھری ہوئی ہے جن سے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کو مصائب میں ڈالا گیا۔

اس کے باوجود آپ اسے معاف فرماتے ہیں اور وہ سب بھول جاتے ہیں حالانکہ ایسے امور بھلائے نہیں جاسکتے۔ اور آپ ﷺ اس کے جنازے کی نماز پڑھتے ہیں اور اس کے دوزخ سے نجات کے خواہش مند ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر میں یہ جانتا کہ اگر میں ستر مرتبہ سے زیادہ اس کے لیے

---

(۱) اخرجہ البخاری ، رقم: ۱۳۶۶

(۲) سورۂ منافقون: آیت: ۸

استغفار کروں تو وہ بخش دیا جائے گا تو میں ضرور ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کرتا۔

بیشک عفو کا یہ ایسا واقعہ ہے کہ اس کے ہم پلہ دوسرا واقعہ نہیں ہو سکتا اس کے تمام پہلوؤں کا ادراک کرنے کے لیے سنجیدگی اور غور وفکر کے ساتھ ان حالات کا جائزہ لینا ہوگا جو ان نو سالوں کے اندر پیش آئے جس میں ابن ابی کی سرکردگی میں نفاق کے بے شمار واقعات پیش آتے ہیں جس میں اللہ تعالی کے راستے سے روکنے میں اس نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ان تمام واقعات کو ہم جمع کریں اور ان کے حجم کا اندازہ لگائیں تب ہم اس سے رسول اللہ ﷺ کے اِس عفو ودر گزر کی مقدار کا اندازہ لگا سکتے ہیں ، پھر یہ معافی آدمی کے مرنے کے بعد ہے جبکہ آپ کو توقع بھی نہیں ہے؛ بلکہ ارادہ بھی نہیں ہے اس سے کسی بدلے اور شکریے کا، آپ ﷺ جہنم سے اس کی نجات کے خواہش مند تھے؛ بلکہ اس میں راغب تھے ،اس لیے کہ اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا؛ لیکن اللہ کے عدل وانصاف میں یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے:

«إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ»(1).

”بے شک منافق دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہونگے۔“ اپنے اعمال بد کے کرتوت کے سبب۔

اس واقعے میں حضرت عمرؓ کی جرأت ہم کو تعجب میں ڈالتی ہے حضرت عمرؓ نے اس پر خود تعجب کیا جبکہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا کپڑا ان کو منع کرنے کے ارادے سے پکڑا۔(2)

لیکن آپ کا یہ حلم جو اپنے دشمنوں تک کے لیے عام تھا، کیا اپنے خاص اصحاب کے لیے وسیع نہ ہوگا یہ آپ کا عظیم عفو ہے اور یہی آپ کا لاثانی حلم ہے اور یہی آپ کے پسندیدہ خصائل ہیں۔

آپ ﷺ نے اپنے لیے بدلہ نہیں لیا:

حقوق میں مواخذے کو چھوڑے بغیر اور بدسلوکیوں میں بدلہ لینے کو چھوڑے بغیر عفو نہیں ہوتا اور آپ ﷺ کے متعلق یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ آپ نے کسی دن اپنے لیے بدلہ لیا ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے؛انھوں نے فرمایا:

---

(1) سورۃ النساء: ۱۴۵

(2) بخاری: رقم: ۴۶۷۰، مسلم: ۲۴۰۰

"جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دو چیزوں میں اختیار دیا گیا تو آپ نے ان میں سے آسان کو اختیار فرمایا جب تک اس میں گناہ نہ ہو اور اگر اس میں گناہ ہوتا تو پھر تمام لوگوں سے زیادہ آپ اس سے دور ہوتے، کبھی انتقام نہیں لیا رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے سوا اس کے کہ اللہ تعالی کی محرمات کی بے حرمتی کی جائے تو اللہ تعالی کے لیے اس سے انتقام لیتے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے کبھی بھی کسی چیز کا انتقام نہیں لیا۔"(۱)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے ہی روایت ہے:

" رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے کبھی کسی کو نہیں مارا، نہ کسی عورت کو، نہ کسی خادم کو؛ لیکن یہ کہ اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہوں، اور آپ کے ساتھ کیسی ہی بدسلوکی کی جاتی آپ انتقام نہ لیتے، اِلّا یہ کہ اللہ کے محارم میں سے کسی کی بے حرمتی کی جائے، تو اللہ تعالی عزوجل ہی کے لیے آپ اس سے انتقام لیتے"۔(۲)

غصے کی ممانعت

جب ہم حلم اور بردباری کی بات کر رہے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم غضب اور غصے کا بھی تذکرہ کریں چنانچہ حلم میں پہلا قدم نفس کو غصہ کرنے سے قابو کرنا ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ مجھ کو نصیحت کیجیے، تو آپ نے فرمایا: غصہ مت کرنا اس کے کئی مرتبہ دہرانے پر یہی فرمایا کہ: "غصہ مت کرنا"۔(۳)

اور حضرت ابوہریرہؓ سے ہی روایت ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہادر پچھاڑ دینے سے نہیں بنتا ہے؛ بلکہ بہادر تو وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو پالے۔"(۴)

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۵۲۰، م: ۲۳۲۷
(۲) اخرجہ مسلم: رقم: ۲۳۲۸
(۳) اخرجہ البخاری: رقم: ۱۶۱۶
(۴) متفق علیہ بخاری: ۶۱۱۴، مسلم: ۲۶۰۹

اور اسی طرح بہادری یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے آپ پر قابو پالے تاکہ اس کو اپنے آپ پر غلبہ حاصل ہو، نہ یہ کہ اس کا نفس ہی اس پر غالب و برتر ہو جائے۔

اور اس کو عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث نے مؤکد کر دیا ہے، انھوں نے کہا:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے میں سے بہادر کس کو شمار کرتے ہو؟ ابن مسعودؓ نے فرمایا: ہم نے عرض کیا کہ بہادر اس کو شمار کرتے جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں، آپ ﷺ نے فرمایا: معاملہ اس طرح نہیں ہے؛ بلکہ بہادر وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔'' (۱)

اسلام صرف امراض اور اس کی ظاہری کیفیات کے بیان پر بس نہیں کرتا؛ بلکہ وہ علاج بھی بتاتا ہے چنانچہ صادق و مصدوق ﷺ نے علاج بیان فرمایا اور بلاشبہ یہ کامیاب علاج ہے۔

حضرت سلمان بن صردؓ سے روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ کے پاس دو آدمیوں نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں جبکہ ہم آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ان میں ایک اپنے ساتھی کو گالی دے رہا تھا، غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک کلمہ ایسا جانتا ہوں کہ اگر اس کو کوئی کہہ لے تو جو چیز (غیظ وغضب کی) وہ پا رہا ہے وہ بالضرور ختم ہو جائے، اگر وہ کہے: اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم لوگوں نے اس آدمی سے کہا: کیا تم سنتے نہیں ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا؟ اس نے کہا: میں پاگل تو نہیں ہوں؟''۔ (۲)

اور ابوذرؓ کی حدیث میں ہے:

رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو غصہ آجائے اور وہ اس وقت کھڑا ہو، تو اس کو بیٹھ جانا چاہیے، اگر اس سے غصہ ختم ہو جائے (تو بہتر) ورنہ اس کو چاہیے کہ لیٹ جائے۔'' (۳)

آپ ﷺ کا غصہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں:

'' نبی ﷺ غصہ ہوتے تھے اور جب آپ غصہ ہوتے تو آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔'' (۴)

---

(۱) اخرجہ مسلم: رقم: ۲۶۰۸

(۲) متفق علیہ: رقم: ۶۱۱۵، م: ۲۶۱۰

(۳) اخرجہ ابوداؤد: رقم: ۴۷۸۲

(۴) اخرجہ البغوی فی الانوار: رقم: ۲۸۷، مسلم: ۲۴۰۰

لیکن آپ کا یہ غصہ دنیا کے فوت ہونے کے سبب نہیں تھا اور نہ کسی ایسے معاملے سے غصہ ہوتے جو آپ کی ذات کے لیے خاص ہو؛ بلکہ آپ کا غصہ اللہ کے لیے ہوتا۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے؛ انھوں نے فرمایا:

"ہم کو رسول اللہ ﷺ نے جہینہ میں حرقہ کی طرف بھیجا، پس ہم نے صبح ان پر حملہ کیا اور ان کو شکست دے دی، حضرت اسامہ نے فرمایا کہ میں نے اور انصار میں سے ایک صاحب نے اس قوم کے ایک آدمی کا پیچھا کیا۔

حضرت اسامہؓ کہتے ہیں: جب ہم نے اس کو گھیرے میں لے لیا تو اس نے لا الہ الا اللہ کہا، اسامہؓ نے کہا: انصاری تو اس سے باز رہے اور میں نے اپنے نیزے سے اس پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ اس کو قتل کر دیا، جب ہم آئے تو یہ خبر نبی ﷺ کو پہنچی، حضرت اسامہؓ نے کہا: آپ نے مجھ سے فرمایا: اے اسامہ! کیا تم نے اس کو لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد قتل کر دیا؟ تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ صرف پناہ حاصل کرنا چاہتا تھا، آپ ﷺ نے (پھر وہی) فرمایا: کیا تم نے اس کو لا الہ الا اللہ پڑھنے کے بعد قتل کر دیا؟ اسامہؓ نے بتایا کہ آپ ﷺ مسلسل اس جملہ (استفہام) کو دہراتے رہے، یہاں تک کہ (دکھ اور افسوس میں آکر) میں نے یہ تمنا کی کاش آج سے پہلے میں مسلمان نہ ہوا ہوتا (کہ مجھ سے یہ خطائے عظیم جو سرزد ہوئی وہ نہ ہوتی!)"۔(۱)

حضرت اسامہؓ کا یہ جملہ "کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا" ظاہر کرتا ہے کہ اس حادثے کی وجہ سے آپ کا غصہ کتنا تھا۔

اور عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کی طرف چلا، راوی نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے دو ایسے آدمیوں کی آواز سنی جو ایک آیت میں اختلاف کر رہے تھے تو ہمارے پاس رسول اللہ تشریف لائے، آپ کے چہرۂ انور پر غضب کے آثار تھے، پھر آپ نے فرمایا: بیشک تم سے پہلے کے لوگ کتاب اللہ میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔"(۲)

---

(۱) متفق علیہ: خ رقم: ۶۸۷۲، م: ۹۶

(۲) اخرجہ مسلم: رقم: ۲۶۶۶

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"نبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے قبلے کی جانب ناک کی ریزش دیکھی، تو آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم پر شاق گزرا، یہاں تک کہ آپ کے چہرۂ مبارک پر (اس کا اثر) دیکھا گیا، پھر آپ کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ سے اس کو کھرچا، اس کے بعد فرمایا: بیشک تم میں کوئی جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے، یا یہ فرمایا: بے شک اس کا رب اس کے اور قبلے کے درمیان ہوتا ہے، اس لیے تم میں سے کوئی بھی قبلے کی طرف ہرگز نہ تھوکے؛ بلکہ وہ اپنے بائیں طرف یا اپنے قدم کے نیچے تھوکے، پھر آپ نے اپنی چادر کا کنارہ پکڑا اس میں تھوکا اور اس کو اسی میں ملادیا (موڑ دیا) پھر فرمایا کہ یا اس طرح کرے۔"[1]

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اللہ کے لیے غضب کے چند نمونے ہیں جو ذکر کیے گئے۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۰۵، م: ۵۵

پندرھویں فصل

صبر

صبر کے میدان بہت ہیں اور مختلف ہیں، حضور اکرم ﷺ کو ان میں سے ہر ایک میدان میں حصہ وافر ملا تھا، زیر نظر فصل میں آپ کے صبر کے چند ایک میدانوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

دعوت الی اللہ کے راستے میں عمر بھر صبر و تحمل آپ کا سلاح رہا، چنانچہ مکہ مکرمہ میں مشرکین کے مقابلے میں اور مدینہ منورہ میں منافقین کے خلاف یہی آپ کا سہارا رہا۔

اس کی مثالوں کو بیان کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ اتنی زیادہ ہیں کہ وہ سیرت نبوی کے تمام واقعات کو محیط ہیں لیکن ہم یہاں آیات کریمہ کی روشنی میں اس سلسلے کی دائمی رہنمائی کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

دعوت و تبلیغ کی عظیم ترین ذمے داری کا بوجھ زبر دست محنت اور جدوجہد کی محتاج و متقاضی ہے، چونکہ رسول اکرم ﷺ بھی انسان تھے اور آپ کے اوپر بھی وہ حالات طاری ہوتے تھے جو دوسرے انسانوں کو پیش آتے ہیں، چنانچہ ان رکاوٹوں کے سبب بعض اوقات آپ کا عزم وارادہ بھی کمزور پڑنے لگتا، تب آپ کے اوپر اُن آیات کا نزول ہوتا تھا کہ آپ کے عزم و حوصلے کو مضبوط کریں اور صبر و تحمل کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنے پر قائم رکھیں۔

جن آیات میں آپ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے، وہ یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے دعوت و تبلیغ کے راستے میں کس عظیم جدوجہد اور صبر و شکیب کا مظاہرہ کیا ہے۔

ہم ذیل میں ان میں سے بعض آیات کو ان کی ترتیب نزول اور ان پر کسی تعلیق و تاثر کے بغیر درج کررہے ہیں، کیونکہ وہ خود ہی نہایت واضح ہیں:

اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

«وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ»(۱). ”اور اپنے رب کے لیے صبر کیجیے۔“

---

(۱) سورۂ مدثر: آیت: ۷

«وَ اتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡكَ وَ اصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡكُمَ اللّٰهُ وَ هُوَ خَیۡرُ الۡحٰكِمِیۡنَ»(۱).

''اور تم اتباع کرو اس حکم کی جو وحی کیا جائے تمھاری طرف اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔''

«وَ اصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ»(۲).

''اور صبر کرو؛ کیونکہ اللہ اچھا کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

« وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا تَكُ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡكُرُوۡنَ »(۳).

''اور صبر کرو اور تمھارے لیے صبر آسان نہیں مگر اللہ کی مدد سے اور ان پر غم نہ ڈھاؤ اور تنگ دل مت ہو ان کے فریب کاریوں سے۔''

« فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ غُرُوۡبِهَا »(۴).

'' تو تم صبر کرو اس بات پر جو یہ لوگ کہتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کی تسبیح بیان کرو سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے بھی۔''

«فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لَا یَسۡتَخِفَّنَّكَ الَّذِیۡنَ لَا یُوۡقِنُوۡنَ»(۵).

''تو تم صبر کرو بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے اور تم کو اشتعال نہ دلا سکیں وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے۔''

«اصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ »(۶).

''صبر کرو اس بات پر جو یہ لوگ کہتے ہیں اور یاد کرو ہمارے بندے داود قوت والے کو، وہ تھا رجوع ہونے والا۔''

---

(۱) سورۂ یونس آیت: ۱۰۹
(۲) سورۂ ہود: آیت: ۱۱۵
(۳) سورۂ نحل: آیت: ۱۲۷
(۴) سورۂ طٰحہ: آیت: ۱۳۰
(۵) سورۂ روم: آیت: ۶۰
(۶) سورۂ ص: آیت: ۱۷

« فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ »(۱).

"تو تم صبر کرو جیسا کہ اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا۔"

«وَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعۡيُنِنَا »(۲).

" تو تم صبر کرو اپنے رب کا حکم آنے تک کیونکہ بیشک تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔"

«فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِيلًا ○ إِنَّهُمۡ يَرَوۡنَهُ بَعِيدًا ○ وَّنَرَاهُ قَرِيبًا »(۳).

"تو تم صبر کرو بہترین صبر ، وہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے نزدیک سمجھتے ہیں۔"

«وَاصۡبِرۡ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيلًا »(۴).

"اور صبر کرو اس بات پر جو یہ لوگ کہتے ہیں اور انھیں چھوڑ دو اچھے طور پر۔"

« فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ آثِمًا أَوۡ كَفُورًا »(۵).

" تو تم صبر کرو اپنے رب کا حکم آنے تک اور اس میں کسی گناہ گار یا ناشکرے سے لالچ مت رکھو"

آپ ﷺ کے لیے ہمہ جہت صبر و تحمل سے کام لینا نا گزیر تھا، مثلاً اللہ کے دشمنوں سے جہاد پر صبر ، مکروفریب پر اور مختلف النوع سازشوں پر صبر ، نصرت و مدد کی تاخیر پر صبر ، طولِ مسافت پر صبر ، باطل کی بے خوفی پر صبر ، انصار واعوان کی قلتِ تعداد پر صبر ، خاردار طول طویل راستے پر صبر ، لوگوں کے نفاق پر صبر ، دلوں کی گمراہی، شدتِ تکلیف اور لوگوں کی بے اعتنائی کی تلخی پر صبر۔(۶)

---

(۱) سورۂ احقاف: آیت: ۳۵

(۲) سورۂ طور: آیت: ۴۸

(۳) سورۂ معارج: آیت: ۵-۶-۷

(۴) سورۂ مزمل: آیت: ۱۰

(۵) سورۃ الانسان: آیت: ۲۴

(۶) فی ظلال القرآن: ۱،۱۴۸

آپ ﷺ نے ان تمام حالات پر صبر کا دامن تھامے رکھا اور صبر و تحمل کی تلقین کی اور صبر کے سلسلے کی آیتیں اس طویل سفر میں آپ کے لیے قوت و توانائی حاصل کرنے کے اسٹیشنوں کی مانند تھیں۔ (۱)

اس موقعے پر بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کو صبر سے کام لینے کی کس قدر تاکید کرتے تھے، اس کی مثال کے طور پر حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کا واقعہ درج کر دیا جائے:

حضرت خبابؓ کہتے ہیں: (۲)

ہم نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی جب کہ آپ ﷺ تشریف فرما تھے کہ آپ ہمارے لیے نصرت طلب نہیں کرتے کیا آپ ہمارے لیے دعا نہیں کرتے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی امتوں میں ایک آدمی کے لیے زمین میں گڑھا کھودا جاتا، اسے اس میں کھڑا کر دیا جاتا اور اس کے سر پر آرا رکھ کر اس کے دو حصے کر دیے جاتے، لیکن یہ سزا بھی اسے دین سے منحرف نہ کر پاتی تھی، اسی طرح لوہے کا کنگھا اس کے جسم پر چلایا جاتا جس سے گوشت ہڈیوں سے الگ ہو جاتا، لیکن اس پر بھی وہ اپنے دین سے برگشتہ نہ ہوتا تھا۔

سنو، اللہ کی قسم! یہ معاملہ پورا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک کا سفر بے خوف و خطر کرے گا، اسے صرف اللہ کا یا اپنی بھیڑ بکریوں کی بابت بھیڑیے کا ڈر ہو گا، مگر تم لوگ جلدی مچاتے ہو۔"

اعزہ و اقارب کی وفات پر آپ ﷺ کا صبر:

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ آپ ﷺ کی تمام اولاد کی آپ کی حیات مبارکہ ہی میں وفات ہو گئی، اسی طرح آپ کی اہلیہ حضرت خدیجہ اور چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم بھی آپ کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے، لیکن آپ نے ہر موقعے پر صبر سے کام لیا اور اس سے اللہ کے اجر و ثواب کی امید بھی رکھی۔

ایسے موقعے پر آپ ﷺ کی زبان سے وہ الفاظ نکلتے جو آپ نے اپنے صاحب زادے حضرت

---

(۱) صبر کے موضوع پر ملاحظہ ہو مؤلف کی دوسری کتاب: السیرۃ تربیۃ أمۃ وبناء دولۃ۔

(۲) اخرجہ البخاری: رقم: ۳۶۱۲

ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت فرمائے:

«إِنَّ العَيْنَ تَدْمَعُ، وَالقَلْبَ يَحْزَنُ، وَلاَ نَقُولُ إِلَّا مَا يَرْضَى رَبُّنَا، وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ »(۱).

" آنکھ اشک بار ہے، دل رنجیدہ ہے، لیکن ہم وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے رب کو راضی کرے ابراہیم ! تمھاری جدائی پر ہم سب رنجیدہ اور غمگیں ہیں۔"

اسی طرح آپ ﷺ نے ایسے حالات میں دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

" اللہ تعالی فرماتے ہیں میرے پاس میرے بندۂ مؤمن کے لیے کوئی بدلہ نہیں ہے جب میں اہل دنیا میں اس کے کسی عزیز وقریب کی روح قبض کرلوں، پھر وہ اس پر بہ نیت ثواب صبر کرے، سوائے جنت کے۔"(۲)

نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" جس مسلمان کو بھی کوئی مصیبت پہنچے اور وہ اس پر وہی بات کہے جس کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے یعنی إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ اے اللہ ! میری اس مصیبت میں مجھے اجر عطا کیجیے اور مجھے اس کا نعم البدل دیجیے، تو اللہ تعالی اسے ضرور بہتر بدلہ دیتے ہیں۔"

صبر کی چند دوسری قسمیں:

صبر کی کچھ اور اقسام بھی ہیں مثلاً بھوک پیاس پر صبر کرنا، فقر وفاقے پر صبر کرنا، بیماری پر صبر کرنا اور خوف میں صبر کرنا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان جملہ حالات میں بے مثال صبر کا مظاہرہ کیا جیسا کہ آپ کی سیرت سے ظاہر و باہر ہے اللہ تعالی صبر کرنے والوں کی جزا کی بابت فرماتے ہیں:

«وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ○الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا

"اور ہم تمھیں تھوڑے سے ڈر، بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے اور خوش خبری دے دوان صبر کرنے والوں کو کہ

(۱) متفق علیہ: رقم: ۱۳۰۳، م: ۲۳۱۵

(۲) بخاری: رقم: ۶۴۲۴

إِنَّا لِلَّهِ وَ إِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ○أُولَٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ أُولَٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾(۱).

جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، ایسے ہی لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں سیدھی راہ پانے والے۔''

صبر ایک روشنی ہے:

مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے ابتلاء اور آزمائش تمام لوگوں پر آتی ہے؛ خواہ مسلمان ہوں یا کافر، مگر مسلمان کا عمل کافر سے مختلف ہوتا ہے اور وہ ہے صبر کرنا جس کا ان آیات میں تذکرہ کیا گیا ہے، نیز صبر کی جزا اور بدلے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

ان آیات اور ان میں بیان کردہ اجر وثواب کی روشنی میں آپ نے ارشاد فرمایا: "وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ" (۲)

صبر ضیاء اور روشنی ہے؛ چنانچہ خوف ودہشت، بھوک پیاس اور مال ودولت کی تنگی کے ذریعے ابتلاء کی مصیبت میں جہاں انسان کو اللہ کی قضاوقدرت میں کسی بھی تصرف پر قدرت نہیں رہتی، صبر انسانی طبیعت کے لیے روشنی اور سکون وطمانیت کا سامان ہوتا ہے، کیونکہ انسان کا نفس اللہ تعالی کی قضاوقدرت پر مطمئن رہتا ہے۔

جبکہ ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ'' کو مصیبت کے وقت دہرانا بندوں کی جانب سے اللہ تعالی کے سامنے اپنی عبودیت کا اور اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ وہ اور جو کچھ ان کے پاس ہے، سب اللہ کی ملکیت ہے اور یہ کہ مرجع وملجا صرف اسی کی ذات ہے، ظاہر ہے کہ نفس کے اس اطمینان کے سبب راضی بہ رضا نفس کو صبر روشن کر دیتا ہے۔

---

(۱) سورۂ بقرہ: آیت: ۱۵۵-۱۵۷

(۲) مسلم: رقم: ۲۲۳

سولہویں فصل

عدل وانصاف

تاکہ یہ لوگ آپ کو حکم تسلیم کرلیں:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

« فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا »[1].

"تمھارے رب کی قسم! یہ لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ تم کو فیصل مان لیں اپنے درمیان کے جھگڑے میں، پھر نہ پائیں اپنے دلوں میں تنگی تمھارے فیصلہ کی بابت، بلکہ مکمل طور پر تسلیم کرلیں۔"

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی مکرم ومقدس ذات کی قسم کھا کر بیان کیا ہے کہ کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ رسول اکرم ﷺ کو جملہ معاملات میں حاکم وحکم تسلیم نہ کرے۔ آپ ﷺ جو فیصلہ کریں وہی حق وصواب ہوگا جس کی اطاعت ظاہر و باطن ہر طور پر لازم ہے۔

آیت بالا سے درج ذیل چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) آپ ﷺ کا ہر فیصلہ عدل وانصاف پر مبنی ہوتا ہے۔

(۲) آپ ﷺ کے ہر فیصلے کو ماننا آپ ﷺ کی زندگی میں لازم ہے، اور وفات کے بعد آپ کی لائی ہوئی شریعت کو حکم بنانا ہے۔

(۳) آپ ﷺ کے فیصلہ کو دل سے قبول کرنا، اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور یہ یقین رکھنا کہ آپ کا فیصلہ ہی حق وصواب ہے، اس کے بغیر ایمان ہو نہیں سکتا۔

اس آیت کریمہ کے بعد آپ کے عدل وانصاف کے ثبوت کے لیے دلائل پیش کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کیوں کہ یہ علیم وخبیر ذات کی شہادت ہے۔

---

(۱) سورۂ نسا: آیت: ۶۵

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے شیخین کی روایت ہے:

«أَنَّ رَجُلًا مِنَ الأَنْصَارِ خَاصَمَ الزُّبَيْرَ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فِي شِرَاجِ الحَرَّةِ، الَّتِي يَسْقُونَ بِهَا النَّخْلَ، فَقَالَ الأَنْصَارِيُّ: سَرِّحِ المَاءَ يَمُرُّ، فَأَبَى عَلَيْهِ؟ فَاخْتَصَمَا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِلزُّبَيْرِ: أَسْقِ يَا زُبَيْرُ، ثُمَّ أَرْسِلِ المَاءَ إِلَى جَارِكَ . فَغَضِبَ الأَنْصَارِيُّ، فَقَالَ: أَنْ كَانَ ابْنَ عَمَّتِكَ؟ فَتَلَوَّنَ وَجْهُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، ثُمَّ قَالَ: اسْقِ يَا زُبَيْرُ، ثُمَّ احْبِسِ المَاءَ حَتَّى يَرْجِعَ إِلَى الجَدْرِ.

فَقَالَ الزُّبَيْرُ: وَاللَّهِ إِنِّي لَأَحْسِبُ هَذِهِ الآيَةَ نَزَلَتْ فِي ذَلِكَ: {فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ}»(۱).

"نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک انصاری شخص نے حرّہ، (حرّہ مدینہ منورہ میں ایک جگہ کا نام ہے) پانی کی بابت، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے خلاف شکایت کی، اس پانی سے لوگ اپنے کھجور کے باغات کی سینچائی کرتے تھے، انصاری نے حضرت زبیر سے کہا کہ پانی نہ روکیں بلکہ آنے دیں، لیکن انھوں نے انکار کردیا جس پر دونوں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں معاملہ لے کر آئے، حضور نے حضرت زبیر سے فرمایا: زبیر! پہلے تم اپنا باغ سینچ لو پھر پانی اپنے پڑوسی کے لیے چھوڑ دو، یہ سن کر وہ انصاری ناراض ہو اٹھا اور کہنے لگا کہ زبیر ٹھہرے آپ کے پھوپھی زاد بھائی؟ اس پر آپ کے روئے مبارک کا رنگ بدل گیا اور فرمایا: زبیر! تم سینچائی کرو، پھر پانی اپنے باغ میں روکے رکھو یہاں تک کی باغ کی منڈیر تک پہنچ جائے۔

حضرت زبیرؓ کا بیان ہے: اللہ کی قسم! {فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ} اسی واقعہ کی بابت نازل ہوئی۔

حضور اکرم ﷺ کا دوسرا فیصلہ نہ ردّ عمل تھا اور نہ ہی اس انصاری کی بات کا انتقام کہ انتقام آپ سے متصور ہی نہیں؛ جبکہ اللہ تعالی نے اس سے آپ کی براءت کا اعلان کردیا ہے۔

دراصل بات یہ کہ حضور اکرم ﷺ کے پاس اس طرح کے معاملات آتے تو آپ عام طور پر ان میں سفارش کرتے اور اپنی طرف سے صلح کی تجاویز پیش کرتے، یہ فیصلہ نہ ہوتا: بلکہ اصلاح بین الناس کی غرض سے آپ ایسا کرتے تھے، چنانچہ اسی جیسا حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے:

---

(۱) متفق علیہ: رقم: خ ۲۳۵۹، م: ۲۳۵۷، والآیۃ: سورۃ النساء: ۶۵

«أَنَّ كَعْبَ بْنَ مَالِكٍ، تَقَاضَى ابْنَ أَبِي حَدْرَدٍ دَيْنًا كان لَهُ عَلَيْهِ فِي الْمَسْجِدِ، فَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُهُمَا حَتَّى سَمِعَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ فِي بَيْتِهِ، فَخَرَجَ إِلَيْهِمَا حَتَّى كَشَفَ سِجْفَ حُجْرَتِهِ، وَنَادَى :يا كَعْبَ قَالَ: لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ قال: ضَعْ مِنْ دَيْنِكَ هذا، وأو مأ إليه: أي الشطر قال: لقد فعلت يارسول الله قال: قم فاقضه»(۱).

"انھوں نے حضرت ابن أبی حدرد رضی اللہ عنہ سے مسجد نبوی کے اندر اپنے قرض کا مطالبہ کیا، اس سے دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں؛ یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے حجرے میں ان کی آوازیں سنیں تو حجرے کا پردہ اٹھایا اور آواز دی: کعب! انھوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! حاضر ہوں، فرمایا: اپنے قرض میں سے اتنا یعنی نصف حصہ معاف کر دو، انھوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کر دیا، پھر آپ نے حضرت ابن ابی حدرد سے فرمایا: تم باقی ماندہ قرض ادا کر دو۔"

حضرت کعبؓ سے جو آپ نے آدھا قرض معاف کرنے کے لیے فرمایا تو یہ کوئی فیصلہ نہیں تھا، بلکہ دونوں میں صلح صفائی کرنے کی ایک کوشش تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت کعبؓ کے سامنے نصف قرض معاف کرنے کی تجویز رکھی جسے انھوں نے بہ خوشی منظور کرلیا، تب آپ نے دوسرے فریق سے باقی ماندہ آدھا قرض ادا کرنے کے لیے فرمایا۔

اسی طرح حضرت زبیرؓ کے معاملے میں بھی آپ ﷺ نے فریقین کے مفاد کو ملحوظ رکھ کر معاملہ رفع دفع کرنے اور صلح صفائی کرانے کی کوشش فرمائی، لیکن دوسرا فریق آمادہ نہ ہوا، تب آپ کو مجبورًا اس معاملہ میں فیصلہ کرنا پڑا، اس کا اندازہ بخاری شریف کی دوسری روایت سے ہوتا ہے جس میں آتا ہے:

«فَتَلَوَّنَ وَجْهُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، ثُمَّ قَالَ: اسْقِ، ثُمَّ احْبِسْ حَتَّى يَبْلُغَ الْجَدْرَ، فَاسْتَوْعَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ حِينَئِذٍ حَقَّهُ لِلزُّبَيْرِ، وَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ قَبْلَ ذٰلِكَ أَشَارَ عَلَى الزُّبَيْرِ بِرَأْيٍ سَعَةٍ لَهُ وَلِلْأَنْصَارِيِّ، فَلَمَّا أَحْفَظَ الْأَنْصَارِيُّ رَسُولَ

" تو رسول اللہ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور فرمایا: زبیر سینچائی کر کے پانی روکے رکھو، یہاں تک کہ منڈیر تک پہنچ جائے، گویا اس وقت آپ نے حضرت زبیر کو ان کا حق دیا، جبکہ اس سے پہلے آپ نے ان کو جو مشورہ دیا تھا اس میں ان کی اور انصاری

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۵۷، مسلم: ۱۵۵۸

اللّٰہِ ﷺ اسْتَوْعَی لِلزُّبَیْرِ حَقَّہُ فِي صَرِیحِ الحُکْمِ»[1].

دونوں کی رعایت تھی، لیکن جب انصاری نے حضور ﷺ کے اس مشورے پر تحفظات کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے واضح فیصلہ دے کر حضرت زبیر کو ان کا حق دلایا"۔

مکارمِ اخلاق اور عدل وانصاف:

حضرت کعب بن مالک اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما نیز دوسرے معاملات میں جوانداز آپ ﷺ نے اختیار کیا، اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کے نظام اخلاق یعنی عفو ودر گزر اور رواداری سے مقدمات کو حل کیا جاسکتا ہے، اگر یہ صورت کامیاب نہ ہو تو پھر قاضی اور جج سے رجوع کیا جائے گا اور اس وقت فریقین پر فیصلہ کی پابندی لازم ہو گی۔

حدود کے نفاذ میں عدل وانصاف:

جن دیگر میدانوں میں عدل وانصاف کرنا لازم ہے، ان میں سے ایک اللہ تعالی کی طرف سے مقرر کردہ سزاؤں (حدود) کا نفاذ بھی ہے، اس سلسلے میں کسی قسم کی شفقت، رحم دلی اور مہربانی مناسب نہیں، نیز یہ بھی درست نہیں کہ اس تعلق سے معزز وطاقتور اور کمزور وبے حیثیت شخص کے درمیان کوئی امتیاز برتا جائے۔

"غزوۂ فتح کے موقع پر آپ ﷺ کی مکہ مکرمہ میں موجودگی کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ قریش کی ایک شاخ بنو مخزوم کی ایک عورت نے چوری کرلی، اس پر اہل قریش بڑے پریشان ہوئے اور ان ذرائع کی جستجو میں لگ گئے جن سے وہ عورت متوقع سزا سے بچ جائے اور یہ لوگ اس پر جاری ہونے والی حد کی عار سے۔ آپس میں مشورہ کیا کہ اس بابت رسول اللہ ﷺ سے کون شخص گفتگو کرسکتا ہے؟ سب کی رائے ہوئی کہ چونکہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما آپ کے نزدیک سب سے زیادہ چہیتے اور لاڈلے ہیں اس لیے انہی سے اس مسئلہ میں بات کرائی جائے، انھوں نے حضور اکرم سے گفتگو کی تو آپ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل گیا اور فرمایا: کیا تم مجھ سے حدود اللہ کی بابت گفتگو کرنا چاہتے ہو؟ وہ آپ کا غیظ وغضب دیکھ کر گھبرائے اور آپ سے اپنی اس حرکت پر استغفار کرنے کی

---

(۱) اخرجہ البخاری: رقم: ۲۷۰۸

درخواست کی۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطاب کیا اور فرمایا: تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب کوئی معزز شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کمزور اور بے حیثیت چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے ، اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد (رضی اللہ عنہا) نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا۔"[۱]

چنانچہ اس عورت کا ہاتھ کاٹا گیا اور اس کی توبہ بھی نہایت اچھی رہی۔

آپ ﷺ خود اپنے آپ سے بدلہ دلاتے:

ایک انصاری حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

" اس اثناء میں کہ وہ لوگوں کو ہنسنے ہنسانے کی باتیں سنا رہے تھے، ان کی طبیعت میں مزاح تھا بھی، اتنے میں نبی اکرم ﷺ نے ایک لکڑی ان کی کوکھ میں چبھو دی، اس سے وہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! مجھے اس کا بدلہ دیجیے، فرمایا ضرور بدلہ لو، انھوں نے عرض کیا: آپ کے بدن پر کپڑا ہے، جبکہ میرے جسم پر کپڑا نہیں، یہ سن کر آپ نے اپنا کرتہ اوپر کر دیا، مگر انھوں نے بدلہ لینے کے بجائے آپ کے کھلے ہوئے پہلو کا بوسہ لینا شروع کر دیا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! میرا تو بس یہی مقصد تھا۔"[۲]

اس طرح غزوۂ بدر کے روز آپ ﷺ صفیں درست کر رہے تھے، آپ ﷺ کا حضرت سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ پر گزر ہوا جو صف سے آگے نکلے ہوئے تھے تو آپ نے تیر کے پھل سے ان کے پیٹ میں کچوکا لگایا اور فرمایا سواد! لائن میں ہو جاؤ، وہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! مجھے تکلیف پہنچائی ہے، جبکہ اللہ نے آپ کو حق اور عدل وانصاف کی صفت سے متصف کر کے مبعوث کیا ہے؛ لہذا مجھے بدلہ دیجیے، یہ سن کر آپ نے اپنا شکم مبارک کھول دیا اور فرمایا: بدلہ لے لو، حضرت سواد بدلہ کیا لیتے، آپ کے گلے لگ گئے اور شکم مبارک کا بوسہ دیا، آپ نے فرمایا: سواد تمھیں ایسا کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟؟ عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ دیکھ ہی رہے ہیں میدان جنگ گرم ہوا چاہتا ہے، اس

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۳۰۴، ۳۴۷۵، م: ۱۶۸۸

(۲) اخرجہ ابوداؤد: رقم: ۵۲۲۴

لیے میری خواہش ہوئی (کہ میری آپ سے آخری ملاقات یہ ہو) کہ میری کھال آپ کی جلد مبارک سے مس ہو جائے، یہ سن کر آپ نے ان کو دعائے خیر دی۔[۱]

ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ حضرت اسید اور حضرت سواد رضی اللہ عنہما کے اس عمل کا محرک اور جذبہ کیا تھا، بلکہ ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے جیسے ہی بدلہ کی بات کہی آپ فوراً بغیر کسی تاخیر کے اس کے لیے آمادہ ہو گئے، اور اس وقت آپ کو یہی علم تھا کہ یہ دونوں بدلہ لینے والے ہیں، اس قسم کا طرز عمل آپ کی سیرت پاک میں نہایت نمایاں ہے۔[۲]

اولاد کے درمیان عدل وانصاف:

عدل وانصاف کے میدان بھی بہت اور نوع بہ نوع ہیں، یہاں ان سب کا احاطہ کرنا مقصد نہیں، ورنہ بات اصل موضوع سے دور نکل جائے گی، بلکہ صرف چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

" میرے والد صاحب نے مجھے ایک چیز بطور تحفہ وعطیہ دی، اس پر ان کی والدہ حضرت عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہا نے کہا: جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا گواہ نہ بنالو، تب تک مجھے یہ قبول نہیں، چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئے کہ میں نے اپنے بیٹے (نعمان جو عمرہ بنت رواحہ کے بطن سے ہیں) کو ایک عطیہ الگ سے دیا ہے، جس پر عمرہ کہتی ہیں کہ اس کے لیے میں آپ کو گواہ بناؤں، آپ نے معلوم کیا تم نے اپنی تمام اولاد کو اسی طرح کا عطیہ دیا ہے؟ کہنے لگے: نہیں، فرمایا: پھر اللہ سے ڈرو، اولاد کے درمیان عدل وانصاف کرو، حضرت نعمان کہتے ہیں: میرے والد

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۶۲۶/۱

(۲) (ابوداود شریف: رقم: ۴۵۳۷، نسائی شریف: رقم: ۴۷۹۱) اس موقع پر یہ واقعہ بھی درج کر دینا مناسب ہے: حضرت ابوفراس کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: میں نے اپنے عمال اور گورنروں کو اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ وہ تمھاری پٹائی کریں اور نہ اس لیے کہ تمھارا مال ہڑپ کریں، اگر کوئی عامل و گورنر رعایا میں سے کسی سے سرزنش کرے تب بھی آپ اس سے بدلہ لیں گے؟ فرمایا: بیشک قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے؛ میں ضرور اس سے بدلہ لوں گا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خود اپنے آپ سے بدلہ دلاتے ہوئے دیکھا ہے۔

صاحب نے جاکر وہ عطیہ واپس لے لیا۔

جبکہ مسلم شریف کی روایت میں ہے: آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر ایسا ہے پھر تم مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں کسی ناانصافی اور ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔"(۱).

عدل وانصاف کے اہم ترین میدان میں آپ ﷺ کا انداز اسی طرح بالکل واضح اور بے لاگ ہوتا تھا، اس موقعہ پر آپ نے یہ بھی واضح فرمادیا کہ ظلم کا گواہ ظلم میں شریک ہوتا ہے۔

غزوہ حنین کے مالِ غنیمت کی تقسیم:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

" غزوۂ حنین کے موقعہ پر نبی پاک ﷺ نے مالِ غنیمت کی تقسیم میں بعض افراد کو ترجیح دی، چنانچہ اقرع بن حابس کو سو اونٹ دیئے اور عیینہ بن حصن فزاری کو اسی کے برابر، علاوہ ازیں قبائل عرب کے بعض معزز و سربرآوردہ اشخاص کو بھی عطایا سے نوازا اور انھیں تقسیم میں ترجیح دی۔

اس پر ایک شخص نے کہا: اللہ کی قسم! اس میں نہ تو انصاف سے کام لیا گیا اور نہ ہی اس سے اللہ کی رضا مقصود ہے، ابن مسعود کا بیان ہے کہ یہ بات میں نے سن کر طے کیا کہ میں اس کی اطلاع ضرور رسول اللہ کو دونگا چنانچہ آکر آپ کو یہ بات بتائی تو آپ نے فرمایا: اگر اللہ اور رسول اللہ ہی انصاف نہ کریں گے تو پھر کون انصاف کرے گا؟ نیز فرمایا: اللہ تعالی حضرت موسی (علیہ السلام) پر رحم کرے، ان کو اس سے بھی زیادہ تکلیف دی گئی، مگر انھوں نے صبر کیا۔

ایک روایت میں ہے کہ میں نے یہ بات آپ ﷺ کو چپکے سے بتائی، آپ کو سخت ناگواری ہوئی اور غصہ کے مارے آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، کہتے ہیں: تب میرے دل میں خیال آیا: کاش! میں نے آپ سے یہ بات بتائی ہی نہ ہوتی۔"(۲).

جبکہ مسلم شریف کی روایت میں ہے:

"رسول اکرم ﷺ نے ابو سفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہما کو سو سو اونٹ دیئے۔"(۳).

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۲۵۸۷، م: ۱۶۲۳

(۲) متفق علیہ: رقم: ۶۱۰۰، ۳۱۵۰، م: ۱۰۶۲

(۳) اخرجہ مسلم: رقم: ۱۰۶۰

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

" انصار میں سے چند لوگوں نے رسول اکرم ﷺ کے بارے میں کہا جب اللہ تعالی نے قبیلہ ہوازن کے اموال آپ کو عطا کیے اور آپ قریش کے بعض افراد کو سو، سو، اونٹ دینے لگے کہ اللہ تعالی رسول اکرم ﷺ کی مغفرت کرے، آپ قریش کو دے رہے ہیں اور ہم کو نظر انداز کر رہے ہیں، جبکہ ہماری تلواروں سے ان کے خون ٹپک رہے ہیں۔(۱)

دوسری روایت میں ہے کہ انصار نے کہا: اللہ کی قسم! یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ ہماری تلواروں سے قریش کے خون ٹپک رہے ہیں، پھر ہمارا مالِ غنیمت قریش کو دیا جارہا ہے۔".(۲)

یہ وہ چند اعتراضات و تحفظات ہیں جو غزوۂ حنین کے مالِ غنیمت کی تقسیم پر ظاہر کیے گئے، آیئے دیکھیں کہ اصل صورت حال کیا تھی؟ یہ بات معلوم ہے کہ غزوۂ حنین میں مسلمانوں کو بہت سارا مالِ غنیمت ملا اور آپ ﷺ نے اہل ہوازن کی آمد کے انتظار میں کچھ دنوں تک تقسیم میں تاخیر سے کام لیا کہ اگر وہ آجائیں تو ان کے اموال انھیں واپس دے دیئے جائیں؛ لیکن ہوازن کے لوگوں نے آنے میں کافی دیر کر دی، ادھر اعراب نے مالِ غنیمت کی تقسیم کا مطالبہ شروع کر دیا؛ لہذا مجبوراً آپ نے مالِ غنیمت تقسیم کر دیا۔

واضح ہو کہ مالِ غنیمت میں پانچ حصے ہوتے ہیں: چار حصے مجاہدین میں تقسیم کیے جاتے ہیں؛ جبکہ پانچواں حصہ رسول اکرم ﷺ کا ہوتا ہے؛ جس کا وہی حکم ہے جو بغیر جنگ کے حاصل شدہ مال (فیئ) کا ہے، یعنی اس میں آپ ﷺ اعزہ و اقارب کو دیتے اور باقی ماندہ مال اپنی صواب دید کے تحت عام مسلمانوں کی ضروریات و مفادات پر صرف کرتے تھے۔

حضرت عمرو بن عنبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت کے ایک اونٹ کو سترہ بنا کر نماز پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد اس اونٹ کے برابر سے ایک مینگنی لی اور فرمایا: میرے لیے پانچویں حصہ کے علاوہ

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۱۴۷، م: ۱۰۵۹

(۲) متفق علیہ: رقم: ۳۷۷۸، م: ۱۰۵۹

تمھارے مالِ غنیمت میں سے اتنا سامال بھی حلال نہیں، جبکہ پانچواں حصہ (خمس) تمھیں ہی واپس ہو جاتا ہے۔''(۱).

یاد رہے کہ اس موقع پر بھی شریعت کے مطابق مالِ غنیمت کی تقسیم ہوئی، ہر ایک نے۔ خواہ انصار ہوں یا دوسرے لوگ۔ اپنا اپنا حصہ لے لیا۔ غنیمت میں مال و دولت بھی تھی اور قیدی بنائے گئے بچے، مرد اور عورتیں بھی۔

وفد ہوازن کی آمد:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

'' ہم آپ ﷺ کے پاس تھے جب ہوازن کے لوگ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے، انھوں نے عرض کیا: محمد! ہم آپ کے خاندان کے لوگ ہیں، ہم پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے، وہ آپ سے مخفی نہیں ہے؛ اس لیے ہمارے اوپر آپ احسان فرمائیے، اللہ آپ کے ساتھ کرم کا معاملہ کرے گا۔

آپ نے فرمایا: تم لوگ مال و دولت اور عورتوں بچوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو، وہ کہنے لگے: آپ نے ہمیں اہل و عیال اور مال میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دیا ہے تو ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو منتخب کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا جو میرے اور بنو عبد المطلب کے تھے وہ سب تمھارے ہیں اور دیکھو جب میں نماز ظہر پڑھا کر فارغ ہو جاؤں تو تم لوگ کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ ہم لوگ مسلمانوں سے رسول اللہ کا واسطہ دے کر اپنی عورتوں اور بچوں کی بابت مدد کے طالب ہیں، جب مسلمان نماز ظہر سے فارغ ہوئے تو انھوں نے کھڑے ہو کر یہی بات کہی، حضور اکرم ﷺ نے پھر کہا: میرے اور بنو عبدالمطلب کے حصے کے قیدی تمھارے حوالے ہیں، یہ تمام مہاجرین نے کہا: جو ہمارے حصہ میں ہیں وہ رسول اللہ کے حوالے ہیں، انصار نے بھی اعلان کیا: جو ہمارے قیدی ہیں وہ سب رسول اللہ کی صواب دید پر موقوف ہیں۔''(۲).

اس سے معلوم ہوا کہ انصار تقسیم میں اپنا حصہ لے چکے تھے پھر انھوں نے دوسروں کی طرح

---

(۱) اخرجہ ابوداؤد: رقم: ۲۷۵۵

(۲) اخرجہ النسائی: رقم: ۳۶۹۰

اپنے قیدی واپس کر دیئے اور اموال رکھ لئے پھر انھوں نے وہ بات کیوں کہی جو پہلے گزر چکی ہے؟

صورتِ حال یہ ہوئی کہ رسول اکرم ﷺ نے قریش یا دیگر قبائل کے جن سر بر آوردہ حضرات کو گراں قدر عطیات دیئے، وہ آپ ﷺ نے خمس سے دیئے تھے جس میں بحکم خداوندی آپ ﷺ کو اپنی صواب دید کے مطابق تصرف کرنے کا مکمل اختیار تھا۔

اس وقت آپ ﷺ نے اِن نئے مسلمانوں کی تالیف قلب اور دل جوئی کرنا مناسب سمجھ کر ان کو خمس میں سے عطا کیا، انصار کا خیال تھا کہ وہ ان نو مسلموں سے خمس کے زیادہ حق دار تھے، نہ یہ کہ یہ ان کا حصہ تھا، اس لیے خمس میں سے دیا جانا در حقیقت مجاہدین کی جاں بازی کی تحسین و تشجیع ہوتی تھی، چنانچہ رسول اکرم ﷺ عام طور پر جانبازی کا مظاہرہ کرنے والوں کو مالِ غنیمت سے ان کے حصوں کے علاوہ بھی دیا کرتے تھے، غزوۂ حنین میں حضرات انصار کی بڑی کلیدی حیثیت تھی، اس لیے انھیں امید تھی کہ انھیں آج بطور تشجیع اصل حصے کے علاوہ بھی ضرور دیا جائے گا، لیکن آپ ﷺ نے اس دن مؤلفین قلوب کی داد و دہش کرنا زیادہ بہتر سمجھا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حنین کے اموالِ غنیمت کی تقسیم میں نہ کسی کی حق تلفی ہوئی تھی اور نہ سابق دستور سے انحراف۔

چنانچہ آپ ﷺ نے حضرات انصار کے پاس قاصد بھیج کر، انھیں ایک خیمہ میں جمع کر کے صرف خطاب فرمایا:

وہ کیا بات ہے جو آپ حضرات کی طرف سے مجھے معلوم ہوئی ہے؟

اس پر اہل خرد اور سمجھدار انصار نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم میں سے جو صاحبِ رائے اور عقل مند ہیں، انھوں نے تو کوئی بات نہیں کہی، البتہ جو نو عمر ہیں انھوں نے اس طرح کی بات کی ہے کہ اللہ رسول ﷺ کی مغفرت کرے کہ قریش کو عطا کر رہے ہیں ہمیں نظر انداز کر رہے ہیں، جبکہ ان کے خون سے ہماری تلواریں ٹپک رہی ہیں۔(۱).

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

جماعتِ انصار! کیا میں نے تمھیں گمراہ نہیں پایا تھا، پھر اللہ نے میرے ذریعے تمھیں ہدایت

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۱۴۷، م: ۱۰۵۹

دی؟ تم اختلاف وانتشار میں مبتلا تھے پھر اللہ نے میرے ذریعے تمھارے درمیان اتحاد واتفاق پیدا کر دیا؟ تم تنگ دست تھے، پھر اللہ نے میرے ذریعے تمھیں بے نیاز کر دیا؟ راوی کہتے ہیں: آپ ﷺ جب بھی کوئی بات فرماتے؛ انصار بیک زبان یہی کہتے: اللہ اور اس کے رسول کا اس سے بھی زیادہ احسان وکرم ہے آپ ﷺ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کی بات کا جواب دینے سے کیا چیز مانع ہے؟ اس پر بھی انصار نے یہی کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کا اس سے بھی زیادہ احسان ہے۔ پھر آپ ﷺ نے خود ہی فرمایا: آپ لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ آپ ہمارے پاس اس حال میں آئے تھے.... ۔آگے فرمایا کیا آپ لوگ اس پر راضی ومطمئن ہیں کہ دوسرے لوگ تو بھیڑ بکریاں اور اونٹ لے کر جائیں اور آپ اپنے گھر رسول اللہ ﷺ کو لے کر جائیں؟ سنو! اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار میں ہی کا ایک فرد ہوتا، اگر دوسرے ایک وادی اور گھاٹی کی راہ اختیار کریں تو میں انصار کی وادی اور گھاٹی اپناؤں گا۔"(۱)

دوسری روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میں ایسے افراد کو دے رہا ہوں جو کفر سے ابھی جلد ہی اسلام کی طرف آئے ہیں، کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ دوسرے مال ودولت لے کر جائیں اور تم اپنے گھر رسول اللہ کو لے کر جاؤ؟"(۲)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کی یہ بات سن کر حضرات انصار اس قدر زار وقطار روئے کہ ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور بیک زبان گویا ہوئے: ہم رسول اللہ ﷺ کی تقسیم سے بالکل مطمئن ہیں۔(۳)

رسول اکرم ﷺ نے اس موقع پر تنہا حضرات انصار کو اس لیے جمع کیا تھا کہ اپنے عمل کو حکمت ومصلحت سے ان کے سامنے واضح کر سکیں اور یہ بتائیں کہ اس کا مقصد ان لوگوں کی دل جوئی تھی۔ اگر یہ بات آپ تمام لوگوں کے سامنے فرماتے تو اس داد ودہش کا مقصد ہی فوت ہو جاتا اور مؤلفین قلوب کو بھی معلوم ہو جاتا کہ اس سے ان کی دل جوئی کی گئی ہے، ورنہ رسول اللہ کے نزدیک

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۳۳۰، م: ۱۰۶۱
(۲) متفق علیہ: رقم: ۳۱۴۷، م: ۱۰۵۹
(۳) سیرت ابن ہشام: ۵۰۰/۲

ان کی کوئی خاص قدر و منزلت نہیں ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مؤلفین قلوب کو زکوۃ کا ایک مستقل مصرف قرار دیا ہے تو خمس میں ایسے لوگوں کو بدرجۂ اولیٰ دیا جانا چاہیے۔ کیا یہ عین عدل وانصاف اور حکمت و مصلحت نہیں ہے؟

ظلم اندھیرا ہی اندھیرا ہے:

اگر انسان کی یہ خواہش ہو کہ وہ عادل اور منصف ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ظلم وستم سے پاک کرے اس لیے کہ عدل وانصاف اور ظلم وستم دو متضاد چیزیں ہیں جو یکجا نہیں ہو سکتیں، ظلم قیامت کے دن اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا، جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

الظلم ظلمات یوم القیامة۔ [1]. ظلم قیامت کے دن اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا۔

ظلم کی قسمیں اور صورتیں بہت زیادہ ہیں جنھیں درج ذیل بنیادی اقسام میں جمع کیا جاسکتا ہے:

(۱) انسان کا خود اپنے اوپر ظلم کرنا:

ایسا حدود اللہ کو پامال کر کے یا انھیں پھلانگ کر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

«وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ» [2]. ”اور جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔“

” ظلم کی اس قسم کی ابتداء شرک سے ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔ (سورۂ لقمان: آیت: ۱۳) بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

(۲) انسان کا دوسروں پر ظلم کرنا:

یہ صورت لوگوں کے جسم، ان کے مال اور ان کی عزت و آبرو پر جارحانہ حملے سے پیدا ہوتی ہے، حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

”تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزتیں تمھارے اوپر حرام ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت، اس شہر کی حرمت اور اس مہینہ کی حرمت ہے۔“[3].

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۲۴۴۷، م: ۲۵۸۹

(۲) سورۂ طلاق: آیت: ۱

(۳) بخاری: رقم: ۴۴۰۶، مسلم: ۱۶۷۹

اسی خطبہ میں نبی پاک ﷺ نے اپنی امت کو ظلم وستم کی چیزوں سے پاک صاف ہو جانے کی تاکید کی اور فرمایا:

"جس کسی شخص کا ظلم ہو کسی کی عزت پر یا اس کی کسی اور چیز پر تو وہ اس سے آج ہی پاک صاف ہو جائے اس سے پہلے کہ نہ اس کے پاس دینار رہ جائے، نہ درہم، اگر اس کے پاس کوئی نیک عمل ہوگا تو اس کے ظلم کی بقدر اس سے لے لیا جائے گا اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی تو دوسرے مظلوم کی برائیاں لے کر اس ظالم کے اوپر لاد دی جائیں گی۔"(۱)

(۳) قاضی اور جج کا ظلم:

جو قاضی اور جج حق وصواب کو جانتے ہوئے اس کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں وہ ظالم ہیں، اسی طرح جو قاضی جہالت اور عدم واقفیت کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں وہ بھی ظالم ہیں؛ جیسا کہ اس حدیث شریف سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

"قاضی وجج تین طرح کے ہیں: ایک جنتی ہے اور دو جہنمی"۔

"جنتی قاضی وہ ہے جس کو حق وصواب کا علم ہو پھر وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ جس نے حق وصواب جانتے ہوئے بھی فیصلہ میں ناانصافی کی، وہ جہنمی ہے۔ اسی طرح جس نے جہالت کے ساتھ لوگوں کا فیصلہ کیا، وہ بھی جہنمی ہے"۔

چونکہ قضا کا معاملہ بڑا نازک اور پُر خطر ہے، اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"جس کو قضا کی ذمہ داری دی گئی گویا اسے بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔"(۲)

یہ بات آپ نے قاضی اور جج کی طرف سے متوقع ظلم وناانصافی پر تنبیہ کرنے کی غرض سے ہی ارشاد فرمائی۔

(۴) حکام اور ذمہ داروں کا ظلم:

اس ظلم وزیادتی کی شکلیں، چند در چند اور ذرائع بہت ہیں، بعض دفعہ یہ ظلم بلاواسطہ ہوتا ہے اور بعض مرتبہ بالواسطہ۔ یہاں ان سب کی تفصیل کرنا پیش نظر نہیں ہے، بلکہ اس ذیل میں

---

(۱) بخاری: رقم: ۲۴۴۹

(۲) ابوداؤد: رقم: ۳۵۷۱، ترمذی: ۱۳۲۵، ابن ماجہ: ۲۳۰۸

وارد بعض احادیث و آثار کو درج کیا جارہا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"دو قسم کے جہنمی ایسے ہیں جنھیں میں نے نہیں دیکھا؛ ایک وہ لوگ جن کے پاس گائے کی دم کی مانند کوڑے ہوں گے جن سے دوسروں کی پٹائی کریں گے۔"[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" اگر تمھاری عمر لمبی ہوئی تو عنقریب تم ایسے لوگوں کو دیکھو گے جن کے ہاتھوں میں گائے کی دم جیسی کوئی چیز (کوڑہ) ہوگی یہ لوگ صبح بھی اللہ کے غضب میں کریں گے اور شام بھی"۔[2]

اسی طرح حدیث میں ہے:

"اللہ تعالی ان لوگوں کو عذاب دیں گے جو دنیا میں دوسروں کو عذاب دیتے تھے"۔[3]

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

" میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کوئی ایسا بندہ ہے جس کو اللہ کسی کا راعی و نگراں بنائے، پھر وہ اس کے ساتھ خیر خواہی و ہمدردی نہ کرے، تو اسے جنت کی خوشبو تک نہ ملے گی۔"[4]

ظلم و ستم کے جرم کی سنگینی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اللہ تعالی نے اسے اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نبی پاک ﷺ سے حدیث قدسی نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نے فرمایا:

" میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا ہے اور تمھارے درمیان بھی اسے حرام کیا ہے، اس لیے تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔"

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۱۲۸

(۲) مسلم: رقم: ۲۸۵۷

(۳) مسلم: رقم: ۲۶۱۳

(۴) متفق علیہ: رقم: ۷۱۵۰، م: ۱۴۲

سترہویں فصل

ورع (پرہیز گاری) اور شبہات کو چھوڑ دینا

ورع کی تعریف:

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
"حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی، ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ (شبہ والی) چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، تو جو شخص شبہ والی چیزوں سے بچا تو وہ اپنا دین اور اپنی آبرو بچا لے گیا۔ اور جو شخص شبہ والی چیزوں میں پڑا تو وہ اس چرواہے کی مانند ہے جو (شاہی) چراہ گاہ کے ارد گرد چرائے، لہذا اندیشہ ہے کہ وہ شاہی چراگاہ میں داخل کر دے۔ سنو! بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی زمین پر اس کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ سنو! بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ ٹھیک رہتا ہے تو سارا بدن ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، سنو! وہ دل ہے۔"(۱)

اس حدیث شریف سے تین باتوں کا علم ہوتا ہے:

(۱) واضح حلال۔

(۲) واضح حرام۔

(۳) مشتبہ چیز جسے بہت سے لوگ نہیں جانتے۔

ورع اسی مشتبہ چیز سے دور رہنے کا نام ہے کہ اس کے آگے حرام ہے، گویا مشتبہ چیز حرام کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے باڑ کی مانند ہے، جو شخص شبہ والی چیز سے دور ہو گا وہ حرام سے بدرجہ اولی دور رہے گا۔

اس مفہوم کو بخاری شریف کی ایک روایت مزید واضح کر دیتی ہے: " تو جس نے وہ گناہ چھوڑ دیا جو اس کے لیے مشتبہ تھا تو وہ واضح اور ظاہر گناہ کو بدرجہ اولی چھوڑ دے گا۔ اور جو شخص مشتبہ گناہ کے

(۱) متفق علیہ: رقم: ۵۲، م: ۱۵۹۹

ارتکاب کی جرأت کرے تو وہ عنقریب واضح گناہ میں بھی مبتلا ہو گا۔

معصیت کے امور اللہ کی چراگاہ ہیں اور جو چراگاہ کے ارد گرد چرے اندیشہ ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے گا۔" (۱)

اسی مفہوم کی تائید اس حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے کہ: شبہ کی چیز چھوڑ کر بے شبہ کی چیز اختیار کرو۔"(۲)

ایک مرتبہ حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے نیکی اور گناہ کی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

"نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ اس چیز کا جو تمھارے دل میں کھٹکے اور لوگوں کا اس سے باخبر ہونا تمھیں ناگوار لگے۔"(۳)

ان دونوں احادیث نے خیر وشر کی معرفت کی بابت ہر شخص کی فطرت کو مقیاس اور پیمانہ بنایا ہے، کہ جب انسان شک وشبہ کے دائرہ میں ہو اور خطرہ کا ادراک کرے تو اس سے دور رہے، اس کی دو علامتیں ہیں:

(۱) کسی بات کی بابت طبیعت کا مطمئن نہ ہونا۔

(۲) اس کا اندیشہ کہ دوسروں کو اس کی خبر ہو جائے۔

جو چیز کھلی ہوئی اور واضح حلال ہو اسے کرتے ہوئے انسان کو کسی قسم کا خوف وخطرہ نہیں ہوتا، لوگوں کے باخبر ہونے اور واقف ہو جانے کا خوف اس وقت ہوتا ہے جب وہ کام شبہ کے دائرہ کا ہو، اگر کوئی کام ایسا ہو تو انسان کو چاہیے کہ اسے چھوڑ کر غیر مشتبہ کام اختیار کرے۔

آپ ﷺ کے ورع واحتیاط کی چند مثالیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

" نبی پاک ﷺ کا گزر راستہ پر پڑی ایک کھجور سے ہوا تو فرمایا: اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ

---

(۱) بخاری: رقم: ۲۰۵۱

(۲) ترمذی: رقم: ۲۵۱۸، نسائی: ۵۷۲۷، دارمی: ۲۵۳۲

(۳) مسلم: رقم: ۲۵۵۳

صدقہ کی ہے تو میں اسے کھالیتا۔"(۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"میں اپنے گھر والوں کے پاس لوٹتا ہوں، پھر اپنے بستر پر کھجور پڑی ہوئی دیکھتا ہوں اور اسے کھانے کے لیے منھ کی طرف لے جاتا ہوں، پھر اس اندیشہ سے کہ صدقہ وزکوۃ کی ہو، اسے ڈال دیتا ہوں۔"(۲)

ابوداود شریف میں روایت ہے:

"ایک خاتون نے رسول اللہ ﷺ کو کھانے کی دعوت دی، چنانچہ آپ ﷺ تشریف لے گئے۔ کھانا لگا دیا گیا، آپ نے لقمہ ہاتھ میں لیا، دوسرے لوگوں نے بھی ہاتھ میں لیا اور کھانے لگے، مگر انھوں نے آپ کو دیکھا کہ ایک ہی لقمہ منھ میں لیے چبا رہے ہیں، پھر فرمایا: مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی بکری کا گوشت ہے جسے مالک کی اجازت کے بغیر لیا گیا ہے، اس خاتون نے عرض کیا: اللہ کے رسول میں نے غلام کو بکری خریدنے کے لیے بھیجا تھا مگر وہاں بکری ملی نہیں پھر میں نے اپنے پڑوسی کے پاس جنھوں نے بکری خریدی تھی۔ بھیجا کہ بکری کی قیمت لے کر بکری میرے پاس بھیجدیں، (مجھے دے دیں)، مگر وہ گھر میں نہ تھے، پھر میں نے ان کی بیوی کے پاس کہلا بھیجا تو اس نے یہ بکری میرے پاس بھجوادی۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا یہ گوشت قیدیوں کو کھلادو۔"(۳)

ورع واحتیاط کی وضاحت کی بابت یہ آپ ﷺ کے عمل کی چند مثالیں ہیں۔

اگر ورع نہ رہے:

جب تک یہ بات لوگوں کی زندگیوں میں پائی جائے گی، لوگ خیر وعافیت سے رہیں گے، اسی پر بچہ جوان ہوگا اور جوان بوڑھا۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

"ابوہریرہ ورع والے بنو تو تم لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار ہو جاؤگے۔"(۴)

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۲۴۳۱م: ۱۰۷۱

(۲) متفق علیہ: رقم: ۲۴۳۲، م: ۱۰۷۰

(۳) ابوداؤد: رقم: ۳۳۳۲

(۴) ابن ماجہ: ۴۲۱۷

لیکن اگر یہ خوبی لوگوں کی زندگی میں ختم ہو جائے اور اسی کے ساتھ حلال و حرام لفظ کا استعمال بھی ختم ہو جائے تو لوگ اس زمانے میں پہنچ جائیں گے جس کی بابت حضور اکرم ﷺ نے پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"لوگوں پر ایسا زمانہ ضرور آئے گا جب انسان کو یہ پرواہ نہ رہے گی کہ اس نے مال کس طرح سے حاصل کیا ہے؛ حلال ذریعے سے یا حرام طریقے سے۔"(۱)

جب لوگ ایسے زمانے میں پہنچ جائیں تو پھر دعا کیونکر قبول ہو سکے گی؟

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لوگو! اللہ تعالیٰ پاکیزہ ہیں اور وہ پاکیزہ چیز ہی قبول کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بھی اسی چیز کا حکم دیا جس کا حضرات انبیاء کو حکم دیا ہے؛ چنانچہ فرمایا:

«يَآ أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صٰلِحًا إِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ»(۲) "اے رسولو! کھاؤ پاکیزہ رزق میں سے اور نیک عمل کرو، بے شک مجھے علم ہے جو تم کرتے ہو۔"

نیز فرمایا:

«يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ»(۳) "اے ایمان والو! کھاؤ اس پاکیزہ رزق میں سے جو ہم نے تمھیں دیا ہے۔"

پھر آپ نے ایک شخص کا تذکرہ فرمایا جو لمبا سفر کرتا ہے، اس کے بال پراگندہ اور حالت غبار آلودہ ہو وہ آسمان کی طرف اپنا ہاتھ اٹھا کر دعا کرے، اے میرے رب! اے میرے رب! جبکہ اس کا کھانا حرام ہو، اس کا پینا حرام ہو، اس کا لباس حرام ہو، اس کی غذا حرام ہو تو اس کی دعاء کیونکر قبول ہو سکے گی۔(۴)

---

(۱) (بخاری: ۲۰۸۳)

(۲) سورۂ مومنون: آیت: ۵۱

(۳) سورۂ بقرہ: آیت: ۱۷۲

(۴) مسلم شریف 1015

اٹھارہویں فصل

اللہ تعالیٰ کا خوف

خوف کی حقیقت اور اس کے اسباب:

مستقبل میں کسی تکلیف دہ چیز کے پیش آنے کے خطرہ کے سبب دل کے رنج والم کا نام خوف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا خوف چند وجوہ سے ہوتا ہے:

(۱) اللہ کی ذات وصفات کی معرفت کے سبب ہوتا ہے۔

(۲) بندہ کے معصیت وجنایت کی کثرت کے سبب ہوتا ہے۔

(۳) کبھی ان سب کے باعث ہوتا ہے۔

کسی انسان کو اپنے عیوب کی جتنی معرفت ہوگی اور جتنی اسے اللہ کی عظمت وجلال کی معرفت ہوگی، اتنا ہی اس میں اللہ کا خوف زیادہ اور طاقت ور ہوگا، معلوم ہوا کہ اپنے رب کا سب سے زیادہ خوف اس شخص کو ہوگا جس کو اپنے نفس اور اپنے رب کی معرفت سب سے زیادہ ہوگی۔ اسی وجہ سے علماء لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

«إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ»[۱]. ”اللہ سے اس کے بندوں میں سے جاننے والے ہی ڈرتے ہیں“۔[۲]

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے زیادہ اللہ کا خوف تھا:

جب خوفِ خدا کا باعث اور محرک اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ ڈرنے والے ہوئے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) سورۂ فاطر: آیت ۲۸

(۲) المهذب من احیاء العلوم الدین: ۱۰/۲

''ان لوگوں کو کیا ہو گیا جو اس چیز سے اجتناب کرتے ہیں جس کو میں کرتا ہوں، اللہ کی قسم! مجھے اللہ کی ان سب سے زیادہ معرفت بھی ہے اور میں ان سب سے زیادہ ڈرنے والا بھی ہوں''۔ (۱)

معلوم ہوا کہ شدتِ خوف و خشیت علم و معرفت الٰہی سے جڑی ہوئی ہے۔

چونکہ دوسرے انسانوں کا علم حضور اکرم ﷺ کے علم سے کم رہا ہے اور رہے گا؛ اس لیے آپ ﷺ نے انھیں بتایا کہ اگر ان کا علم اتنا بڑھ جائے اور وہ آپ کے علم تک پہنچ جائیں تو ان کی زندگی کے اطوار ہی بدل جائیں اور خوشی کی ان کے دل و دماغ تک رسائی ہی نہ رہ جائے۔

چنانچہ فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے! اگر تمھیں اس چیز کا علم ہو جاتا جس کا علم مجھے ہے تو تم روتے بہت اور ہنستے کم''۔ (۲)

جن چیزوں کا ہمیں علم نہیں، ان میں سے بعض چیزوں کی جنھیں آپ ﷺ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہمیں خبر دی اور آپ سچے خبر دینے والے ہیں۔ فرمایا:

''میں ان چیزوں کو دیکھتا ہوں جنھیں تم نہیں دیکھتے اور وہ باتیں سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے، آسمان بوجھ تلے دب کر چرچرا پڑا اور اس کے لیے چرچرانا مناسب تھا، آسمان میں چار انگل کے بقدر بھی کوئی جگہ نہیں ہے مگر ایک فرشتہ وہاں سجدے میں اپنی پیشانی رکھے ہوئے ہے، اگر تمھیں ان چیزوں کا علم ہو جاتا جن کو میں جانتا ہوں تو تم لوگ روتے بہت اور ہنستے کم۔ بستر پر عورتوں سے لطف اندوز نہ ہوتے اور راستوں میں نکل پڑتے اور اللہ کی پناہ طلب کرتے''۔ (۳)

اس حدیث کے راوی حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے تھے:

''میری خواہش ہے کہ کاش میں کوئی درخت ہوتا جسے جڑ سے کاٹ دیا جاتا۔'' (یعنی غیر ذی روح ہوتے، تو حشر کے سوال و جواب سے بچ جاتے)

---

(۱) بخاری: رقم: ۱۶۰۱

(۲) بخاری: رقم: ۶۶۳۷

(۳) ترمذی: رقم: ۲۳۱۲، ابن ماجہ: ۴۱۹۰

یہ بات وہ اس لیے کہتے تھے کہ ان کے دل میں ہمہ وقت اللہ کی خشیت کا غلبہ رہتا تھا۔

ایک حدیث میں ہے:

''تین افراد نبی پاک ﷺ کی ازواج مطہرات کے گھر پر آئے تاکہ آپ کی عبادت کی بابت معلومات کریں۔ جب انھیں بتایا گیا تو جیسے ان کو (آپ کی عبادت کی مقدار) کم لگی، اس لیے کہنے لگے: کہاں ہم اور کہاں رسول اللہ ﷺ، کہ آپ کے تو اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے۔ گویا وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کی مغفرت کے اعلان کے سبب آپ کو زیادہ عبادت کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی، اور خود اپنی بابت سمجھا کہ انھیں تو بہت زیادہ عبادت گزار ہونا چاہئے۔

جب آپ ﷺ کو ان تینوں افراد کی بات بتائی گئی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ: تم لوگوں نے ہی ایسا ایسا کہا تھا؟ سنو! اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا بھی ہوں اور سب سے زیادہ متقی بھی، اس کے باوجود میں روزہ بھی رکھتا ہوں؛ نہیں بھی رکھتا ہوں، نماز نوافل بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اسی طرح عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، لہذا جو کوئی میرے طریقے سے اعراض کرے اس کا مجھ سے تعلق نہیں''۔ (۱)

آپ ﷺ کے گناہوں کی مغفرت کر دیے جانے کے باعث آپ کے خوف و خشیت میں۔ جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی معرفت تھی۔ کمی نہ ہوئی۔ بلکہ اس کی وجہ سے آپ اور زیادہ شکر گزار اور زیادہ عبادت گزار بن گئے۔

معلوم ہوا کہ کوئی بھی شخص نہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ عبادت گزار ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو آپ سے زیادہ اللہ کا خوف ہو سکتا ہے۔ ہماری انتہائے عبادت و خشیت آپ ﷺ کی اتباع میں ہے۔

آپ ﷺ کے خوف خدا کے چند مظاہر:

اللہ تعالیٰ کی خشیت آپ ﷺ کے قلب مبارک میں ہمیشہ موجود رہتی، کبھی جدا نہ ہوتی تھی، بایں ہمہ کائنات میں پیش آمدہ امور آپ کی ذات پر اثر انداز ہوتے، جس کا اثر آپ کے چہرۂ انور پر بھی نمایاں ہوتا اور آپ ﷺ ذکر و عبادت میں بہ عجلت مشغول ہو جاتے۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۵۰۶۳، م: ۱۴۰۱

حضرت انسؓ سے روایت ہے:

”جب تیز ہوا چلتی تو اس کا اثر آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر دیکھا جا سکتا تھا“۔[۱]

اسی طرح حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

”نبی پاک ﷺ جب آسمان پر بدلی دیکھتے تو گھر کے اندر آتے، کبھی باہر جاتے، تو آپ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا، جب بارش ہو جاتی تب یہ کیفیت دور ہوتی۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں: میں نے اس کی بابت آپ سے معلوم کیا تو فرمایا: مجھے نہیں معلوم، شاید یہ وہی ہو جس کی بابت ایک قوم نے کہا تھا:

﴿فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضاً مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ﴾[۲] ”پھر جب انھوں نے اسے دیکھا کہ وہ ایک ابر ہے جو ان کی وادیوں کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے“۔[۳]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے: میں نے رسول اللہ ﷺ کو زور سے ہنستے ہوئے کبھی نہ دیکھا کہ آپ ﷺ کے حلق کا کوّا نظر آجائے۔ آپ ﷺ تو صرف مسکراتے تھے۔ کہتی ہیں: جب آپ بدلی دیکھتے یا ہوا تو اس کا اثر آپ کے چہرہ پر محسوس ہو جاتا۔ کہتی ہیں: میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! دوسرے لوگ بدلی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ اب بارش ہو گی، لیکن آپ کو دیکھتی ہوں کہ بدلی دیکھ کر آپ کے چہرے پر کراہیت کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں؟ فرمایا: عائشہ! مجھے یہ اطمینان نہیں رہتا کہ اس میں کوئی عذاب ہو، کیوں کہ ایک قوم کو ہوا ہی کا عذاب دیا گیا، جبکہ ایک قوم نے عذاب دیکھا تو یوں کہنے لگے: یہ تو بدلی ہے جو ہمارے لیے پانی برسائے گی“۔[۴]

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے:

”سورج گرہن لگا تو نبی اکرم ﷺ گھبرا کر اٹھے، مبادا قیامت آجائے، مسجد میں تشریف لے گئے اور اتنے طویل قیام، رکوع اور سجدے کے ساتھ نماز پڑھی کہ میں نے ایسا کبھی نہ دیکھا تھا، اس کے بعد آپ نے فرمایا: یہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جنھیں وہ بھیجتا ہے، یہ کسی کی موت وحیات کی

---

(۱) بخاری: رقم: ۱۰۳۴

(۲) سورۂ احقاف: آیت: ۲۴

(۳) متفق علیہ: رقم: ۳۲۰۶ م: ۸۹۹۔

(۴) متفق علیہ: رقم ۶۰۹۲: ۸۹۹ واللفظ للمسلم

وجہ سے نہیں ہوتیں، بلکہ ان سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتے ہیں، جب تم ایسی کوئی چیز دیکھو تو خوفِ خدا کی وجہ سے بعجلت اس کے ذکر، استغفار اور دعاء میں مشغول ہو جاؤ"۔(۱)

حضر اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

"نبی پاک ﷺ کے عہد میں سورج گرہن ہوا تو گھبراہٹ میں آپ نے اپنا کرتا لینے کے بجائے اپنی اہلیہ کی قمیص اٹھالی، پھر بعد میں آپ کو آپ کی ردائے مبارک دی گئی"۔(۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے مواقع پر آپ ﷺ کو کس قدر شدید خوف دامن گیر ہوتا اور ذکر واستغفار اور دعاء کتنی اہتمام سے فرماتے تھے کہ اپنی ردائے مبارک لینے کے بجائے جلدی میں ازواج کی قمیص اٹھالی اور اس کا احساس نہ رہا۔

خوفِ خدا میں آپ ﷺ کی گریہ وزاری:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ابن مسعود مجھے قرآن سناؤ، میں نے عرض کیا: میں آپ کو سناؤں! جبکہ آپ کے اوپر ہی قرآن نازل ہوا؟ فرمایا: ہاں! مجھے دوسرے سے پڑھوا کر سننا اچھا لگتا ہے۔ چنانچہ میں نے سورۂ نساء پڑھنی شروع کی، جب اس آیت پر پہنچا:

﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾(۳).

تو اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ کو ان سب پر گواہ بنائیں گے۔

تو مجھ سے فرمایا: بس کرو، بس کرو۔ جب میں نے آپ کو دیکھا تو آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے"۔(۴)

حضرت عبداللہ بن شخیرؓ کا بیان ہے:

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۱۰۵۹، م: ۹۱۲

(۲) مسلم: رقم: ۹۰۶

(۳) سورۂ نساء: آیت: ۴۱

(۴) متفق علیہ: رقم: ۵۰۵۵، م: ۸۰۰

''میں نبی پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے اندر سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے ہانڈی میں کھدّا لگنے کی ہوتی ہے، یعنی رونے کے سبب''۔[1]

اور کیونکر ایسا نہ ہو جبکہ خود آپ ﷺ نے فرمایا:

''دو طرح کی آنکھوں کو جہنم کی آگ نہ چھوئے گی؛ ایک وہ آنکھ جو خوفِ خدا سے روئی ہو اور دوسری وہ جو راہِ خدا میں پہرہ داری و نگرانی کے لیے جاگی ہو''۔[2]

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۹۰۴، نسائی: رقم: ۱۲۱۳

(۲) ترمذی: رقم: ۱۶۳۹

انیسویں فصل

امیدِ ثواب اور عمل میں میانہ روی اختیار کرنا

خوف کی حدود:

خوف کی فضیلت قرآن کریم کی آیات سے بھی ثابت ہے اور رسول اکرم ﷺ نے اپنے عمل سے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے ہمیں ڈرنے کا حکم دیا اور اسے ضروری قرار دیا اور اسے ایمان کی ایک شرط بتایا ہے:

﴿وَخَافُوْنِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ﴾[1]. "اور مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔"

نیز اہل ایمان کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا﴾[2]. "وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں، ڈر اور امید سے۔"

نیز فرمایا:

﴿جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ﴾[3].

"ان کا بدلہ ان کے رب کے یہاں دائمی باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور یہ اللہ سے راضی ہوئے، یہ اس شخص کے لیے ہے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہوگا۔"

نیز ارشاد ہے:

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ﴾[4]. "اور اس کے لیے جو ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے دو باغات ہیں۔"

---

(۱) سورۂ آل عمران ۱۷۵

(۲) سورۂ سجدہ: آیت: ۱۶

(۳) سورۂ بیّنہ: آیت: ۸

(۴) سورۂ رحمٰن: ۴۶

معلوم ہوا کہ خوفِ خدا اللہ تعالیٰ پر ایمان سے پھوٹنے والی ایک صفت ہے، لہذا یہ مؤمن کے قلب میں پیوست چیز ہے۔ مگر یہ خوف اس درجہ تک نہ پہنچ جائے کہ بندے کی طبیعت میں اللہ کی رحمت سے مایوسی اور قنوطیت پیدا کر دے۔ یا اسے اتنی زیادہ عبادت پر مہمیز کرے جو خود اس کے لیے مضر ہو، اس سے اسلام نے منع بھی کیا ہے۔

رجاء اور امید ثواب کی فضیلت:

ایک مؤمن کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو؛ کیونکہ یہ ناامیدی حرام اور ممنوع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

«قُلۡ يٰعِبَادِىَ الَّذِيۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِيۡعًا‌ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ »[1]

"آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو، بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دے گا، بے شک وہی بہت زیادہ مغفرت کرنے والا بڑا مہربان ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنے کی ترغیب دی ہے۔

چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وفات سے تین روز پہلے یہ فرماتے ہوئے سنا:

"تم میں سے کوئی ہرگز نہ مرے مگر وہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھتا ہو"۔[2]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں اپنے بندہ کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں"۔[3]

عمل میں اعتدال:

پس بندہ خوفِ خدا کی وجہ سے عبادت کے ذریعہ اپنے نفس کو نقصان نہ پہنچائے، اس لیے

---

(۱) سورۂ زمر: آیت: ۵۳

(۲) مسلم: رقم: ۲۸۷۷

(۳) بخاری: رقم: ۷۴۰۵، مسلم: رقم: ۲۶۷۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا؛ چنانچہ سابقہ فصل میں ان لوگوں کا واقعہ ہم پڑھ چکے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کے بارے میں پوچھنے کے لیے آئے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے کسی کو اس کا عمل ہر گز نجات نہیں دے سکے گا، صحابہ نے عرض کیا: اور آپ کو بھی نہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ؟ فرمایا: اور مجھے بھی نہیں؛ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے گا، معتدل رہو (میانہ روی اختیار کرو) اور اس سے قریب قریب رہو (یعنی ہر حال میں اعتدال کے قریب ہونے، رہنے کی کوشش کرو) اور صبح و شام اور رات کے کچھ حصہ میں چلو (یعنی ہر وقت ہی نوافل و عبادت میں مصروف نہ ہو، ورنہ اکتا جاؤ گے)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس آئے، اور ان کے پاس ایک عورت (بیٹھی) تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ کون ہے؟ حضرت عائشہؓ نے کہا: فلاں عورت ہے، اپنی کثرتِ نماز کا ذکر کر رہی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مَہْ" (اونہ، اظہار ناگواری کے لیے) تم اتنی عبادت وریاضت کرو جتنی بسہولت سہہ سکو، بخدا اللہ تعالیٰ نہیں اکتائیں گے (تمھیں ثواب دینے سے) یہاں تک کہ (کثرتِ عبادت کی وجہ سے) تم ہی اکتا جاؤ"۔ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں آئے تو دیکھا کہ دو ستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: یہ رسّی کیسی ہے؟ لوگوں نے بتایا: زینب کی رسّی ہے، جب ان کو سستی آجاتی ہے تو اس سے لٹک جاتی ہیں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں، رسّی کھول دو، تم میں سے ہر ایک نماز پڑھے جب تک نشاط رہے، جب سستی آجائے تو بیٹھ جائے"۔ (۲)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دائمی عمل کی ترغیب دیتے تھے خواہ وہ تھوڑا ہی ہو، اس ذیل میں بہت سی احادیث وارد ہیں، ان میں ایک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

---

(۱) بخاری: رقم: ۴۳، مسلم: رقم: ۷۸۵

(۲) بخاری: رقم: ۱۱۵۰، مسلم: رقم: ۷۸۴

’’اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب عمل وہ ہے جو ہمیشگی کے ساتھ ہو، چاہے وہ تھوڑا ہو‘‘۔ (۱)

اس انداز اعتدال سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پہلو (غلو) کا علاج فرمایا کرتے تھے۔

رجاء اور امید کی حد:

مناسب یہ ہے کہ بندۂ مسلم کے نفس میں خوف اور رجاء دونوں دو متوازی لکیروں کی مانند رہیں ، بالکل پہلو بہ پہلو، ان میں سے کوئی ایک دوسری پر غلبہ حاصل نہ کرے۔ قرآن کریم کی آیات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

« یَدۡعُوۡنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا » (۲).

’’اور لوگ ہمیں پکارتے ہیں رغبت سے بھی اور خوف سے بھی۔‘‘

نیز ارشاد ہے:

« یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا » (۳).

’’یہ لوگ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف میں اور لالچ میں۔‘‘

رجاء اور امید ہی یاس وناامیدی میں گرفتار ہونے سے بچانے والا قوی تر علاج ہے، مایوسی اور ناامیدی کو اللہ تعالیٰ نے کافروں اور گمراہوں کی پہچان قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

« اِنَّهٗ لَا یَایۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡكٰفِرُوۡنَ » (۴).

’’بلاشبہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں گے مگر قوم کافر۔‘‘

نیز ارشاد فرمایا:

« وَمَنۡ یَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ » (۵).

’’اور اپنے رب کی رحمت سے ناامید نہیں مگر گمراہ لوگ۔‘‘

---

(۱) بخاری: رقم: ۵۸۶۱، مسلم: ۷۸۲-۷۸۳

(۲) سورۂ انبیاء: آیت: ۹۰

(۳) سورۂ سجدہ: آیت: ۱۶

(۴) سورۂ یوسف: ۸۷

(۵) سورۂ حجر: آیت: ۵۶

جب رجاء اور امید کا یہ مقام و مرتبہ ہے تو پھر اس کے خد و خال کو کس طرح واضح کیا جائے؟ اس ذیل میں امام غزالیؒ نے لکھا ہے:

''رجاء'' نام ہے اس چیز کی توقع میں دل کے اطمینان کا جو انسان کے نزدیک محبوب ہو، تاہم اس چیز کے حصول کے لیے کسی نہ کسی سبب کا پایا جانا ضروری ہے، اگر انسان کی توقع محبوب چیز کے حصول کے لیے اکثر اسباب کے اختیار کرنے کی بناپر ہو تو اس پر رجاء کا اطلاق صحیح ہے، اور اگر اسباب کے فقدان کے ساتھ ہو تو اس پر رجاء سے زیادہ غرور اور حماقت کا اطلاق مناسب ہے۔ اور اگر ان اسباب کا نہ وجود معلوم ہو اور نہ عدم تو اس انتظار اور توقع پر تمنی زیادہ صادق آئے گی؛ کیونکہ یہ امید بغیر سبب ہے''۔(۱)

مثلاً اگر کوئی آدمی زرخیز زمین تلاش کر کے اس میں عمدہ بیج ڈالے جو نہ سڑا ہوا ہو اور نہ کرم خوردہ، پھر بیج کو جس جس چیز کی ضرورت ہو اسے فراہم کرے، مثلا وقت پر پانی دینا، پھر اس زمین سے کانٹوں، مضر گھاسوں اور ہر اس چیز کو صاف کردے جو بیج کی روئیدگی میں مانع ہو یا جو اسے خراب کرنے والی ہو، اس کے بعد وہ کھیتی تیار ہو جانے تک آسمانی بجلی اور دیگر آفات کو دفع کرنے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی امید رکھے تو اسے ''رجاء'' کہا جائے گا۔

اور اگر وہ کسی سخت، شوریا اونچی زمین میں بیج بکھیرے جس میں پانی جاتا ہی نہ ہو، پھر اس کی مطلق دیکھ بھال نہ کرے، اس کے باوجود فصل کاٹنے کی امید رکھے تو اس امید کو حماقت اور غرور کہا جائے گا نہ کہ رجاء اور امید۔

اور بیج تو بوئے اچھی زمین میں؛ لیکن پانی کا انتظام نہ ہو، صرف بارش کا انتظار کرے، وہ بھی ایسی جگہ جہاں بارش زیادہ نہ ہوتی ہو تو اس کی امید کو تمنی کہا جائے گا نہ کہ رجاء۔

اس لیے مناسب ہے کہ مغفرت کے تعلق سے بندے کی امید کو کاشت کاری کی مثال پر قیاس کیا جائے''۔(۲)

---

(۱) المہذب من احیاء علوم الدین: ۳۰۴/۲

(2) المہذب من احیاء علوم الدین: ۳۰۵/۲

بیسویں فصل

اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت

عبودیت صرف اللہ کی؛ ظاہر میں بھی، باطن میں بھی:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جس نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے ہی دشمنی کی، اللہ کے لیے ہی دیا اور اللہ ہی کے لیے منع کیا تو اس نے ایمان مکمل کر لیا"۔ (۱)

ساری زندگی حضور اکرم ﷺ کا یہی طرز عمل رہا، اسی کو آپ ﷺ نے ان مختصر الفاظ میں ہمارے لیے اختصار کے ساتھ بیان فرمایا، یہ الفاظ در حقیقت بلاغت نبوی کے سرچشمہ سے نکلے ہوئے ہیں۔

یہ تھوڑے سے الفاظ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ آپ ﷺ ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی کامل و مکمل پابندی کرتے تھے۔

چنانچہ ظاہر میں آپ ﷺ کے جملہ تصرفات خواہ ایجابی و مثبت ہوں یا سلبی و منفی، ان کا تعلق عطا کرنے سے ہو یا منع کرنے سے، اپنے ذاتی معاملات ہو یا عوام الناس کے امور؛ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے تابع ہوتے تھے۔

جب آپ عطا کرتے تو محض اللہ کے لیے اور اس کی رضاجوئی کی خاطر عطا فرماتے۔

جب منع کرتے تو بھی صرف اللہ کی خاطر اور اس کی رضاجوئی کی غرض سے۔

نہ عطا کرنے میں آپ ﷺ کے نفس کا کوئی حصہ ہوتا اور نہ ہی منع کرنے میں، نیز اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق عمل کرنے کے سوا، دینے یا منع کرنے کے پیچھے کوئی دوسرا محرک نہ ہوتا۔

باطن میں آپ کے تمام تر جذبات: محبت، نفرت، رضامندی اور ناراضگی اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا کے مطابق ہوتے تھے، نہ تو آپ کی محبت کا باعث نفسانی خواہشات ہوتی اور نہ ہی نفرت کا محرک

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۴۶۸۱، ترمذی: ۲۵۲۱

اپنی ذات کے لیے انتقام لینے کی رغبت ہوتی تھی، آپ نے اپنے لیے کبھی انتقام لیا ہی نہیں؛ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کی پامالی ہوتی، تب آپ اللہ کی خاطر انتقام لیتے تھے۔(۱)

یہ تھے اللہ کے رسول ﷺ جو نہایت کامل الایمان تھے، جیسا کہ حدیث شریف میں صراحت کی گئی ہے۔

جب کوئی بندۂ مسلم اس نبوی طریقے کے سایہ میں چلتا ہے تو اس کا ظاہر و باطن، اس کی حرکات و سکنات اور جذبات و خواہشات اللہ کی محبت اور مرضی کے تابع ہو جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے محبت کی یہی آخری منزل ہے؛ اور تب بندہ اس حدیث قدسی کا مصداق بن کر زندگی گزارتا ہے جس میں وارد ہے:

"میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔"(۲)

اس مقام پر بندے کے تمام حواس محبت و عبودیت کے اعتبار سے اللہ کی اطاعت و فرماں برداری میں لگ جاتے ہیں۔

انسان صرف اللہ کے لیے محبت کرے:

جب یہ معنی مسلمان کی طبیعت میں رچ بس جاتا ہے تو وہ ایمان کی حلاوت وذائقہ سے آشنا ہو سکتا ہے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"تین صفتیں جس شخص میں ہوں اسے ایمان کی حلاوت ملے گی اور .... یہ کہ وہ دوسرے انسان سے صرف اللہ کے لیے محبت کرے۔"(۳)

---

(۱) یہ حضرت عائشہؓ کی روایت کا ایک حصہ ہے: ....

(۲) بخاری: ۶۵۰۲۔ اس کی مکمل عبارت یہ ہے: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے کسی دوست سے دشمنی کرے میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں، میرا تقرب میرے بندے نے کسی بھی چیز سے حاصل نہیں کیا، جو میرے نزدیک زیادہ محبوب ہو اس سے جو میں نے فرض کیا ہے، بندہ نوافل سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان...... اور اس کا پیر بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے...... اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور بالضرور اسے دوں گا اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے ہر حال میں پناہ دوں گا، مجھے کسی چیز کی بابت تردد نہیں ہوتا جسے میں کرنے والا ہوتا ہوں جتنا تردد مجھے مؤمن کی جان کی بابت ہوتا ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور مجھے اس کی تکلیف ناگوار ہے۔

(۳) الشیخان: خ: ۱۶، م: ۴۳

اگر انسانوں کے باہمی تعلقات اس بلند معیار پر استوار ہوں گے تو وہ دنیاوی زندگی کی سعادت سے بھی لطف اندوز ہوں گے، جبکہ اللہ تعالیٰ انھیں آخرت میں، اعمال میں ان کے اخلاص کے بقدر اجر وثواب بھی مرحمت فرمائیں گے، کیونکہ ان کے جذبات اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع رہے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"کہاں ہیں میرے جلال کی خاطر باہم محبت کرنے والے؟ میں آج انھیں اپنے سایہ میں جگہ دوں گا، آج کے دن میرے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہیں۔"(۱)

حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اللہ کے بندوں میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید، مگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے مرتبہ کے باعث انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے، صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہمیں بتائیے وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کی رحمت کی خاطر باہم محبت کی، نہ وہ ذی رحم رشتہ دار تھے اور نہ ہی مال و دولت حاصل کر رہے تھے، اللہ کی قسم! ان کے چہرے سراپا نور ہوں گے، وہ نور پر جلوہ افروز ہوں گے، جب دوسرے لوگوں کو خوف دامن گیر ہوگا، اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

«أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ»(۲).

"سن لو کہ اللہ کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنج میں مبتلا ہوں گے"۔

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے میرے جلال کی خاطر باہم محبت کرنے والوں کے لیے نور کے منبر ہوں گے، ان پر انبیاء اور شہداء رشک کریں گے۔"(۳)

یہ ان بندوں کا درجہ ہے جن کے جذبات واحساسات اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کے تابع

---

(۱) مسلم: ۶۵۶۶

(۲) ....

(۳) ابوداؤد: ۳۵۲۷

رہے، اسی اطاعت سے وہ صادر ہوئے اور اسی کی وجہ سے سر گرم ہوئے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان جب کسی انسان سے اللہ کی خاطر محبت کرتا ہے تو یہ اس محبوب انسان کے اللہ کی اطاعت اور اللہ سے محبت کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور یہ محبوب انسان جب اللہ تعالیٰ سے منحرف ہو جاتا ہے تو بندہ مسلم اسے اللہ کی خاطر چھوڑ دیتا ہے، اور جب اس کا انحراف ورو گردانی زیادہ ہو جاتی ہے تو بندہ مسلم اس سے انتہائی بغض و نفرت کرنے لگتا ہے، اس کے جذبات واحساسات اللہ کی اطاعت اور رضا کی دقیق ترازو کے مطابق حرکت کرتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ بعض اوقات کسی شخص کو نہ دیکھے ہوئے ہوتا ہے اور نہ ہی اس کو جانتا پہچانتا ہے، اس کے باوجود اس سے صرف اس وجہ سے محبت کرتا ہے کہ وہ اللہ کا مطیع اور اس کے احکام کا پابند ہے، تاریخی کتابوں میں کسی شخصیت کے بارے میں پڑھتا ہے کہ وہ اللہ سے بڑی محبت کرتے تھے، اور اس کے احکام پر کاربند تھے تو اس وجہ سے ان سے محبت کرنے لگتا ہے، جبکہ اس شخصیت سے اس کا کوئی مادی مفاد وابستہ نہیں ہوتا، اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو کفار سے محبت نہیں

جس طرح ایک مسلمان کے اندر اللہ کی خاطر محبت کرنے کا جذبہ ہوتا ہے، اسی طرح اللہ کی خاطر ہی نفرت اور کراہیت کا بھی احساس ہوتا ہے، یہ بھی کسی دنیوی یا ذاتی محرک کے سبب نہیں ہوتا۔

ایک مسلمان کا احساس وجذبہ ایسا ہی ہوتا ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے کفار کے سلسلہ میں اس بات کو بڑی تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ﴾[1]. "بے شک اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔"

اس کے بعد کسی صاحب ایمان کے اندر کافروں اور اللہ ورسول کے مخالفین کے تئیں محبت ومودت کا کوئی جذبہ نہیں ہونا چاہیئے؛ کیونکہ ایسا جذبہ مؤمن کو پکڑ کر اہل ایمان سے دور دوسرے کنارے پر کھڑا کر دیتا ہے، بلکہ اس سے سرے سے ہی ایمان کی نفی کر دیتا ہے۔

---

(۱) سورۂ روم: آیت: ۴۵

اس معاملہ کی سنگینی کے پیش نظر بہت ساری آیات اس کی بابت بڑی واضح اور نا قابل تاویل وارد ہوئی ہیں: چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

«لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ»(۱).

”تم نہیں پاؤگے ایسے لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، محبت کریں اس انسان سے جو اللہ اور اس کے رسول کا مخالف ہو خواہ وہ ان کے باپ دادا ہوں، یا ان کے بیٹے پوتے ہوں یا بھائی یا پھر خاندان والے۔“

آیت بالا میں ”لا تجد“ ”تم نہیں پاؤگے“ پر گہری نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس میں اس قسم کے لوگوں کے وجود اور پائے جانے کی ہی نفی کی گئی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے درمیان ایسا کوئی شخص پایا جائے جس میں یہ صفت ہو تو وہ مسلمانوں میں سے ہو ہی نہیں سکتا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان میں اس صفت کی ہی نفی کر دی ہے۔

سید قطب شہیدؒ نے آیت بالا کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اللہ تعالیٰ نے کسی بھی انسان کے پیٹ میں دو دل نہیں بنائے ہیں اور نہ کوئی انسان ایک دل میں دو محبتیں جمع کر سکتا ہے، اللہ اور اس کے رسول سے محبت، اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت، یا تو ایمان رہے یا عدم ایمان، لیکن دونوں یکجا رہیں ممکن نہیں۔“(۲).

جب کافروں اور دشمنانِ خدا کے تئیں مؤمن کے دل میں محبت و مودت کا پایا جانا ہی مجموعی طور پر متصور نہیں پھر یہ کہ ایک مؤمن دشمنانِ خدا کو جگری دوست اور اپنا مددگار بنائے بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا، اس مفہوم پر مشتمل بہت سی آیت وارد ہوئی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد:

«يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ»(۳).

”اے ایمان والو! نہ بناؤ یہود و نصاریٰ کو جگری دوست، یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے تو وہ انھیں میں سے ہے، بے شک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

---

(۱) سورۂ مجادلہ: آیت: ۲۲

(۲) فی ظلال القرآن: ۳۵۱۴/۶

(۳) سورۂ مائدہ: آیت: ۵۱

دیکھیں تو " وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ " سے بڑھ کر کوئی وضاحت ممکن نہیں کہ ایسے مؤمن کو یہود و نصاریٰ میں ہی شمار کیا گیا ہے۔ اس طرح ایک مسلمان کے جذبات خود بخود اللہ تعالیٰ کے احکام کے تحت منضبط ہو جاتے ہیں"۔(۱)

تشبُّہ کفار سے:

جب کوئی شخص کسی دوسرے کی تقلید کرتا یا اس کی مشابہت اختیار کرتا ہے تو اس کا سبب اس کے تعلق سے محبت و مودت ہوتی ہے، یا اس کو پسند کرنے کا احساس۔

گذشتہ سطور کی بنا پر جن میں یہ وضاحت ہے کہ ایک مسلمان کے مثبت جذبات ان اہل ایمان کے تعلق سے ہونے چاہئیں جو اللہ ہی کی طاعت میں لگے ہوئے ہوں، اس تناظر میں کسی کافر کی تقلید یا اس سے تشبہ کا مطلب ہے اس کافر کو وہ درجہ دینا جس کا وہ مستحق نہیں ہے، کہ اسے نمونہ بنا رہا ہے اور اس کے نقش قدم پر چل رہا ہے، ظاہر ہے اس میں گذشتہ طے کردہ اصول وضابطہ سے خروج اور بغاوت ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں درج ذیل حدیث بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ ان میں سے ہی ہوگا۔"(۲)

کفار کی شکل وصورت اور لباس وپوشاک وغیرہ میں مشابہت اختیار کرنے سے ممانعت کی بابت بہ کثرت احادیث وارد ہوئی ہیں:

چنانچہ ایک روز نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے جسم پر دو زرد رنگ کے کپڑے دیکھے تو فرمایا:

"یہ کفار کے کپڑوں میں سے ہیں، اس لیے ان کو نہ پہنو۔"(۳)

---

(۱) یہ اس بات کے لیے مانع نہیں کہ مسلمان غیر مسلم کے ساتھ خرید وفروخت اور دوسرے مادی معاملات کرے؛ کیونکہ یہ سب کچھ محبت و مودت کے جذبہ کے بغیر ممکن ہے۔

(۲) ابوداؤد: ۴۰۳۱

(۳) مسلم: ۲۰۷۷

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عتبہ بن فرقد کے نام خط لکھا جو اس وقت آذر بائجان میں تھے:

""تم لوگ تعیش، مشرکین کی پوشاک اور ریشم کے کپڑوں سے دور رہو۔""(۱)

کفار کی مخالفت میں دیگر احادیث بھی وارد ہوئی ہیں، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

""یہود و نصاریٰ بالوں میں خضاب نہیں کرتے تو تم ان کی مخالفت کرو۔""(۲)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

""مشرکین کی مخالفت کرو، ڈاڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں ترشواؤ۔""(۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

""مونچھیں ترشواؤ، ڈاڑھیاں چھوڑ دو اور مجوس کی مخالفت کرو۔""(۴)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبادت تک میں یہود و نصاریٰ کی مخالفت اختیار کی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوم عاشورہ کا روزہ رکھا اور مسلمانوں کو اس دن کا روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا:

""صحابہ نے عرض کیا اللہ کے رسول! اس دن کی تعظیم تو یہود و نصاریٰ کرتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اب جب آئندہ سال ہوگا تو ان شاء اللہ ہم نویں تاریخ کا بھی روزہ رکھیں گے، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اگلا سال آنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی۔""(۵)

اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاہا کہ ہم صرف یوم عاشورہ کا روزہ نہ رکھیں تاکہ ہمارا یہ عمل یہود و نصاریٰ کے عمل کے مشابہ نہ ہو جائے اور نویں تاریخ کو بھی روزہ رکھنے کا عزم فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان کی مشابہت اختیار نہ کرنا، بلکہ ان کی مخالفت کرنا شریعت کے مقاصد میں سے ہے۔

---

(۱) مسلم: ۲۰۶۹

(۲) متفق علیہ، ح: ۳۴۶۲، م: ۲۱۰۳

(۳) متفق علیہ، ح: ۵۸۹۲، م: ۲۵۹

(۴) مسلم: ۲۶۰

(۵) مسلم: ۱۱۳۴

غیر مسلموں کے ساتھ معاملات:

کفر اور اہل کفر سے نفرت کی بابت جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ برا معاملہ کیا جائے، یا ان پر ظلم و ستم کیا جائے، یا ان کی حق تلفی کی جائے، بہت سی احادیث میں ان امور سے سختی کے ساتھ ڈرایا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"جس نے کسی معاہد کافر کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو تک نہ پائے گا، جب کہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے محسوس ہوتی ہے۔"[1]

نیز فرمایا:

"سن لو! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، یا اس کی حق تلفی کی یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف بنایا، یا اس سے بغیر اس کی خوشی کوئی چیز لے لی تو میں قیامت کے روز اس معاہد کا وکیل ہوں گا۔"[2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

«لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ»[3].

"اللہ تعالیٰ تم کو نہیں روکتے ہیں ان لوگوں کے تعلق سے جنھوں نے دین کے سلسلے میں تم سے جنگ نہیں کی اور نہ انھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نکال باہر کیا کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو اور ان کے ساتھ انصاف کرو، بے شک اللہ کو انصاف کرنے والے پسند ہیں"۔

خود حضور اکرم ﷺ یہود کے ساتھ خرید و فروخت کرتے تھے، جیسا کہ زید بن سعنہ کے واقعہ میں گزر چکا، نیز وفات کے وقت آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی

---

(۱) بخاری: ۳۱۶۶

(۲) ابوداؤد: ۳۰۵۲

(۳) سورۂ ممتحنہ: آیت: ۸

رکھی ہوئی تھی۔

الغرض! کافروں سے محبت نہ کرنے کا مطلب ہے ان کے کفر سے نفرت اور یہ چیز ان کے ساتھ حسن سلوک اور بھلائی کرنے سے مانع نہیں ہے، بلکہ اسلام کی اشاعت ہی مسلمانوں کے غیروں کے ساتھ حسن معاملہ اور رواداری کے سبب ہوئی۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ ان دونوں معاملوں کو خلط ملط نہ کیا جائے، چنانچہ زید بن سعنہ کے کفر سے حضور اکرم ﷺ کی نفرت اس کے ساتھ حلم و بردباری اور رواداری میں مانع نہ بنی، جس کے سبب وہ بالآخر مسلمان ہو گیا۔

کفر سے نفرت در حقیقت اس مرض میں مبتلا ہونے سے روکنے والا انجکشن ہے، گویا یہ نفرت کافروں کے ساتھ معاشرت کے دوران، انسان کا ان کے کفر کو اچھا سمجھنے سے حفاظت ہے، کفر کو اچھا سمجھنے کا انجام بہ تدریج ان سے محبت، پھر ان سے قلبی مودت ہو گی اور یہی سب سے بڑی قیامت ہے۔

معلوم ہے کہ بڑی آگ چھوٹی چنگاری سے بھڑکتی ہے، اندلس سے مسلمانوں کے خاتمہ پر کی جانے والی بعض تحقیقات میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں میں جو سب سے پہلی خامی پیدا ہوئی وہ تھی مسلم خواتین کا کافر عورتوں کے لباس و پوشاک کو پسند کرنا، چنانچہ مسلم خواتین لباس و پوشاک اور چال ڈھال میں ان کی تقلید کرنے لگیں۔

علامہ ابن خلدون نے ایک اہم معاشرتی قاعدہ ذکر کیا ہے کہ مغلوب غالب کی اور کمزور طاقتور کی تقلید کرتا ہے، اس طرح مسلم خواتین کی کافر عورتوں کی تقلید کرنا اس مرض کا نقطہ آغاز بلکہ کمزوری کا نقطہ آغاز تھا۔ اعاذنا اللہ منہ

اکیسویں فصل

قناعت اور نفس کا غنا

مال جمع کرنے کی جبلّی خواہش/فطری خواہش:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”اگر ابن آدم کے پاس مال و دولت کی دو وادیاں ہو تو وہ تیسری وادی کی جستجو میں رہے گا، ابن آدم کا پیٹ تو مٹی ہی بھر سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتے ہیں۔“[1]

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے — اور اس باب میں احادیث بہت ہیں — کہ مال و دولت جمع کرنا ابن آدم کے نفسیاتی ڈھانچہ میں موجود ایک طبعی چیز ہے اور یہ طبیعت موت تک باقی رہتی ہے۔

دین اسلام طبائع انسانی کو ختم کرنے نہیں؛ بلکہ انھیں منضبط کرنے اور درست سمت دینے کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ اس طبیعت کو بھی اسلام نے حلال و حرام کے نظام کے تحت منضبط کیا ہے جو فقہی ابواب میں تفصیل سے مدوّن ہیں، تو مال جمع کرنے کا دروازہ مکمل طور پر کھلا ہوا نہیں ہے، بلکہ وہ انتہائی واضح اور دقیق ترین نظام کے تابع و موافق ہے۔

اپنی آنکھیں دراز مت کرو:

بعض اوقات انسان حلال و حرام کے نظام کا پابند ہوتا ہے، مگر لالچ باقی رہتی ہے، وہ ہاتھ کو تو قابو میں رکھتا ہے؛ مگر آنکھوں کو قابو میں نہیں رکھ پاتا، جبکہ آنکھوں کی زود درازی ہاتھوں کی زود درازی کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہوتی ہے، اسی وجہ سے قرآن کریم نے ہدایت دی ہے:

«وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى»[2].

”اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیئے جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ دنیوی

---

(۱) متفق علیہ: ح: ۶۴۳۴، م: ۱۰۴۹، واللفظ للبخاری

(۲) سورۂ طٰہٰ: آیت: ۱۳۱

زندگی کی رونق ہے اور آپ کے رب کا عطیہ بدرجہا
بہتر ہے اور دیر پا ہے۔"

آیت کریمہ نے واضح کیا کہ مال و دولت کی یہ اقسام جو بعض لوگوں کو دی گئی ہیں، صرف فتنہ اور آزمائش ہیں، جس شخص کی نگاہیں لوگوں کی طرف دراز ہوتی ہیں وہ (ذہنی طور پر) مستقل فقر و محتاجگی میں پڑا رہتا ہے، خواہ اس کے پاس کتنی ہی دولت ہو؛ اس لیے کہ ہر دولت مند سے اور بھی کوئی دوسرا زیادہ دولت مند ہوتا ہے۔

بنابریں غنا کے معنی و مفہوم کی تعیین ضروری ہے

یہ تعیین خود حضور اکرم ﷺ کی زبانی ہو چکی ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"غنا اور دولت مندی سامان کی کثرت کا نہیں، بلکہ طبیعت کے غنا اور بے نیازی کا نام ہے۔"(۱)

سامان کی کثرت کے پیچھے بھاگنا، اس کی کوئی حد و نہایت نہیں، اسی وجہ سے اس کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والا مستقل محتاجگی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے تولتا، ان تک پہنچنے، بلکہ ان سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

دین اسلام طیب اور پاکیزہ چیزوں سے انتفاع کو منع نہیں کرتا؛ بلکہ ان کے حصول کے لیے دوڑ بھاگ نہ کرنے کی بھی دعوت نہیں دیتا، لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ مسلمان مال و دولت کی چمک دمک کے سامنے ڈھیر ہو جائیں اور ان فانی پُرفریب سجاوٹوں کے سامنے اپنی قابلِ فخر و اعتزاز، اقدار و روایات کو کھو دیں۔

الغرض! غنی وہ آدمی ہے جس کا نفس لوگوں کے مال و دولت پر لالچ کی نظر ڈالنے سے بلند و ارفع ہو، اللہ تعالیٰ نے اسے جو رزق دیا ہے اس کے سبب دوسروں سے بے نیاز اور اسی پر قانع ہو۔

اسی ذیل میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

"کامیاب ہوا وہ آدمی جس نے اسلام قبول کیا، اسے بقدر ضرورت رزق ملا اور جو کچھ اللہ نے اسے دیا، اس پر قانع و مطمئن رہا۔"(۲)

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۶۴۴۶، م: ۱۰۵۱

(۲) مسلم: رقم: ۱۰۵۴

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

"آفریں ہو اس شخص کے لیے جس کو اسلام کی ہدایت ملی، اس کے گزر بسر کا سامان بقدر ضرورت رہا اور وہ اس پر قانع و مطمئن رہا۔"(۱)

قناعت:

اگر انسان کسبِ حلال کے سلسلے میں احکام خداوندی کی پابندی کرلے، جو چیز اسے نہیں ملی اس کا لالچ نہ کرے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو جو چیز تقسیم کردی اس پر راضی رہے اور اپنی نگاہ دوسرے لوگوں کے مال واسباب کی طرف دراز نہ کرے اور نہ اس کی لالچ کرے، تب وہ غنی نفس کا مالک اور قناعت پسند ہوگا۔

اس صفت سے متصف ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کا ایک مضبوط ارادہ ہو جو اسے ان معانی کا پابند رکھے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انصار میں سے کچھ حضرات نے رسول اکرم ﷺ سے مانگا تو آپ ﷺ نے ان کو دے دیا، پھر مانگا، پھر دے دیا یہاں تک کہ آپ کے پاس جو کچھ تھا سب ختم ہوگیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"میرے پاس جو بھی مال ہو تو میں اسے تم سے بچا کر ہرگز جمع کرکے نہ رکھوں گا اور جو شخص سوال سے بچتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بچادیتے ہیں اور جو غنا اختیار کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اسے غنی کردیتے ہیں، اور جو صابر بننا چاہے اللہ تعالیٰ اسے صابر بنادیتے ہیں، اور کسی کو کوئی بھی عطیہ نہیں دیا گیا جو صبر سے زیادہ بہتر اور دراز ہو۔"(۲)

حضور ﷺ کے ارشاد (مذکورہ حدیث کے اصل عربی الفاظ میں) "مَنۡ يَّسۡتَعِفَّ، مَنۡ يَسۡتَغۡنِ، مَنۡ يَتَصَبَّرۡ" نے بخوبی واضح کردیا کہ ارادہ کا اپنا کردار ہے، جو وہ ضرور ادا کرتا ہے، لہذا انسان کی طرف سے طلب عفاف، استغناء اور صبر کا عزم مصمم پایا جانا ضروری ہے، جب انسان کا کوئی ارادہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے مقصود عفاف کے حصول میں نصرت ہوتی ہے۔

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۳۴۹

(۲) ترمذی: متفق علیہ: رقم: ۱۴۶۹، م: ۱۰۵۳

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مانگا تو آپ نے عطا کر دیا، پھر مانگا تو دوبارہ عطا کر دیا، سہ بارہ مانگا تب بھی دے دیا، اس کے بعد فرمایا: اے حکیم! یہ مال سرسبز وشاداب اور شیریں ہے، پس جو شخص اسے لے، سخاوت نفس[1] کے ساتھ تو اس کے لیے برکت مقدر کی جاتی ہے، اور جو اسے لے نفس کے لالچ کے ساتھ تو اس کے لیے اس میں برکت نہیں ہوتی، وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔'' (یعنی دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے)۔[2]

حضرت حکیم بن حزامؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اللہ کے رسول! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، آج کے بعد میں کسی کو سوال کر کے زیر بار نہیں کروں گا، یہاں تک کہ دنیا سے چلا جاؤں، واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو عہد کیا اسے پورا بھی کیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص کو فاقہ نازل ہو وہ اسے لوگوں پر اتار دے تو اس کا فاقہ دور نہ ہوگا اور جس شخص پر فاقہ نازل ہو پھر وہ اسے اللہ پر اتار دے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جلد یا بدیر رزق عطا کر دیں گے۔''[3]

تاکہ تم اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قناعت وسیر چشمی تک پہنچانے والے راستوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی اس شخص پر نظر ڈالے جو مال اور جمال میں اس سے بہتر ہو تو اسے اس شخص پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے جو اس سے کم تر ہو۔

دوسری روایت میں ہے کہ تم اس آدمی کو دیکھو جو تم سے کمتر ہو، اس کو نہ دیکھو جو تم سے برتر ہو

---

(۱) سخاوت نفس سے مراد یہ ہے دینے والا خوشی سے دے، وہ از خود دے، لینے والے کی طرف سے نہ سوال ہو نہ لالچ کا اظہار۔

(۲) متفق علیہ: رقم: ۱۴۷۲، م: ۱۰۳۵

(۳) ابوداؤد: رقم: ۱۶۴۵، ترمذی: رقم: ۲۳۲۶

کہ اس طرح تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔"[۱]

اس حدیث کی پہلی روایت نفس میں توازن اور اعتدال پیدا کرنے کی رہنمائی کرتی ہے، کہ جب وہ کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو اس سے مال وجمال میں برتر ہو تو ممکن ہے کہ اسے حزن وافسوس اور رنج وغم کا احساس ہو، پھر جب وہ دوسری طرف نظر ڈالے جو اس سے مال وجمال میں کم تر ہو تو اس سے نفس میں اعتدال وتوازن بحال ہوتا ہے۔

جبکہ دوسری روایت یہ ہدایت دیتی ہے کہ اپنی اس صورت حال کو اس آدمی سے قیاس کرنا چاہئے جو ہم سے کم تر ہو، اللہ تعالیٰ کی نعمت کو معمولی اور حقیر نہ سمجھنے کا یہی ایک راستہ ہے، فَنَحْمَدُاللّٰہَ تَعَالٰی عَلٰی نِعَمِہِ الَّتِیْ لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی......

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۶۴۹۰، م: ۲۹۶۳

بائیسویں فصل

حسنِ کارکردگی

اصابتِ رائے اور حسن تصرف کا اظہار پیچیدہ امور اور مشکل صورت حال میں ہوتا ہے۔

زندگی کے دیگر میدانوں کی مانند اس میدان میں بھی رسول اکرم ﷺ سب سے ممتاز اور آگے تھے۔

اس فصل میں درج ذیل مضمون کی بابت ہم صرف بعض مثالیں اور حالات کا تذکرہ کررہے ہیں، اگرچہ آپ کے جملہ تصرفات اور فیصلے اس بات پر نمونہ اور آئیڈیل تھے؛ کیونکہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اس قسم کے واقعات وحالات سے بھری پڑی ہے۔

(۱) حجر اسود:

حضرت عبداللہ بن سائب ؓ سے روایت ہے:

''میں ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے بیت اللہ کی تعمیر جدید کی، حجر اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے کی بابت قریش میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا، قریب تھا کہ تلواروں سے قتل وقتال کی نوبت آجائے۔

اس وقت بعض لوگوں نے رائے دی کہ جو شخص دروازہ سے سب سے پہلے آئے اسے حکم بنالو، آپ ﷺ سب سے پہلے داخل ہوئے، یہ لوگ زمانۂ جاہلیت میں آپ ﷺ کو ''امین'' کہا کرتے تھے، جب آپ ﷺ کو دیکھا تو سب نے کہا: (سب سے پہلے) ''امین'' داخل ہوئے ہیں۔

سب لوگوں نے کہا: محمد! ہم آپ کے فیصلہ پر مطمئن ہیں، آپ نے ایک چادر منگوائی، اسے پھیلا دیا، پھر اس میں حجر اسود رکھ کر قریش کی جملہ شاخوں سے کہا: آپ میں سے ہر شاخ کا ایک آدمی اس چادر کا ایک کونہ پکڑ لے؛ چنانچہ سب نے مل کر حجر اسود کو اوپر اٹھایا، پھر آپ ﷺ نے اسے اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔''(۱)

---

(۱) دلائل النبوۃ لابن أبو نعیم: ۵۵/۱۔ حافظ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد: ۲۲۹/۸ پر لکھا ہے کہ اس روایت کے راوی صحیح کے راوی ہیں، سوائے ہلال بن خباب کے، جبکہ یہ بھی ثقہ ثبت ہیں، ملاحظہ ہو: الصحیح المسند من دلائل النبوۃ: ص: ۲۵۷

حجرِ اسود اپنی جگہ پر رکھے جانے کا یہ حل بہ ظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے؛ لیکن جب اس پر غور کریں کہ تمام عقلائے قریش کے سامنے یہ مشکل صورت حال تھی اور انھیں تلوار کے ذریعے فیصلہ کے علاوہ کوئی دوسرا حل نظر نہ آرہا تھا، تب ہمیں بدیہی طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فیصلے کی عظمت اور آپ کی اصابت رائے کا اندازہ ہوگا۔ بے شک

(۲) صلح حدیبیہ:

بہ ظاہر اس موقع پر کی جانے والی صلح کی شرطیں اہل اسلام کے حق میں بڑی ظالمانہ تھیں، اور گویا قریش نے اس روز اپنی من چاہی شرطیں لکھوائی تھیں، اسی وجہ سے مسلمان اس کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور اس روز اس صلح کو مسترد کرانے کی کوشش میں حضرت عمر کا خاص کردار رہا۔

مسلمان اس سے کس قدر دل گیر اور غیر مطمئن تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں عمرے سے حلال ہونے کا حکم دیا تو کسی نے بھی ایسا نہ کیا۔

مسلمانوں کی نظر صرف وقتی صورت حال پر تھی، مستقبل پر ان کی نظر نہ تھی، جبکہ بعد میں یہ واضح ہوگیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ کیا وہی حق وصواب تھا۔

جس شرط نے مسلمانوں کی غیرت بھڑکا دی تھی وہ یہ تھی کہ اگر مشرکین میں سے کوئی مدینہ آتا ہے تو رسول اللہ اسے مکہ واپس کردیں گے اور جو مسلمان مشرکین کے پاس چلا جائے گا وہ اسے واپس نہ کریں گے۔

جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس شرط کو تسلیم کرنے میں بڑی حکمت تھی، آپ نے اس معاملہ کو ظاہری مساوات کی نظر سے نہ دیکھ کر باطن اور حقیقت کو پیش نظر رکھا، صحابہ نے اعتراض کیا کہ کیا یہ شرط بھی لکھی جائے گی؟ انھیں اس شرط کو قبول کرنے پر سخت حیرت تھی، تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”جی ہاں! ہم میں سے جو کوئی ان کی طرف گیا تو اللہ نے اسے ہم سے دور کردیا اور جو شخص ان میں سے ہمارے پاس آیا تو جلد ہی اللہ تعالیٰ اس کی کشادگی اور نکلنے کا راستہ بنادیں گے۔“(۱)

مسلمانوں میں سے جو کوئی مرتد ہوکر کفار کے پاس چلا جائے تو اللہ اسے واپس نہ کرے۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۷۸۴

اس صلح کی بابت آپ ﷺ کے درست فیصلہ اور حسن تصرف کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو "فتح" سے تعبیر کیا، چنانچہ صلح حدیبیہ سے واپسی کے وقت سورۂ فتح نازل ہوئی۔

تب حضرات صحابہ کرامؓ نے اپنی کوتاہ نظری کا برملا اعتراف کیا، ان میں سرفہرست حضرت عمر بن خطابؓ تھے، نیز انہی میں حضرت سہل بن حُنیف بھی تھے، جنھوں نے بعد میں ایک موقع پر کہا:

"اے لوگو! اپنی رائے کو الزام دو، میں نے خود اپنے آپ کو ابو جندل کے روز (صلح حدیبیہ کے روز) دیکھا، اگر میں نبی اکرم ﷺ کے فیصلہ کو مسترد کر سکتا تو ضرور مسترد کر دیتا۔"(۱)

(۳) منافقین:

غزوہ بنو مصطلق سے واپسی میں حضرت عمر بن خطاب کے ایک مزدور اور قبیلہ خزرج کے ایک حلیف کے درمیان پانی لینے پر جھگڑا ہو گیا، جب اس کی خبر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن سلول کو ہوئی تو اس نے کہا: کیا واقعی ان لوگوں نے ایسا کیا ہے، یہ تو ہم سے جھگڑا کرنے لگے اور ہمارے ہی علاقے میں تعداد میں ہم سے بڑھ گئے، خدا کی قسم! ہم خود کو اور قریش کے ان بے حیثیت لوگوں کو وہی سمجھتے ہیں جیسا کہ پہلے کسی نے کہا تھا: "سَمِّن كَلْبَكَ يأكُلْكَ" اپنے کتے کو کھلا پلا کے موٹا کرو، وہ تمھیں ہی کاٹے گا، سنو اللہ کی قسم! اگر ہم لوٹ کر مدینہ گئے تو ہم سے باعزت آدمی ذلیل آدمی کو وہاں سے نکال باہر کر دے گا۔

اس کی اطلاع حضور اکرم ﷺ کو ملی، اس وقت آپ کے پاس حضرت عمرؓ تھے، حضرت عمر نے عرض کیا: اللہ کے رسول! عبّاد بن بِشر کو حکم دیجئے کہ اسے قتل کر دیں، تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

" اس کا کیا ہو گا جب لوگ یہ کہنے لگیں کہ محمد تو اپنے ساتھیوں کو قتل کرا رہے ہیں بلکہ تم یہاں سے کوچ کرنے کا اعلان کر دو۔"

چنانچہ حضور اکرم ﷺ روانہ ہو گئے اور شام تک بلکہ اگلی رات بھر چلتے رہے، صبح کو دن کے ابتدائی حصہ میں بھی چلتے ہی رہے، جب دھوپ تیز ہو گئی تب آپ ﷺ نے لوگوں کے ساتھ

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۱۸۱

پڑاؤ کیا، لوگ جیسے ہی زمین پر بیٹھے، شدتِ تھکان کے باعث فوراً ہی سو گئے۔

حضور اکرم ﷺ کا مسلسل سفر کرنے سے مقصد یہ تھا کہ لوگ رئیس المنافقین کی بات سے غافل ہو جائیں، مبادا اس سے امت مسلمہ کے بدن میں کوئی شگاف پڑ جائے، یہ مسلسل سفر آپ کے مقصود کی تکمیل کا کامیاب ذریعہ ثابت ہوا کہ ہر ایک آدمی اپنے آپ میں ہی مشغول ہو گیا، پھر جیسے زمین سے جسم لگا فوراً نیند آگئی، سورۂ منافقون کی آیتیں اسی کے بعد نازل ہوئیں۔

(۴) خالد بن سفیان:

"نبی اکرم ﷺ کو اطلاع ملی کہ خالد بن سفیان بن نبیح ہذلی مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے لشکر اکٹھا کر رہا ہے، آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن انیس کو بلا کر فرمایا: مجھے اطلاع ملی ہے کہ ابن سفیان مجھ پر حملہ کرنے کے لیے لوگوں کو یکجا کر رہا ہے، اس وقت وہ مقام نخلہ یا میدان عرفات میں ہے، تم جا کر اسے قتل کر دو۔

حضرت عبداللہ بن انیس کہتے ہیں کہ میں روانہ ہو کر اس کے پاس پہنچ گیا، اس نے پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا عبداللہ! پھر میں نے کہا: عرب میں سے ایک آدمی نے تمھارے اور اس سے جنگ کے لیے تمھارا لشکر جمع کرنے کے بارے میں سنا ہے تو وہ اسی کی وجہ سے آیا ہے، اس نے کہا: بے شک میں اسی میں مصروف ہوں، کہتے ہیں: میں تھوڑی دیر اس کے ساتھ چلتا رہا، جب مجھے موقع ملا تو میں نے تلوار بلند کی اور اسے قتل کر دیا، اس کے بعد وہاں سے نکل آیا۔"(۱)

اس طرح نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو ایک جنگ سے بچا دیا، جس میں گھسنے کی ان کو ضرورت نہ تھی۔

لشکر اسامہ:

نبی اکرم ﷺ نے لشکر اسامہ کو تیار کیا، اپنے دستِ مبارک سے عَلَم باندھا، اس کے بعد آپ بیمار ہو گئے جس کے سبب لشکر رُک گیا، آپ بیماری میں بھی لشکر اسامہ کو روانہ کرنے کی تاکید کرتے رہے۔

جب آپ کی وفات ہو گئی تو صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر بہت سے صحابہ کی خواہش تھی

(۱) ابوداؤد: رقم: ۱۲۴۹، سیرۃ ابن ہشام: ۲/۶۱۹

کہ لشکر روانہ نہ ہو، لیکن حضرت ابو بکر صدیق روانگی کے لیے مصر رہے، چنانچہ یہ لشکر روانہ ہو گیا۔

حالات نے واضح کر دیا کہ لشکر کی روانگی خیر و برکت کا باعث بنی؛ کہ بہت سے قبائل ارتداد کے قریب تھے، جب انھوں نے لشکر کو دیکھا تو کہنے لگے: اگر ان کے پاس قوت و طاقت نہ ہوتی تو ان کے پاس سے ایسا لشکر نہ نکلتا، بس ہم تو ان کو یوں ہی رہنے دیتے ہیں یہاں تک کہ ان کی رومیوں سے جنگ ہو جائے۔

جب یہ لشکر صحیح سالم اور کامیاب و کامران واپس لوٹا تو یہ قبائل اسلام پر جم گئے۔

یہ حضور اکرم ﷺ کی طرف سے عواقب اور انجام پر گہری نظر کی ایک مثال ہے۔

نیز اس بات کی دلیل بھی ہے کہ آپ ﷺ کے احکام کی پابندی اور ان کا نفاذ ہی نجات کا راستہ ہے، حالات خواہ کچھ بھی ہوں۔

حضور اکرم ﷺ کے حسنِ تصرف، حالات کے درست اندازے کی یہ چند ایک مثالیں ہیں اور ہم اس ذیل میں انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

چوتھا مقصد

حضور ﷺ کی

اخلاقِ رذیلہ سے نزاہت

یہ بات گزر چکی ہے کہ انسان اچھے اخلاق کا حامل تب ہوتا ہے جب اس کا نفس برے اخلاق سے پاک وصاف اور حسنِ اخلاق سے آراستہ و پیراستہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اس طرح یہاں دو چیزیں ہوئیں:

(۱) طہارت اور پاکی۔

(۲) زینت و کمال۔

یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ زینت اور طہارت باہم لازم وملزوم ہیں؛ کیونکہ زینت بغیر طہارتِ اخلاق ممکن ہی نہیں، چنانچہ صدق وراستی تب ہی پائی جاسکتی ہے جب کذب ودروغ بیانی نہ رہے، لہذا کسی انسان کو صدق وراستی سے اسی وقت متصف کیا جاتا ہے جب اس کے سلوک و عمل میں کذب ودروغ بیانی نہ پائی جائے۔

اسی تلازم کے تحت ریاء، جھوٹ، خیانت، بزدلی، بخل، فحش گوئی، تکبر، خود پسندی، درشت مزاجی، قساوت قلبی، غصہ وغضب، ظلم وستم، اور شبہات کے پیچھے پڑنے جیسے امور پر سابق میں گفتگو کی جاچکی ہے۔

ان صفات پر گفتگو ان کی متضاد صفات یعنی فضائل ومحاسن پر کلام کے دوران کی گئی ہے۔ اس مقصد میں اخلاقِ سیئہ کے صرف چند نمونوں پر ہی گفتگو کی جارہی ہے، یہ وہ اخلاق ہیں جن سے حضور اکرم ﷺ بذاتِ خود دور ونفور رہے اور اپنی امت کو بھی ان سے دور رہنے کی تلقین فرمائی۔

شمائل نبوی کے تعلق سے اس طرح اخلاق کی بابت گفتگو پر حیرت ہوسکتی ہے، حالانکہ یہ شمائل کا ایک حصہ ہیں، اگرچہ شمائل نگار حضرات محدثین نے ان سے صرف نظر کیا ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے شمائل وعادات کے ذیل میں اخلاق سیئہ سے آپ کی دوری کا بھی تذکرہ کیا ہے، کہ یہ سلبی سلوک و عمل کا ایک حصہ ہیں جس سے تصویر مکمل ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

’’حضور اکرم ﷺ نہ (عادتاً) فحش گو تھے اور نہ (لوگوں کو ہنسنے ہنسانے کے لیے) بد گو۔‘‘(۱)

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

’’نبی اکرم ﷺ نہ فحش گو تھے، نہ بد گو، نہ بازار میں شور وشغب کرنے والے تھے اور نہ ہی برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے، بلکہ معاف اور در گزر فرمادیا کرتے تھے۔‘‘(۲)

اس طرح ان دونوں حضرات نے سلبی صفات وعادات شمار کیں، جو کہ ان عادات کو اپنانے سے باز رہنے کے دائرہ میں آتی ہیں، چنانچہ آپ ﷺ فحش گوئی، بد گوئی اور بازار میں شور وشغب کرنے سے ہمیشہ دور رہے۔

خود قرآن کریم نے بھی آپ ﷺ سے درشت مزاجی اور قساوت قلبی کی نفی کی ہے۔

ارشاد ہے:

«وَ لَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ »(۳).

’’اگر آپ درشت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے‘‘۔

خود آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ نماز شروع کرنے سے پہلے یہ دعاء کرنے کی تھی:

«اللّٰهم اهدني لأحسن الأعمال وأحسن الاخلاق لا يهدي لأحسنها إلا انت، وقني سيّئ الأعمال وسيّئ الاخلاق لا يقي سيّها إلاانت»(۴).

’’اے اللہ! مجھے اچھے اعمال اور اچھے اخلاق کی ہدایت دیجئے، ان کی ہدایت صرف آپ ہی دے سکتے ہیں، اور مجھے بچایئے برے اعمال اور برے اخلاق سے، ان سے صرف آپ ہی بچا سکتے ہیں۔

نیز آپ ﷺ یہ دعاء بھی کرتے تھے:

«اللهم إني أعوذبك من منكرات الأخلاق والأعمال والأهوال»(۵).

’’اے اللہ آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں ناپسندیدہ اخلاق واعمال اور ہولناک امور سے

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۵۵۹، م: ۲۳۲۱

(۲) ترمذی: رقم: ۲۰۱۶

(۳) سورۃ آل عمران: آیت: ۱۵۹

(۴) سنن نسائی: رقم: ۸۹۵

(۵) ترمذی: ۳۵۹۱

فصل اول

ایک عمومی وضاحت

حضرت عائشہؓ نے رسول اکرم ﷺ کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''کان خُلُقُهُ القرآن'' آپ کے اخلاق قرآن کریم تھا۔

ان کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا، ان کے آپ ﷺ پورے طور پر پابند؛ اور جن سے منع کیا ان سے دور رہنے والے تھے، آپ ﷺ نے اس سلوک وعمل کے ایجابی وسلبی دونوں پہلوؤں کی وضاحت فرمادی جن کا قرآن مطالبہ کرتا ہے۔

سورۂ انعام کی درج ذیل آیات نے ان چیزوں کی بابت بھی واضح لکیر کھینچ دی جن سے دور رہنا چاہئے، اور ان چیزوں کی بابت بھی جن کی پابندی کی جانی چاہیے، ارشاد ہے:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ

''کہو آؤ میں تمھیں پڑھ کر سناؤں کہ تمھارے پروردگار نے تم پر کون سی باتیں حرام کی ہیں، وہ یہ ہیں کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور غربت کی وجہ سے اپنے بچوں کو قتل مت کرو، ہم تمھیں بھی رزق دیں گے اور ان کو بھی، اور بے حیائی کے کاموں کے پاس بھی نہ بھٹکو، چاہے وہ بے حیائی کھلی ہو یا چھپی ہوئی، اور جس جان کو اللہ نے حرمت عطا کی ہے، اسے کسی برحق وجہ کے بغیر قتل نہ کرو، لوگو! یہ ہیں وہ باتیں جن کی اللہ نے تاکید کی ہے تاکہ تمھیں کچھ سمجھ آئے، اور سوائے بہتر طریقہ کے یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچے، اور ناپ تول کو انصاف سے پورا کرو، چاہے معاملہ اپنے قریبی رشتہ دار ہی کا ہو، اور اللہ کا عہد پورا

بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾[(۱)].

کرو، اللہ نے تمھیں یہ حکم دیا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو اور بیشک یہی میرا سیدھا راستہ ہے، سو اسی کا اتباع کرو، اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ چلو، ورنہ وہ تمھیں اللہ کے راستہ سے ہٹا دیں گے، لوگو! یہ باتیں ہیں جن کی اللہ نے تاکید کی ہے، تاکہ تم متقی بنو''

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:

''جو شخص رسول اللہ ﷺ کی اس تاکیدی وصیت کو دیکھنا چاہے جس پر آپ کا خاتمہ ہوا تو اسے چاہیے کہ ان آیات کو پڑھ لے۔[(۲)]

جب ہم ان تاکیدی احکام پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین اسلام کی بنیاد و اساس ہیں، یہ توحید پر قائم ضمیر کی زندگی کی اساس ہے، آئندہ آنے والی نسلوں سمیت خاندان کی زندگی کی اساس ہیں، معاشرہ میں پیش آنے والے معاملات کی بابت، باہمی کفالت وطہارت کے ساتھ پورے معاشرہ کی اساس ہیں، اسی طرح انسانیت کی زندگی اور اس کو محیط حقوق اور ضمانتوں کی اساس ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کے عہد و پیمان سے مربوط ہیں[(۳)]۔

اس طرح یہ آیات اس بات کو طے کر دیتی ہیں کہ شرک، قتلِ ناحق، کھلی اور چھپی بے حیائیوں جیسے شر سے باز رہنا ان ضروریات میں سے ایک ہے جن سے فضائل کی تکمیل ہوتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ منہیات سے دور رہنے میں بھی اسوہ اور نمونہ تھے، اور اسی وجہ سے آپ خلق عظیم سے متصف کیے جانے کے بجا طور پر سزاوار ٹھہرے۔[(۴)]

---

(۱) سورۂ انعام: آیت: ۱۵۱۔۱۵۳

(2) تفسیر ابن کثیر: مذکورہ آیات کے تحت۔

(۳) فی ظلال القرآن، آیات بالا۔

(۴) یہ موضوع مؤلف کتاب نے اس بات کو بتلانے کے لیے بیان کیا ہے کہ شر سے دوری اخلاق کریمانہ کی عمارت کا دوسرا پہلو ہے۔

فصل دوم

زبان کے خطرات

زبان انسانی جسم کے دوسرے اعضاء کے مقابلہ میں سائز میں چھوٹی ہونے کے باوجود انسان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے؛ کہ یہ در حقیقت گاڑی کو اِدھر اُدھر لے جانے والا اسٹیرنگ ہے۔

اسی سے انسان راہِ راست پر باقی رہتا اور بھٹکتا ہے، اسی سے کلمۂ توحید بھی ادا ہوتا ہے، اور اسی سے کفر کا اعلان بھی، حدیث شریف میں اس حقیقت کو کیا ہی عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے:

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مرفوعاً مروی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ابن آدم جب صبح کو اُٹھتا ہے تو جسم کے سارے اعضا زبان سے دست بستہ گزارش کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرنا، کہ ہم سب تیرے اوپر منحصر ہیں، اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہو گئی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔''(۱)۔

چوں کہ زبان کی خطرناکی زیادہ ہے بنابریں اسے کنٹرول میں رکھنے، اس کا محاسبہ کرتے رہنے اور ایسا کر سکنے والے انسان کی جزاء کی بابت بہ کثرت احادیث وارد ہوئی ہیں۔

حضرت سہل بن سعدؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے راویت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص مجھے اس عضو کی ضمانت دے دے جو اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان ہے (زبان) اور اس کی جو اس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ ہے (شرم گاہ) میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں''۔ (۲)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۴۰۷

(۲) بخاری: رقم: ۶۴۷۴

''اللہ تعالیٰ جس شخص کی اس عضو کے شر سے حفاظت کریں جو اس کے جبڑوں کے بیچ میں ہے اور اس عضو کے شر سے جو ٹانگوں کے بیچ میں ہے تو وہ داخلِ جنت ہو گا۔''(۱)

حضور اکرم ﷺ نے اس بات کی ضرورت پر خصوصی تنبیہ فرمائی ہے کہ انسان اپنے آپ کا محاسبہ کرتا رہے کہ اس کی زبان سے کیا کچھ نکل رہا ہے؟ کیونکہ بعض جملے ایسے ہوتے ہیں جن پر انسان توجہ نہیں کرتا حالانکہ وہی اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں۔

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے حضور اکرم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

''بندہ ایک لفظ بغیر سوچے سمجھے بول دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ پھسل کر جہنم میں اتنی دور چلا جاتا ہے جو مشرق و مغرب کے درمیان کے فاصلہ سے زیادہ ہوتا ہے''۔(۲)

ف: زبان کی حفاظت کی ضرورت پر یہ بہت ہی اہم حدیث ہے۔ (مترجم)

اسی وجہ سے زبان پر کنٹرول رکھنا بڑی فضیلت کی چیز ہے، جس کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ وباللہ التوفیق۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ خیر کی بات کہے یا خاموش رہے''۔(۳)

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا:

''اللہ کے رسول! نجات کی کیا صورت ہے؟ فرمایا: اپنی زبان پر کنٹرول رکھو، تمھارا گھر تمھارے لئے کافی رہے (بلاضرورت گھر سے باہر مت نکلو) اور اپنی غلطی پر رویا کرو۔''(۴)

ف: بہت ہی قیمتی نصیحت ہے جو لائحۂ عمل بنانے کے لائق ہے۔ (مترجم)

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۴۰۹

(۲) متفق علیہ: رقم: ۶۴۷۷، م: ۲۹۸۸

(۳) متفق علیہ: رقم: ۶۰۱۸، م: ۴۷

(۴) ترمذی: رقم: ۲۴۰۶

حضرت معاذ بن جبلؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے جو اسلام کے اصول و قواعد پر مشتمل ہے کہ زبان اس موضوع کے ایک بڑے حصہ کو محیط ہے، اس سے زبان کی حفاظت کے تعلق سے حضور اکرم ﷺ کی غیر معمولی دل چسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر پوری حدیث شریف درج کر دی جائے؛ کیونکہ اس میں زبان کی حیثیت، اس کی خطرناکی اور اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کا بیان ہے:

''میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھا، ایک روز صبح کو میں چلتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کے قریب ہو گیا تو میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ مجھے کوئی ایسا عمل بتادیجئے جو مجھے جنت میں داخل اور جہنم سے دور کر دے، فرمایا: تم نے بہت بڑی چیز کی بابت مجھ سے سوال کیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جس کے لیے آسان بنادے اس کے لیے آسان ہے: تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی بھی شئی کو شریک نہ ٹھراؤ، نماز کی پابندی کرو، زکاۃ ادا کرو، رمضان کا روزہ رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو، اس کے بعد فرمایا: کیا میں تمھیں ابواب خیر نہ بتلاؤں؟ روزہ ڈھال ہے، صدقہ وزکوۃ گناہ کو ایسے بجھا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو اور درمیانی شب میں کسی شخص کا نماز پڑھنا (نماز تہجد) بعد ازاں آپ ﷺ نے "تَتَجَافٰى جُنُوبُهُمْ" آیت "يُنْفِقُونَ"[1] تک تلاوت کی۔

پھر ارشاد فرمایا: کیا میں تمھیں اس سارے معاملہ کی اصل، اس کے ستون اور اس کی کوہان کی بلندی کی نہ خبر کر دوں؟ میں نے عرض کیا؛ اللہ کے رسول! کیوں نہیں، فرمایا: اس کی اصل اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے اور اس کی کوہان کی بلندی جہاد ہے، اس کے بعد فرمایا: کیا میں تمھیں ان سب کا حاصل و مالک بننے کا راز نہ بتلادوں؟ میں نے عرض کیا: ضرور اللہ کے رسول! تب آپ ﷺ نے اپنی زبان پکڑ کر فرمایا: اسے روک کر رکھو، اس پر میں نے عرض کیا: ہم لوگ جو بات کرتے ہیں اس کی وجہ سے بھی پکڑے جائیں گے؟ فرمایا: معاذ! تمھاری ماں تمھیں کھوئے۔''[2] لوگوں کو چہروں یا فرمایا

---

(۱) سورۃ السجدۃ: آیت: ۱۶

(۲) تمھاری ماں تمھیں کھوئے، اس جملہ سے اسکا حقیقی معنی مراد نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ انسان کس قدر بھولا بھالا اور معاملہ کی سنجیدگی سے غافل ہے۔

نتھنوں کے بل جہنم میں صرف ان کی زبان کی باتیں ہی ڈلوائیں گی۔"[1]

اس حدیث شریف پر ٹھہر کر جن امور پر غور و فکر کرنا چاہئے وہ یہ ہیں:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے ارکانِ اسلام کی بابت کلام فرمایا، اس کے بعد ابواب خیر پر گفتگو کی، پھر اس معاملہ کی جڑ و اصل، اس کے ستون اور کوہان کی بلندی کی بابت ارشاد فرمایا، اس سب کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "آلا أخبر بملاك ذلك كله" فرمایا، حضرات شراح حدیث کا اس جملہ کی بابت کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا میں تمھیں وہ نسخہ نہ بتلادوں جس سے انسان ان سب کا حامل و مالک بن جائے۔

جو کچھ سابقہ سطور میں ذکر کیا گیا وہ انتہائی اہم، عظیم اور بڑا ہے، یہ سب کچھ زبان پر کنڑول رکھنے سے حاصل ہوگا جیسا کہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا۔

کیا یہ حدیث زبان پر کنڑول رکھنے کے معاملہ کو اعمال کی بلندی و چوٹی نہیں قرار دیتی ہے؟ بے شک قرار دیتی ہے۔

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۶۱۶۔ ابن ماجہ: رقم: ۳۹۷۳۔

فصل سوم

زبان کی بعض آفتیں

احادیث نبویہ کے ذریعہ گزشتہ فصل میں زبان کی خطرناکی سے ہم اچھی طرح سے واقف ہوگئے، نیز کفِّ لسان اور اسے کنٹرول میں رکھنے کی فضیلت کا بھی علم ہوگیا۔

فصل ہذا میں زبان کی بعض آفتوں کا تذکرہ کردیتے ہیں، مقصد سوم کی سابقہ فصلوں میں کذب بیانی، ریاء ونمود اور فحش گوئی پر کلام کیا جاچکا ہے، اسی قبیل کی ایک چیز ہے:

غیبت:

غیبت امتِ مسلمہ کی عمارت اور اس کی وحدت کو منہدم کردینے والا ایک پھاوڑہ ہے، نیز اخوت وبھائی چارہ کو پارہ پارہ کردینے کا ایک مؤثر محرک بھی۔

ارشاد ربانی ہے:

«وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ »[1].

”اور تم میں سے بعض بعض کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں کا کوئی ایک یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے۔“

ارشاد نبوی ہے:

” ہر مسلمان دوسرے مسلمان پر حرام ہے اس کا خون بھی، مال بھی اور عزت وآبرو بھی۔“[2]

نبی اکرم ﷺ نے غیبت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ہے:

” تم لوگ جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ ورسول کو ہی

---

(۱) سورۂ حجرات: آیت: ۱۲

(۲) مسلم: رقم: ۲۵۶۴

زیادہ علم ہے، فرمایا: تمھارا اپنے بھائی کا ایسا تذکرہ جو اسے ناگوار گزرے، عرض کیا گیا: اگر میرے بھائی میں وہ بات ہو جو میں کہہ رہا ہوں تب؟ فرمایا: اگر وہ بات جو تم کہہ رہے ہو اس میں ہو تب تم نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں نہ ہو تو تم نے بہتان لگایا۔"(۱)

جہاں تک اس گناہ کی سنگینی ہے تو یہ ان احادیث سے واضح ہو جاتی ہے جو غیبت کرنے ولے کی سزا کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

"جب مجھے معراج میں لے جایا گیا تو میرا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے، وہ اپنے چہرے اور سینے نوچ رہے تھے، میں نے کہا: جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں، جبرئیلؑ نے بتایا: یہ وہ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی بے آبروئی کرتے ہیں۔"(۲)

حضرت ابو برزہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اے ایسے شخص کی جماعت!(۳) جو صرف اپنی زبان سے ایمان لایا اور اس کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا، نہ مسلمانوں کی غیبت کرو اور نہ ان کی آبرو کے پیچھے پڑو، کیونکہ جو شخص ان کی آبرو کے پیچھے پڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی آبرو کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، اور جس کی عزت کے پیچھے اللہ تعالیٰ پڑ جائیں اسے اس کے گھر میں رُسوا کر دیتے ہیں۔"(۴)

حضرت ابو بکرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم کا گزر دو قبروں سے ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے، حالانکہ کسی بڑی چیز پر عذاب نہیں ہو رہا ہے، ان میں سے ایک کو عذاب دیا جا رہا ہے پیشاب کے سلسلہ میں (یعنی وہ پیشاب کی ناپاکی سے مکمل پرہیز نہیں کرتا تھا) اور دوسرے کو غیبت کے بارے میں۔"(۵)

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۵۸۹

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۸۷۸۔۴۸۷۹

(۳) اس طرح خطاب کرنے کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اس طرح کی حرکتیں کرنا منافقین یا کمزور و ناقص ایمان والوں کا کام ہے۔ (ط ق)

(۴) ابوداؤد: رقم: ۴۸۸۰

(۵) ابن ماجہ: رقم: ۳۴۸

چغل خوری:

چغل خوری غیبت کی بہن ہے؛ بلکہ گناہ کی حیثیت سے اس سے زیادہ بھاری ہے؛ کیونکہ چغل خور ایسا انسان ہوتا ہے جو شر لے کر چلتا اور اس کے لیے دوڑ بھاگ کرتا ہے، چغل خوری فتنہ وفساد کرنے کے لیے ایک کی بات دوسرے سے نقل کرنے سے عبارت ہے۔

اس کی مذمت قرآن کریم میں کی گئی ہے، ارشاد ہے:

«وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ○ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ»(۱). ''آپ ایسے کسی کی بات نہ مانیں جو بہت قسم کھانے والا بے وقعت شخص ہے، بہت طعنہ دینے والا اور چغلی لگانے والا ہے۔''

حضرت حذیفہؓ نبی اکرم ﷺ سے وہ بات نقل کرتے ہیں جو انھوں نے آپ سے ارشاد فرماتے ہوئے سنی:

''چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔(۲)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا گزر دو قبروں سے ہوا تو فرمایا: ''ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور یہ عذاب کسی بڑی مشکل چیز کی بابت نہیں ہو رہا، بلکہ فرمایا: ان میں سے ایک چغل خوری کرتا پھرتا تھا، اور دوسرا اپنے پیشاب سے بچتا نہیں تھا''۔(۳)

حضرت اسماء بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''کیا میں تمھیں تمھارے نیک لوگوں کی بابت نہ بتادوں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کیوں نہیں، فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں دیکھا جائے تو اللہ کی یاد آجائے (پھر فرمایا) کیا میں تمھیں تمھارے برے لوگوں کی بابت نہ بتادوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ فرمایا: چغل خوری کرنے والے، دوستوں کے درمیان بگاڑ پیدا کرنے والے اور بے گناہ لوگوں کے لیے مصیبت وہلاکت چاہنے والے۔''(۴)

---

(۱) سورۃ القلم: آیت: ۱۰ تا ۱۱۔

(۲) متفق علیہ: رقم: ۶۹۵۶، م: ۱۰۵، واللفظ للمسلم۔

(۳) متفق علیہ: خ ۱۳۷۸ م ۲۹۲۔

(۴) الادب المفرد للبخاری: ۳۲۶

فضول بات چیت:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾[(۱)]. ”وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے۔“

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”انسان کے گناہ کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جو بات سنے اسے بیان کر دے۔“[(۲)]

جب مسلمان کو اس کا یقین ہو گا کہ اس سے اس کی بات چیت پر حساب لیا جائے گا تو وہ بات کم کرے گا، جیسا کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا:

”جو شخص اپنی بات کو اپنا عمل شمار کرے گا تو اس کی بات لایعنی چیزوں میں کم ہو گی۔“[(۳)]

فضول بات چیت اکثر باطل اور نامناسب چیزوں میں مبتلا ہونے کا سبب بن جاتی ہے، اسی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اچھی بات کہنے یا پھر خاموش رہنے کی تاکید فرمائی ہے، جیسا کہ گزرا۔

دورُخا آدمی:

دورُخ یا دو چہروں والے سے دو زبان والا آدمی مراد ہے؛ کیونکہ زبان ہی چہرے کو استقامت یا انحراف میں سے کوئی ایک شکل دیتی ہے۔

دورُخا سے وہ آدمی مراد ہے جو دو دشمنوں کے درمیان آئے جائے اور ہر ایک سے اس کی من مرضی کی بات کرے، جو شخص ایسی حرکت کرے، اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدترین انسان قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا:

”تم روزِ قیامت اللہ کی بارگاہ میں بدترین انسان دورُخے کو پاؤ گے جو اِن لوگوں کے پاس ایک چہرہ لے کر آتا ہے اور اُن لوگوں کے پاس دوسرا چہرہ لے کر۔“[(۴)]

---

(۱) سورۂ ق: آیت: ۱۸

(۲) مسلم: رقم: ۵

(۳) المہذب من احیاء علوم الدین: ۶۶/۲

(۴) متفق علیہ: رقم: ۶۰۵۸، م: ۲۵۲۶

حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:
''جس شخص کے دنیا میں دو چہرے ہوں گے اس کی آخرت میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔''(۱)

کسی آدمی میں اس عادت کے پائے جانے کی علامت اس میں امانت و دیانت کا فقدان ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:
''دورُخے انسان کے لیے زیب نہیں کہ وہ امانت دار ہو۔''(۲)

لعن طعن کرنا:

نبی اکرم ﷺ نے بہت سی احادیث میں لعن طعن کرنے سے منع فرمایا اور واضح کیا ہے کہ مومن لعن طعن کرنے والا نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
''مومن لعن طعن کرنے والا نہیں ہوتا۔''(۳)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:
''مومن نہ طعن کرنے والا ہوتا ہے نہ لعنت بھیجنے والا، نہ بد گو ہوتا ہے اور نہ پھوہڑ وبد تہذیب۔''(۴)

حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:
''لعن طعن کرنے والے قیامت کے دن نہ گواہ ہوں گے اور نہ شفاعت کرنے والے۔''(۵)

حضرت عمران بن حُصینؓ نے بیان کیا کہ اس دوران کہ رسول اکرم ﷺ ایک سفر میں تھے اور ایک انصاری عورت اپنی اونٹنی پر سوار تھی، اونٹنی کچھ بدکی تو اس نے اونٹنی پر لعنت بھیجی، یہ بات

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۴۸۷۳، والدارمی: ۲۷۶۴
(۲) ادب المفرد للبخاری: رقم: ۳۱۶
(۳) سنن ترمذی: رقم: ۲۰۱۹
(۴) ترمذی: رقم: ۱۹۷۷
(۵) مسلم: رقم: ۲۵۹۸

رسول اللہ ﷺ نے سن لی تو فرمایا:

"جو کچھ اس پر ہے، اسے لو اور اسے چھوڑ دو، کہ یہ ملعون ہے۔ حضرت عمران کہتے ہیں: گویا کہ اس وقت بھی میں اُسے دیکھ رہا ہوں کہ وہ اونٹنی لوگوں میں چل پھر رہی ہے، مگر کوئی اسے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔"(۱)

جس شخص پر لعنت بھیجی جائے اگر وہ اس کا اہل نہ ہو تو پھر وہ لعنت کہنے والے پر ہی لوٹ آتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جب بندہ کسی چیز پر لعنت بھیجتا ہے تو لعنت آسمان کی طرف چڑھتی ہے، مگر اس کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں، پھر وہ زمین کی طرف اُترتی ہے تو اس کے دروازے بھی بند کر دئے جاتے ہیں، اس کے بعد دائیں بائیں مڑتی ہے، جب وہ کوئی گنجائش نہیں پاتی تو جس کو لعنت بھیجی گئی ہوتی ہے تو وہ اس کی طرف لوٹتی ہے، اگر وہ اس کا مستحق ہو تو ٹھیک ورنہ لعنت بھیجنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔"(۲)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے: ایک آدمی نے ہوا پر لعنت بھیجی، ایک دوسری روایت میں ہے: عہد نبوی میں ہوا ایک آدمی کی چادر سے الجھ گئی تو اس نے ہوا پر لعنت بھیجی، اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"تم اس پر لعنت نہ بھیجو، اس لیے کہ اُسے یہی حکم ملا ہے، اور جو شخص کسی چیز پر لعنت بھیجتا ہے جو اس کا مستحق نہ ہو تو وہ اس پر لوٹ آتی ہے۔"(۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا: اللہ کے رسول! مشرکین کو بددعاء دیجئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"مجھے لعنت بھیجنے والا بنا کر نہیں مبعوث کیا گیا، بلکہ مجھے تو سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔"(۴)

اس طرح مشرکین تک کے لیے بھی لعنت آپ ﷺ کی زبان مبارک پر جاری نہیں ہوئی۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۵۹۵

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۹۰۵

(۳) ابوداؤد: رقم: ۴۹۰۸۔ ترمذی: رقم: ۱۹۷۸

(۴) مسلم: رقم: ۲۵۹۹

فصل چہارم

گھمنڈ/ خود فریبی اور دھوکہ میں مبتلا ہونا

غرور اور خود فریبی اخلاق رذیلہ میں سے ہے جس سے چھٹکارا پانے کے لئے ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیئے، بہت سی آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے غرور اور خود فریبی سے خبر دار کیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

« فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ »[۱]. "لہذا تمھیں دنیوی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ اللہ کے معاملہ میں بڑا دھوکہ باز (شیطان) تمھیں دھوکے میں ڈالے"۔

نیز ارشاد ہے:

«وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ»[۲]. "دنیوی زندگی صرف دھوکے کا سامان ہے۔"

مزید ارشاد ہے:

«يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَاغَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ»[۳]. "اے انسان! کس چیز نے تمھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے، اپنے رب کے معاملہ میں جو بڑا اکرم والا ہے۔"

حضرت عثمان بن عفانؓ سے روایت ہے؛ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "لَا تَغْتَرُّوْا"۔

"تم لوگ دھوکے میں اور خود فریبی میں نہ پڑو۔"[۴]

اس موقع پر غرور کی حقیقت پر مطلع ہونا بہتر ہے؛ تاکہ اس سے دور رہا جائے۔

غرور نام ہے کسی شبہ اور شیطان کے دھوکہ کے سبب ایسی چیز کی بابت نفس کا اطمینان جو خواہش

---

(۱) سورۂ فاطر: آیت ۲۸۔ سورۂ فاطر: آیت: ۵

(۲) سورۂ آل عمران: آیت: ۱۸۵۔ سورۂ حدید: آیت: ۲۰

(۳) سورۂ انفطار: آیت: ٦

(۴) صحیح بخاری: رقم: ٦۴۲۳

نفس کے مطابق ہو اور طبیعت اس کی طرف مائل ہو، پس جس شخص کا یہ خیال ہو کہ وہ دنیا یا آخرت میں خیر پر ہے جبکہ اس کا منشا کوئی فاسد شبہ ہو تو وہ مغرور[1] ہے۔"[2]

پس مغرور وہ انسان ہے جو خود پسندی میں گرفتار ہو اور اپنی حالت پر مطمئن۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ اور ان کے بعد آنے والے اہل اسلام کو اس بُری خصلت سے ڈرایا کرتے تھے؛ کیونکہ یہ مبتلائے غرور انسان کو بڑی مصیبت اور ہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔

چنانچہ حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"سمجھ دار وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرلے اور مابعد الموت کے لیے عمل کرے اور عاجز و مجبور وہ ہے جو اپنے نفس کو اس کی خواہش کے پیچھے لگادے اور اللہ پر (خواہ مخواہ) امیدیں باندھے۔"[3]

حضرت خارجہ بن زید انصاری سے روایت ہے:

"ایک انصاری خاتون حضرت ام علاءؓ — جنھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست اقدس پر بیعت کی تھی — نے بیان کیا کہ رہائش میں حضرت عثمان بن مظعونؓ کا قرعہ ان کے گھر والوں کے نام نکلا جس وقت انصار نے مہاجرین کو اپنے یہاں رکھنے پر قرعہ اندازی کی۔

حضرت ام علاءؓ کہتی ہیں کہ حضرت عثمان بن مظعون ہمارے گھر پر رہے، جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو ہم نے ان کی تیمارداری کی، جب ان کی وفات ہوگئی تو ہم نے انھیں انہی کے کپڑوں میں بطور کفن لپیٹ دیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے گھر آئے تو میں نے کہا: اے ابو سائب (حضرت عثمان بن مظعونؓ کی کنیت) آپ پر اللہ کی رحمت ہو، میری گواہی آپ کے حق میں ہے، اللہ نے آپ کو عزت بخشی، اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: تمھیں کیسے علم ہوا کہ اللہ نے عثمان کو عزت

---

(۱) امام غزالی نے "غرر" کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ رجاء نام ہے اس چیز کی توقع میں دل کے اطمینان کا جو اس کے نزدیک محبوب ہو، تاہم اس محبوب چیز کے لیے کسی نہ کسی سبب کا ہونا ضروری ہے، اگر انسان کی توقع اس محبوب چیز کے حصول کے اکثر اسباب کی بنا پر ہو تو اس پر "رجاء" کا اطلاق درست ہے، اور اگر اسباب کے فقدان کے ساتھ ہو تو وہ غرر اور "حمق" ہے نہ کہ "رجاء" (المهذب من احیاء العلوم)

(۲) المهذب من احیاء علوم الدین: ۲/۲۲۳

(۳) ترمذی: رقم: ۲۴۵۹۔ ابن ماجہ: رقم: ۴۲۶۰

بخشی ہے؟ میں نے عرض کیا: مجھے بالکل علم نہیں، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اللہ کے رسول! اس پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: جہاں تک عثمان کی بات ہے تو خدا کی قسم اسے موت آگئی ہے، اور میں عثمان کے لیے خیر کی امید رکھتا ہوں، مگر اللہ کی قسم: مجھے معلوم نہیں جبکہ میں اللہ کا رسول ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوگا؟۔"(۱)

اس حدیث میں دو باتیں انتہائی اہم ہیں:

پہلی بات یہ کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ جن کی حضرت ام علاءؓ نے تعریف و تحسین کی وہ سابقین اولین میں سے تھے، حبشہ اور مدینہ منورہ دونوں جگہ ہجرت کی تھی، غزوۂ بدر میں شریک تھے، اور مدینہ منورہ میں وفات پانے والے اولین مہاجر صحابی تھے۔

دوسری بات حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد جبکہ آپ صادق و مصدوق ہیں—"واللہ ما أدری وأنا رسول اللہ مایفعل بی" درحقیقت یہ ایسی بات ہے جہاں ٹھہر کر دیر تک غور کرنا چاہیے۔

لہذا کوئی عالم اپنے علم کی وجہ سے غرور میں مبتلا نہ ہو۔

نہ کوئی عمل کرنے والا اپنے عمل کی وجہ سے۔

نہ کوئی عبادت گزار اپنی عبادت کی وجہ سے۔

اور نہ کوئی خرچ کرنے والا اپنے خرچ کرنے کی وجہ سے۔

یہ غرور اور خود فریبی بُری چیز ہے، چاہے یہ دنیاوی امور میں ہو یا اخروی معاملات میں، غرور و خود فریبی جہالت کی پیداوار ہے، بلکہ جہالت ہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:

"اللہ کے خوف و خشیت کے لیے علم کافی ہے اور خود فریبی کے لیے جہالت۔"(۲)

غرور اور خود فریبی کے بہت سے اسباب و محرکات ہیں اور ہر ایک قسم کے غرور کا علاج اس کے سبب و محرک کے اعتبار سے ہی کیا جائے گا۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۱۲۴۳، ۲۶۸۷۔

(۲) المهذب من احياء علوم الدين: ۲۲۸/۲

پس اگر کسی کو غرور اپنے علم کی وجہ سے ہو تو اسے چاہئے کہ متقدمین اہل علم سے اپنے علم کا تقابل کرے، تب اس کی نظر میں اس کے علم کی بے مائیگی ظاہر ہو گی اور پھر اس کا نفس بھی چھوٹا ہو جائے گا، عالم حقانی تو وہ ہے کہ جتنا اس کے علم میں اضافہ ہو اتنا ہی اپنی جہالت پر اس کی معرفت بھی بڑھے۔

اس طرح ہر قسم کی خود فریبی کا علاج اس کے سبب کو مد نظر رکھ کر کیا جائے۔''[1]

---

(۱) المھذب من احیاء علوم الدین: ۲/۲۲۳-۲۴۱۔اس مقام پر امام غزالیؒ نے غرور و خود فریبی کی اقسام اور ان کے علاج کے طریقۂ کار کو بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

فصل پنجم

حسد

حسد انتہائی گندی بیماری ہے، یہ جماعت کو برباد کردیتی اور اس کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے، نیز دلوں میں دشمنی، غیظ و غضب اور کینہ کی آگ بھڑکاتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے اس کے اثرات کی سنگینی کی بابت فرمایا کہ حسد دین کو مونڈ دیتا ہے؛ چنانچہ حضرت زبیر بن عوام سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''تمھارے اندر دوسری امتوں کی بیماری گھس آئی ہے: یعنی حسد اور بغض، یہی مونڈنے والی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بیماری بال مونڈتی ہے؛ بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔''(۱)

نبی اکرم ﷺ نے ایک سے زیادہ احادیث میں باہم حسد کرنے سے منع فرمایا:

''تم ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔''(۲)

حسد ایک نفسیاتی تاثر ہے اللہ کی اس نعمت کے خلاف جو اس نے کسی بندے کو دی، اس نعمت کے زوال کی آرزو کے ساتھ، خواہ حاسد کینہ اور بغض سے متاثر ہو کر اس نعمت کے خاتمے کے لیے کوشش کرے، یا محض نفسیاتی تاثر تک ہی رُکا رہے؛ کیونکہ اس تاثر کے بعد بھی کوئی شر پیدا ہو سکتا ہے۔''(۳)

جب حسد کی یہ صورت حال ہے تو ایسی چیز کو مومن کے دل میں کوئی جگہ نہیں ملنی چاہئے، وجہ یہ ہے کہ ایمان جو خیر و ہمدردی کا نچوڑ ہے اس میں اور حسد میں جو شر کا نتیجہ ہے باہم تضاد پایا جاتا ہے۔

اسی بات کو حدیث شریف میں تاکید سے بیان کیا گیا ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۵۱۰

(۲) بخاری: رقم: ۶۰۶۶، م: ۲۵۶۳

(۳) فی ظلال القرآن، تفسیر سورۂ فلق

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"دو چیزیں کسی بندے کے دل میں جمع نہیں ہو سکتی: ایمان اور حسد۔"[(۱)]

نیز ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ حاسد کے شر سے پناہ طلب کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾[(۲)]. "اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے۔"

بنا بریں مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنا قلب حسد سے پاک کرے، تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء کرنے والا بن جائے۔

☆☆☆

---

(۱) نسائی: ۳۱۰۹

(۲) سورۂ فلق: آیت: ۵

پانچواں مقصد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

آداب کے بیان میں

پہلی فصل

آنحضرت ﷺ کا صحابہ کرام کے ساتھ قرب اختیار کرنا

آنحضرت ﷺ ہمہ وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ رہتے تھے، وہاں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں تھی جو صحابہ کرامؓ کو آپ تک پہونچنے سے روک دے، آپ کے اصحاب رات دن جس وقت چاہتے آپ کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔

حضرت سماک بن حرب سے روایت ہے کہ میں نے جابر بن سمرہؓ سے کہا:

''کیا آپ آنحضرت ﷺ کے ساتھ مجلس میں بیٹھا کرتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں؛ بکثرت اس کا اتفاق ہوتا تھا، رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد اسی مصلے پر سورج طلوع ہونے تک تشریف فرما رہتے، جب سورج نکل آتا تو آپ وہاں سے اٹھتے اور صحابہ کرامؓ دورِ جاہلیت کی باتوں کا آپس میں تذکرہ کیا کرتے اور ہنستے تھے تو آنحضرت ﷺ ان کی باتوں سے مسکراتے''۔(۱)

اور آپ ﷺ کبھی قوم کے بدترین آدمی سے بہت زیادہ توجہ اور خوش اخلاقی سے ملتے اور باتیں کرتے؛ تاکہ وہ آپ سے مانوس ہو جائے، جس سے کبھی اس کو یہ خیال ہوتا کہ میں جماعت کا سب سے اچھا آدمی ہوں''۔(۲)

چنانچہ آپ کے ہر صحابی کو یہ احساس ہوتا کہ میرا آنحضرت ﷺ کے پاس ایک خاص درجہ ومقام ہے، اور میں ہی آپ کا سب سے مقرب ہوں، اس کی ایک اچھی مثال حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے، یہ سن ۸ھ ہجری کے آغاز میں مسلمان ہوئے اور پانچ ہی مہینہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے جھنڈا تیار کیا اور ان کو ذات السلاسل سریہ (مہم) کا امیر بنا کر روانہ کیا، جس میں تین سو صحابہ کرامؓ شامل تھے۔ پھر ان کو کمک پہنچانے کے لیے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو دو سو مہاجرین

---

(۱) مسلم: رقم: ٦٧٠

(۲) الترمذی فی الشمائل

وانصار کے ساتھ بھیجا جس میں ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس جنگی مہم کو سر کرنے کے بعد مدینہ منورہ واپس آئے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو قرب و منزلت حاصل ہوئی اس پر بہت خوش تھے کہ ان کو آپ نے ایسے لشکر کی قیادت سپرد فرمائی جس میں ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما تھے؛ حالانکہ ان کو اسلام لائے ہوئے ابھی چند ماہ گزرے تھے۔

اسی احساس نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے مقام و مرتبہ کو— جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک ان کا ہے— معلوم کریں۔

چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب آپ کے نزدیک کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: عائشہ، حضرت عمرو بن العاص نے کہا اور مردوں میں سب سے زیادہ کون ہے؟ تو ارشاد فرمایا: ان کے والد، میں نے عرض کیا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: عمر بن الخطاب؛ چنانچہ آپ نے متعدد لوگوں کے نام شمار کئے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے خاموشی اختیار کر لی اس ڈر سے کہ کہیں آپ مجھ کو بالکل آخر میں نہ رکھ دیں''۔(۱)

اس واقعہ میں غور کرنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت کریمہ اپنے اندر مختلف پہلو اور بہت وسعت رکھتی تھی، جس کے نتیجہ میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنے بارے میں سمجھنے لگے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب ہو گئے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس خندہ جبینی اور کشادہ قلبی کا پتہ چلتا ہے، جس کا برتاؤ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہر صحابی کے ساتھ کرتے تھے، اور حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو خیبر کے روز جھنڈا دینے کے سلسلہ میں ہے آپ نے فرمایا:

''ضرور کل میں یہ جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ اللہ تعالیٰ فتح نصیب فرمائیں گے، اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اور اس کے رسول اس سے محبت کرتے ہیں، چنانچہ سہل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اگلے دن لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور ہر شخص یہ امید کر رہا تھا کہ

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۶۶۲، ۴۳۵۸، م: ۲۳۸۴

جھنڈا مجھے عنایت ہوگا"۔[۱]

اور اس کے لیے حضرت عمر بن الخطاب، سعد بن ابی وقاص، بریدہ بن الحصیب رضی اللہ عنہم جیسے حضرات اپنی گردنیں اونچی کر کر کے اس کے آرزومند تھے

چنانچہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم میں سے جس شخص کا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک کوئی قرب و مرتبہ تھا وہ اس بات کی امید کر رہا تھا کہ مجھ ہی کو یہ جھنڈا ملے گا؛ یہاں تک کہ خود میں نے اپنی گردن اونچی کر کے اپنے کو اس کا امیدوار سمجھا"۔[۲]

اس واقعہ میں غور کر کے آپ نے دیکھا؛ کس طرح ہر صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنی نزدیکی کو محسوس کر رہا ہے، اسی بنیاد پر اپنے کو اس جلیل القدر عمل کے لائق سمجھ رہا ہے، کیونکہ وہ بھی اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے اور اس بات کو بھی محسوس کرتا ہے کہ اللہ کے رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔

یہ جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو دیکھو؛ جو یہ کہتے ہیں:

"جب میں مسلمان ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہیں بھی حاضر ہونے سے مجھے نہیں روکا اور جب بھی آپ کی نظر مجھ پر پڑتی تو آپ مجھ کو دیکھ کر مسکرانے لگتے"۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ طرز عمل اپنے ہر صحابی کے ساتھ تھا، چنانچہ آپ نے کسی صحابی کو کسی دن بھی حاضر ہونے سے نہیں روکا اور کسی صحابی کو بھی دیکھ کر مسکرانا آپ کی ہمیشہ عادت تھی؛ لیکن حضرت جریر رضی اللہ عنہ اس بات کو بیان کر رہے ہیں جو ان کے ساتھ پیش آئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے اصحاب کی خبر گیری کرنا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اپنے اصحاب کی سفر ہو یا اقامت، خبر گیری اور ان کے حال چال دریافت کرتے رہتے تھے، اگر کسی کی بیماری کی خبر معلوم ہوتی تو آپ اس کی زیارت (عیادت) کے لیے تشریف لے جاتے، ایسی احادیث بکثرت ہیں، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے کسی بیمار صحابی کی

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۲۱۰، م: ۲۴۰۶

(۲) فتح الباری: ۷/۷۷۴

(۳) متفق علیہ: رقم: ۳۰۳۵، م: ۲۴۷۵

عیادت کے لئے تشریف لے جانے کا ذکر موجود ہے۔

اکثر و بیشتر ایسا بھی ہوا کہ آپ کسی سفر میں رہے اور کسی صحابی کو اپنے ساتھ موجود نہیں پایا تو اس کے متعلق دریافت فرمایا: چنانچہ غزوۂ تبوک کا واقعہ مشہور ہے جس میں حضرت کعب بن مالکؓ غیر حاضر تھے، اس وقت مسلمانوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہو چکی تھی کہ اگر کوئی شخص غائب ہونا چاہتا تو وہ سمجھتا تھا کہ یہ بات آپ ﷺ سے پوشیدہ رہے گی، اس سب کے باوجود جب آپ ﷺ تبوک پہنچے اور مجلس میں تشریف فرما ہوئے تو آپ نے دریافت فرمایا: کعب کو کیا ہوا وہ کہاں رہ گئے؟ جیسا کہ آپ ﷺ نے اور بھی بعض لوگوں کے بارے میں معلوم کیا کہ یہ کہاں رہ گئے؟ لوگوں کی تعداد کی کثرت نے آپ ﷺ کو کسی صحابی کو فراموش نہیں کرنے دیا۔

اور اسی روز کا واقعہ ہے کہ دور سے آنے والے ایک شخص کے بارے میں —جو سب سے آخر میں آکر جماعت میں شامل ہو رہے تھے، جن کو آپ جانتے بھی نہیں تھے کہ کون ہیں— آپ نے فرمایا: ابو خیثمہ ہوں گے تو وہ ابو خیثمہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

اسی طرح ابو برزہؓ کی روایت میں اس واقعہ کا ذکر ہے:

''رسول اللہ ﷺ ایک غزوہ میں تشریف لے گئے جس میں مال غنیمت حاصل ہوا، آپ نے اس موقع پر صحابہ کرام سے دریافت فرمایا: تم لوگ کسی کو غائب پا رہے ہو؟ لوگوں نے جواب دیا: ہاں ہم کو فلاں، فلاں اور فلاں شخص نہیں مل رہے ہیں، آپ نے پھر دوبارہ دریافت فرمایا: تم لوگ کسی اور کو بھی اپنے میں سے گم پا رہے ہو؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: ہاں؛ فلاں فلاں شخص موجود نہیں ہیں، پھر آنحضرت ﷺ نے تیسری بار یہی بات دریافت فرمائی کہ کسی اور کو غائب پا رہے ہو؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: مگر مجھ کو میرے جلیبیب نظر نہیں آرہے ہیں، ان کو تلاش کرو، چنانچہ مقتولین کی لاشوں میں ان کو تلاش کیا تو دیکھا کہ وہ سات آدمیوں کے بیچ میں ہیں جن کو انھوں نے قتل کیا تھا پھر مشرکین نے ان کو قتل کر کے مار ڈالا۔'' (مسلم: ۲۶۷۲)

اسی طرح دوسری روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں:

''ایک مرد یا ایک عورت (راوی کو شبہ ہے) جس کا رنگ کالا تھا، مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتا تھا اور اس کی صفائی کرتا تھا، اس کا انتقال ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم نہ ہو سکا، ایک روز آپ نے

اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ شخص کہاں چلا گیا؟ لوگوں نے بتایا کہ اس کا تو انتقال ہو چکا ہے [1] تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی؟"۔[2]

اسی طرح مسلمانوں کے ہر شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نزدیکی وقرب حاصل تھا تو آپ ہر ایک کو پوچھتے تھے اور اس کا حال دریافت فرمایا کرتے تھے، ان کے حالات ومعاملات سے واقفیت حاصل کر کے اطمینان حاصل کرتے تھے، سفر اور جہاد کے مواقع میں آپ کی عادت طیبہ یہ تھی کہ سب کے پیچھے چلا کرتے تھے، اور کسی کو کمزور محسوس کرتے تو اس کو آگے بڑھاتے یا سواری پر اپنے ساتھ لے لیتے تھے، آپ کا پیچھے چلنا اس لیے بھی ہوتا کہ آگے چلنے والے قافلہ کے لیے دعائے خیر کرتے رہیں۔

اسی طرح آپ دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے پُر رعب شخصیت کے مالک ہونے کے باوجود اس بات سے نہیں رُکتے تھے کہ صحابہ کرام کے پاس اٹھیں بیٹھیں، ان سے مزاح ولطف کی باتیں کریں، اور نہ ہی صحابہ کرام کو کوئی رکاوٹ پیش آتی تھی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے تکلف ہو کر صحابہ کرام سے مزاح کی باتیں کیا کرتے تھے اور صحابہ کرام آپس میں بے تکلف ہنسی مزاح کی باتیں کیا کرتے تھے، آگے آنے والے فقرہ میں ہم اس پر بات کریں گے۔

آپ کا صحابہ سے مزاح فرمانا:

جس وقت حضرت حنظلہؓ نے گمان کیا کہ زندگی میں سنجیدہ ہی رہنا چاہئے، لہو ولعب سے بالکل دور، اس لیے انھوں نے یہ سمجھا کہ ہم جو اپنی بیوی بچوں سے ہنسی مذاق کرتے ہیں یہ نفاق ہے اور اس کی شکایت کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لیکن اے حنظلہ! ایسا گاہے گاہے ہوتا ہے (وقت وقت کی بات ہوتی ہے)"۔[3]

اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو آگاہ کیا کہ وقتاً فوقتاً نفوس کو راحت پہنچانا ضروری ہے: تا کہ ان میں تازگی آجائے۔

---

(۱) یہ اس کی وفات کے ایک دو دن بعد کا قصہ ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی قبر پر گئے، اس کے لیے دعا کی یا نماز پڑھی۔ط،ق۔

(۲) متفق علیہ: رقم: ۱۲۳۷، م: ۹۵۶

(۳) مسلم: رقم: ۲۷۵۰

''مزاح'' لہو مباح (جائز) ہے، اسی لیے حضور ﷺ اپنے اصحاب سے مزاح فرمایا کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

''انھوں نے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ ہم سے مزاح فرماتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ: مزاح میں بھی حق ہی بات کہتا ہوں۔''(۱)

ایسا ہی حضور ﷺ کا مزاح ہوتا تھا کہ وہ آپ کو حق اور صدق کے دائرے سے باہر نہیں کرتا تھا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے:

''ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: یا رسول اللہ! مجھے سوار کر دیجیے، (اس نے سواری طلب کی) آنحضور ﷺ نے فرمایا: میں تم کو ایک اونٹنی کے بچے پر سوار کر دوں گا تو اس نے عرض کیا: میں اونٹنی کے بچے کا کیا کروں گا (اس پر میں کیسے سوار ہو سکتا ہوں) تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اونٹوں کو اونٹنیاں ہی جنتی ہیں۔''(۲)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے:

''حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا: (یاذاالاذنین) یعنی اے دو کانوں والے؟ ابواسامہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ ان سے بطور مزاح یہ فرمارہے تھے۔''(۳)

اور تفسیر ابن کثیر میں حضرت حسن سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ حضور ﷺ کی خدمت میں ایک بوڑھی عورت حاضر ہوئی اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ میرے لیے دعا کیجیے کہ اللہ مجھے بھی جنت میں داخل فرمادے تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے فلاں کی اماں! جنت میں تو بوڑھی عورت داخل نہیں ہو سکتی تو وہ عورت روتی ہوئی واپس ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس عورت کو خبر دیدو کہ کوئی عورت جنت میں بوڑھی ہونے کی حالت میں داخل نہیں ہو گی، اللہ فرماتے ہیں:

---

(۱) ترمذی: ۱۹۹۰

(۲) ابوداؤد: ۴۹۹۸، ترمذی: ۱۹۹۱

(۳) ابوداؤد: رقم: ۵۰۰۲، ترمذی: رقم: ۱۹۹۲

اِنَّآ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً ○ فَجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡكَارًا ‌«[۱] کہ ہم نے وہاں کی عورتوں کو ایک خاص طور پر بنایا ہے۔اور ہم نے ان کو پاکیزہ بنایا ہے۔

اور حضور ﷺ نے محمد بن ربیع کے چہرے پر کلی فرمائی جبکہ وہ پانچ سال کے تھے،اس طرح اس بچہ سے مزاح فرماتے تھے۔‘‘[۲]

اور حضرت انسؓ سے روایت ہے:

’’دیہاتیوں میں سے ایک دیہاتی جس کا نام زاہر تھا وہ دیہات کی چیزیں ہدیہ کے طور پر حضور ﷺ کی خدمت میں لایا کرتا تھا اور حضور ﷺ اسے واپسی کے وقت تحفے عنایت فرماتے تھے، اور فرماتے تھے زاہر ہمارے دیہات ہیں اور ہم ان کے شہری ہیں، اور حضور ﷺ ان سے محبت فرماتے تھے جبکہ وہ بدصورت تھے،ایک دفعہ حضور ﷺ اس کے پاس تشریف لائے اور وہ اپنا سامان فروخت کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے پیچھے سے ان کو دبوچ لیا، جبکہ وہ آپ ﷺ کو نہیں دیکھ رہے تھے، تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا، اے آدمی! مجھ کو چھوڑ دے،آخر تم کون ہو تو انھوں نے ترچھی نگاہ سے دیکھا تو پہچان لیا کہ حضور ﷺ ہیں تو پہچاننے کے بعد اپنی پیٹھ کو برابر آپ کے سینے سے چمٹایا اور حضور ﷺ فرماتے رہے کہ کون اس غلام کو خریدے گا تو انھوں نے کہا اے اللہ کے رسول! اس وقت آپ مجھ کو کھوٹا ردی پائیں گے تو حضور ﷺ نے فرمایا: لیکن تم اللہ کے نزدیک کھوٹے نہیں ہو۔‘‘[۳]

اسی طرح حضور ﷺ اپنے اصحاب سے ہنسی مزاح فرماتے تھے، جب اس کا کوئی موقع یا فرصت ہوتی اور چونکہ بعض اوقات مزاح ضروری ہوتا ہے تو آپ ﷺ نے اس کے لیے آداب مقرر فرمائے کہ اس کی رعایت ضروری ہے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ جائز نہیں ہے کہ ایسی کوئی بات کہی جائے جو مخاطب کو بری معلوم ہو یا کوئی اس سے خوف زدہ ہو جائے،اس لیے کہ حدیث پاک میں ہے:

---

(۱) سورۂ واقعہ: آیت: ۳۵۔۳۶

(۲) تفسیر ابن کثیر میں مذکورہ آیت کے تحت۔

(۳) اخرجہ احمد فی المسند: ج: ۱۶۱/۳

"مسلم کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو خوف زدہ کرے۔"[۱]

اور حضور ﷺ نے فرمایا:

"ہر گز تم میں سے کوئی اپنے کسی بھائی کے سامان کو مزاح کے طور پر یا قصداً نہ لے۔"[۲]

نیز مزاح میں یہ جائز نہیں ہے کہ صدق کے دائرہ سے خارج ہو جائے جیسا کہ آپ کی شان تھی، کہ حضور ﷺ نے صرف لوگوں کو ہنسانے کے لیے کوئی جھوٹی بات کہنے سے ڈرایا ہے چنانچہ آپ نے فرمایا:

"ہلاکت ہے اس شخص کے لیے جو بات کرے اور جھوٹ بکے تاکہ لوگ ہنسیں، اس کے لیے ہلاکت در ہلاکت ہے۔"[۳]

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۵۰۰۴

(۲) ابوداؤد: رقم: ۵۰۰۳، ترمذی: ۲۱۶۰

(۳) ابوداؤد: رقم: ۴۹۹۰، ترمذی: رقم: ۲۳۱۵، دارمی: ۲۷۰۲

دوسری فصل
شفاعت کے بیان میں

اللہ نے ارشاد فرمایا:

«مَنۡ یَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنۡ لَّهٗ نَصِیۡبٌ مِّنۡهَا وَ مَنۡ یَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنۡ لَّهٗ كِفۡلٌ مِّنۡهَا وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیۡءٍ مُّقِیۡتًا »[1].

"جو شخص اچھی سفارش کرے گا اس کے لیے (بھی) اس میں حصہ ہے، اور جو شخص بری سفارش کرے اس کو بھی اس میں سے حصہ ملے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔"

شفاعت کی دو قسمیں ہیں: (۱) شفاعت حسنہ۔ (۲) شفاعت سیئہ۔

حضور اقدس ﷺ باہم صلح صفائی اور محبت والفت پیدا کرنے کے لیے برابر شفاعت وسفارش فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ یہ واقعہ ہے:

"حضرت عبداللہ (حضرت جابرؓ کے والد) کی وفات ہوگئی اور ایک یہودی کا قرض ان کے سرپر تھا تو حضرت جابر نے یہودی سے مہلت طلب کی تو یہودی نے انکار کر دیا تو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے شفاعت کے بارے میں عرض کیا تو حضور ﷺ کھڑے ہوگئے اور یہودی کے پاس گئے اور یہودی سے اس کے بارے میں کلام فرمایا۔"[2]

حضرت کعب بن مالک کا ابن ابی حدرد سے قرض کے بارے میں جو کعب ابن مالک کا ابن ابی حدرد پر تھا جھگڑا ہو گیا تو ان کو حضور ﷺ نے پکار کر کہا:

"اے کعب! تو انھوں نے جواب میں کہا: "لبيك يا رسول الله!" میں حاضر ہوں، تو فرمایا: قرض سے اتنا معاف کر دو اور ان کو نصف کا اشارہ فرمایا، تو انھوں نے عرض کیا کہ ایسا کر دیا، یارسول اللہ! اس

---

(۱) سورۂ نساء: آیت: ۸۵

(۲) بخاری: رقم: ۲۳۹۶

کے بعد حضور نے ابن ابی حدرد سے فرمایا اٹھو اور ان کا قرض ادا کرو۔"[۱]

اسی طرح کا واقعہ ہے:

حضرت مغیث حبشی غلام تھے اور ان کی بیوی بھی باندی تھی، ان کا نام بریرہ تھا، اس کے بعد بریرہ آزاد کر دی گئیں جس کی وجہ سے انھوں نے نکاح فسخ کر دیا اور حضرت مغیث ان سے بے حد محبت کرتے تھے تو ان کے پیچھے پیچھے مدینہ کی گلیوں میں گھوما کرتے تھے اور رویا کرتے تھے۔ تو حضرت مغیث کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے سفارش کی اور بریرہ سے کہا:

"کاش! تم اس کے پاس لوٹ جاتیں، تو انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ مجھے اس کا حکم دے رہے ہیں؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا میں سفارش کر رہا ہوں، حکم نہیں دے رہا ہوں تو عرض کیا مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔"[۲]

یہ حضور ﷺ کے شفاعت کے چند نمونے ہیں، خیر اور اصلاح کے میدان میں۔ اور حضور ﷺ نے اعمال خیر کے ان میدانوں میں سفارش کے لیے پیش قدمی کرنے پر اُبھارا ہے اور اپنے اصحاب سے چاہا ہے کہ وہ لوگ بھی ایسا کریں۔

حضرت ابو موسیٰ الاشعری ؓ نے فرمایا: "جب حضور ﷺ کے پاس کوئی سائل آتا، یا کوئی حاجت آپ کے سامنے پیش کی جاتی تو صحابہ ؓ سے فرماتے کہ تم لوگ سفارش کرو تاکہ تم کو اجر و ثواب دیا جائے اور اللہ اپنے نبی کی زبان پر وہی جاری فرمائے گا جو چاہے گا۔"[۳]

شفاعت کسی مسلمان کو بھلائی ملنے کا سبب ہوتی ہے، اور کبھی اس کے لیے آسانی مہیا کرنے کا اور کبھی اس سے کسی ظلم کے دور کرنے کا سبب ہوتی ہے۔ تو شفاعت کرنے والے کو اس کی وجہ سے اجر ملتا ہے اور یقیناً یہ بات من جملہ بخل کے ہے کہ انسان اپنی شفاعت میں بخل کرے جبکہ وہ جانتا ہے کہ وہ کسی تنگ دست یا پریشان حال کو سہولت پہنچانے کا ذریعہ بن سکتا ہے، پس حضور ﷺ کے اس

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۵۷، م: ۱۵۵۸

(۲) بخاری: رقم: ۵۲۸۳

(۳) متفق علیہ: رقم: ۱۴۳۲، م: ۲۶۲۷

سبق کو صحابہ کرام نے محفوظ رکھا۔

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

"سفارش کیا کرو اس کی وجہ سے تم اجر وثواب سے بہرہ ور ہو گے۔ میں ایک کام کرنے کا ارادہ کرتا ہوں مگر اس کو اس لیے مؤخر کرتا ہوں تاکہ تم لوگ شفاعت کرو تاکہ اجر دیئے جاؤ، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سفارش کیا کرو اس کی وجہ سے تم اجر وثواب سے بہرہ ور ہو گے۔"(۱)

تو یہ تھی شفاعت حسنہ یعنی اچھی سفارش۔ (اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی توفیق دے)

اور شفاعت سیئہ یعنی بری شفاعت وہ ہے جو اللہ کی متعین کردہ سزاؤں (وغیرہ) کے بارے میں ہو، جیسا کہ اسامہ بن زید نے اس عورت کے بارے میں سفارش کی جس نے چوری کی تھی، اور اسی طرح ہر وہ شفاعت جس پر کسی انسان پر ظلم مرتب ہو، ظلم کسی حیثیت کا ہو، کیونکہ شریعت مطہرہ نے اس سے منع کیا ہے۔

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۵۱۳۲، نسائی: رقم: ۲۵۵۶

تیسری فصل

مشورہ اور استخارہ کے بیان میں

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾[1]. "اور ان کا کام باہم مشورہ سے طے ہوتا ہے۔"

یہ آیت کریمہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، ایمان والوں اور اپنے رب پر توکل کرنے والوں کے اوصاف کے بیان کے ضمن میں۔

اور مکہ میں اس آیت کا نزول مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے اور غیر مسلموں کے ساتھ ان کی جنگ واقع ہونے سے پہلے ہوا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اجتماعی امر (مشورہ) انتہائی ضروری ہے، حالتِ امن میں بھی اور حالتِ جنگ میں بھی۔ مسلمانوں کی قیادت کے سلسلہ میں بھی یہ ضروری ہے اور اس سے کمتر کسی معاملہ میں بھی، یہاں تک کہ اپنے خاص معاملات میں بھی انسان کے لیے بہتر ہے کہ اپنے کسی معتمد سے مشورہ کرے اور حضور ﷺ اپنے اصحاب سے سب سے زیادہ مشورہ فرماتے تھے۔

اگر ہم اس سلسلے میں مثالیں اور واقعات بیان کریں تو بات بہت طویل ہو جائے گی، اس لیے ہم اس سلسلہ کے کچھ واقعات کو اختصار کے ساتھ درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) حضور ﷺ نے غزوۂ بدر کے دن اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا اور فرمایا: "اشیروا علیّ ایھا الناس" یعنی اے لوگو! مجھے مشورہ دو؛ لہذا مہاجرین وانصار میں سے چند حضرات نے اس سلسلہ میں کلام کیا پھر طے ہوا۔

پھر آپ ﷺ نے حباب ابن منذر کے مشورہ کو میدان جنگ کی جگہ طے کرنے میں اختیار فرمایا، اس کے بعد غنیمتوں کے بارے میں مشورہ ہوا۔

---

(۱) سورۃ الشوری، آیت: ۳۸

(۲) اسی طرح غزوۂ احد کے موقع پر بھی حضور ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا تو ان کی رائے مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کی ہوئی مگر آپ کی رائے مدینہ میں رہتے ہوئے دشمنوں سے لڑنے کی ہوئی، آپ نے صحابہ کی رائے کو اختیار فرمایا اور اپنی رائے کو ترک فرمادیا، اس کے بعد جو ہوا سو ہوا، اس کے باوجود قرآن کریم کی آیات نازل ہوئیں؛ تاکہ مشورہ کی اہمیت کو اجاگر کریں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَ لَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَ شَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ﴾[(۱)]

”پھر تم اللہ کی رحمت کے سبب ہی ان کے لیے نرم ہوئے اور اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمھارے پاس سے بھاگ جاتے، سو انھیں معاف کردو اور ان کے لیے معافی طلب کرو، اور کام میں ان سے مشورہ لو، پھر جب تم کسی کام کا پختہ ارادہ کرچکو تو اللہ پر بھروسہ کرو، بیشک اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔“

(۳) اس طرح غزوہ خندق میں حضور ﷺ نے حضرت سعد ابن عبادہ اور سعد ابن معاذ سے اس معاملہ میں مشورہ فرمایا کہ مدینہ کے پھلوں کا تہائی غطفان کے لوگوں کو دے دیا جائے، تاکہ وہ واپس ہوجائیں، تو ان دونوں حضرات نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کو اس کا منجانب اللہ امر و حکم ہے تو آپ اللہ کے امر کی اتباع فرمائیں۔ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر مجھے اللہ کی طرف سے امر ہوتا تو تم لوگوں سے مشورہ نہ کرتا؛ بلکہ اللہ کے امر کے مطابق عمل پیرا ہوتا، لیکن یہ میری رائے ہے جس کو تم پر پیش کررہا ہوں، تو ان حضرات نے عرض کیا کہ ہماری رائے تو یہ ہے کہ ان کو کچھ نہ دیا جائے، بلکہ تلوار سے کام لیا جائے، حضور ﷺ نے ان دونوں حضرات کی رائے کو قبول فرمایا۔“[(۲)]

اور اسی غزوہ میں حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے کو جو خندق کھودنے کے بارے میں تھی اختیار فرمایا۔

---

(۱) سورۂ آل عمران: آیت: ۱۵۹

(۲) طبقات ابن سعد: ۲/۷۳

(۴)اس طرح عمرۂ حدیبیہ میں جب آپ کو معلوم ہوا کہ قریش نے آپ کے مقابلہ کے لیے بہت لوگوں کو جمع کیا ہے، توآپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! مجھے مشورہ دو، تمھارا کیا خیال ہے کیا میں ان لوگوں کے اہل وعیال کارخ کروں جو ہمیں بیت اللہ سے روک رہے ہیں؟ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: یارسول اللہ! آپ اس بیت پاک کے ارادے سے نکلے ہیں، آپ کسی کے قتل یا کسی سے جنگ کے ارادے سے نہیں نکلے ہیں، اس لیے آپ جس ارادے سے نکلے ہیں (یعنی بیت اللہ کی زیارت وعمرہ) ادھر توجہ فرمائیں۔ جو لوگ اس مقصد میں مانع ہوں گے، رکاوٹ ڈالیں گے تو ہم ان سے قتال کریں گے تو آپ نے فرمایا کہ: امضوا علی اسم اللہ یعنی اللہ کے نام سے اس مقصد کے تحت آگے بڑھو۔"(۱)

گویا آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو مان لیا۔

عزم وپختگی اور عدمِ تذبذب:

یقیناً مشورہ عزم اور کسی فعل کا حتمی ارادہ کرنے سے پہلے ہوتا ہے اور جو آیت کریمہ پہلے لکھی گئی ہے اس سے بخوبی یہی مفہوم ہوتا ہے، وہ آیت یہ ہے:

((وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ۔))

اور غزوہ احد میں حضور ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کے بعد انہی کی رائے پر عمل کیا، بعد میں آپ کے صحابہ اپنی رائے پر شرمندہ ہوئے، اور سمجھے کہ آپ ﷺ کی رغبت وچاہت ہماری رائے کے خلاف ہے، چنانچہ انھوں نے عرض کیا کہ شاید ہم نے آپ کو مجبور کیا، آپ چاہیں تو مدینہ میں ہی رہیں، یعنی مدینہ سے باہر چل کر قتال کے ارادہ کو موقوف فرمادیں۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نبی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ جب وہ زرہ پہن لے تو وہ اس کو بغیر قتال کے اتار دے

اس سے آپ ﷺ نے تردد کی جڑ کاٹ دی؛ کیونکہ تردد عزم کے بعد ضعف وکمزوری اور ناکامی پر ختم ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مشورہ ابتدائی ہو جائے، اس کے بعد عزم کا درجہ ہے (جس سے انسان کو کامیابی نصیب ہوتی ہے)۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۴۱۷۸،۴۱۷۹

استخارہ:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم کو ہر معاملہ میں استخارہ اس طرح سکھاتے تھے جیسے قرآن کی سورت۔ فرماتے تھے کہ جب کوئی کسی کام کا قصد کرے تو چاہیے کہ فرض کے علاوہ دو رکعت نفل نماز پڑھے پھر یہ کہے:

«اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ، اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي -أَوْ قَالَ: فِي عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ - فَاقْدُرْهُ لِي وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي أَوْ قَالَ: فِي عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ فَاصْرِفْهُ عَنِّي وَاصْرِفْنِي عَنْهُ وَقْدُرْلِي الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ رَضِّنِي بِهِ وَيُسَمِّي حَاجَتَهُ»(۱).

" اے اللہ میں تجھ سے تیرے علم کے سبب خیر طلب کرتا ہوں، اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے اور میں نہیں رکھتا، اور تجھ کو علم ہے اور مجھ کو نہیں، اور تو تمام غیبوں کا جاننے والا ہے، اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام (جس کے لیے میں استخارہ کر رہا ہوں) میرے دین، میرے معاش اور میرے انجام کے لیے بہتر ہے یا فرمایا: ابھی یا آئندہ (یہ راوی کا شک ہے ابھی سے دنیا مراد ہے اور آئندہ سے آخرت یا ابھی سے مراد سر دست بالفعل اور آئندہ سے دنیا کا مستقبل) میرے لیے بہتر ہے تو وہ میرے لیے مقدر فرما، اور اس کو میرے لیے آسان فرما، پھر اس میں میرے لیے برکت عطا فرما اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے دین اور میرے معاش اور میرے انجام کے لیے بُرا ہے، یا یہ فرمایا: ابھی یا آئندہ میرے لیے بُرا ہے تو اس کو مجھ سے پھیر دے اور مجھ کو اس سے پھیر دے اور جہاں میرے لیے خیر وبھلائی ہو مقدر فرما، پھر مجھ کو اسی سے راضی کر دے اور اپنی حاجت بیان کرے۔"

فائدہ: مگر افسوس کہ ہم سب سے بے انتہاء اس سلسلہ میں کوتاہی ہو رہی ہے اور ایک اہم سنت کے ترک کے مرتکب وشکار ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس عمل خیر کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

---

(۱) بخاری: رقم: ۶۳۸۲۔

چوتھی فصل

مسجد کے آداب میں

مسجدیں عبادت کی جگہیں ہیں، یہ اللہ کے گھر ہیں، جہاں اس کا نام بلند کرنے اور اس کا ذکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور مسلمانوں کا ان گھروں سے بہت مضبوط تعلق ہے اور وہ دن میں پانچ مرتبہ وہاں کا رُخ کرتے ہیں۔

وہاں جانے، اس میں داخل ہونے، وہاں ٹھہرنے اور وہاں سے نکلنے کے آداب ہیں، لہذا ہر مسلمان کے لیے بہتر ہے کہ ان پر لازمی طور پر عمل کرے، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل کی اقتداء حاصل ہوگی یا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امر کی تنفیذ و تعمیل میسر ہوگی۔

مسجد جانا:

اسلام نے وسائل کو بھی غایات و مقاصد کا حکم دیا ہے، مسجد عبادت کی جگہ ہے اور وہاں جانا عبادت کی طرف جانا ہے اور عبادت اطمینان و سکون ہے، اس لیے مسجد جانے والے کے لیے لازم ہے کہ اس کی رفتار اطمینان و وقار کے ساتھ ہو، اور نماز کے پانے کے لیے جلد باز نہ بنے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”جب نماز کھڑی ہو جائے تو دوڑتے ہوئے نہ جاؤ، بلکہ وقار کے ساتھ چلتے ہوئے جاؤ، جتنی نماز مل جائے پڑھ لو، اور جو فوت ہو جائے اسے پوری کر لو۔ اور مسلم نے اپنی روایت میں اتنا زیادہ کیا ہے کہ اس لیے کہ تم میں کا جو کوئی نماز کا قصد کر کے جاتا ہے تو اس کا شمار نماز ہی میں ہوتا ہے۔“[1]

پس مسلم کی روایت سے وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ طریق میں وقار و سکون مطلوب ہے، اس لیے کہ نماز کے لیے چلنا بھی نماز کے حکم میں ہے۔

مسجد میں داخل ہونا:

جب مسجد پہنچے تو اس کے داخلہ کے لیے پہلے دایاں پاؤں رکھے پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجے اس کے

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۹۰۸۰، م: ۶۰۲

بعد کہے: ''اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ'' اے اللہ میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیجئے۔

اور حضرت ابو حمید یا ابو اسید انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو پہلے حضور ﷺ پر سلام بھیجے پھر کہے ''اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ'' اور جب نکلے تو یہ کہے: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ'' اے اللہ میں آپ سے آپ کے فضل کا سوال کرتا ہوں۔

تحیۃ المسجد:

اور جب مسجد میں داخل ہو جائے تو مناسب نہیں کہ بغیر دو رکعت نماز پڑھے بیٹھے، حضرت قتادہ اسلمی سے روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں کا کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے۔''(۱)

فائدہ: اس لیے لوگوں کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ اس میں تاکیدی سنت پر عمل کی دولت نصیب ہو، ہمارے ملک میں اس سلسلہ میں خواص و عوام سے کوتاہی ہو رہی ہے، العیاذ باللہ۔

گردن پھلانگ کر جانے کی کراہت:

چونکہ نبی ﷺ نے صف اول کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور اس کی طرف پیش قدمی کی رغبت دلائی ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ نے نماز کے لیے جلد از جلد جانے پر ابھارا ہے، تاکہ صف اول میں جگہ مل جائے، نہ یہ کہ آئے تو سب سے اخیر میں مگر سب کی گردنوں کو پھلانگتے ہوئے صف اول تک پہنچنے کی خواہش کرے۔

حضرت عبد اللہ بن بسر سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا:

''ایک آدمی جمعہ کے دن لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتے ہوئے آگے جا رہا تھا اور حضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے، یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے ناخوش ہو کر اس آدمی سے کہا کہ بیٹھ جاؤ، تم تکلیف پہنچا چکے۔''(۲)

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۴۴، م: ۷۱۴

(۲) ابوداؤد، رقم: ۱۱۱۸، نسائی: ۱۳۹۸

مسجد میں ٹھہرنے کے آداب:

مسجد کی حرمت کی رعایت ضرور کرنی چاہیے پس اس میں آواز بلند نہ کرنی چاہیے۔

حضرت سائب ابن یزید نے کہا:

’’میں مسجد میں کھڑا تھا تو میرے ساتھ ایک آدمی اور آ گئے، دیکھا کہ وہ عمر ابن الخطابؓ ہیں۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جاؤ ان دونوں کو لاؤ، میں ان دونوں کو لے کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان دونوں سے دریافت کیا کہ تم کون ہو، یا یہ کہا کہ: کہاں سے تم لوگ آئے ہو؟ ان دونوں نے کہا کہ ہم لوگ طائف کے باشندے ہیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ اس شہر کے ہوتے تو میں تم کو سزا دیتا، تم لوگ حضور ﷺ کی مسجد میں اپنی آوازوں کو بلند کرتے ہو۔‘‘(۱)

اور مسجد میں وہ شخص داخل نہ ہو جس نے کچا لہسن اور پیاز (۲) کھایا ہو۔ اور احادیث اس سلسلہ میں بہت ہیں۔

مسجد میں قیام کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اُس میں گمشدہ چیزوں کا اعلان نہ کرے۔ اور مسجد میں ٹھہرنا عبادت ہے خواہ انتظارِ نماز میں ہو یا اس کے بعد۔

مسجد سے نکلنے کے آداب:

جب مسجد سے نکلے تو بائیں پیر کو پہلے نکالے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ کہے: ’’اَللّٰھُمَّ اِنِّي اَسۡأَلُكَ مِنۡ فَضۡلِكَ‘‘ اے اللہ میں آپ سے آپ کا فضل چاہتا ہوں۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۴۷۰

(۲) بیڑی اور سگریٹ جیسی بدبودار چیزوں کا بھی یہی حکم ہے..... پیشہ ورانہ گندے، بدبودار کپڑے پہن کر مسجد میں آنے والے کا بھی یہی حکم ہے، مسجد کی نظافت اور خوشبودار فضا کی حفاظت از بس ضروری ہے، ایسے لوگ اپنے گھروں یا اپنے کام کی جگہوں پر نماز ادا کر لیں، مسلمانوں اور فرشتوں کو تکلیف نہ پہنچائیں۔

پانچویں فصل
آداب مجلس میں

حضور ﷺ اپنے اصحاب کے مقتدا تھے، ہر عمل میں جس کو آپ کرتے تھے خواہ عبادت ہو یا ادب، آپ ﷺ کے اصحاب ہر چھوٹی بڑی چیز میں آپ ﷺ کی اقتدا کرتے تھے۔ اور اس فصل میں ہم اُس ادب کے متعلق گفتگو کریں گے جس ادب کا آپ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ ہم نشینی میں خیال رکھتے تھے۔

جہاں مجلس ختم ہوتی ہے:

حضور ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب آپ اپنے اصحاب کے پاس تشریف لاتے تو جہاں مجلس تمام ہوتی وہاں ہی بیٹھ جاتے؛ اس لیے جب کوئی پردیسی آتا تو آپ کو صحابہ سے ممتاز نہ کر پاتا، جس کی وجہ سے آپ کے متعلق اہل مجلس سے دریافت کرتا کہ آپ ﷺ کون ہیں؟

بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی ہے:

''ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی اونٹ پر سوار ہو کر وارد ہوا، اس نے اونٹ کو بٹھایا، باندھا، اس کے بعد اس نے لوگوں سے کہا کہ تم میں محمد کون ہیں؟ اور حضور ﷺ ان کے درمیان ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، تو ہم نے کہا یہ ہیں جو گورے ہیں اور ٹیک لگائے ہوئے ہیں۔''(۱)

اور حضرت ابوذر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''حضور ﷺ اپنے اصحاب کے درمیان بیٹھے ہوئے ہوتے تھے، یہاں تک کہ جب کوئی مسافر پردیسی آتا تو نہیں پہچان پاتا کہ رسول اللہ کون ہیں، یہاں تک کہ سوال کرتا کہ رسول اللہ کون ہیں؟۔''(۲)

---

(۱) بخاری: رقم: ۶۳

(۲) ابوداؤد، رقم: ۴۶۹۸، نسائی: ۵۰۰۶

اسی ادب کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سیکھا ہے، اور اسی پر وہ عمل پیرا تھے۔
اور حضرت جابر ابن سمرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:
''جب ہم حضور ﷺ کی خدمت میں آتے تو ہم میں سے ہر شخص مجلس کے آخر میں بیٹھ جاتا۔''(۱)

اور حضور اقدس ﷺ دو آدمیوں میں بغیر ان کی اجازت کے گھسنے سے منع فرماتے۔(۲)
حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں:
''آپ نے فرمایا کہ آدمی کے لیے حلال نہیں ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان بیٹھ کر باہم تفریق کرے ہاں اگر وہ اس کی اجازت دیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔''(۳)
اسی طرح حضور ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر اس کی جگہ خود بیٹھ جائے، جیسا کہ بخاری، مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
''کوئی آدمی دوسرے آدمی کو اس کی جگہ سے نہ اٹھائے کہ پھر وہ اس جگہ میں بیٹھ جائے۔''(۴)
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:
''ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایک آدمی اپنی مجلس سے اٹھا اور آنے والا اس جگہ بیٹھنے کے لیے گیا تو اس سے حضور ﷺ نے اسے منع فرمایا۔''(۵)

آنے والے کے لیے کھڑا نہ ہونا چاہیے:

حضور ﷺ اس بات کو ناپسند فرماتے تھے کہ ان کے اصحاب ان کے لیے کھڑے ہوں۔

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۴۸۲۵، نسائی: رقم: ۲۷۵۲
(۲) چوں کہ آدمیوں کے درمیان میں بیٹھ جانا جس سے دونوں ساتھیوں میں علیحدگی ہو عموماً لوگوں کو ناگوار ہوتا ہے، اس لیے حضور ﷺ نے اس معمولی کلفت جو مسلمانوں کو پہنچے اس سے امت کو منع فرمایا ہے۔
(۳) ابوداؤد: رقم: ۴۸۴۴، ترمذی: رقم: ۲۷۵۲
(۴) متفق علیہ: رقم: ۶۲۲۹، م: ۲۱۷۷
(۵) ابوداؤد: رقم: ۴۸۲۸

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''صحابہ کے نزدیک کوئی شخص حضور ﷺ سے زیادہ محبوب نہ تھا، مگر وہ لوگ جب آپ کو دیکھتے تو کھڑے نہ ہوتے تھے، اس لیے کہ وہ آپ کی ناپسندیدگی کو جانتے تھے۔''(۱)

اور حضرت معاویہؓ سے مروی ہے:

''میں نے حضور ﷺ سے سنا کہ جو شخص یہ پسند کرے کہ لوگ کھڑے ہو کر اس کا اکرام کریں تو چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔''(۲) اعاذنا اللہ۔

پہلے سے بیٹھا ہوا آدمی اپنی جگہ کا زیادہ مستحق ہے:

جب کوئی آدمی اپنی نشست گاہ سے کسی حاجت کی بنا پر اٹھا اور اس کی نیت ہے کہ واپس آئے گا تو وہ اس نشست گاہ کا زیادہ مستحق ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے راویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص اپنی مجلس سے اٹھا پھر اس کے بعد وہاں لوٹ کر آیا تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔''(۳)

باہم راز کی باتیں کرنا:

حضور ﷺ نے مجلس میں جب تین شخص ہوں تو باہم دو شخصوں کو سرگوشی کرنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ یہ دونوں آدمی مجلس کے تیسرے شخص سے اپنی باتوں کو چھپا رہے ہوں اس سے تیسرے پر طبعی طور پر بُرا اثر ہوگا، ان دونوں کے نقطۂ نظر سے وہ یہ سمجھے گا کہ یہ دونوں مجھے اپنی بات سنانے کا اہل نہیں گردان رہے ہیں، اس کی وجہ سے وہ حزین و غمگیں ہوگا اور ممکن ہے کہ ان کے خلاف کینہ اور کراہت اپنے جی میں بٹھالے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب لوگ تین ہوں تو دو شخص ایک کو چھوڑ کر راز و نیاز کی باتیں نہ کریں۔''(۴)

---

(۱) ترمذی: ۲۷۵۴، والبغوی فی الانوار: ۳۹۲

(۲) ابوداؤد: ۵۲۲۹، ترمذی: ۲۷۵۵

(۳) مسلم: ۲۱۷۹

(۴) متفق علیہ: رقم: ۶۲۸۸، م: ۲۱۸۳

اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جب لوگ تین ہوں تو دو شخص ایک کو چھوڑ کر راز و نیاز کی باتیں نہ کریں، اس لیے کہ یہ عمل اس تیسرے آدمی کو غمگین کرتا ہے۔''(۱)

ہاں اگر تین سے زیادہ افراد ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ اس وقت تیسرے کے دل میں رنج کی کیفیت نہیں ہو گی، کیونکہ وہاں اس کے ساتھ چوتھا شخص ہو گا یا اس سے زیادہ، جبکہ چوتھا یا اس سے زیادہ اشخاص ہوں گے۔

بات کرنے کے آداب:

مجالس میں گفتگو کا ادب یہ ہے کہ انسان اپنے سے عمر میں بڑے کے سامنے گفتگو میں پہل نہ کرے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''ہم میں سے وہ نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کا شرف نہ پہچانے۔''(۲)

اور حضرت عبداللہ ابن سہل رضی اللہ عنہ کے قتل کے مقدمہ میں جو حویصہ رضی اللہ عنہ اور محیصہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو محیصہ رضی اللہ عنہ بات کرنے لگے جبکہ وہ چھوٹے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بڑوں کو بولنے دو، تو حویصہ رضی اللہ عنہ نے کلام کیا۔(۳) اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان آداب شریفہ پر مشرف بہ عمل ہوئے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے اصحاب سے دریافت فرمایا کہ درختوں میں ایک ایسا درخت ہے جس کے پتے (موسم خزاں میں) نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان کے مثل ہے، بتلاؤ وہ کونسا درخت ہے؟ تو لوگ جنگل کے درختوں میں غور کرنے لگے اور میرے دل میں یہ بات آئی کہ وہ درخت کھجور کا ہے، مگر میں نے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما جیسے اکابر کو دیکھا کہ وہ لوگ خاموش ہیں، بول نہیں

---

(۱) متفق علیہ: ۶۲۹۰، م: ۲۱۸۳

(۲) ابوداؤد: ۴۹۴۳، ترمذی: ۱۹۲۰

(۳) بخاری: رقم: ۷۱۹۲، مسلم: رقم: ۱۶۶۹

رہے ہیں، تو اس غایتِ ادب سے میں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ میں بولوں جبکہ میں قوم میں سب سے چھوٹا ہوں، اس لیے خاموش رہا۔ تو صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ ہی ایسے درخت سے ہم کو مطلع فرمایئے؟ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔''(۱)

تو اس طرح ادب اور حیاء نے حضرت عبداللہؓ کو کلام سے باز رکھا، جبکہ اس مجلس میں عمر اور مرتبہ کے لحاظ سے ان سے بڑے موجود تھے۔

ایسے ہی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا حال ہوا کہ حضرت امیر المومنین عمر بن الخطابؓ کی مجلس میں سن رسیدہ مشائخ بدر کے ساتھ حاضر تھے، ابھی نوجوان تھے، حضرت عمرؓ نے سورہ ''اذا جاء نصر اللہ... الخ تک تلاوت کر کے فرمایا:

''تم لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ تو بعض نے جواب دیا کہ اللہ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم اللہ کی حمد کریں اور استغفار کریں جبکہ ہماری اللہ کی طرف سے مدد کی جائے اور ہم فتح سے ہم کنار ہوں، اور بعض نے کہا کہ ہم نہیں جانتے۔

تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ اے ابن عباس تم بھی یہی کہتے ہو؟ تو عرض کیا کہ نہیں، تو فرمایا کہ آخر تمھاری کیا رائے ہے؟ تو عرض کیا کہ اللہ نے اس سورت کو نازل فرما کر حضور ﷺ کو ان کی وفات سے آگاہ فرمایا کہ جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح مکہ مکرمہ کے شرف سے مشرف ہو جائیں تو سمجھ لیں کہ اب موت قریب ہے۔

لہذا اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور اس ذات پاک سے مغفرت طلب فرمائیں، پس وہ کریم ذات بہت ہی توبہ کو قبول فرمانے والی ہے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم جو سمجھ رہے ہو وہی میں بھی سمجھ رہا ہوں۔''(۲)

اس طرح ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے جب سوال کیا گیا تب ہی جواب دیا، اس لیے کہ اس مجلس میں ان کے بڑے موجود تھے اور یہ ادب اسلامی کے التزام واہتمام کی وجہ سے تھا۔

---

(۱) متفق علیہ: ۷۲،۱۳۱،۴۶۹۸، م: ۲۸۱۱

(۲) بخاری: رقم: ۴۲۹۴

چھینک کا بیان

چھینک غیر اختیاری امر ہے، انسان کو اچانک پیش آجاتی ہے، جبکہ وہ لوگوں کے مجمع میں ہوتا ہے: حضور ﷺ نے اس کے صادر ہونے کے وقت ایک ادب قولی اور ایک ادب عملی کو اپنی سنت قرار دیا ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

''حضور ﷺ کو جب چھینک آتی تو حضور ﷺ اپنے ہاتھ یا کپڑے کو منہ پر رکھ لیتے اور اس کے ذریعہ اپنی آواز پست فرماتے۔''(۱)

پس آپ کی یہ سنت فعل کے اعتبار سے ہے، اور قولی سنت کے لیے فرمایا:

''جب تم میں کسی کو چھینک آئے تو ''اَلْحَمْدُلِلّٰہ'' کہے، اور اس کا بھائی یا ساتھی ہو تو ''یَرْحَمُكَ الله'' کہے (یعنی اللہ تم پر رحم فرمائے) پھر اس کے بعد چھینکنے والا کہے: ''یَھْدِیْکُمُ اللهُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ'' یعنی اللہ تم کو ہدایت دے اور تمھارے حال درست فرمائے۔''(۲)

''اور جب کسی کو چھینک بار بار آنے لگے تو اس کے لیے ''اَلْحَمْدُلِلّٰہ'' کہنے کے جواب میں تین مرتبہ ''یرحمك الله'' کہے، اور اگر اس سے زیادہ چھینک آئے تو اب اسے ''اَلْحَمْدُلِلّٰہ'' کے جواب میں ''یَرْحَمُكَ الله'' کہنے کی حاجت نہیں ہے، اس لیے کہ اب وہ زکام کا مریض ہو گیا۔''(۳)

یعنی اب اس کے بعد تشمیت یعنی ''یَرْحَمُكَ الله'' کہنے کی حاجت نہیں ہے۔

مسلمان کے لیے لازم ہے کہ ان آداب کا ضرور لحاظ کرے، اگرچہ تنہا کیوں نہ ہو، پس جب چھینک آئے تو اللہ کی حمد کرے، اور اپنے ہاتھ کو منہ پر رکھ لے اور اس کے ذریعہ اپنی آواز کو پست کرے، تاکہ حضور ﷺ کی سنتوں میں ایک سنت کی مطابقت ہو جائے، اس لیے کہ یہ سنت ایسی نہیں کہ اس پر عمل صرف مجمع میں کیا جائے اور تنہا ہونے کی صورت میں اس سے گریز کیا جائے۔

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۵۰۲۹، ترمذی: ۲۷۴۵

(۲) بخاری: رقم: ۶۲۲۴

(۳) ابن ماجہ: ۳۷۱۴

جمائی کا بیان:

تثاؤب یعنی جمائی چھینک سے الگ ہے، اور کسل و سستی کی علامت ہے، انسان کو چاہیے کہ اس کو روکنے کی پوری کوشش کرے، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث میں ہے:

''حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تثاوب یعنی جمائی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے، جب یہ آئے تو حتی الوسع اس کو روکنا چاہیے، اس لیے کہ جب تم جمائی کے وقت ''ہائے'' کہتے ہو تو شیطان ہنستا ہے۔''(۱)

اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب جمائی آئے تو اپنے ہاتھ کو اپنے منہ پر رکھ کر بند کر دے، اس لیے کہ شیطان منہ میں داخل ہو جاتا ہے۔''(۲)

اور ہاتھ کا منہ پر رکھنا جمائی کی آواز کو دھیما اور پست کر دیتا ہے، اور پورے منہ کے کھلنے کو روک دیتا ہے، اس کے علاوہ جمائی کے وقت ہاتھ کا رکھنا انسان کے چہرہ کی بد صورتی کو چھپاتا ہے۔

ڈکار کا آنا:

ڈکار ایک ہوا ہے جو کھانے سے آسودگی کے وقت منہ سے نکلتی ہے اور معاشرہ کے نزدیک بُرا فعل ہے، اور انسان پر لازم ہے کہ اس کے اسباب کے ارتکاب سے بچتے ہوئے اس بُرے فعل سے اجتناب و پرہیز کرے، پس جبکہ آسودگی اور پیٹ میں غذا کی کثرت ہو گی تو اس کی وجہ سے ڈکار آئے گی تو چاہیے کہ انسان اس سے بچے، اور رسول اللہ ﷺ نے پیٹ بھرنے سے (شکم سیر ہو کر کھانے سے) منع فرمادیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے راویت ہے:

''ایک آدمی نے حضور ﷺ کے پاس ڈکار لی تو ارشاد فرمایا کہ اپنی ڈکار کو ہم تک پہنچنے سے روکو، اس لیے کہ دنیا میں بہت زیادہ شکم سیر ہونے والا قیامت کے دن بہت طویل بھوک والا ہو گا۔''(۳)

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۲۸۹، م: ۲۹۹۴

(۲) مسلم: ۲۹۹۵

(۳) ترمذی: ۲۴۷۸، ابن ماجہ: ۳۳۵۰

اور ڈکار کو روکنا منہ پر ہاتھ رکھنے سے ہو گا جیسا کہ جمائی میں کیا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ آواز کو پست کرتا ہے اور منہ کی بدبو کو پھیلنے سے باز رکھتا ہے۔

ذکر کی مجالس:

کسی قوم کے لیے مناسب نہیں ہے کہ اپنی پوری مجلس میں فضول کلام میں مشغول رہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرے، اس سے حضور ﷺ نے ڈرایا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

کوئی قوم جو کسی مجلس میں بیٹھتی ہے اور اس میں اللہ کا ذکر نہیں کرتی ہے، تو یہ اس مجلس سے ایسے اٹھتی ہے جیسے کسی مردار گدھے کے پاس سے اٹھی ہو، اور یہ ان کے لیے باعث حسرت ہو گی۔"[1]

مجلس کا کفارہ:

حضرت ابو برزہ اسلمی سے روایت ہے کہ حضور ﷺ جب کسی مجلس سے اٹھنے کا ارادہ فرماتے تو فرماتے تھے:

«سبحانك اللّٰهم وبحمدك اشهد ان لا اله الاّ انت استغفرك واتوب اليك»[2].

"اے اللہ میں تیری تسبیح و تحمید کرتا ہوں، گواہی دیتا ہوں کہ تیرے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں، تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور تیری جانب رجوع ہوتا ہوں۔"

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص کسی مجلس میں بیٹھا اور اس میں بہت سی لغو ولایعنی باتیں کیں، مگر مجلس سے اٹھنے سے پہلے ہی یہ کہہ لیا: "سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله الاّ انت استغفرك واتوب اليك" تو اس کی مجلس میں جو کچھ ہوا اس کی معافی ہو جائے گی۔"[3]

---

(۱) ابوداؤد: ۴۸۵۵

(۲) ابوداؤد: ۴۸۵۹، دارمی: ۲۶۵۸

(۳) ابوداؤد: رقم: ۴۸۵۸، ترمذی: رقم: ۳۴۳۳

مجلس سے واپس ہونا:

مجلس کے آداب میں یہ بھی ہے کہ جب کسی قوم وجماعت کی مجلس میں داخل ہو تو سلام سے ابتدا کرے اور ایسے ہی جب لوٹنے کا ارادہ کرے تو ایسے ہی سلام کر کے واپس ہو۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جب آدمی کسی مجلس میں جائے تو سلام کرے اور جب واپسی کا ارادہ کرے تب بھی سلام کرے۔ پہلا سلام اخیر کے سلام سے زیادہ حق دار نہیں ہے۔"(۱)

یعنی دونوں برابر ہیں، اس لیے آتے جاتے دونوں وقت سلام کرنا چاہیے۔

(۱) ابوداؤد: رقم: ۵۲۰۸

چھٹی فصل

راستے کے آداب

راستے لوگوں کے ملنے جلنے اور یکجا ہونے کے مقامات ہیں، اس لیے اس کے لیے چند اسلامی آداب ہیں جس کو حضور ﷺ نے اپنے قول و عمل سے بیان فرمایا ہے۔

چلنے کا طریقہ:

حضور ﷺ کے چلنے کے طریقہ کے متعلق مقصد ثانی میں حدیث گذر چکی ہے، اس کو وہاں دیکھ لیا جائے۔

سلام کرنا:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مسلمان کے ہر مسلمان پر چھ حق ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب اس سے ملاقات ہو تو اس کو سلام کرو۔"(۱)

اسلامی معاشرہ، بھائی چارگی، باہم مودت و محبت کا معاشرہ ہے اور سلام کا ہدیہ لوگوں کے درمیان ان معانی اور روابط کی تقویت و تاکید کا وسیلہ ہے۔

چنانچہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"قسم ہے اس ذات کی میری جان جس کے ہاتھ میں ہے، بغیر ایمان کے تم لوگ جنت میں داخل نہیں ہو سکتے اور مومن نہیں رہ سکتے جب تک باہم محبت نہ کرو۔ تو کیا میں تم لوگوں کو ایسے عمل سے خبردار نہ کردوں کہ اگر تم اس کو بجالاؤ تو باہم محبت کرنے لگو گے تو سنو وہ یہ ہے کہ باہم سلام کی اشاعت کرو۔"(۲)

اسی لیے حضور ﷺ کی طرف سے سلام کی بہترین ترغیب یوں وارد ہے کہ سلام کرو جس کو

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۱۶۲

(۲) مسلم: رقم: ۱۴۹، ابوداؤد: رقم: ۵۱۹۳، واللفظ لأبی داؤد

پہچانتے ہو، اور اس کو بھی جسے نہیں پہچانتے ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے:

''ایک شخص نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کیا کہ ''اسلام میں کونسا اسلام بہتر ہے؛ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کھانا کھلانے کا اہتمام کرو، اور جس کو پہچانو یا نہ پہچانو تو اس کو سلام کیا کرو۔''(۱)

سلام کے کچھ اصول و قواعد ہیں، سب پر مختلف احوال میں عمل پیرا ہونا چاہیے:

ا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سوار پیدل چلنے والے کو، اور پیدل چلنے والا بیٹھے رہنے والے کو اور کم تعداد والی جماعت بڑی تعداد والی جماعت کو سلام کرے۔''(۲)

نیز فرمایا:

''چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔''(۳)

''اور خود حضور ﷺ کا جب گزر بچوں پر ہوتا تو ان کو سلام کرتے۔''(۴)

جسم پر اٹھائی چیز سے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچائیں:

راستہ تمام لوگوں کی ملک ہوتا ہے، اس لیے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایسی چیز ڈھوئے یا کہیں پہنچائے جس سے کسی کو تکلیف پہنچے۔

حضرت ابو موسی اشعریؓ حضور ﷺ سے روایت فرماتے ہیں:

''تم میں کا کوئی جب ہماری مسجدوں سے گزرے یا ہمارے بازار سے گزرے اور اس کے ساتھ تیر ہو تو اس کی نوک کو پکڑے تاکہ مسلمانوں میں سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔''(۵)

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۱۲، م: ۳۹

(۲) متفق علیہ: رقم: ۶۲۳۲، م: ۲۱۶۰

(۳) بخاری: رقم: ۶۲۳۱

(۴) متفق علیہ: رقم: ۶۲۴۷، م: ۲۱۶۸

(۵) متفق علیہ: رقم: ۷۰۷۵، م: ۲۶۱۵

فقہائے کرام نے احکام کی تفصیل بیان فرمادی ہے، اس شخص کے بارے میں جس نے راستہ کا غلط طریقہ سے استعمال کیا، جیسے اس نے اپنی سواری کو تنگ راستہ میں باندھ دیا یا اپنی لکڑیوں کے گٹھے کو راستے میں رکھ دیا۔

راستے سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنا:

جب راستہ عام نفع کے لیے ہے تو ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ اس کی صفائی کی حفاظت اور اس سے تکلیف دہ چیزوں کو دور کرنے کی سعی کرے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

''میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! مجھے ایسی چیز کی تعلیم دیجئے جس سے میں منتفع ہوں، نفع اٹھاؤں تو ارشاد فرمایا مسلمانوں کے راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو دور کرو۔''(۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

''حضور ﷺ نے فرمایا: ایک شخص کسی راستہ پر چل رہا تھا کہ ایک کانٹے کی ٹہنی سامنے آگئی تو اس نے اسے راستے سے ہٹا دیا تو اللہ کو یہ بات پسند آئی اور اس کے عمل کو قبول فرمایا اور مغفرت فرمادی۔''(۲)

نیز حدیث میں حضور ﷺ کا یہ قول وارد ہوا ہے:

«وتميط(۳) الأذى عن الطريق صدقة»(۴). ''تکلیف دہ چیز کو راستہ سے دور کرو تو یہ صدقہ ہے۔''

جب معاملہ ایسا ہے تو پھر مسلمان کے لیے ایسا کرنا یا مسلمانوں کے راستہ میں ایسی چیز ڈال دینا جو اس کے لیے باعث اذیت ہو نہایت ہی بری حرکت ہے۔

اور مسلمانوں کی سوجھ بوجھ اس معاملہ میں اس حد تک بلند ہے کہ ان کے اماموں نے من جملہ

---

(۱) مسلم: ۲۶۱۸، وابن ماجہ: ۳۶۸۱

(۲) متفق علیہ: رقم: ۶۵۲، م: ۱۹۱۴

(۳) اماطۃ الاذی، یعنی ایذا کو دور کرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ تھوک اور بلغم راستہ میں نہ ڈالو اور اگر مضطر ہو تو کم سے کم اتنا تو کرے کہ تھوک یا بلغم کو اپنے جوتے سے اس طرح پونچھ دو کہ اس کا اثر جلد ختم ہو جائے

(۴) متفق علیہ: رقم: ۲۹۸۹، م: ۱۰۰۹

اپنے واجبات کے ایک واجب اس کو بھی شمار کرایا ہے۔

یہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ہیں کہ جب بصرہ تشریف لائے تو اہل بصرہ سے فرمایا کہ مجھ کو تم لوگوں کے پاس حضرت عمر ابن الخطابؓ نے بھیجا ہے تاکہ تم کو تمھارے رب کی کتاب اور سنتیں سکھاؤں اور تمھارے راستوں کو صاف ستھرا کروں۔

پس اس سے ثابت ہوا کہ اس کام کو انجام دینا اور اس کی نگرانی کرنا حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری ہے، اور لوگوں کو مفاد عامہ کی چیزوں کے متعلق ان کی ذمہ داریوں کو بتلانا ضروری ہے۔

راستہ پر بیٹھنے کا ادب:

راستے بیٹھنے کی جگہیں نہیں ہے، مگر جس راستہ پر لوگوں کا گزر کم ہوتا ہے، وہاں لوگوں کا بیٹھنا ہو جاتا ہے، اور ایسا شہر کے اطراف میں ہوتا ہے۔

اولاً حضور ﷺ نے راستہ پر بیٹھنے سے منع فرمایا، مگر پھر چند شرائط کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

چنانچہ ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"تم لوگ راستوں پر بیٹھنے سے اپنے کو بچاؤ تو صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! ایسا کرنا تو ہمارے لئے ضروری ہے، بغیر اس کے چارہ ہی نہیں، یہ ہماری مجالس ہیں، جن میں ہم باتیں کرتے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا جب تم لوگ بیٹھنا ضروری سمجھتے ہو تو راستہ کا حق ادا کرو، تو صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! راستہ کا کیا حق ہے؟ تو فرمایا: آنکھوں کو جھکائے رکھنا، ایذاء سے دوسروں کو بچانا اور سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے باز رکھنا۔" (۱)

اور ایک روایت میں اتنی زیادتی ہے کہ:

راستہ بتلانا، راستے پر بیٹھنے کے شرائط میں سے ہے۔ (۲)

اور ایک روایت میں حضرت عمر ابن خطابؓ سے اتنی اور زیادتی وارد ہے:

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۲۴۶۵، م: ۲۱۲۱

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۸۱۶

"پریشان حالوں کی فریاد رسی کرنا اور راستہ بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتلانا۔"[1]

پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو اس کی طرف اس طرح متوجہ فرمایا کہ ان کا بیٹھنا گزرنے والوں کے لیے کارِ خیر کی انجام دہی میں مؤثر و مثبت سبب بن گیا۔

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۴۸۱۷

ساتویں فصل

مریض کی عیادت

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یقیناً اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے: اے ابن آدم، میں مریض ہوا مگر تم نے میری عیادت نہ کی، تو وہ عرض کرے گا، یارب میں آپ کی کیسے عیادت کرتا جبکہ آپ رب العالمین ہیں، تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ کیا تم کو نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ مریض ہوا تھا مگر تم نے اس کی عیادت نہ کی، کیا تم کو نہیں معلوم کہ تو میرے اس بندے کی عیادت کرتا تو تو مجھ کو اس کے پاس پاتا۔"(۱)

مریض کی عیادت اسلام کی مؤکدہ سنتوں میں سے ہے، چنانچہ حضور ﷺ کو جب یہ بات پہنچتی کہ ان کے اصحاب میں کوئی بیمار ہو گیا ہے تو اس کی زیارت وعیادت کے لیے جلدی فرماتے، اور ان کی زیارات کی بڑی تعداد سیرت واحادیث کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

حضور ﷺ نے اس یہودی لڑکے کی عیادت فرمائی جو آپ کی خدمت کرتا تھا اور یہی چیز اس کے اسلام لانے کا سبب ہو گئی۔

اور آپ کا یہ فعل اس عمل پر ابھارنے کے لیے کافی ہے، کہ اس سے مریض کے درد والم میں تخفیف ہو جاتی ہے، آپ ﷺ نے اپنے قول سے بھی عیادت کی ترغیب دی ہے۔

حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"بیشک جب مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہ جنت کے پھول چُن رہا ہوتا ہے، حتی کہ وہ وہاں سے واپس آجائے۔"(۲)

اور حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۵۶۹

(۲) مسلم: رقم: ۲۵۶۸

''جس نے کسی مریض کی عیادت کی تو آسمان سے ایک ندا کرنے والا یہ ندا کرتا ہے: تم اچھے ہو اور تمھارا چلنا بھی مبارک ہے، تم نے جنت میں ایک گھر کا انتظام کر لیا۔''[۱]

عیادت کرنے والے کا سلوک کیا ہونا چاہیے تو سنئے: حضرت عائشہؓ نے ہم سے یہ نقل کیا ہے کہ جب حضور ﷺ کسی مریض کے پاس تشریف لے جاتے تو فرماتے:

«اذهب الباس رب الناس، اشف وانت الشافی لا شفاء الا شفاءك شفاء لايغادر سقماً»[۲].

''اے اللہ! لوگوں کو پالنے والے تکلیف دور کر دے اور اس کو تندرستی عطا فرما، تو ہی تندرستی دینے والا ہے، تیری شفاء کے علاوہ کوئی شفاء حقیقی نہیں، ایسی شفا دے کہ کوئی بیماری نہ رہے''۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ جب کسی مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو فرماتے:

''کچھ حرج نہیں، یہ مرض تمہارے گناہوں کے لیے مطہر ثابت ہو گا، ان شاءاللہ۔''[۳]

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۰۰۸، وابن ماجہ: رقم: ۱۴۴۳

(۲) بخاری: رقم: ۵۶۶۵، م: ۲۱۹۱

(۳) بخاری: رقم: ۳۶۱۶

آٹھویں فصل

نیکی کا شکر ادا کرنا اور اس کی جزا دینا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾(۱). احسان کا بدلہ احسان کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا ہے۔

سوسائٹی اور معاشرہ میں فلاحی اور خیراتی کاموں کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ صاحب خیر کے نیک کاموں کا ذکر کیا جائے اور اس پر اس کا شکر ادا کیا جائے۔

اور حضور ﷺ نے صاحب خیر کی تعریف فرمائی ہے اور اس کے فضل کا اعتراف کیا ہے، یہ ایک قسم کا اللہ ہی کا شکر ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔''(۲)

اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس نے لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا اس نے اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کیا۔''(۳)

رسول اللہ ﷺ نے نیکی کا بدلہ دینے پر ابھارا ہے، اور اس کے شکر کی ادائیگی کی ترغیب دی ہے اور آپ کے اس عمدہ خلق کو صحابہ کرامؓ نے آپ کی طویل حیات مبارکہ میں پہچانا، چنانچہ آپ ہمیشہ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کے مقابلہ میں اس سے گراں قدر ہدیہ عطا فرماتے تھے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

''حضور ﷺ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس پر بڑھا کر عنایت فرماتے تھے۔''(۴)

---

(۱) سورۂ رحمان: آیت: ۶۰

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۸۱۱، والترمذی: ۱۹۵۴

(۳) ترمذی: رقم: ۱۹۵۵

(۴) بخاری: رقم: ۲۵۶۸

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس فعل کے ساتھ اپنے قول سے بھی اس کی ترغیب دی ہے۔

چنانچہ حضرت جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جس کے ساتھ کوئی عملِ خیر کیا گیا تو اسے چاہیے کہ اس کا بدلہ دے اور اگر بدلہ کے لیے کچھ نہ پائے تو اس کی اس نیکی پر تعریف ہی کر دے، اس لیے کہ جب اس نے تعریف کر دی تو اس نے اس کا شکریہ ادا کر دیا، اور اگر اس کو چھپایا (یعنی نہ بدلہ دیا اور نہ تعریف ہی کی) تو کفران نعمت کیا۔"(۱)

اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"تمہارے پاس کوئی ہدیہ لائے تو اس کا بدلہ چکا دو، پس اگر اس پر قدرت نہ پاؤ تو اس کے لیے دعائے خیر ہی کر دو، یہاں تک کہ وہ جان لے کہ تم نے بدلہ دیا ہے۔"(۲)

اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توجہ دلا رہے ہیں کہ ہدیہ کا بدلہ مادی چیز سے جہاں تک ممکن ہو دے دو، اور اگر ممکن نہ ہو تو دعاء سے اس کا بدلہ ادا کرو اور اس سے بڑھ کر کیا بدلہ ہوگا۔

اور حضرت اسامہ ابن زید نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جس کے ساتھ نیکی کی جائے اُس نے نیکی انجام دینے والے کو کہا: "جزاک اللہ خیراً" (یعنی اللہ تعالیٰ تم کو جزائے خیر دے) تو اس نے اس کی ستائش (بدلہ) کا حق ادا کر دیا۔"(۳)

---

(۱) اخرجہ أبوداؤد: رقم: ۴۸۱۳، والترمذی: ۲۰۳۴، والبخاری فی الأدب المفرد: ۲۱۵

(۲) أخرجہ البخاری فی الأدب المفرد: ۲۱۶

(۳) ترمذی: رقم: ۲۰۳۵

نویں فصل

ہر آدمی کو اپنی خدمت خود کرنی چاہیے

ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا زندگی کے ناگزیر مروّجہ طریقوں میں سے ایک طریقہ وسنت ہے، اس لیے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام کاموں کو بذات خود تنہا انجام نہیں دے سکتا، اور یہ تعاوُن باہمی خاندان سے شروع ہوتا ہے، اس کا ہر فرد دوسروں کی خدمت کر کے اپنا فرض ادا کرتا ہے، اس کے بعد یہ وسیع ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ معاشرہ کے تمام افراد کے اندر وسیع ہو جاتا ہے، اس کے باوجود حضور ﷺ نے ترغیب دی ہے کہ ہر انسان اپنے ذاتی کام اور ضروریات کو پوری کرنے کی خود کوشش کرے، دوسرے کی مدد لینے کا ہرگز ارادہ نہ کرے، بلکہ دوسرے کی اعانت کو قبول بھی نہ کرے، ہاں حاجت میں مجبوری ہے، اس لیے قبول کر سکتا ہے۔

اس طرح خاندان کے افراد میں خدمت کی ذمہ داری کا یہ بوجھ کم سے کم ہو جائے گا، اور سوسائٹی کے افراد کے درمیان بھی یہ ذمہ داری ہلکی ہو جائے گی۔

اور ہم نے دیکھا ہے کہ حضور ﷺ کیسے اپنے ذاتی کام خود کیا کرتے تھے، حالانکہ وہاں یقیناً ایسے لوگ موجود تھے جو کہ آپ کی خدمت انجام دیتے، اگر آپ اس کا ارادہ فرماتے۔

آپ ﷺ کی ہدایت شریفہ یہ تھی کہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ بلا ضرورت کوئی انسان لوگوں سے کسی چیز کا سوال کرے، اور اس میں شک نہیں ہے کہ یہ کلی طور پر دشوار ہے، مگر حضور ﷺ کا منشاء یہ ہے کہ صاحب استطاعت اپنی استطاعت کے مطابق اپنی ذات خاص پر اعتماد کرے، اور اس کی روشنی میں آنے والی حدیث کا مفہوم ہم بیان کرتے ہیں۔

حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں:

”ہم لوگ نو یا آٹھ یا سات افراد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ رسول اللہ سے بیعت نہ ہوگے اور ہم نے نئی نئی بیعت کی تھی، تو ہم لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم تو آپ سے بیعت کر چکے ہیں، پھر فرمایا: کیا تم لوگ رسول اللہ ﷺ سے

بیعت نہ ہوگے تو پھر ہم لوگوں نے کہا کہ ہم لوگ تو آپ سے بیعت ہو چکے ہیں، اس کے بعد پھر فرمایا کیا تم لوگ رسول اللہ سے بیعت نہ ہوگے۔

راویٔ حدیث عوف ابن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں: ہم نے اپنے ہاتھوں کو پھیلا دیا اور ہم نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم تو آپ سے بیعت کر چکے ہیں، مگر اب بتلایئے کہ ہم آپ سے کس بات پر بیعت کریں، تو فرمایا: اس بات پر کہ اللہ کی عبادت کرنا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، پانچوں وقت نماز کو ادا کرنا، اور امیر کی اطاعت کرنا اور ایک کلمہ آہستہ سے فرمایا وہ یہ کہ لوگوں سے کسی شئ کا سوال نہ کرنا۔

چنانچہ اس پر ایسی پابندی رہی کہ راوی حدیث کہتے ہیں کہ ان میں سے بعض فرد کو دیکھا ہے کہ ان کا کوڑا سواری سے گر جاتا تو کسی سے سوال نہ فرماتے تھے، بلکہ خود اس کو سواری سے اتر کر لے لیتے۔"(۱)

اور ثوبانؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مولی یعنی غلام تھے انھوں نے کہا:

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو مجھے ذمہ داری (گارنٹی) دے کہ وہ کسی سے سوال نہ کرے گا تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں، تو حضرت ثوبانؓ نے کہا کہ میں یا رسول اللہ! چنانچہ وہ کسی سے کسی چیز کا سوال نہ کرتے تھے۔"(۲)

اور اسی روشنی میں ہم اس واقعہ کو دیکھیں جسے حضرت انسؓ بیان فرما رہے ہیں، یعنی صحابہؓ کا معمول آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں۔

چنانچہ حضرت انسؓ نے فرمایا:

"ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے، ہم میں بعض روزے سے تھے اور بعض روزے سے نہیں تھے، راوی کہتے ہیں کہ ہم گرمی کے دن میں ایک منزل پر اترے، ہم میں سے سائے کے لحاظ سے زیادہ صاحب کساء (چادر) تھے، اور ہم میں سے بعض اپنے ہاتھوں سے سورج کی تپش سے بچ رہے تھے پس روزہ دار تو گر گئے اور جو روزہ سے نہ تھے وہ کھڑے ہو گئے اور وہاں

---

(۱) مسلم: ۱۰۴۳

(۲) ابوداؤد: ۱۶۴۳

(عارضی) خیمے بنائے اور سواریوں کو پانی پلایا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اجر میں غیر روزے دار آگے بڑھ گئے۔"(۱)

یقیناً روزے نے روزے داروں کو اپنے ذمے کے کام سے کمزور کر دیا، اور اس عمل سے بھی درماندہ کر دیا جس کا کرنا ان کے ذمہ تھا۔ اس لیے غیر روزے دار اجر و ثواب میں آگے بڑھ گئے۔

معلوم ہوا کہ انسان پر اپنی ذات کی ضروری خدمت، روزے پر مقدم ہے، جبکہ افطار کر سکتا ہو۔

پس یہ حضور ﷺ کی اپنی امت کو تعلیم ہے کہ مستحبات میں کیسے ترتیب ہونی چاہیے۔

اور اس معنی کی تاکید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے نسائی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے:

"حضور ﷺ کے پاس مر الظہران نامی مقام میں کھانا لایا گیا تو آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا: قریب آجاؤ اور کھاؤ، تو دونوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ روزے سے ہیں تو لوگوں کو فرمایا: اپنے دونوں یاروں کی سواری تیار کر و اور کام کر و ان کے حصہ کا، اس لیے کہ وہ روزہ دار ہیں۔"(۲)

اس طرح حضور ﷺ نے ان دونوں کو توجہ دلائی کہ ان دونوں کے روزے رکھنے کی وجہ سے ان کے کام کی ذمہ داری باقی صحابہ کرام برداشت کر لیں گے، تو وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے: اپنے دونوں رفیقوں کی سواری تیار کر و اور ان کے کام کرو۔

اس طرح یہ مقولہ "اخدم نفسك" (اپنا کام خود کرو) آداب اسلام میں سے ایک ادب ہے۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۲۸۹۰، م: ۱۱۱۹

(۲) نسائی: رقم: ۲۲۶۳

دسویں فصل

قدیم الفاظ کے جدید معانی

جن اسالیب کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کی تادیب وتربیت کے موقع پر استعمال کیا ہے، ان میں سے ایک اسلوب یہ ہے کہ آپ نے عام رائج الفاظ کو نئے معانی کا جامہ پہنایا، یا ان کے ایسے پوشیدہ معانی کی طرف توجہ مبذول کرائی جن کی طرف ذہن نہیں جاتا تھا۔

ہم اس فصل میں نمونہ کے طور پر چند باتیں بیان کرتے ہیں۔

(۱) غِنیٰ کا جدید معنیٰ:

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"غنیٰ کثرتِ سامان کا نام نہیں، بلکہ غنی تو نفس کا غنی ہونا ہے (چاہے اس کے دنیوی اسباب نہ ہوں)۔"[۱]

آپ ﷺ کی خواہش یہ تھی کہ اسلامی معاشرہ میں انسان اپنے بہترین اخلاق اور حسن سلوک کی بناء پر سراہا جائے، نہ کہ جیبیں پھولی ہونے اور دولت وثروت کی فراوانی کی بناء پر۔

یہ میزان حق ہے، اس میزان کو انسان قائم کرے، اور یہ فضائل اور عالی اقدار کی میزان ہے۔

سابق حدیث سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔

نیز حضور ﷺ نے صرف اسی بیان پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ اپنے اصحاب کے لیے، ان کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے ایک مثال بیان فرمائی۔

چنانچہ حضرت سہل ابن سعدؓ نے فرمایا:

"ایک دن حضور ﷺ کے پاس سے ایک آدمی گزرا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ اس کے بارے میں تم لوگوں کی کیا رائے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا کہ یہ آدمی اس لائق ہے کہ کسی لڑکی کے لیے پیغام دے تو (اُس سے) اس کا نکاح کر دیا جائے، اگر (کسی کی) سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کر لی جائے اور اگر کچھ کہے تو اس کی بات سنی جائے۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۶۴۴۶، م: ۱۰۵۱

راوی کہتے ہیں: حضور ﷺ یہ کہہ کر خاموش ہوگئے اس کے بعد فقرائے مسلمین میں سے ایک فقیر گزرا تو فرمایا: اس کے بارے میں تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ یہ ایسا گیا گزرا آدمی ہے کہ اگر کسی لڑکی کو پیغامِ نکاح دے تو اس کا نکاح نہ کیا جائے اور اگر سفارش کرے تو اس کی طرف التفات نہ کیا جائے، اور اگر کچھ کہے تو اس کی بات اَن سُنی کر دی جائے۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: یہ غریب مسلمان اس آدمی جیسے پوری دنیا کے لوگوں سے بہتر ہے۔"[1]

اس سے حضور ﷺ نے مال و دولت کی بنیاد پر انسان کی قدر و قیمت متعین کرنے کے نظریہ کو غلط قرار دیا ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ نظر انسان کے دین اور اخلاق پر ہونی چاہیے، آدمی کی قدر و قیمت کی میزان فقر و غنا نہیں ہے، اس لیے کہ کبھی آدمی غنی ہوتا ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ صالح و فاضل بھی ہوتا ہے اور کبھی فقیر آدمی بد کردار ہوتا ہے اور اس کے بر عکس بھی ہوتا ہے، پس حضور ﷺ نے متنبہ فرمایا کہ غلطی انسان کا معیار متعین کرنے کے اسلوب و طریقہ میں ہے۔

(۲) افلاس کا جدید معنیٰ:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"کیا تم لوگ جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ تو صحابہ نے عرض کیا ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہو نہ متاع (سامان) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت میں مفلس وہ لوگ ہیں جو قیامت کے دن نماز، روزہ، زکوٰۃ کے ساتھ آئیں گے مگر اس کے ساتھ یہ بھی سامنے آئے گا کہ اس کو گالی دی ہے، اس پر بہتان لگایا ہے، اور اس کا مال کھایا ہے، اور اس کا خون بہایا ہے، اور اس کو مارا ہے تو اس کے حسنات (دے دئے جائیں گے) پس اگر اس کے حسنات (نیکیاں) ختم ہو جائیں گی قبل اس کے کہ اس پر جو قرض و تاوان ہے وہ ادا کر دیا جائے، تو ان صاحب حقوق کی خطایا (برائیاں) لی جائیں گی اور اس پر ڈال دی جائیں گی، پھر اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔"[2]

جی ہاں! سن لو، یہ ہے افلاس و فقر!

---

(۱) بخاری: ۵۰۹۱

(۲) مسلم: ۲۵۸۱

(۳) قوت کا جدید معنی:

جب ہم قوت کا ذکر کرتے ہیں تو ذہن بڑے بھاری، مضبوط پٹھوں والے، کسرتی جسم کی جانب منتقل ہوتا ہے، اور بیشک یہ قوت ہے۔ لیکن حضور ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ اپنے اصحاب کی نظر قوت کے معانی میں سے ایک خاص معنی کی طرف متوجہ کریں اور وہ معنی دقیق ہے، اور زیادہ لائق ہے کہ یہ لفظ قوت اس پر محمول کیا جائے تو آپ ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

”تم اپنے لوگوں میں پہلوان کس کو شمار کرتے ہو؟ تو صحابہ نے کہا کہ اس کو جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں، تو فرمایا کہ نہیں ایسا نہیں، بلکہ اصل بہادر پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو پچھاڑ دے۔“(۱)

یقیناً غصہ کے ہیجان وجوش کے وقت نفس پر قابو پانا بالفعل قوت ہے، اور یہ امر مشاہد ہے کہ بہت کم لوگ ہیں کہ جو اس حالت غضب میں اپنے نفوس پر قابو پاتے ہیں، یقیناً وہ اس لائق ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو پہلوان کہا جائے۔

(۴) باقی رہا مگر اگلا شانہ:

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے:

”حضور ﷺ تشریف لائے تو گھر میں بکری ذبح کی گئی اور پڑوسیوں اور فقیروں کے درمیان اس کا گوشت تقسیم کر دیا گیا اس کے بعد جب حضور ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ بکری کے گوشت میں سے کچھ باقی رہ گیا ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ نہیں باقی رہا، مگر اگلا شانہ، یعنی سب تقسیم کر دیا سوائے اگلے دست کے کہ آپ کے لیے رکھ چھوڑا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: کل باقی رہا مگر اس کا اگلا دست۔“(۲)

اس لیے کہ باقی در حقیقت وہ ہے جو اللہ کے نزدیک اجر و ثواب کے اعتبار سے باقی ہو، پس اس معنی کے اعتبار سے بکری کل کی کل باقی رہی سوائے اس کے اگلے دست کے۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۶۰۸

(۲) ترمذی: رقم: ۲۴۷۰

(۵) وارث کا مال:

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"کون شخص ہے جس کو وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ تو صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کوئی ایسا نہیں ہے، جس کو وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ تو فرمایا: انسان کا مال وہ ہے جس کو آگے بھیجا ہے (یعنی اللہ کے راستہ میں خرچ کیا ہے) اور وارث کا مال وہ ہے جس کو چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔"[1]

اس لیے کہ انسان مال کو اپنی پوری زندگی میں جمع کرتا ہے، پھر مر جاتا ہے اور مال کو دنیا ہی میں چھوڑ جاتا ہے، پس جس کو چھوڑ کر گیا وہی تو وارث کا مال ہے۔

پس انسان کا مال وہی ہے جس کو اس نے پہلے بھیجدیا ہے، اللہ کے پاس ذخیرہ کے طور پر اور وہ مال جو حرص کی بناء پر خرچ نہیں کیا اور اس کو چھوڑ کر مرا تو وہ اس کے وارث کا مال ہے۔

پس رسول اللہ ﷺ نظر کو اس طرف پھیر رہے ہیں کہ اکثر لوگ ایسے ہیں جنھیں اپنے وارث کا مال زیادہ محبوب ہے، بایں طور کہ وہ اسے جمع کرتے ہیں (راہِ خدا میں) خرچ نہیں کرتے، اور ورثاء کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔

اسی حقیقت کی وضاحت حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث نے یوں کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"بندہ میرا مال، میرا مال، کہتا رہتا ہے، حالانکہ اس کا مال تین مواقع (صورت) میں ہوتا ہے، جو کھا کر فنا کر دیا، یا جو پہن کر پُرانا کر دیا، یا جو (راہ خدا میں) خرچ کر کے (آخرت کے واسطے) جمع کر لیا۔ اس کے علاوہ تو وہ جانے والا ہے، اور لوگوں کے لیے چھوڑنے والا ہے۔ (مسلم ۲۹۵۹)

(٦) "اپنے بھائی کی مدد کرو" کا معنیٰ:

زمانۂ جاہلیت میں نصرت و مدد کی پیش کش قبیلوں کی اساس و بنیاد پر تھی، پس قبیلہ اپنے افراد کی ہر حال میں مدد کرتا تھا، یہاں ہی سے ان کا قول رائج تھا کہ "اُنصر اخاك ظالماً او مظلوماً" یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم۔

---

(۱) بخاری: رقم: ٦٤٤٢

مفضل الضبی نے اپنی کتاب ''الفاخر'' میں ذکر کیا ہے کہ : اول وہ شخص جس نے یہ مقولہ ''أنصر اخاك ظالماً او مظلوماً'' کہا ہے وہ جندب ابن العنبر ابن عمرو ابن تمیم ہے، اس سے اس نے اس کا ظاہر مراد لیا ہے، اور وہ جاہلیت کے دور میں لوگ اسی مفہوم کے عادی تھی، اسی کے بارے میں دورِ جاہلیت کا شاعر یوں کہہ رہا ہے ؎

اذا انالم انصر اخی وهو ظالم على القوم لم أنصر أخي حين يظلم

''اگر میں نے قوم کے خلاف اپنے ظالم بھائی کی مدد نہیں کی تو گویا میں نے اپنے مظلوم بھائی کی بھی مدد نہیں کی''۔

اس کے بعد اسلام آیا اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم۔

حضرت انس سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم، تو لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! ہم مظلوم کی مدد کر سکتے ہیں، آخر ظالم کی کیسے مدد کریں؟ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کے ہاتھ کو (ظلم سے) روک دو۔

اور ایک روایت میں ''تجزه'' اور ''تمنعه'' ہے، یعنی اس کو روک دو اور ظلم سے منع کر دو، اس لیے کہ یہ اس کی نصرت ہے''۔(۱)

پس صحابہ کرام جاہلی معنی سے نکل چکے تھے اسی لیے سوال کیا کہ کیسے اس شخص کی نصرت ہوگی جو ظالم ہے۔ تو حضور ﷺ نے اس کا مطلب و معنی وہ بیان فرمایا جو اسلامی نقطۂ نظر سے تھا، یعنی ظالم کی نصرت یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روک دو، اس کے ذریعہ تم اس کو لوٹا رہے ہو صواب و درستگی کی طرف اور معصیت سے دور کر رہے ہو، اور اس سے بڑھ کر اور کون سی نصرت ہو سکتی ہے۔

بیشک حضور ﷺ نے ایسے موقع پر دوسروں سے منفی عمل کو قبول نہیں کیا ہے، اور وہ ہے ظالم کی مدد نہ کرنا اور اس سے دوری اختیار کرنا، بلکہ آپ نے ارادہ فرمایا کہ دونوں ایجابی ہوں، پس ظلم کو روکنے میں لوگ سبقت کریں اور یہ ظالم کو ظلم سے منع کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

پس یہ مقولہ ''انصر اخاك ظالما اومظلوما'' حدیث نبوی شریف ہو گیا، بعد اس کے کہ اس نے جدید لباس کو پہن لیا، جو اس دین کے مفاہیم سے بنا ہوا تھا۔

---

(۱) بخاری: ۲۴۴۴، ۶۹۵۲

چھٹا مقصد

لازمی ضروریات کی فراہمی میں آپ کی سیرت مبارکہ

پہلی فصل

زہد کے بیان میں

یقینی حقیقت / طے شدہ حقیقت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ»[1].

''کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہو، دنیا کی زندگی کا فائدہ تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

«وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ»[2].

''اور خوش ہیں دنیا کی زندگی پر اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے آگے مگر متاع حقیر۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

«وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى»[3]

''اور البتہ آخرت بہتر ہے تجھ کو دنیا سے۔''

دنیوی اور اخروی زندگی کی دو ثابت شدہ حقیقتیں ہیں۔

قرآن کریم کی دسیوں آیات میں ان دونوں زندگیوں کا بار بار ذکر آیا ہے، یہ آیتیں جس پائیدار محور کے ارد گرد دائر ہیں وہ ہے آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی کی بے وقعتی کو ثابت کرنا، جب انسان کے لیے دونوں زندگیوں کا گزارنا طے شدہ امر ہے تو مناسب ہے کہ ان دونوں (دنیا اور آخرت) میں زندگی گزارنے کی مدت کے اعتبار سے وہ ان سے دلچسپی لے۔

---

(۱) سورۂ توبہ: آیت: ۳۸

(۲) سورۃ الرعد: آیت: ۲۶

(۳) سورۃ الضحیٰ: آیت: ۴

یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس سلسلے میں مختلف اسالیب کے ذریعہ متعدد بار اس حقیقت کی طرف متوجہ فرمایا ہے، تاکہ تمام لوگ اس کی حقیقت سے بخوبی واقف ہو جائیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا:

"رسول اللہ ﷺ نے میرے دونوں مونڈھوں کو پکڑ کر فرمایا: دنیا میں کسی پردیسی یا راہ چلتے مسافر کی طرح ہو جاؤ"۔(۱)

"مجھے دنیا سے کیا واسطہ؟ میں دنیا میں اس سوار کی طرح ہوں جس نے کسی درخت کے نیچے سایہ حاصل کیا، پھر اسے چھوڑ کر چل دیا"۔(۲)

آپ ﷺ نے فرمایا:

"بخدا! دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے جیسے کوئی اپنی انگشت شہادت کو سمندر میں ڈالے۔ پھر دیکھے کہ اس پر کتنا پانی لگا ہوا ہے"۔(۳)

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی یہ حقیقت ہے جو قرآن کریم کی تشریح کے مطابق نہایت قلیل شئ ہے، اور نبی کریم ﷺ نے اس قلیل کی عملی وضاحت کے ذریعے تشریح فرمائی ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے انگلی پر لگا ہوا پانی سمندر کے پانی کے مقابلے میں، اس تمثیل میں کوئی مبالغہ نہیں، بلکہ یہی حقیقت اور امر واقعی ہے، جس کی تائید اصطلاح اعداد سے ہوتی ہے۔

اس حقیقت سے اسلامی زہد کا مفہوم نکلتا ہے اور وہ ہے باقی رہنے والی شئ کو اہمیت دینا۔

زہد کا مفہوم:

زہد نام ہے ایک شئ سے اعراض کر کے اس سے بہتر شئ کی جانب مائل ہونے کا، پھر اسی بنیاد پر نام ہو گیا مباحات کے ترک کرنے کا جن کے کرنے میں نفس کو حظ ملتا ہے، باقی رہا ممنوعات کا ترک کرنا تو اسے زہد نہیں کہا جاتا، نیز ان مباحات کا ترک زہد اس وقت کہلائے گا جب آدمی کو ان پر قدرت حاصل ہو، چنانچہ ان چیزوں کو چھوڑنا جو اس کے مقدور سے باہر ہیں "زہد" نہیں کہلائے گا"۔(۴)

---

(۱) بخاری: رقم: ۶۴۱۶

(۲) ترمذی: رقم: ۲۳۷۷

(۳) مسلم: ۲۸۵۸

(۴) المهذب من احياء علوم الدين: ۲/۳۳۷

سنن ترمذی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

”لوگوں نے ایک بکری ذبح کی، آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں سے کیا بچا ہے، حضرت عائشہؓ نے کہا صرف اس کا شانہ بچا ہے، آپ نے فرمایا: اس کے شانے کے علاوہ سب بچا ہے“۔(۱)

صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

”نبی اکرم ﷺ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے، مگر گھر میں داخل نہیں ہوئے، حضرت علیؓ آئے تو حضرت فاطمہؓ نے ان سے اس بات کا تذکرہ کیا، حضرت علیؓ نے حضور اکرم ﷺ سے یہ بات کہی تو آپ نے فرمایا: میں نے ان کے دروازے پر ایک منقش پردہ دیکھا پھر فرمایا: مجھے دنیا سے کیا کام؟ حضرت علیؓ نے آکر حضرت فاطمہؓ سے یہ بات بتائی تو انھوں نے کہا اس سلسلے میں آپ جو چاہیں مجھے حکم فرمائیں، آپ نے ایک ضرورت مند خاندان کے بارے میں فرمایا کہ ان کے یہاں بھیج دیں“۔(۲)

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے:

”آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کون ایسا ہے کہ اس کے وارث کا مال اس کو اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے، لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایسا تو کوئی نہیں ہے، ہم میں سے ہر ایک کو خود اپنا مال ہی محبوب ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: فی الواقع آدمی کا مال تو وہی ہے جو اس نے آگے بھیجا (یعنی کارِ خیر میں خرچ کیا) اور جتنا مال چھوڑ گیا وہ اس کے وارثوں کا ہے“۔(۳)

ان احادیث شریفہ کی روشنی میں زہد کا مفہوم واضح ہوتا ہے کہ وہ اخروی زندگی کو اہمیت دینا ہے، اور اسے دنیا پر مقدم رکھنا ہے، چنانچہ بکری کا جو حصہ فقراء پر تقسیم کر دیا گیا وہ بچا ہوا اور ذخیرہ آخرت ہے۔

حضرت فاطمہؓ کا پردہ اگر بطور پردہ ہی استعمال ہوتا رہتا تو صرف دنیا ہی میں باقی رہتا لیکن اس سے ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کر دی گئی تو اس کا مقام آخرت ہو گیا۔

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۴۷۰
(۲) بخاری: رقم: ۲۶۱۳
(۳) بخاری: رقم: ۶۴۴۲

درحقیقت انسان کا مال وہی ہے جو اس کے نامۂ اعمال میں اللہ تعالیٰ کے یہاں عمل خیر کے طور پر لکھ دیا گیا ہے، رہا وہ مال جو اس کے بعد باقی بچا ہوا ہے تو وہ دوسروں کی ملکیت قرار پائے گا۔

مذکورہ احادیث میں وارد شدہ یہ مضامین باہم ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں، اس وجہ سے کہ یہ سب ایک ہی سر چشمہ سے صادر ہو رہے ہیں اور ان مضامین کے ذریعہ زہد کے مفہوم کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔

زہد ایک مثبت طرز عمل ہے:

دنیوی زندگی کا سریع الزوال ہونا ایک حقیقت ہے اور اخروی زندگی کا جاوداں ہونا بھی ایک حقیقت ہے، جب یہ یقین مومنین کے قلوب میں راسخ ہو جاتا ہے تو وہ انھیں عطاء و بخشش پر آمادہ کرتا ہے اور اس یقین کا چراغ جس قدر روشن ہوتا ہے نفس انسانی عطاء و بخشش میں اتنی ہی ترقی کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس درجہ تک پہونچ جاتا ہے کہ اپنا تمام سرمایہ خرچ کر ڈالتا ہے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی روش اپنا لیتا ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ میں نے بچوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا، یا اپنی جان قربان کر دیتا ہے، جیسا کہ ان لوگوں نے کیا جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ''صَدَقُوْا'' کی شہادت کے مستحق ہوئے اور جن لوگوں نے ''سَارِعُوْا'' کی آواز پر لبیک کہا۔

کیا عمل کے میدان میں اس سے بھی بڑھ کر مثبت باتیں ہو سکتی ہیں؟ یہی سچا زہد ہے۔

جس وقت زہد منفی طرز عمل کی صورت اپنا لے تو وہ بس نام کا زہد ہوتا ہے، جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، چنانچہ ترک دنیا کے نام پر کام نہ کرنے اور بیکاری کی جانب مائل ہونے کا نام زہد نہیں ہے، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''اوپری ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے، پہلے اپنے عیال کو دو''۔(۱)

نیز فرمایا:

''اوپری ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے، اوپری ہاتھ خرچ کرنے والا اور نچلا ہاتھ سوال کرنے والا ہے''۔(۲)

---

(۱) بخاری: رقم: ۱۴۲۷، مسلم: رقم: ۱۰۳۴

(۲) متفق علیہ: رقم: ۱۴۲۹، م: ۱۰۳۳

بغیر عمل کے کسی کو دینے اور کسی پر خرچ کرنے کا کام کیسے ہو سکتا ہے اور ایک تارک الدنیا اعطاء وانفاق کا عمل کیوں کر سکتا ہے؟

زہد انسانوں سے کٹنے اور دور رہنے کا نام نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری کرتا ہے، جو شخص کسی مسلمان سے کوئی مصیبت دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے مصیبت دور فرمائے گا اور جو شخص کسی مسلمان بھائی کی عیب پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی عیب پوشی کرے گا"۔(۱)

اسی طرح مال کو حقیر سمجھنے اور اس کی تحصیل میں کوشش نہ کرنے کا نام زہد نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"بیوہ اور مسکین کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والا، مجاہد فی سبیل اللہ کے مثل ہے"۔(۲)

جب زہد منفی طرز عمل نہیں ہے تو جنھوں نے کام چھوڑ دیا، گھٹیا لباس وطعام پر اکتفا کیا، مسجدوں میں پڑے رہے اور یہ سمجھا کہ اس طرح انھیں زاہدین کا مقام حاصل ہو جائے گا تو یہ گمراہی اور غلط فہمی ہے۔ بیشک

وسائل و مقاصد:

دین کی صحیح فہم کا تقاضا یہ ہے کہ وسائل و مقاصد میں فرق ہونا چاہیے اور ان میں سے ہر ایک کا لحاظ اس کے بقدر ہونا چاہیے اور جس وقت وسائل مقاصد بن جائیں تو یہ زبردست غلطی ہے۔

طہارت ادئیگیٔ نماز کا وسیلہ ہے، لیکن اگر نماز کا سارا وقت طہارت سے وسوسہ کے سبب ختم ہو جائے تو یہ لاعلاج مرض ہے۔

اگر ایک شخص اپنے مستقل رہائشی مکان کی تعمیر ہونے تک کے لیے ایک مکان کرایے پر لے، پھر اسی کرایے کے مکان کی تزئین وآرائش میں مصروف ہو جائے، نیز اس میں اپنا مال خرچ کرنے لگے اور اپنے مستقل مکان کو طاق نسیان پر رکھ دے تو یہ شخص کوتاہ اندیش اور خطاء کار ہے۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۲۴۴۲، م: ۲۵۸۰

(۲) متفق علیہ: رقم: ۶۰۰۷، م: ۲۹۸۲

صحیح بات یہ ہے کہ ہمیں وسیلہ کے ساتھ وسیلہ ہی جیسا معاملہ کرنا چاہئے، دنیا اسلامی اصول کے اعتبار سے آخرت کا وسیلہ اور اس تک پہنچنے کا راستہ ہے، بڑا عقل مند وہ ہے جو کرائے کے مکان میں اتنے ہی پر اکتفاء کرے جس سے گزر اوقات ہو سکے، اور اپنے مستقل رہائشی مکان کے لیے سامان زینت، اسباب راحت اور عمدہ اشیاء کا انتظام کرے۔

فقر وزہد کا فرق:

بعض دفعہ فقر وزہد ظاہر شکل کے اعتبار سے باہم متشابہ نظر آتے ہیں، لیکن دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔ جب دنیا بندے سے کنارہ کش اور دور ہو جائے تو وہ فقر ہے اور جب بندہ دنیا سے کنارہ کشی کرے اور دوری اختیار کرے تو وہی زہد ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زاہد تھے، فقیر نہیں تھے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعاء میں فقر سے بار بار پناہ مانگتے تھے۔

آپ ہر نماز کے بعد یہ دعاء ضرور پڑھتے تھے:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ»(۱).

"اے اللہ میں آپ کے ذریعہ کفر، فقر اور عذاب قبر سے پناہ مانگتا ہوں۔"

آپ کی اس دعاء (جسے آپ نمازوں کے بعد بار بار کیا کرتے تھے) پر ایک تحقیقی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو فقر کس درجہ ناپسند تھا، آپ نے فقر و کفر کو ایک ساتھ ذکر کیا جس سے فقر کے تئیں اسلام کے موقف کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے تھے:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفَقْرِ وَالْقِلَّةِ وَالذِّلَّةِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ اَنْ أَظْلَمَ اَوْ أُظْلِمَ»(۲).

"اے اللہ میں فقر، قلت، ذلت سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں کسی پر ظلم کر دوں یا کوئی مجھ پر ظلم کرے"۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کلمات کے ساتھ دعا کرتے تھے:

---

(۱) نسائی: ۵۴۸۰، ۱۳۴۶

(۲) ابوداؤد: رقم: ۱۵۴۴، نسائی: ۵۴۷۵، ابن ماجہ: ۳۸۴۲

«اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ النَّارِ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ شَرِّ الْغِنٰى وَالْفَقْرِ[1].

"اے اللہ میں دوزخ کے فتنے سے اور قبر کے عذاب سے، مالداری اور محتاجی کی برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں"۔

اگر فقر امر مطلوب یا بہتر حال ہوتا تو اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پناہ نہ مانگتے، بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ فقر پسندیدہ اور قابل تعریف حالت ہے، بلکہ بعض کتابوں میں ہمیں فضل الفقر جیسے عناوین بکثرت نظر آتے ہیں، اور ایسی احادیث سے استدلال کرتے ہیں جن میں ان کے مطلب کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ مثلاً صحیح بخاری میں حضرت سہلؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گزر ہوا تو آپ نے فرمایا:

"تم لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: یہ اس لائق ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اس سے نکاح کیا جائے، اگر سفارش کرے تو اس کو قبول کیا جائے اگر کچھ کہے تو اس کو سنا جائے، آپ خاموش رہے۔ پھر ایک مسلم فقیر کا گزر ہوا تو آپ نے فرمایا: تم لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ یہ سن کر لوگوں نے کہا: یہ اس لائق ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اس سے نکاح نہ کیا جائے اگر سفارش کرے تو اس کو قبول نہ کیا جائے اگر کچھ کہے تو اس کو سنا نہ جائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ فقیر شخص اس مالدار شخص جیسے دنیا بھر کے آدمیوں سے بہتر ہے"۔[2]

اس حدیث میں فضیلت فقر کا ثبوت نہیں ہے، بلکہ یہ حدیث فقر و غنی کی بنیاد پر لوگوں کی حیثیت متعین کرنے کو غلط قرار دینے کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے اور یہ بتانے کے لیے وارد ہوئی ہے کہ ہر انسان کی حیثیت اس کے دین، اخلاق اور کردار سے متعین کی جائے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے ان کی غلطی کو عملی طور پر واضح فرمایا پھر کہا: یہ فقیر اس جیسے زمین بھر کے غنی سے بہتر ہے، اس وجہ سے نہیں کہ فقیر صفت فقر کے ساتھ متصف ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ عمدہ خصوصیات سے آراستہ ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۱۵۴۴، نسائی: ۵۴۷۵، ابن ماجہ: ۳۸۴۲

(۲) بخاری: ۵۰۹۱

کے تعلق سے اپنا طرز عمل درست کرلیں اور انسان کی حیثیت فقر و غنی کی بنیاد پر متعین نہ کی جائے، اس لیے کہ کسی کی حیثیت کو متعین کرنے کا یہ اصول غلط ہے۔

ہمیں وہ احادیث جن سے فقیر کی فضیلت معلوم ہوتی ہے تو ان کا تعلق فقر پر صبر کی فضیلت سے ہے نہ کہ فقر کی فضیلت سے، بلاشبہ صبر ایک فضیلت ہے جس کا قرآن کریم نے بہت سے مقامات میں ذکر کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ فقر و زہد کے درمیان فرق واضح ہو گیا۔ الحمد للہ۔

حضور اکرم ﷺ کے کھانے پینے، لباس اور مکان کی سیرت سے متعلق گفتگو سے پہلے اس فصل کا لانا ضروری تھا، تاکہ اس سلسلے میں حضور ﷺ کا طرز عمل ہمارے سامنے واضح طور پر آسکے۔ باتوفیق وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ کی پیروی کرنے اور آپ کی سیرت کو اپنانے کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین

دوسری فصل

آپ ﷺ کی سیرت خورد ونوش کے بارے میں

کھانا بذات خود مقصد نہیں ہے؛ بلکہ وہ جسمانی ضروریات کی تکمیل کا ایک وسیلہ ہے تاکہ جسم اس زندگی میں اپنے کام کی انجام دہی کرتا رہے، یہی وجہ ہے کہ ضرورت کے بقدر مختلف اوقات میں کھانا کھانا ضروری ہے

باوجودیکہ کھانا ایک ضرورت ہے، پھر اسلام نے انسانوں کو جانوروں کی طرح کھانے میں من مانی کی چھوٹ نہیں دی ہے، بلکہ اس کے لیے حلال کا ایک دائرہ بنایا کہ اس سے کھائیں، اس کے کھانے کے آداب مقرر کئے کہ ان کی پابندی کریں، اس طرح یہ ضرورت ترقی کر کے عبادت بن جاتی ہے، جس میں زندگی کے اس پہلو میں شریعت کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔

پاکیزہ کھانا:

صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

" اے لوگو! اللہ تعالیٰ طیب ہیں اور طیب کو قبول فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مومنین کو انہی باتوں کا حکم دیا ہے جن کا حکم رسولوں کو دیا ہے اور ارشاد فرمایا: اے پیغمبرو! تم نفیس چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو، میں تم سب کے کیے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہوں، نیز فرمایا: اے مومنو! تم نفیس چیزیں کھاؤ جو کچھ ہم نے تمھیں بطور رزق دیا ہے۔

پھر ایک شخص کا تذکرہ فرمایا کہ بالوں کی پراگندگی اور غبار آلودگی کی حالت میں بسلسلہ عبادت طویل سفر کرتا ہے اور آسمان کی جانب ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہتا ہے، اے میرے رب! اے میرے رب! جبکہ اس کا کھانا پینا، لباس وغذا سب حرام ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟"۔[1]

مذکورہ بالا حدیث شریف میں لکھا ہے کہ کھانے کے پاکیزہ ہونے کے لیے دو صفتوں کا ہونا

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۰۱۵

ضروری ہے۔

اول: یہ کہ کھانا حلال ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے جس کے کھانے کو مباح قرار دیا ہے، مفسرین نے بلااختلاف اللہ تعالیٰ کے قول ''کلو من طیبات'' میں طیبات کا معنی حلال بتایا ہے۔

دوم: یہ کہ انسان نے اسے مشروع طریقے پر حاصل کیا ہو، خواہ حلال مال کے ذریعہ خرید کر یا بطور ہبہ کے، جس کی جانب حدیث کا آخری فقرہ اشارہ کررہا ہے، لہذا جس نے حرام غذا کھائی، اس کی دعا قبول نہیں ہوگی۔

اس وضاحت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دعاء کی قبولیت وعدم قبولیت کے سلسلے میں انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی تحدید میں کھانے کا دخل ہے۔

کھانے کے تعلق سے آپ کی سیرت:

ابن قیم نے کہا: کھانے کے سلسلے میں آپ کی سیرت یہ تھی کہ موجودہ چیزوں کو واپس نہیں کرتے اور غیر موجودہ کے لیے تکلف نہیں کرتے، جو بھی پاکیزہ شیٔ آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی اسے تناول فرمالیتے؛ البتہ اگر آپ کی طبیعت اسے ناپسند کرتی تو اس کو حرام قرار دیئے بغیر چھوڑ دیتے، آپ نے حلوہ اور شہد کھایا، یہ چیزیں آپ کو پسند تھیں، نیز آپ نے اونٹ، بھیڑ، مرغی، خرگوش کا گوشت اور مچھلی تناول فرمائی، اسی طرح آپ نے بھنا ہوا گوشت کھایا اور تازہ وخشک کھجور بھی کھائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خالص دودھ اور پانی ملا ہوا دودھ، ستو، پانی میں ملا ہوا شہد اور کھجور کا بھگویا ہوا پانی نوش فرمایا، نیز آپ نے تازہ کھجور اور ککڑی ملا کر کھائیں، اور مکھن کے ساتھ کھجور تناول فرمائی، آپ اس کو پسند فرماتے تھے۔

آپ کا زیادہ تر کھانا زمین پر بچھائے ہوئے دستر خوان پر رکھ دیا جاتا تھا، آپ عموماً بیٹھ کر پانی پیتے؛ بلکہ آپ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا، آپ نے ایک مرتبہ کھڑے ہو کر پانی پیا ہے، جب آپ پانی پیتے تو اپنے دائیں والے شخص کو دیتے، اگرچہ بائیں والا شخص اس سے بڑا ہی کیوں نہ ہو''۔(۱)

---

(۱) زادالمعاد: ۱/۱۴۷-۱۵۰

آپ کے گزراوقات کا بیان:

ہم اس عنوان کے ذیل میں بعض ان احادیث کا تذکرہ کریں گے جن سے حضور اکرم ﷺ کے گزراوقات کے بارے میں روشنی ملتی ہے، نیز یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

”محمد ﷺ کے گھر والوں نے –جب سے آپ مدینہ تشریف لائے– مسلسل تین دن تک گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی، یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے“۔ (۱)

حضرت عائشہؓ نے حضرت عروہؓ سے کہا:

”اے بھانجے! ہم دو مہینوں میں تین چاند دیکھ لیتے تھے، یعنی مکمل دو مہینے ہو جاتے تھے اور حضور ﷺ کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، میں نے کہا: اے خالہ! پھر کیسے گزراوقات ہوتا؟ کہا: کھجور اور پانی سے؛ البتہ حضور ﷺ کے کچھ انصاری پڑوسی تھے جن کے پاس دودھ دینے والے مویشی (جانور) تھے، وہ لوگ آپ کے پاس ان کا دودھ بھیج دیتے ، جسے آپ ﷺ ہمیں پلادیتے“۔ (۲)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

”وہ ایک قوم پر گزرے جن کے سامنے ایک بھنی ہوئی بکری رکھی ہوئی تھی، ان لوگوں نے انھیں بلایا لیکن انھوں نے کھانے سے انکار کردیا، اور کہا: حضور ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور جو کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی“۔ (۳)

حضرت عائشہؓ نے کہا:

”رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور ایک دن میں دو بار روٹی اور زیتون کے تیل

---

(۱) متفق علیہ، رقم: ۵۴۱۶، م: ۲۹۷۰

(۲) متفق علیہ: رقم: ۲۵۶۷ م: ۲۹۷۲

(۳) بخاری: رقم: ۵۴۱۴

سے شکم سیر نہیں ہوئے''۔[۱]

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''میں نے تمھارے نبی کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ردی کھجوریں اتنی بھی نہیں ہوتی تھیں کہ ان سے پیٹ بھر سکیں''۔[۲]

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا:

''میں نہیں جانتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے باریک روٹی (چپاتی) دیکھی ہو، یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملے اور نہ اپنی آنکھ سے کبھی بھنی[۳] ہوئی بکری دیکھی''۔[۴]

یہ آپ کے گزر اوقات کا انداز تھا، بیشتر مہاجرین کی زندگی بھی تقریباً یہی تھی، خیبر فتح ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کشادگی عطا فرمائی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بدستور اپنے پہلے حال ہی پر قائم رہے۔

آداب طعام کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت:

حضرت عمر بن ابی سلمہؓ نے کہا:

''میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیر کفالت لڑکا تھا، میرا ہاتھ رکابی میں چاروں طرف گھومتا تھا، آپ نے فرمایا: اے لڑکے بسم اللہ کہہ اور دائیں ہاتھ سے اپنے نزدیک سے کھا''۔[۵]

حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی کھانے کو کبھی بُرا نہیں کہا، اگر جی چاہا تو کھایا، جی نہ چاہا تو چھوڑ دیا۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۹۷۴

(۲) مسلم: رر قم: ۲۹۷۷

(۳) حدیث میں ''شاۃ سمیطاً'' کا لفظ آیا ہے، یہ وہ بکری ہے جس کے بال گرم پانی سے صاف کر دیئے جاتے ہیں، پھر اسے کھال سمیت (آگ پر) بھونا یا پکایا جاتا ہے۔

(۴) بخاری: رقم: ۵۴۲۱

(۵) متفق علیہ: رقم: ۵۳۷۶، م: ۲۰۶۴

مسلم کی روایت میں ہے کہ اگر جی نہیں چاہا تو خاموش رہے''۔ (۱)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا''۔ (۲)

حضرت کعب بن مالکؓ نے کہا:

''رسول اللہ ﷺ تین انگلیوں سے کھاتے تھے، اور اپنا ہاتھ پوچھنے سے پہلے چاٹ لیتے تھے''۔ (۳)

نبی اکرم ﷺ نے اپنے کھانے میں چھری کا استعمال کیا ہے (۴) اور اس سے گوشت اور پنیر کاٹا ہے (۵) آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی کچھ پی رہا ہو تو سانس برتن میں نہ لے (سانس لینا ہو تو برتن کو منھ سے ہٹالے)''۔ (۶)

آنحضرت ﷺ نے مشک کے منہ سے پانی پینے سے منع فرمایا (۷) آنحضرت نے لہسن، پیاز، گندنا کی بو ناپسندیدہ ہونے کے سبب انھیں نہیں کھایا اور ان کے کھانے والوں کو مسجد میں آنے سے منع فرمایا (۸)۔

یہ آداب طعام سے متعلق آنحضرت ﷺ کی بعض سیرتیں ہیں۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۵۴۰۹، م: ۲۰۶۴
(۲) بخاری: رقم: ۵۳۹۸
(۳) مسلم: رقم: ۲۰۳۲
(۴) بخاری: رقم: ۵۴۰۸
(۵) ابوداؤد: رقم: ۳۸۱۹
(۶) متفق علیہ: رقم: ۱۵۳، م: ۲۶۷
(۷) بخاری: رقم: ۵۶۲۹
(۸) بخاری: رقم: ۸۵۵، مسلم: ۵۶۴

کھانے کے بعد اللہ کی حمد:

حضرت انس بن مالکؓ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"بیشک اللہ تعالیٰ بندے سے اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ وہ کھانا کھانے اور مشروب پینے پر اس کی تعریف کرے"۔ (۱)

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے:

"آنحضرت ﷺ جب کھانے سے فارغ ہوتے تو یہ کہتے: ساری حمد اللہ کے لیے ہے جس نے ہم کو پیٹ بھر کر کھلایا پلایا، یہ حمد ایسی نہیں ہے کہ ایک بار کرنے پر ختم ہو جائے، یا پھر ناشکری کی جائے"۔ (۲)

کم کھانا:

حضرت ابن عمرؓ نے کہا:

میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا: مومن ایک آنت میں اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے"۔ (۳)

یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ ابوہریرہؓ، ابوموسی اشعریؓ اور جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے، اس سلسلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس حدیث کا ظاہر مراد نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کم کھاتا ہے اور کافر زیادہ، اس حدیث کی سب سے بہتر تشریح اللہ تعالیٰ کے قول:

«وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ» (۴) "جو لوگ کافر ہیں وہ سامانِ زیست سے مزے اٹھاتے ہیں اور حیوانوں کی طرح کھاتے ہیں"۔

اس لیے کہ ان کا مطمح نظر صرف پیٹ اور شرمگاہ ہیں، وہ جانوروں کی طرح مغفل اور حلال

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۷۳۴

(۲) بخاری: رقم: ۵۴۵۹

(۳) متفق علیہ: رقم: ۵۳۹۳، م: ۲۰۶۰

(۴) سورۂ محمد: آیت: ۱۲

وحرام کے درمیان تمیز سے بے بہرہ ہیں۔

مختصر یہ کہ مومن کم خوراک ہوتا ہے، اس وجہ سے کہ کھانا اس کے نزدیک وسیلہ ہے، نہ کہ بذات خود مقصود، جیسا کہ کافروں نے سمجھ رکھا ہے۔

مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے، انھوں نے کہا:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا: کسی آدمی نے پیٹ سے زیادہ کسی برے برتن کو نہیں بھرا، آدمی کے لیے چند لقمے کافی ہیں، جن سے اس کی کمر سیدھی رہے، اگر آدمی پر اس کا نفس غالب آجائے تو تہائی حصہ کھانے کے لیے، ایک تہائی حصہ پانی کے لیے، ایک تہائی حصہ سانس کے لیے رکھے"۔(۱)

چکنائی سے ہاتھ کا دھلنا:

حضرت ابوہریرہؓ سے راویت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جس کے ہاتھ میں چکنائی لگی ہو اور ایک روایت میں چکنائی کی بو ہو اور اس کے دھلے بغیر سو جائے، پھر اس کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے"۔(۲)

---

(۱) ترمذی: ۲۳۸۰، ابن ماجہ: ۳۳۴۹

(۲) ابوداؤد: ۳۸۵۲، الترمذی: ۱۸۶۰، ابن ماجہ: ۳۲۹۷، والدارمی: ۲۰۶۳

تیسری فصل

لباس کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت

لباس کی ضرورت:

لباس کھانے کی طرح ایک ضرورت ہے، بذات خود مقصود نہیں ہے، بلکہ تین مقاصد کے لیے وسیلہ ہے:

(۱) ستر کا چھپانا۔

(۲) زینت وآراستی۔

(۳) گرمی وسردی سے حفاظت۔

قرآن کریم نے اول اور دوم مقصد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

«يٰبَنِيٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا»(۱).

"اے اولاد آدم! ہم نے تم پر پوشاک اتاری جو تمھاری شرم گاہیں ڈھکتی ہے، اور آرائش کے کپڑے بھی اتارے"۔

اور تیسرے مقصد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

«وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ»(۲).

"اور تمھارے لیے لباس بنائے جو تمھیں گرمی سے بچاتے ہیں"۔

انھی مقاصد کے دائرے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لباس کا انتخاب فرماتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوم کا لباس پہنا:

یہ بات معلوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی قوم کا لباس زیب تن کرتے تھے حتی کہ بعثت کے بعد بھی لباس کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ البتہ آپ نے مردوں پر ریشم کے پہننے کو حرام قرار دیا

---

(۱) سورۂ اعراف: آیت: ۲۶

(۲) سورۂ نحل: آیت: ۸۱

ہے اور اسی طرح مردوں کو عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا:

خوبصورتی اور نمائشی لباس:

یہ بات گزر چکی ہے کہ کپڑوں کا ایک مقصد، ان سے بدن کی آرائش ہے، اسلام نے اسے تسلیم کیا ہے، اور اس کی اجازت دی ہے، بلکہ اس پر ابھارا ہے۔

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا، ایک آدمی نے کہا: آدمی چاہتا ہے کہ اس کا کپڑا اور جوتا بہتر ہو، تو آپ نے فرمایا: بیشک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، اور تکبر تو حق کے انکار اور لوگوں کی تحقیر کو کہتے ہیں"۔(۱)

حضرت مالک بن نضلہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

"میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک معمولی لباس میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا: کیا تمھارے پاس مال ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، آپ نے پوچھا: کس طرح کا مال ہے؟ انھوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹ، بکری، گھوڑا اور غلام عطا فرمائے ہیں، آپ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے تمھیں مال عنایت کیا ہے تو تمھارے اوپر اس کی عطا کردہ نعمت و عزت کا اثر ظاہر ہونا چاہیئے"۔(۲)

عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے کہا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بیشک اللہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو"۔(۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لوگوں سے زیب وزینت کا مطالبہ کرتا ہے۔

لیکن نام ونمود کے کپڑوں سے منع کرتا ہے، جن کا مقصد کپڑوں کے نفیس و ممتاز ہونے کے سبب لوگوں کے درمیان شہرت حاصل کرنا ہوتا ہے اور یہ صرف دنیا اور اس کی آرائش پر ایک دوسرے پر فخر کی غرض سے پہنے جاتے ہیں۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۹۱

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۰۶۳، الترمذی: رقم: ۲۰۰۶، والنسائی: رقم: ۵۲۳۸

(۳) ترمذی: رقم: ۲۸۱۹

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے شہرت کا کپڑا پہنا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن اسی جیسا کپڑا پہنائیں گے''۔ (۱)

اور ایک روایت میں ہے:

''اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ذلت کا کپڑا پہنائیں گے پھر اس پر آگ بھڑکا دی جائے گی''۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے کپڑے کا محرک بڑائی اور تکبر ہوتا ہے، یہی حکمت کپڑا لمبا کرنے کی ممانعت میں بھی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''تہبند کا ٹخنوں سے نیچے والا حصہ جہنم میں ہوگا''۔ (۲)

آنحضرت ﷺ کا لباس:

آنحضرت ﷺ کو جو لباس میسر ہوتا اسے زیب تن فرماتے، آپ نے کبھی اون، کبھی روئی، اور کبھی کتان پہنا، آپ نے کھردرا اور موٹا کپڑا پہنا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

''آنحضرت ﷺ ایک دن صبح کو باہر آئے، جبکہ آپ پر کالے بالوں کی ایک دھاری دار چادر تھی''۔ (۳)

شیخین نے حضرت بردہؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا:

''حضرت عائشہؓ نے ہمارے سامنے ایک کمبل اور ایک تہبند نکالا اور کہا: انہی دو کپڑوں میں آنحضور ﷺ کی وفات ہوئی''۔ (۴)

آپ نے خوبصورت اور نرم کپڑا بھی پہنا ہے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا:

''میں نے آنحضرت ﷺ کو ایک سرخ (دھاری دار) جوڑے میں دیکھا، میں نے آپ سے

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۴۰۳۰-۴۰۲۹، وابن ماجہ: ۳۶۰۷-۳۶۰۶

(۲) بخاری: رقم: ۵۷۸۷

(۳) مسلم: رقم: ۲۰۸۱

(۴) متفق علیہ: رقم: ۵۸۱۸، م: ۲۰۸۰

زیادہ کسی خوبصورت شخص کو نہیں دیکھا''۔ (۱)

آنحضرت ﷺ عمدہ کپڑے پسند فرماتے تھے۔ حضرت انسؓ نے کہا:

''سب کپڑوں میں آنحضرت ﷺ کو یمنی سبز چادر پہننا بہت پسند تھا''۔ (۲)

حضرت ام سلمہؓ نے کہا:

''آنحضرت ﷺ کو تمام کپڑوں میں قمیص پسند تھی''۔ (۳)

ابن قیم نے کہا: نبی کریم ﷺ نے یمنی چادر، سبز چادریں، جبہ، قباء (چوغہ) پائجامہ، تہبند، چادر، موزہ اور جوتا پہنا ہے (۴)

لباس وغیرہ میں دائیں سے شروع کرنا:

آنحضور ﷺ کو تمام امور میں دائیں سے شروع کرنا پسند تھا۔

حضرت عائشہؓ نے کہا:

''آنحضرت ﷺ جوتا پہننے میں، بال سنوارنے میں، پاکی حاصل کرنے میں، اور تمام کاموں میں دائیں طرف سے شروع کرنے کو پسند کرتے تھے''۔ (۵)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کہا:

''جب تم میں سے کوئی جوتا پہنے تو پہلے دایاں پاؤں ڈالے اور جب جوتا اتارے تو پہلے بایاں پاؤں کا جوتا اتارے، دایاں پاؤں پہننے میں اول ہو اور اتارنے میں آخری پاؤں یعنی بایاں پاؤں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تم میں سے کوئی ایک جوتا پہن کر نہ چلے، یا تو دونوں اتار دے یا دونوں

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۵۵۱، م: ۲۳۳۷

(۲) متفق علیہ: رقم: ۵۸۱۳، م: ۲۰۷۹

(۳) ابوداؤد: رقم: ۴۲۵، ترمذی: ۱۷۶۲، ابن ماجہ: ۳۵۷۵

(۴) زادالمعاد: ۱/۱۴۳

(۵) متفق علیہ: رقم: ۱۶۸، م: ۲۶۸

پہن کر چلے''۔[۱]

حضرت ابوہریرہؓ نے کہا:

''آنحضرت ﷺ جب قمیص پہنتے تو دائیں طرف سے شروع کرتے''۔[۲]

آپ نے کبھی کبھی موٹا جھوٹا لباس بھی پہنا:

اسلام زیب وزینت اور ظاہر پر توجہ دینے کا حکم دیتا ہے، لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان کا یہی دائمی مشغلہ بن جائے، بلکہ مناسب یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں سادگی اور ترک زینت کی بھی گنجائش ہو۔

عبداللہ بن بریدؒ سے روایت ہے:

''ایک صحابیِ رسول نے اس وقت کے امیر مصر فضالہ بن عبید سے ملاقات کی، دیکھا کہ ان کے بال پراگندہ ہیں، ان سے کہا: کیا بات ہے کہ آپ سرزمین مصر کے امیر ہیں، پھر بھی آپ کے بال پراگندہ ہیں، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کو زیادہ خوش عیشی اختیار کرنے سے منع فرماتے تھے، صحابی نے کہا: میں آپ کے پاؤں میں جوتا بھی نہیں دیکھ رہا ہوں، فرمایا: نبی کریم ﷺ ہم لوگوں کو کبھی کبھی ننگے پاؤں رہنے کا حکم دیا کرتے تھے''۔[۳]

حدیث میں ہے:

''سادگی ایمان کا حصہ ہے''۔[۴]

بلاشبہ خوش عیشی کی زیادتی یعنی ناز ونعم میں غرق ہونا، اور اس میں پڑے رہنا ایک ناپسندیدہ امر ہے، اس وجہ سے کہ اس سے قساوت قلبی پیدا ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سادگی اور کم سے کم کپڑا رکھنا ایمان کا حصہ ہے؛ لیکن سادگی اور ترک زینت کا مطلب طہارت ونظافت کو چھوڑ دینا نہیں ہے، اس وجہ سے کہ یہ تو دین کا حصہ ہے۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۵۸۵۵۔۵۶، نسائی ۵۰۷۳، ۵۲۵۴م رقم: ۲۰۹۷

(۲) ۲۰۹۷ ترمذی: رقم: ۱۷۶۶

(۳) ابوداؤد: رقم: ۴۱۶۰، نسائی ۵۰۷۳، ۵۲۵۴ رقم:

(۴) ابوداؤد: رقم: ۴۱۶۱، ابن ماجہ: ۴۱۱۸

فائدہ: ہم سب کو مندرجہ بالا مضمون بغور پڑھنا چاہئے اور خود بھی اور اپنے بچوں کی بھی اسی طور پر تربیت کرنی چاہئے اس لیے کہ یہی اقرب الی طریق السنتہ ہے۔ و باالله التوفیق۔ (از: مترجم)

دعاء:

ابو سعید خدریؓ نے کہا:

«كان رسول الله ﷺ اذا استجد ثوبا، سماه باسمه، إما قميصا، أو عمامة، ثم يقول: اللهم لك الحمد، انت كسوتنيه، أسألك من خيره وخير ما صنع له، وأعوذ بك من شره وشر ما صنع له»[1].

"آنحضرت ﷺ جب نیا کپڑا پہنتے تو اس کا نام لیتے، خواہ قمیص ہوتی یا عمامہ، پھر کہتے: اے اللہ! آپ ہی کے لیے ساری تعریف ہے، آپ نے ہی مجھے پہنایا، آپ سے اس کے خیر اور جس مقصد کے لیے وہ بنایا گیا ہے اس کے خیر کا طلب گار ہوں اور آپ کی اس کے شر اور جس مقصد سے وہ بنایا گیا ہے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں"

کپڑوں کے رنگ:

احادیث میں وارد کپڑوں کے رنگ کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کُسُم میں رنگے ہوئے اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑوں کو چھوڑ کر تمام رنگوں کا استعمال کیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمروؓ نے کہا:

"آنحضرت ﷺ نے میرے بدن پر دو کُسُم میں رنگے ہوئے کپڑے دیکھے تو فرمایا: کیا تمھاری ماں نے اس کا حکم دیا ہے؟ میں نے کہا: انھیں دھل دوں؟ آپ نے کہا: بلکہ انھیں جلا دو اور ایک روایت میں ہے کہ وہ کفار کے کپڑے ہیں، انھیں مت پہنو"۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

"آپ ﷺ نے کُسُم میں رنگے ہوئے کپڑے سے منع فرمایا ہے"۔[3]

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۴۰۲۰، والترمذی: ۱۷۶۷۔
(۲) مسلم: رقم: ۲۰۷۷
(۳) مسلم: رقم: ۲۰۷۸

حضرت ابن عمروؓ کی حدیث سے ایک اور بات بھی ثابت ہوتی ہے، وہ یہ کہ مسلمان کفار کے مخصوص لباس نہ پہنے، حدیث میں معصفر (عصفر سے رنگا ہوا سرخ رنگ کا کپڑا) اور مزعفر یعنی (زعفران سے رنگا ہوا کپڑا) کے الفاظ آتے ہیں۔

انگوٹھی پہننا:

اسلام نے مرد کے لیے چاندی کی انگوٹھی پہننا مباح کیا ہے، آنحضرت ﷺ نے اسے پہنا ہے اور سونے کی انگوٹھی کو حرام قرار دیا ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی تو اسے نکال کے پھینک دیا، اور کہا: تم میں سے کوئی شخص جہنم کے انگارے کا ارادہ کرتا ہے تو پھر اس کو اپنے ہاتھ میں پہن لے، حضور ﷺ کے چلے جانے کے بعد اس شخص سے کہا گیا کہ اپنی انگوٹھی لے کر اس سے نفع اٹھاؤ، تو انھوں نے کہا کہ حضور ﷺ کے پھینک دینے کے بعد میں اس کو کبھی بھی نہیں لوں گا"۔ (۱)

عورتوں کی زینت:

اندرون خانہ عورتوں کی زینت مطلوب ہے اور عورتوں کو حکم ہے کہ اپنے شوہر کے لیے بناؤ سنگار کریں، زینت مختلف النوع کپڑوں سے بھی ہوتی ہے اور زیورات سے بھی۔

اور سونا عورتوں کے لیے زیب وزینت کے وسائل میں سرفہرست ہے، احادیث میں ان کے لیے مباح قرار دیا گیا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میری امت کے مردوں پر ریشمی لباس اور سونا حرام قرار دیا گیا ہے اور عورتوں کے لیے حلال ہے"۔ (۲)

حضرت علیؓ سے روایت ہے:

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۰۹۰

(۲) ترمذی: رقم: ۱۷۲۰، والنسائی: رقم: ۵۲۸۰۔ ۵۱۶۳

"آنحضرت ﷺ نے ریشم کو اپنے دائیں ہاتھ میں اور سونا کو بائیں ہاتھ میں لے کر فرمایا: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں، ابن ماجہ کی روایت میں یہ زیادتی آئی ہے کہ یہ دونوں عورتوں کے لیے حلال ہیں"۔ (۱)

دونوں حدیثوں میں عورتوں کے لیے سونا چاندی کے مباح ہونے کی واضح دلیل موجود ہے، اباحت کا معنی یہ ہے کہ کسی کام کا نہ کرنا اور کرنا برابر ہو، نہ اس کے کرنے پر ثواب ہو اور نہ اس کے چھوڑنے پر عذاب ہو، جب شریعت کا یہ حکم ہے تو دیکھا جائے کہ نبی کریم ﷺ کے گھر والوں نے اس کے کرنے کو ترجیح دی ہے یا اس کے چھوڑنے کو؟

مکی زمانے کے آخر میں آیت تخییر "سورۂ احزاب: ۲۷" نازل ہوئی جس میں ازواج مطہرات کو اختیار دیا گیا کہ وہ دنیوی زندگی کی زینت کو اختیار کریں یا بغیر زینت کے حضور کے پاس رہنے کو، تمام ازواج مطہرات نے بغیر زینت کے آپ کے پاس نکاح میں رہنے کو ترجیح دی، رضی اللہ عنہن۔

جب ہم آیت تخییر سے پہلے ازواج مطہرات کی حیات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے پتہ چلے کہ ان میں سے کسی کے پاس سونے کا زیور رہا ہو۔

اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ ہمیں یہ ملتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھیں اور ان سے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے عاریت پر لیا ہوا ایک ہار گم ہو گیا تھا، اسی کی تلاش آیت تیمم کے نزول کا سبب بنی"۔ (۲)

یہ حدیث سنن ترمذی کے علاوہ بقیہ صحاح ستہ میں موجود ہے، اسی طرح دارمی نے بھی اس کی تخریج کی ہے، لیکن کسی بھی روایت میں ہار کی نوعیت کا ذکر نہیں ہے۔

غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر دوسرے واقعہ میں حضرت عائشہؓ سے ظفار کے پتھر کا بنا ہوا ایک ہار گم ہوا، جس کی تلاش حادثۂ افک کا سبب بنی"۔ (۳)

حضرت اسماء کا ہار خواہ سونے کا ہو—ویسے ہمیں اس کا یقین نہیں ہے—یا سونے کا نہ ہو؛ لیکن

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۴۰۵۷، والنسائی: رقم: ۵۱۶۲-۵۱۵۹، وابن ماجہ: رقم: ۳۵۹۵

(۲) بخاری: رقم: ۳۷۷۳، مسلم: رقم: ۳۶۷، ابوداؤد: ۳۱۷

(۳) بخاری: رقم: ۴۱۴۱، مسلم: رقم: ۲۷۷۰

حضرت عائشہؓ کی ملکیت نہیں تھا۔

اور دوسرا ہار یمنی موتیوں کا تھا، جو یمن کے گاؤں ''ظفار'' میں بنایا جاتا تھا۔

ہمیں یقین ہے کہ دیگر ازواج مطہرات کا حال بھی حضرت عائشہ ہی جیسا رہا ہو گا۔

جب ہم حضرت فاطمہؓ کے حالات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو مندرجہ ذیل حدیث سامنے آتی ہے، آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''آنحضرت ﷺ حضرت فاطمہ کے پاس آئے اور دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں سونے کی ایک زنجیر ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو ہدیہ میں دی تھی، آپ نے فرمایا: فاطمہ! کیا تم لوگوں کی طرف سے رسول اللہ کی بیٹی کہنے سے دھوکے میں ہو جبکہ ہاتھ میں سونے کی زنجیر پڑی ہوئی ہو، پھر وہاں سے نکل آئے، بیٹھے نہیں، حضرت فاطمہؓ نے اس زنجیر کو بازار میں بھیج کر فروخت کر دیا اور اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا۔

جب یہ بات نبی کریم ﷺ کو بتائی گئی تو آپ نے فرمایا: تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے فاطمہ کو جہنم کی آگ سے نجات دی''۔(۱)

احمد کی روایت میں ہے:

''اے فاطمہ! کیا یہ انصاف ہو گا کہ لوگ فاطمہ بنت محمد کہیں جبکہ تمھارے ہاتھ میں آگ کی زنجیر ہو، پھر انھیں سخت قسم دی''۔(۲)

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کو زیور اور ریشم سے منع فرماتے تھے اور کہتے تھے: اگر تم لوگ جنت کا زیور اور اس کا ریشم پسند کرتے ہو تو ان کو دنیا میں نہ پہنو''۔(۳)

حضرت ثوبان و عقبہ رضی اللہ عنہما کی حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی

---

(۱) نسائی: رقم: ۵۱۵۵۔۵۱۵۶

(۲) الفتح الربانی: ۲۶۰/۱۷، الحدیث: ۹۰

(۳) نسائی: رقم: ۵۱۵۱

ازواج مطہرات اور لخت جگر کے لیے سونے کے زیور کے نہ پہننے کو ترجیح دی ہے جبکہ ظفار کے پتھر سے بنے ہوئے ہار کے پہننے پر حضرت عائشہ کو کوئی ملامت نہیں کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ عورتیں کم قیمت کے زیورات پہننے کو ترجیح دیں۔

جب مسلمان خواتین کو اختیار ہے کہ امر مباح کو اپنائیں یا حضور ﷺ نے اپنی بیٹی اور بیویوں کے لیے جو پسند فرمایا ہے اسے اپنا وتیرہ بنائیں، تو ہمیں یقین ہے کہ وہ دوسری صورت کو اختیار کریں گی، اس لیے کہ حضور ﷺ ہی اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کے لیے منتخب کردہ اشیاء میں نمونہ عمل ہیں۔

عورتوں کی زینت کے سلسلے میں گفتگو کے موقع پر مناسب ہے کہ لباس شہرت سے متعلق سابقہ مضمون کی گزشتہ باتیں ذہن نشیں کرلی جائیں، اس وجہ سے کہ عورتیں اس مسئلے میں مردوں سے زیادہ حریص ہوتی ہیں، زیب وزینت لوگوں کے عام طور پر پہننے والے کپڑوں سے بھی ممکن ہے، ان کا ممتاز ومنفرد ہونا ضروری نہیں ہے کہ ان کو پہننے والی خاتون دیگر خواتین پر اپنے کو فائق محسوس کرے، جس کے نتیجے میں کبر وغرور پیدا ہو، جو دوزخ میں جانے کا ذریعہ ہے۔

فوقیت نفس کی بلندی اور روح کی بالیدگی سے ہوتی ہے، نہ کہ لباس، زیورات، اور ظاہری شکل وصورت سے۔ اور نفس کی بلندی حاصل ہوتی ہے اللہ کے لیے تواضع اختیار کرنے اور ''ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم'' [1] کے تناظر میں دوسروں کی طرف دیکھنے سے، یہ کون جانتا ہے کہ اتقی (سب سے زیادہ پرہیزگار) کون ہے، اس لیے ہر شخص کو ذاتی طور پر تواضع اختیار کرنی چاہئے، ہر شخص کا احترام کرنا چاہیے، لوگوں پر برتری اور امتیازی حیثیت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

---

(۱) سورۂ حجرات: آیت: ۱۳

چوتھی فصل

حضور ﷺ کی رہائش کے بارے میں

رہائش کی ضرورت:

کھانا، پانی اور لباس کے بعد رہائش کو ضرورت میں شمار کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ»(۱).

"اور اللہ تعالیٰ نے تمھارے واسطے تمھارے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی اور تمھارے لیے جانوروں کی کھال کے گھر بنائے، جن کو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام کے دن ہلکا پاتے ہو، اوران کے اُون اوران کے رُوؤں اوراُن کے بالوں سے گھر کا سامان اور فائدہ کی چیزیں ایک مدت تک کے لیے بنائیں"

پس ٹھہرنے کی جگہ سفر، حضر دونوں صورت میں ایک ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے دوسری جگہ منتقل ہونے کی صورت میں اسے گھر مہیا کئے جن کا کھڑا کرنا اور اسی طرح ان کا اٹھالے جانا آسان ہوتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک احسان ہے۔

مکان کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کو سکون حاصل ہو، جس کا ذکر آیت کریمہ میں موجود ہے، آیت میں سکون سے مراد مستقل ٹھکانے کا حاصل ہونا اور جسمانی راحت کی جگہ مہیا ہونا ہے، جہاں انسان لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ ہوتا ہے، اوران کے درمیان رواجی ظاہری بندشوں سے آزاد ہوتا ہے، اور تمام پابندیوں سے دور اپنے خاندان کے ساتھ یا تنہا زندگی بسر کرتا ہے۔

اور "بیت" (گھر) ہی وہ جگہ ہے جہاں انسان گرمی اور سردی سے محفوظ رہتا ہے، اور سر چھپانے کا اس کو محفوظ ٹھکانہ ملتا ہے۔

یہ تمام چیزیں انسان کی زندگی میں اہمیت رکھتی ہیں، اس لیے اسلام نے مکان کا شمار ان ضروری

---

(۱) سورۃ النحل: آیت: ۸۰

چیزوں میں کیا ہے جن کی مذہب اسلام نے رعایت فرمائی ہے اوران کو حرمت وتحفظ عطا کیا ہے۔

مدینہ میں حضور ﷺ کا گھر:

مکہ میں حضور اکرم ﷺ کی رہائش گاہ کے تعلق سے ہمارے سامنے ایسی روایات نہیں ہیں جن کی طرف ہم رجوع کر سکیں؛ کیونکہ عقیل بن ابی طالب نے ہجرت کے بعد آپ کے رہائشی مکان کو فروخت کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ جب حجۃ الوداع میں حضرت اسامہ بن زید نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ کل کہاں قیام فرمائیں گے تو آپ نے کہا: کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر چھوڑا ہے؟۔(۱)

اس وجہ سے ہماری گفتگو حضور ﷺ کے مدینے کے گھر تک ہی محدود رہے گی۔

جب رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کرائی تو اس کے بغل میں پچھلے حصہ کی طرف پورب سمت میں دو کمرے تعمیر کرائے، قبلہ ان دنوں بیت المقدس کی سیدھ میں تھا۔

تحویل قبلہ کے بعد یہ دونوں کمرے قبلہ کی دیوار کے برابر نماز پڑھنے والے کے بائیں جانب ہو گئے، جبکہ وہ قبلہ رُخ ہو۔

ان میں سے ایک ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہؓ کے لیے تھا اور دوسرا حضرت عائشہ کے لیے تیار کیا گیا تھا، اس وقت ان سے عقد ہو چکا تھا۔

رہے باقی کمرے تو بعد میں جب ضرورت پڑی تعمیر کئے گئے، نبی کریم ﷺ جب نئی شادی کرتے تو ایک کمرہ تعمیر کراتے۔

ابن جوزی نے محمد بن عمر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حارثہ بن نعمان کے مسجد کے ارد گرد اور اس کے قریب مکانات تھے جب آنحضرت ﷺ کسی عورت سے نکاح فرماتے تو حارثہ آپ کے لیے اپنے گھر سے دستبردار ہو جاتے، یہاں تک کہ ان کے یہ تمام مکانات رسول اللہ ﷺ اور ان کی

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۰۵۸، مسلم: رقم: ۱۳۵۱

ازواج کے لیے ہو گئے''۔ (۱)

یہ تمام گھر مسجد کی شرقی جانب، نماز پڑھنے والے کے بائیں جانب واقع تھے، جبکہ وہ قبلہ رُخ ہو اور بعض مکانات مسجد کے قبلہ کی طرف تھے، ان کے اور مسجد کی دیوار کے درمیان پانچ ہاتھ چوڑا راستہ تھا، ان کی تعمیر کچی اینٹ کی تھی، ان کی چھت کھجور کی ٹہنی کی تھی، یہ کل نو عدد مکانات تھے۔

ان میں چار مکانات کے سامنے کھلی جگہ تھی، جسے کھجور کی ٹہنی سے اس طرح گھیر دیا گیا تھا کہ لوگ کمرے تک نہ پہنچ سکیں، اور ان کمروں کی دیوار کھجور کی ٹہنی کی تھی جسے مٹی سے مضبوط کیا گیا تھا۔

ہمیں روایات میں ان کمروں کے دروازوں اور پردوں کا ذکر ملتا ہے، چنانچہ مروی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے کمرے کا دروازہ ساکھو یا سرو کی لکڑی کا بنا ہوا ایک پٹ کا تھا، جیسا کہ مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دروازہ ناخن سے کھٹکھٹایا جاتا تھا۔

صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اصحاب پر جو آخری نگاہ ڈالی تھی اس کے لیے پردہ اٹھایا تھا، مجھے ایسا لگتا ہے کہ گھروں (کمروں) کے دروازے لکڑی کے تھے، گھروں کے سامنے کی کھلی جگہ کے دروازوں پر صرف پردہ ہوتا تھا۔

یہ پردے بال کے بنے ہوئے کمبل کے تھے، عمر بن ابی انیس نے ان میں سے ایک کو ناپا تو تین ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ چوڑا تھا۔

ان گھروں کا رقبہ وسیع نہیں تھا، صحیح حدیث میں وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب رات کی نماز میں سجدہ کرتے، حضرت عائشہؓ کو ہاتھ سے چھوتے اور جب تک آپ سجدے کرتے تھے وہ اپنا پیر سمیٹے رہتیں، اور جب کھڑے ہوتے تو پھیلا لیتیں، اس صورت حال سے ان کے گھروں کی صورت حال

---

(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت حارثہ ابن نعمان کو اس کا پورا پورا معاوضہ دیا، اگر انھوں نے یہ مکان ہدیہ کئے تو یہ بات معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہدیہ سے کئی گنا زیادہ بدلہ دیا کرتے تھے، یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قیمت ادا کی، اور ان کے شکر گزار ہوئے کہ ان کی وجہ سے ازواج مطہرات کے گھر مسجد سے قریب ہوئے..... ہمیں معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسجد نبوی کے لیے بھی زمین ہدیۃً قبول نہیں کی، بلکہ اس کی قیمت ادا کی.....آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ: ہم نے ہر کسی کے احسان کا بدلہ چکا دیا، سوائے ابو بکر کے کہ ہم پر ان کے احسان کا بدلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ دیں گے (ترمذی: رقم: ۳۶۶۱) اس سے یہ بات پختہ ہو گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حارثہ کو معاوضہ ادا کیا۔

واضح ہوتی ہے، حضرت حسن بصری نے چھت کی اونچائی کے بارے میں کہا کہ میں حضرت عثمان بن عفان کے عہد خلافت میں ازواج مطہرات کے گھروں میں داخل ہوتا تھا تو ان کی چھت ہاتھ سے چھولیتا تھا۔

حضرت ام سلمہؓ نے اپنے گھر کا کمرہ کچی اینٹ سے بنایا تھا، یہ اس وقت جبکہ آپ ﷺ غزوہ دومۃ الجندل میں تشریف لے گئے، جب آپ واپس آئے تو کچی اینٹ دیکھی اور سب سے پہلے ان کے پاس گئے اور کہا: یہ کیسی تعمیر ہے، انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرا مقصد تھا کہ لوگوں کی نگاہوں سے حفاظت رہے، آپ نے فرمایا: اے ام سلمہ! سب سے بُری چیز جس میں مسلمانوں کا مال ختم ہوتا ہے وہ عمارت ہے۔

یہ رسول اللہ ﷺ کے گھر تھے جن میں وحی نازل ہوتی تھی اور نبی خیر البشر ﷺ اس میں زندگی بسر کرتے تھے۔

مکانات کا انہدام:

یہ مکانات ولید کے دورِ حکومت آنے تک باقی رہے، یہاں تک کہ ولید کا دورِ حکومت آگیا اور مسجد نبوی نمازیوں کے لیے تنگ ہونے لگی، اور اس کی توسیع ضروری ہوگئی اور نبی کریم ﷺ کے مکانات مسجد سے سب سے قریب ہونے کی وجہ سے ضرورتاً انھیں منہدم کیا گیا۔

عطاء خراسانی نے کہا: میں نے ازواج مطہرات کے کمروں کو کھجور کی ٹہنی کا پایا جن کے دروازے پر سیاہ بال کے بنے ہوئے کمبل لٹکے ہوئے تھے، میں اس موقع پر موجود تھا، جب ولید کا خط پڑھا جارہا تھا جس میں اس نے ان مکانات کو مسجد میں داخل کرنے کا حکم دیا تھا، میں نے اس دن سے زیادہ رونے والے کبھی نہیں دیکھے۔

کاش کہ یہ مکانات نہ ڈھائے جاتے:

عطاء نے کہا: ان مکانات کے ڈھائے جانے کے دن میں نے سعید بن مسیب کو کہتے ہوئے سنا: بخدا میری خواہش تھی کہ لوگ ان مکانات کو اپنی حالت پر باقی رکھتے، مدینہ میں پروان چڑھنے والی نئی نسل اور دنیا بھر سے آنے والے لوگ دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں کس درجہ قناعت سے کام لیتے تھے جس سے لوگ ایک دوسرے پر فخر کرنے اور ایک دوسرے سے بڑھنے کی خواہش

چھوڑ دیتے۔

عمر بن ابی انس نے کہا: جس دن یہ مکانات منہدم کئے گئے میں ایک مجلس میں تھا جس میں اصحابِ رسول کے اولاد ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوف، ابوامامہ بن سہل بن حنیف اور خارجہ بن زید بن ثابت وغیرہ موجود تھے اور سب رو رہے تھے، یہاں تک کہ آنسوؤں نے ان کی ڈاڑھیاں بھگودیں، ابوامامہ نے اس دن کہا: کاش کہ یہ منہدم نہ کئے گئے ہوتے، ویسے ہی چھوڑ دئے گئے ہوتے تاکہ لوگ تعمیر سے رُک جاتے اور دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے کس چیز کو پسند فرمایا تھا جبکہ آپ کے ہاتھ میں دنیا کے خزانوں کی کنجیاں تھیں"۔(۱)

نبی اکرم ﷺ کے مکانات کے سامان:

ان مکانات کے حالات معلوم ہونے کے بعد ان کے بستر اور سامان کی نوعیت کا اندازہ لگانا آسان ہے، حضرت عائشہؓ نے کہا:

آنحضرت ﷺ جس بستر پر سوتے تھے وہ چمڑے کا تھا، اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، جس تکیہ پر آپ ٹیک لگاتے تھے وہ چمڑے کا تھا اور اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی"۔(۲)

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام لانے کے واقعہ کے ذیل میں بیان کیا ہے:

"پھر مجھے رسول اللہ ﷺ لے کر چلے یہاں تک کہ جب مجھے اپنے گھر میں لے گئے تو کھجور کی چھال سے بھرا ہوا چمڑے کا ایک تکیہ اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا اور کہا: اس پر بیٹھو، میں نے کہا: نہیں، بلکہ آپ تشریف رکھئے، آپ نے فرمایا: نہیں، بیٹھو، میں اس پر بیٹھ گیا اور رسول اللہ ﷺ زمین پر بیٹھے"۔(۳)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہم سے اس بالاخانے کا تذکرہ کرتے ہوئے — جس میں آپ نے اپنی

---

(۱) اس پوری بحث کے حوالہ جات: طبقات ابن سعد: ۴۹۹/۱۔۵۰۱، الوفا باحوال المصطفیٰ: ۴۰۵/۱۔۴۰۶، خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ: ۲۱۹۔۲۲۲، البدایہ والنہایہ: ۲۲۰/۳، شرح الزرقانی علی المواہب: ۳۰۷/۱، مرآۃ الحرمین: ۴۶۲/۱

(۲) متفق علیہ: رقم: ۶۴۵۶، م: ۲۰۸۲، واللفظ لمسلم

(۳) سیرت ابن ہشام: ۵۸۰/۲

بیویوں سے علیحدگی اختیار کی تھی — کہتے ہیں:

”بلاشبہ آپ ﷺ ایک چٹائی پر تھے جس پر کوئی چیز بچھی نہیں تھی، آپ کے سر کے نیچے چمڑے کا تکیہ تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، میں نے آپ کے پہلو پر چٹائی کا نشان دیکھا اور رو پڑا، آپ نے کہا: کیوں رو رہے ہو؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! قیصر و کسریٰ تو عیش و آرام میں ہیں، اور آپ اللہ کے رسول ہیں (پھر بھی آپ کے یہاں بے سروسامانی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم راضی نہیں ہو کہ دنیا ان کے لیے ہو اور آخرت ہمارے لیے۔ آپ کے یہاں کھجور کی ایک چٹائی تھی جس پر آپ نماز پڑھتے تھے“۔ (۱)

صورت حال کے مکمل خدوخال:

یہ آپ ﷺ کے گزراوقات کی صورت حال کے بعض خدوخال ہیں، قارئین بقیہ کی تکمیل کر سکتے ہیں، کمرے اور گھر تعمیری اعتبار سے نہایت سادہ، رقبہ بہت کم اور اونچائی قلیل تھی، بستر اتنے کہ کسی طرح ضرورت پوری ہو جائے، کھانا اتنا کہ سانس چلتی رہی، کبھی وہ بھی نہیں، لباس کا بھی یہی حال تھا۔

اس طرح وسائل آپ کی حیات میں اپنی صحیح کیفیت پر باقی تھے، آگے بڑھ کر مقاصد نہیں بن گئے تھے، آپ کا ارشاد ہے:

”میں اور دنیا ایک سوار کے مثل ہے جس نے کسی درخت سے سایہ حاصل کیا پھر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا“۔ (۲)

اگر آپ چاہتے تو جتنا چاہتے دنیا حاصل ہو جاتی، ہم نے آپ کی بخشش کا حال دیکھا ہے کہ اس شخص کی طرح دادودہش کرتے تھے جسے فاقہ کا اندیشہ نہ ہو۔

بیہقی نے حضرت عائشہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ انھوں نے کہا:

”میرے پاس ایک انصاری خاتون آئی اور دیکھا کہ حضور ﷺ کا بستر ہری چادر ہے تو انھوں نے اون سے بھرا ہوا بستر میرے پاس بھیجا، جب رسول اللہ ﷺ میرے پاس آئے تو فرمایا: عائشہ!

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۹۱۳، م: ۱۴۷۹

(۲) ترمذی: رقم: ۲۳۷۷، فتح الباری: ۴۷۱/۱۱

یہ کیا ہے؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! فلاں انصاری خاتون آئی تھی اور آپ کا بستر دیکھا تو انھوں نے میرے پاس یہ بھیجا، آپ ﷺ نے کہا: عائشہ! اسے واپس کرو، بخدا اگر میں چاہتا تو اللہ تعالیٰ میرے ساتھ سونے چاندی کا پہاڑ چلا دیتے''۔(۱)

آپ ﷺ اپنے اس طرز عمل کے ذریعہ انسانی قلوب کو حقائق اشیاء کی جانب متوجہ کر رہے ہیں، اور لوگوں کی آنکھیں کھول رہے ہیں، تاکہ آپ کے گزر اوقات کے ضمن میں تمام امور کو صحیح کیفیت پر دیکھ سکیں، ہم ازواج مطہرات کے کمروں کے باقی رہنے اور منہدم نہ کئے جانے کے سلسلے میں سعید بن مسیب اور ابوامامہ بن سہل کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں؛ تاکہ لوگ حضور ﷺ کی قناعت پسندی کا مشاہدہ کر سکتے اور ان کمروں کا انہدام ولید کی غلطی تھی جس کی سنگینی کا اس نے احساس نہیں کیا؛ ورنہ ان کا باقی رہنا مسلمانوں کے لیے مسجد کی توسیع سے کہیں بہتر تھا۔ بیشک

اسوۂ حسنہ اور ذریعۂ تسلی:

بہر حال کیا لوگوں کے بس میں ہے کہ اس نقش قدم کی پیروی کر سکیں اور اس راستے کو اپنا سکیں؟ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ طرز عمل بہت اونچا ہے جس کا ہر مسلمان کو متمنی ہونا چاہیے اور حسب استطاعت اس سے قریب ہونا مطلوب ہے۔

بلاشبہ امت کے بہت سے فقہاء و علماء —اور وہی خلاصۂ امت ہیں— نے حضور کی پیروی میں اس راستے کو اپنایا، حضور اکرم ﷺ کے گزر بسر کے طرز عمل میں غور و فکر کرنے سے ہمارے سامنے افراد و قوم کے تیار کرنے میں بے شمار فوائد نظر آتے ہیں، ہم دو حکم کا ذکر کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، پہلا اس کا تعلق امت کی بڑی مصلحتوں سے ہے، اور دوسرا افراد کے دائرہ کار سے متعلق ہے۔

(۱) خلفائے راشدین اور ان کے راستے پر چلنے والے بعد کے لوگ جیسے عمر بن عبدالعزیز، نورالدین، صلاح الدین نے یہ بات سمجھی، بلاشبہ رسول اللہ ﷺ اپنے اس طرز عمل کے ذریعہ مسلم حکمرانوں کے بطور خاص اسوہ اور نمونہ عمل ہیں، اور حضور کے گزر اوقات کے اس پہلو میں آپ کی سیرت پر عمل کرنا چاہیے، اپنے اس فہم کی وجہ سے یہ لوگ خلفائے راشدین قرار پائے۔

حضرت علیؓ اس کی حکمت کی جانب توجہ مبذول کرتے ہوئے کہتے ہیں: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ائمہ

---

(۱) المواہب اللدنیہ للقسطلانی: ۴۷۱/۲

عدل پر فرض کیا ہے کہ اپنے کو عوام کی سطح پر رکھیں تاکہ فقیر پر اس کا فقر برا نہ معلوم ہو۔

حضرت علیؓ کی رائے میں یہ فرض ہے، فضائل کے باب میں نہیں ہے، جیسا کہ ان کی عبارت سے —جبکہ وہ بلاغت کے امام ہیں— ظاہر ہے۔

یہ کس قدر عمدہ تسلی کی بات ہے کہ فقیر کھانے، پہننے اور رہنے سہنے میں حاکم وقت کے معیار پر گزر بسر کرے''۔[1]

(۲) یہ ہمیشہ کے لیے ہر ایک مسلم فقیر (محتاج) کے لیے تسلی ہے اور اس کے لیے صبر کرنے، پیٹ پر پتھر باندھنے اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں حضور اکرم ﷺ کی اقتداء کا پیغام ہے۔

تین آدمی عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور کہا:

''ابو محمد! ہم بخدا کسی چیز پر قادر نہیں ہیں، نفقہ پر، نہ جانور پر، اور نہ سامان پر، تو انھوں نے ان لوگوں سے کہا: تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ اگر چاہتے ہو تو ہمارے پاس آؤ، ہم تمھیں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمھارے لیے میسر کیا ہوگا دیں گے اور اگر چاہو تو تمھارے مسئلے کو بادشاہ سے ذکر کر دیں اور اگر چاہو تو صبر کرو، اس وجہ سے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو کہتے ہوئے میں نے سنا ہے کہ مہاجر اور فقراء قیامت کے دن جنت میں مالداروں سے چالیس سال پہلے پہنچ جائیں گے، ان لوگوں نے کہا: ہم صبر کریں گے، کچھ بھی سوال نہیں کریں گے''۔[2]

ان لوگوں نے حدیث سنتے ہوئے صاحب حدیث کی زندگی کا تصور کیا اور انھیں اس میں فقراء کی زندگی ملی جس نے ان میں صبر اور سوال نہ کرنے کی روح پھونک دی۔ اور اس میں مصیبت و تنگی کے اوقات میں حضور ﷺ کی اقتداء میں صبر پر امت کی تربیت ہے۔

اس کے بعد:

بہر کیف! ہم اس بات کی دعوت نہیں دیتے کہ لوگ اپنے گھروں اور سامانوں کو خیر باد کہہ دیں اور کھجور کی شاخوں کے گھر اور کھجور کی چھال کے بستر کی تلاش میں لگ جائیں، نبی کریم ﷺ اور

---

(۱) اس کی تفصیلات کے لیے دیکھئے: من معین السیرۃ: ۴۶۵-۴۷۵

(۲) مسلم: رقم: ۲۹۷۹

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا حکم نہیں دیا ہے، نبی کریم ﷺ کی سیرت سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے؛ اس کی روشنی میں یہ بات کہتے ہیں کہ مسلمان کی زندگی، ماحول اور اس کے حالات نبی ﷺ کے نقش قدم کی پیروی میں گزرنے چاہئیں، چنانچہ وہ اس زندگی کے سامان تفریح کو اپنا مقصود نہ بنائے اور نہ اپنی فکر پر اسے غالب ہونے دے اور نہ ایسا ہو جائے کہ اس کی نگاہ میں صرف اس کا بستر، سامان، گھر اور کمرہ ہی گھومتا رہے اور نہ اپنے قلب کو اس کے رنگ وصورت میں مشغول رکھے، یہاں تک کہ یہی چیز اس کے قلب کے ارد گرد ایک گوشے کو پُر کر دے اور اس کی ذات کے ایک حصے پر قابض ہو جائے، یہ چیزیں اور بھی بڑی مصیبت ہیں، جبکہ ان سے فخر ومباہات اور کبر اور بڑائی جنم لیں۔

جو شخص اپنی خواہشات وشہوات پر غالب ہونے کی طاقت رکھتا ہے، بایں طور کہ مکان، سامان اور بستر میں صرف اتنے ہی پر قناعت کرتا ہے کہ جس سے اس کی زندگی وصحت محفوظ رہے، ذمہ داری کی ادائیگی ہو سکے، اور اس کی حیثیت وشخصیت بچی رہے تو بلاشبہ اس نے سنت پر عمل کیا اور راہِ مستقیم پر قائم رہا۔

ف: ماشاء اللہ! بہت ہی خوب فیصلہ؛ بل کہ شریعت وسنت کا خلاصہ درج فرمایا جو سویدائے قلب پر لکھے جانے کے لائق ہے۔ اللہ تعالی اس اعتدالی راہِ سنت پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔ (قمر الزماں، مترجم)

پانچویں فصل

گھروں کے بارے میں آپ کی سیرت

گھروں کا احترام اور اجازت طلب کرنے کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ○فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَا اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ »(۱).

''اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے علاوہ کسی گھر میں داخل مت ہو، جب تک کہ اجازت حاصل نہ کرلو اور ان کے رہنے والوں کو سلام کرلو، یہی تمھارے لیے بہتر ہے؛ تاکہ تم خیال رکھو، پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی نہ ملے تو ان گھروں میں نہ جاؤ، جب تک کہ تم کو اجازت نہ دی جائے، اور اگر تم سے کہہ دیا جائے کہ لوٹ جاؤ تو تم لوٹ آیا کرو، یہی بات تمھارے لیے بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمھارے اعمال کی سب خبر ہے''

مذکورہ دونوں آیات سے گھروں کا احترام ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس احترام کے بغیر یہ گھر پُر سکون مقام نہیں ہو سکتے، جہاں انسان، مادی اور ذہنی تکان سے راحت حاصل کر سکے۔

سنت مطہرہ سے واضح ہوتا ہے کہ گھروں کے اندر آنے کی اجازت کیسے حاصل کی جائے۔

۱—رہی اجازت طلب کرنے کی کیفیت تو ابو داؤد میں ہے:

''ایک آدمی نے حضور ﷺ سے —جبکہ آپ ایک گھر میں موجود تھے— اندر آنے کی اجازت طلب کرتے ہوئے کہا: اندر آجاؤں؟ آپ ﷺ نے اپنے خادم سے کہا: جاؤ اسے اجازت لینے کا ڈھنگ بتادو، اور اس سے کہہ دو کہ یوں کہے: السلام علیکم، کیا اندر آسکتا ہوں؟''۔(۲)

---

(۱) سورۃ النور: آیت: ۲۷-۲۸

(۲) ابوداؤد: رقم: ۵۱۷۶-۵۱۷۹، والترمذی: رقم: ۲۷۱۰

۲—اجازت تین بار طلب کرے، جیسا کہ ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اگر کوئی شخص تین بار اجازت طلب کرے پھر بھی اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ جائے''۔(۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس بغرض ملاقات تشریف لائے اور کھڑے ہو کر کہا:

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے آہستہ سے جواب دیا، آپ نے یہ عمل تین بار کیا، پھر واپس لوٹ گئے، تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے ہو لیے اور کہا: میں آپ کو آہستہ سے جواب دے رہا تھا، تاکہ آپ ہم کو زیادہ سلام کریں''۔(۲)

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین بار سلام کرنے کے بعد واپس لوٹ گئے۔

جب دروازے میں کھٹکھٹانے کے لیے کڑا لگا ہوا ہو تو اسے ایک بار کھٹکھٹانے کے بعد انتظار کرے اور جب تین بار کھٹکھٹانے پر بھی جواب نہ ملے تو لوٹ جائے، یہاں تک کہ اندرون خانہ لوگوں کی موجودگی کا احساس ہو تب بھی، اس وجہ سے کہ جواب نہ دینا ''وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا'' (3) (اور اگر تمھیں کہا جائے لوٹ جاؤ، تو لوٹ جاؤ) کے درجہ میں ہے۔

۳—اجازت طلب کرنے والا دروازے کے سامنے نہ کھڑا ہو، عبداللہ بن بسر سے روایت ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی کے دروازے پر آتے تو اس کی طرف رُخ کر کے کھڑے نہیں ہوتے بلکہ اس کے دائیں یا بائیں طرف کھڑے ہوتے''۔(۴)

ایک آدمی اجازت طلب کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازے پر سامنے کھڑا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو فرمایا:

''تم ایسا کرتے ہو، اجازت طلب کرنے کا حکم نظر پڑنے ہی کے سبب دیا گیا ہے''۔(۵)

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۶۲۴۵، م: ۲۱۳۵

(۲) ابوداؤد: رقم: ۵۱۸۵

(۳) سورۂ نور: آیت: ۲۸

(۴) ابوداؤد: ۵۱۸۶

(۵) ابوداؤد: ۵۱۷۴-۵۱۷۵

۴۔جب اجازت طلب کرنے والے سے کہا جائے کون؟ تو اسے اپنا نام بتانا چاہیے۔
حضرت جابرؓ نے کہا:
''میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا تو آپ نے فرمایا: کون؟ میں نے کہا: میں، آپ نے کہا میں بھی میں ہوں، گویا کہ آپ نے اسے ناپسند فرمایا''۔ (۱)

۵۔سوراخ وغیرہ سے گھروں میں دیکھنا حرام ہے۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:
''ایک آدمی نے حضور ﷺ کے گھر میں ایک سوراخ سے جھانکا جبکہ آپ کنگھی سے اپنا سر کھجلا رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اسی کنگھی کو تمھاری آنکھ میں چبھو دیتا، بلاشبہ اجازت کا حکم نظر پڑنے ہی کے سبب دیا گیا ہے''۔ (۲)

گھر کی حفاظت و نظافت:

مرد اپنے گھر میں اپنی زندگی کا نصف حصہ گزارتا ہے اور عورت اس میں اپنا زیادہ تر وقت گزارتی ہے، اسی وجہ سے اسلام چاہتا ہے کہ گھر صاف ستھرا اور عطر بیز ہو، نبی کریم ﷺ نے بعض ایسے اساسی امور کی جانب رہنمائی فرمائی ہے، جس کا گھر کی حفاظت و خوبصورتی میں اہم کردار ہوتا ہے۔

۱۔نبی کریم ﷺ نے گھروں کو کیڑوں مکوڑوں اور موذی جانوروں سے صاف رکھنے کا حکم دیا ہے، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ان کے قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔
چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''پانچ ایسے موذی جانور ہیں جنہیں حل و حرم دونوں جگہ میں قتل کیا جائے، کوا، چیل، بچھو، چوہا اور کاٹ کھانے والا کتا''۔ (۳)

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۲۱۵۵۔۶۲۵۰
(۲) متفق علیہ: رقم: ۵۹۲۴۔۲۱۵۶
(۳) متفق علیہ: رقم: ۱۸۲۹، م: ۱۱۹۸، واللفظ لمسلم

جیسا کہ آپ ﷺ نے سانپ‘‘۔[1] اور چھپکلی‘‘۔[2] وغیرہ کے مارنے کا حکم فرمایا:
بعض احادیث میں ان کیڑوں مکوڑوں اور جانوروں کے نقصانات کا تذکرہ ہے۔
آنحضرت ﷺ نے گھروں میں کتوں کے پالنے سے منع فرمایا اور کہا:
’’ایسے گھر میں فرشتۂ رحمت داخل نہیں ہوتے جس میں کتا اور تصویریں ہوں‘‘۔[3]

جب اسلام ان موذی حیوانات سے نجات پانے کی دعوت دیتا ہے تو اسی کے ساتھ ان اسباب کے اختیار کرنے کی بھی دعوت دیتا ہے، یعنی گھر کو میل کچیل اور گندگیوں سے صاف رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے، اس وجہ سے کہ یہ گندگیاں ہی ان موذی جانوروں کے گھر میں لانے کا سب سے پہلا ذریعہ ہے۔

۲- آپ ﷺ نے بہت سی احادیث میں کھانے پینے کے برتنوں کو ڈھکنے کا حکم فرمایا ہے، مثلاً فرمایا:
’’برتن کو ڈھک دو اور مشک کو باندھ دو‘‘۔[4]
ایک صحابی دودھ کا ایک برتن لے کر حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:
’’اس کو کیوں نہیں ڈھک لیا، اگرچہ اس پر چوڑائی میں ایک لکڑی ہی رکھ لیتے‘‘۔[5]

۳- آنحضرت ﷺ نے انسان کے سوتے وقت رات میں آگ کے بجھانے کا حکم دیا اور فرمایا:
’’یہ آگ تمھاری دشمن ہے جب سونے لگو تو اسے بجھا دو‘‘۔[6]

۴- نیز آپ نے فرمایا کہ گھروں کو صاف ستھرا رکھا جائے، اور ان میں گندگیاں نہ چھوڑی جائے، آپ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) بخاری: رقم: ۱۸۳۰، مسلم: ۲۲۳۴
(۲) بخاری: رقم: ۳۳۰۷، مسلم: ۲۲۳۷
(۳) متفق علیہ: رقم: ۵۹۴۹، م: ۲۱۰۶
(۴) مسلم: رقم: ۲۰۱۴
(۵) متفق علیہ: رقم: ۵۶۰۶، م: ۲۰۱۱
(۶) متفق علیہ: رقم: ۶۲۹۴، م: ۳۰۱۶

"بیشک اللہ پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے، نظیف ہے نظافت کو پسند کرتا ہے، کریم ہے کرم کو پسند کرتا ہے، سخی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے، تم لوگ اپنے صحن کو صاف رکھو اور یہودیوں کی مشابہت نہ اختیار کرو"۔[۱]

کھانے کی بحث میں گزر چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گوشت اور چربی کی چکناہٹ سے ہاتھ دھونے کا کس طرح حکم فرمایا ہے۔

ہمارے لیے بہتر ہوگا کہ اس مضمون کا اختتام اس باب کی جامع حدیث سے کریں جسے شیخین نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جب رات ہو جائے یا فرمایا جب شام ہو جائے تو اپنے بچوں کو روک لو، اس وجہ سے کہ شیطان اس وقت پھیل جاتے ہیں، پھر جب کچھ رات گزر جائے تو انھیں چھوڑ دو اور اللہ کا نام لے کر دروازے بند کر دو، کیونکہ شیطان بند دروازے کو نہیں کھول پاتا ہے اور اپنے مشک کو اللہ کا نام لے کر باندھ دو، اپنے برتنوں کو اللہ کا نام لے کر ڈھانک دو؛ اگرچہ اس پر چوڑائی میں کوئی چیز ہی رکھ دو، اور اپنے چراغ بجھا دو۔ مسلم کی روایت میں ہے: شیطان مشک نہیں کھول پاتا ہے اور نہ دروازہ کھول پاتا ہے اور نہ کسی برتن کے ڈھکن کو ہٹا پاتا ہے"۔[۲]

۵- آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر خوشبو سے مہکتے تھے، آپ کے جسد اطہر کی خوشبو سے اور اس خوشبو سے جسے آپ استعمال فرماتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خوشبو کو پسند کرنے کی بات اس طرح مشہور ہے کہ وہ محتاج دلیل نہیں ہے۔

گھروں کے بستر اور سامان کے بارے میں:

انسان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے گھر میں ایسے وسائل موجود ہوں جو جسمانی راحت کا سامان بہم پہونچائیں، کھانے کی تیاری میں معاون ہوں اور موسم سرما میں گرمی مہیا کریں۔

اسلام نے ان تمام باتوں کو دو عام ضابطوں کے تحت درست ٹھہرایا ہے:

- ضرورتوں کی تکمیل اس طرح کہ وہ وسائل ہی رہیں، مقصود نہ بن جائیں۔

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۷۹۹

(۲) متفق علیہ: رقم: ۲۰۱۲، م: ۶۶۲۳

● تمام امور میں درمیانہ روی۔

اس سلسلے کی احادیث ہدیہ ناظرین ہیں :

۱۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ایک بستر مرد کا اور ایک بستر عورت کا ہے، ایک بستر مہمان کا ہے اور چوتھا شیطان کا ہے''۔[1]

حدیث اگرچہ بستر کے بارے میں ہے؛ لیکن اس سے تمام ضروریات اور سامان کی دیگر انواع کے سلسلے میں ایک عام قاعدہ معلوم ہوتا ہے؛ چنانچہ یہاں افراد خاندان کی ضرورت ان کی تعداد کے اعتبارے سے طے کی گئی ہے اور مہمان کو الگ شمار کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ زائد ہے وہ شیطان کا ہے۔

۲۔ ضرورت سے زیادہ سامان کی وجہ سے گھر میں جگہ کی ضرورت کا مسئلہ پیدا ہوگا، جس سے اہل خانہ پر گھر تنگ ہو جائے گا، پھر یہ بلا فائدہ مال کا خرچ کرنا ہے جس کا فرد و جماعت کی اقتصادیات پر بہت برا اثر پڑے گا۔

حضرت عائشہؓ نے کہا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک غزوے میں نکلے اور میں نے ایک اونی کپڑے کو لیکر دروازے پر پردہ ڈال دیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور اس کپڑے کو دیکھا تو حضرت عائشہؓ نے آپ کے چہرہ پر ناگواری دیکھی، پھر آپ نے اسے کھینچا اور اس کو پھاڑ دیا یا کاٹ دیا، اور فرمایا: اللہ نے ہمیں پتھر اور مٹی کو پہنانے کا حکم نہیں دیا ہے، حضرت عائشہؓ نے کہا کہ ہم نے کاٹ کر اس سے دو تکیے بنائے اور اس میں کھجور کی چھال بھر دی، آپ نے اس کو ہمارے لیے معیوب نہیں جانا''۔(حوالہ مسلم، ۲۰۱۷)

حدیث شریف میں غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دروازہ موجود ہونے کی وجہ سے پردے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، رہیں وہ احادیث، جن میں آپ کے گھروں میں پردوں کا پایا جانا وارد ہے تو اس کی صورت یہ تھی کہ پردے یا تو وہاں تھے جہاں دروازہ نہیں تھا، یا گھروں کے سامنے والے صحنوں پر تھے جن میں دروازے نہیں تھے، جیسا کہ عنقریب یہ بات گزر چکی ہے۔

حدیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جہاں ضرورت ہو وہاں پردہ جیسے روشنی کی مقدار کم

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۰۸۴

کرنے یا اندر دکھائی نہ دینے کے لیے۔ کھڑکیوں پر لگایا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ پردہ بقدر ضرورت ہوتا ہے؛ لہٰذا اگر کسی کھڑکی کے لیے ہوگا تو اس کے بقدر ہوگا، ایسا نہیں ہے کہ وہ آگے بڑھ کر پوری دیوار کے لیے ہو جائے، یہ بات نص حدیث سے واضح ہے، آپ نے فرمایا: اللہ نے یہ حکم نہیں دیا کہ ہم پتھر اور مٹی کو پہنائیں اس وجہ سے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ اضاعت مال اور ضرورت سے زائد آسودہ حالی کے قبیل سے ہے۔

آپ نے پردے کو کسی خاص نوع کا ہونے کے سبب نہیں پھاڑا تھا، اسی وجہ سے جب حضرت عائشہؓ نے اس کے دو تکئے بنا دیئے تو آپ نے کچھ نہیں کہا۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ دیواروں کا پردہ خوبصورتی کے قبیل سے ہے، اور اسلام خوبصورتی کا مطالبہ کرتا ہے، میں کہتا ہوں کہ ضرورت کے دائرے میں اگر خوبصورتی کا لحاظ کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، نہ یہ کہ خوبصورتی ہی ضرورت ہو جائے، دونوں میں بڑا فرق ہے، مثلاً جس پیالے سے انسان پانی پیتا ہے وہ ایک ضرورت ہے، اگر وہ مزین ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن اگر وہی پیالہ محض خوبصورتی کے لیے بنایا گیا ہے، اس کا سرے سے استعمال ہی نہ ہو تو وہ محل نظر ہے۔

۳-رسول اکرم ﷺ نے ریشم اور دیباج کے بچھانے سے اسی طرح چیتوں اور درندوں کی کھال بچھانے سے منع فرمایا ہے۔(۱)

جیسا کہ آپ ﷺ نے سونے اور چاندی کے برتنوں کے استعمال سے بھی منع فرمایا ہے۔

حضرت حذیفہؓ نے کہا:

"میں نے نبی اکرم ﷺ کو کہتے ہوئے سنا: تم لوگ ریشم اور دیباج (ریشمیں) کے لباس نہ پہنو، سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور نہ ان کی پلیٹوں میں کھاؤ، اس لیے کہ یہ کافروں کے لیے دنیا میں ہے اور ہمارے لیے آخرت میں"۔(۲)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا پیالہ لکڑی کا تھا۔

---

(۱) ابوداؤد: رقم ۴۱۲۹-۴۱۳۲، ترمذی: ۱۷۷۱

(۲) متفق علیہ: رقم: ۵۴۲۶، م: ۲۰۶۷

گھروں کی آرائش:

حضرت عائشہؓ نے کہا:

’’رسول اکرم ﷺ ایک سفر سے واپس آئے اور میں نے اپنے ایک باریک کپڑے کا اپنی ایک الماری پر پردہ ڈال دیا، اس پردے پر تصویریں بنی ہوئی تھیں جب آپ ﷺ نے دیکھا تو اس کو پھاڑ دیا اور فرمایا: ان لوگوں کو قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب ہوگا، جو اللہ کی مخلوق کی طرح کوئی چیز بناتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے کہا: میں نے اس پردے کے ایک یا دو تکیے بنا دیے، تو آپ گھر میں ان کا استعمال کرتے تھے، اس پردے پر پروں والے گھوڑے بنے ہوئے تھے‘‘۔ (۱)

حدیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ممانعت پردے کے لٹکنے کی صورت میں تھی، جب اسے تکیہ وغیرہ کی حیثیت سے زمین پر رکھ دیا گیا تو آپ نے اسے درست قرار دیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر ذی روح اشیاء کی تصویر میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے آکر ان سے کہا:

’’میں ایسا آدمی ہوں کہ میرا گزراوقات میرے ہاتھ کی کاریگری سے ہوتا ہے، میں یہ تصویر بناتا ہوں، حضرت ابن عباس نے کہا: میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جسے میں نے آنحضرت ﷺ کو کہتے ہوئے سنا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے کوئی تصویر بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دیں گے، یہاں تک کہ وہ اس میں روح پھونک دے اور وہ روح کبھی بھی پھونک نہیں پائے گا، وہ آدمی بیحد گھبرایا اور اس کا چہرہ زرد ہو گیا، آپ نے کہا: تم پر افسوس اگر تمھیں بنانا ہی ضروری ہے تو اس درخت اور غیر ذی روح اشیاء کی تصویریں بنایا کرو‘‘۔ (۲)

صلیب کی تصاویر سے بھی ممانعت وارد ہوئی ہے، حضرت عائشہؓ نے کہا:

’’نبی اکرم ﷺ گھر میں جس چیز پر بھی صلیب کی صورت ہوتی اسے ضرور توڑ دیتے‘‘۔ (۳)

اس صورت حال میں، گھروں کو ذی روح جانور (مثلاً سانپ) اور صلیب کی تصویروں کے علاوہ دیگر تصاویر کے ذریعہ مزین کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۵۹۵۴، م: ۲۱۱۰

(۲) متفق علیہ: رقم: ۵۹۵۴، م: ۲۱۰۷

(۳) متفق علیہ: بخاری: رقم: ۵۹۵۲

گھروں میں داخل ہونے کے سلسلے میں آپ ﷺ کی سیرت:

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب انسان اپنے گھر میں داخل ہو تو اللہ کا ذکر کرے۔

حضرت جابرؓ نے کہا:

"میں نے نبی اکرم ﷺ کو کہتے ہوئے سنا ہے: جب آدمی اپنے گھر میں آتا ہے اور اس میں داخل ہونے اور کھانا کھانے کے وقت اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ نہ تمھیں رات کا کھانا نصیب ہوا اور نہ شب باشی اور جب اندر آتا ہے اور اللہ کا ذکر نہیں کرتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ تم نے شب باشی پالی اور کھانے کے وقت اللہ کا ذکر نہیں کرتا ہے تو کہتا ہے کہ تم نے شب باشی اور رات کا کھانا پالیا"۔ (۱)

حدیث میں ذکر کے لیے کسی متعین صیغے کی تحقیق نہیں ہے، لہذا اللہ کے ذکر سے یہ غرض پوری ہو سکتی ہے۔

گھر میں داخل ہونے والا شخص اپنے گھر والوں پر سلام کرے، آپ ﷺ عورتوں اور بچوں پر سلام کرتے تھے، پس آدمی کا اپنے بیوی بچوں کو سلام بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہیے، آدمی اور اس کے بیوی بچوں کے درمیان پائی جانے والی محبت اس سے مانع نہیں ہو گی، بلکہ اس سے محبت میں مزید اضافہ ہو گا۔

حضرت انس بن مالکؓ نے آنحضرت ﷺ کے حضرت زینبؓ سے شادی کے وقت آپ کے عمل کا ایک منظر نقل کرتے ہوئے کہا:

"آپ نکل کر حضرت عائشہؓ کے کمرے کی طرف گئے اور کہا: السلام علیکم اهل البیت ورحمة الله وبرکاته، حضرت عائشہؓ نے کہا: وعلیك السلام ورحمة الله، آپ نے اپنی بیوی کو کیسا پایا، اللہ آپ کو برکت دے، اسی طرح اپنی تمام بیویوں کے کمروں کی طرف گئے اور ان سے وہی کہا جو حضرت عائشہؓ سے کہا تھا اور انھوں نے بھی وہی جواباً کہا جو حضرت عائشہؓ نے جواب دیا تھا، پھر آپ واپس لوٹ آئے"۔ (۲)

حضور اکرم ﷺ کا اپنی بیویوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا یہ انداز تھا، جس میں محبت واحترام پورے طور پر جلوہ فگن ہے۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۰۱۹

(۲) متفق علیہ: رقم: ۴۷۹۳، م: ۱۴۲۸

سونے میں آپ ﷺ کی سیرت:

جب ہم آپ کے مکان کی گفتگو کررہے ہیں جہاں آپ سوتے اور رات گزارتے تھے تو مناسب ہے کہ آپ کے سونے کی کیفیت کے بارے میں بھی ہم گفتگو کریں۔

حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے:

''آنحضرت ﷺ سوتے وقت اپنے دائیں ہاتھ کو تکیہ بناتے اور کہتے: اے میرے رب! مجھے اپنے عذاب سے اس دن محفوظ رکھ جس دن آپ اپنے بندوں کو دوبارہ اٹھائیں گے''۔(۱)

ابو قتادہؓ نے کہا:

''نبی اکرم ﷺ جب سفر میں ہوتے اور رات میں پڑاؤ ڈالتے تو دائیں پہلو پر لیٹتے اور جب صبح سے کچھ پہلے پڑاؤ ڈالتے تو اپنا ہاتھ کھڑا کر لیتے اور اپنی ہتھیلی پر اپنا سر رکھتے''۔(۲)

حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی سونے کے لیے اپنے بستر پر جائے تو اپنے ازار کے اندر کی طرف کے حصے سے (تاکہ باہر والا حصہ صاف رہے) بچھونا جھاڑے لے، معلوم نہیں، اس کے پیچھے بچھونے پر کوئی کیڑا وغیرہ (جیسے سانپ یا بچھو) آگیا ہو پھر یوں کہے میرے پروردگار! تیرا مبارک نام لے کر میں اپنا پہلو بستر پر رکھتا ہوں اور تیرا ہی مبارک نام لے کر اس کو اٹھاؤں گا، اگر تو میری جان اس عالم میں روک رکھے (یعنی مر جاؤں) تو اس پر رحم فرما، اور اگر اس کو چھوڑ دے تو اس کو (گناہوں سے) اسی طرح سے بچائے رکھ جیسے اپنے نیک بندوں کو بچائے رکھتا ہے''۔(۳)

حضرت حذیفہؓ نے کہا:

''آنحضرت ﷺ جب رات کو آرام فرماتے تو اپنا ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھ لیتے، پھر کہتے: "اللهم باسمك أموت وأحيا" اے اللہ میرا مرنا اور جینا تیرے مبارک نام سے ہے، اور جب سو کر بیدار ہوتے تو فرماتے: "الحمد لله الذی أحيانا بعد ما أماتنا واليه النشور" حمد اس خدا کی جس نے ہم کو مار کر پھر جلایا (سلا کر پھر جگایا) اسی کی طرف ہم کو (قیامت کے دن) اٹھ کر جانا ہے۔''(۴)

---

(۱) ترمذی: رقم: ۳۳۹۹، وعن حذیفہ مثلہ: ۳۳۹۸

(۲) مسلم: ۶۳۸

(۳) متفق علیہ: رقم: ۶۳۲۰، م: ۲۷۱۴

(۴) بخاری: ۶۳۱۴

ساتواں مقصد

کھلم کھلا ڈرانے والا

تمہید

کھلم کھلا ڈرانے والا

شیخین نے ابو موسی رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے، وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں: آپ ﷺ نے فرمایا:

"میری اور جو کچھ لے کر مجھ کو اللہ نے بھیجا اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو کسی قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے میری قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے لشکر دیکھا ہے اور میں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں، لہذا چھٹکارا اور خلاصی پالو۔

تو اس کی قوم کے کچھ لوگوں نے اس کی بات مان لی اور سفر شروع کر دیا اور پیش قدمی کرتے ہوئے چل دیئے تو وہ نجات پا گئے، اور ایک گروہ نے بات نہ مانی اور اپنی جگہ ٹھہرے رہے تو لشکر نے صبح سویرے ان پر حملہ کر کے ہلّا بول دیا اور ان کا صفایا کر دیا۔ پس اسی طرح مثال ہے اس شخص کی جس نے میری اطاعت کی اور جو کچھ میں لے کر آیا اس کی اتباع کی اور اسی طرح مثال ہے اس شخص کی جس نے میری نافرمانی کی اور جو کچھ میں لے کر آیا اس کی تکذیب کی"۔(۱)

پس آپ ﷺ ہی وہ کھلم کھلا ڈرانے والے ہیں جو اپنی امت کو ہر آن تمام بڑے امور حتی کہ چھوٹے امور سے بھی ڈراتے ہیں جن سے بچنا ضروری ہے، پس وہ عام بھی ہیں اور خاص بھی:

وہ آنے والی نسلوں سمیت پوری امت کو ان تمام امور سے ڈراتے ہیں جو اس امت کی طرف منسوب ہر فرد کو پیش آنے والے ہیں۔ اور ہر گروہ کو بھی خصوصی طور پر ان امور سے ڈراتے ہیں جن سے بچنا ان کے لیے ضروری ہے، دوسروں کو چھوڑ کر جو امر اس گروہ کے ساتھ خاص ہیں۔

تنبیہ: عام ہو یا خاص، خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کے افعال میں سے بعض وہ ہیں جن کی اقتداء کی جائے گی، جبکہ بعض وہ ہیں جن سے آپ بچتے رہے اور آپ نے اجتناب کیا۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۷۲۸۳، م: ۲۲۸۳

اور ''نذیر عریان'' وہ اس قوم کا پہلا آدمی ہے جس نے اچانک پیش آمدہ خطرہ دیکھا تو اسے یہ خوف ہوا کہ وہ اپنی قوم تک نہیں پہنچ سکے گا تاکہ ان کو خبر دے تو اس نے اپنا کپڑا نکال دیا اور اسی سے قوم کو اشارہ کر دیا۔

اور اس مقصد میں ہم تحذیرات عامہ کی کچھ مثالیں ذکر کرتے ہیں، اور کچھ مثالیں تحذیرات خاصہ کی بھی ذکر کریں گے۔

پہلی فصل

تحذیرات عامہ کے بیان میں

اس فصل میں ہم بعض وہ امور ذکر کرتے ہیں جن سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈرایا ہے اور یہ ہر شخص سے انفرادی طور پر متعلق ہے، وہ مذکر ہو یا مؤنث۔

شیطان سے ڈرانا:

وہ آیات کریمہ بہت زیادہ ہیں، جنھوں نے انسان سے شیطانی عداوت کو بیان کیا ہے اور اس سے بچنے کا مطالبہ کیا ہے اور ان میں سے:

«اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ»[1].

"یہ شیطان بے شک تمھارا دشمن ہے، سو تم اس کو دشمن سمجھتے رہو، وہ تو اپنے گروہ کو محض اس لیے بلاتا ہے تاکہ وہ لوگ دوزخیوں میں سے ہو جاویں۔"

نیز فرمایا:

«وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ»[2].

"اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو، فی الواقع وہ تمھارا صریح دشمن ہے۔ وہ تو تم کو انہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ بری اور گندی ہیں، اور یہ کہ اللہ کے ذمہ تم وہ باتیں لگاؤ جنھیں تم نہیں جانتے۔"

اور قرآن کریم نے شیطانی عداوت کو بہت سی آیات میں ثابت کیا ہے اور اس عداوت کے پیچھے ایک ہدف ہے جہاں تک شیطان رسائی چاہتا ہے اور وہ ہدف اپنے متبعین کو جہنم تک پہنچانا ہے، جیسا کہ آیت کریمہ نے بیان کیا ہے۔

اور قرآن کریم نے آدم علیہ السلام کے ساتھ اس عداوت کا قصہ تفصیل سے بیان کیا ہے جو ہر

---

(۱) سورۂ فاطر: آیت: ۶

(۲) سورۃ البقرۃ: آیت: ۱۶۸۔۱۶۹

مسلمان کو معلوم ہے۔

اسی طرح حدیث شریف نے بھی بیان کیا ہے کہ شیطان کی عداوت ہر مولود کے ساتھ اس کی ولادت کے ابتدائی دن ہی سے کیسے شروع ہوتی ہے۔

ابوہریرہؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: بنی آدم کے ہر مولود کو شیطان چھوتا ہے، جب وہ پیدا ہوتا ہے، پس وہ شیطان کے چھونے کی وجہ سے چیختے ہوئے روتا ہے، حضرت مریم اور ان کے بیٹے کے سوا۔

پھر حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: ''وَإِنِّىٓ أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ'' (اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو آپ کی پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے) اور مسلم کی روایت میں ہے: ''مگر شیطان اس کو کچو کا لگاتا ہے''۔(۱)

اور جب عداوت اتنی بڑی ہے تو مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اپنے دشمن کو پورے طور پر پہچانے تاکہ وہ احتیاط کرنے پر اور گمراہی کی ان سازشوں (کے جال) سے بچنے پر قادر ہوسکے جو اس نے لوگوں کے لیے بچھایا ہوا ہے۔

اور قرآن کریم نے وہ راستے بھی واضح فرمائے ہیں جن پر شیطان چلتا ہے، جیسا کہ یہ ابلیس کی زبانی آیا ہوا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ»(۲).

'' میں ان کو (گمراہ کرنے کے لیے) تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا، پھر ان کے پاس آؤں گا ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور ان کے بائیں جانب سے بھی اور تو ان میں اکثروں کو احسان ماننے والا نہ پائے گا''

اور اس طرح یہ معرکہ تمام محاذوں پر ہے، جیسا کہ شیطان اپنے لشکر کو مکمل دستے کی شکل میں

---

(۱) متفق علیہ: ۳۴۳۱، م: ۲۳۶۶، والآیۃ فی سورۃ آل عمران: ۳۶

(۲) سورۂ اعراف: آیت: ۱۶۔۱۷

اور مخفی طور پر حرکت میں رکھتا ہے، اور کبھی انسان کو اس حرکت کا شعور نہیں ہوتا۔
نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
"شیطان ابن آدم میں خون کی طرح چلتا ہے"۔(۱)
اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جو معرکہ کو صعوبت کے اعتبار سے بڑھاتا ہے، پس اس کی گمراہ کرنے کی قدرت خون کی طرح دوڑتی ہے اور جس طرح انسان کو خون کے چلنے کا احساس نہیں ہوتا، اسی طرح اس کو یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے اور جس طرح خون انسان کے تمام اجزائے بدن میں پہنچتا ہے ٹھیک اسی طرح شیطان کا بھی حال ہے۔
اور اسی طرح قرآن وسنت اس بڑی عداوت اور معرکہ کے بیان کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے، تاکہ انسان بیداری اور انتباہ کی اس مقدار کے ساتھ رہے، جو اس زبردست دشمن کا مقابلہ کرسکے اور حدیث نے ہر میدان میں اس کے لیے لازمی وضروری اسلحہ کے ایجاد کی ذمہ داری لی ہے۔
اور ہم یہاں مثال کے طور پر کچھ ذکر کرتے ہیں:

۱۔عقائد کے میدان میں:

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
" شیطان تمھارے پاس آکر کہتا ہے: یہ کس نے پیدا کیا؟ یہ کس نے پیدا کیا؟ حتی کہ وہ کہتا ہے: تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب تجھے خیال آئے تو اللہ کی پناہ طلب کر اور (یہیں) رک جا"۔(۲)
ابوداؤد کی روایت میں یہ زیادتی ہے:
"تو تم کہو " اللّٰهُ اَحَدٌ،اَللّٰهُ الصَّمَدُ،لَمْ يَلِدْ،وَلَمْ يُوْلَدْ ،وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ " پھر اپنی بائیں طرف تین مرتبہ تھوک دے اور شیطان سے (اللہ کی) پناہ طلب کرے"۔(۳)
حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۱۷۴
(۲) متفق علیہ: رقم: ۳۲۷۶، م: ۱۳۴
(۳) ابوداؤد: رقم: ۴۷۲۲

”کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر پوچھا: ہم اپنے دلوں میں وہ چیز پاتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک اس کو زبان پر لانا بہت بھاری سمجھتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: واقعی تم ایسا محسوس کرتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: یہی صریح ایمان ہے۔“(۱)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

”نبی ﷺ سے وسوسہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہی خالص ایمان ہے۔“(۲)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ، وہ فرماتے ہیں:

”ایک شخص نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: کہ ہم میں سے ایک شخص اپنے نفس میں کچھ محسوس کرتا ہے۔ انھوں نے کسی چیز کی طرف اشارہ کیا۔ تو اس کے نزدیک راکھ ہو جانا زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے بنسبت اس کے کہ وہ اُسے زبان پر لائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہے جس نے اس کے مکر کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا“۔(۳)

تینوں احادیث اسی وسوسہ کے دائرہ میں گھومتی ہیں جو شیطان نفوس میں ڈالتا ہے اور کیسے مومن اس کو قبول کرنے سے بھاگتا ہے، یہ تو ان چیزوں میں سے ہے جس کو اپنی زبان پر لانے کو بھی وہ قبول نہیں کرتا ہے، اور جیسا کہ تیسری حدیث میں ہے: راکھ ہو جانا اس کو زبان پر لانے سے زیادہ محبوب ہے، یہی وہ معرکہ ہے جو مومن اور شیطان کے درمیان اس کے عدم تکلم کے عمل میں گھومتا رہتا ہے، یہی خالص ایمان ہے۔“(۴)

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی تکبیر و تحمید بیان کی کہ اس نے شیطان کے مکر کو وسوسہ میں بدل دیا، اس طور پر کہ وہ تکلم تک پہنچنے پر قادر نہ ہو سکا، اور اس سے مانع اور بچاؤ وہ ایمان کا ہتھیار ہے جس سے مسلمان شیطان کو دفع کرتا ہے۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۳۲

(۲) مسلم: رقم: ۱۳۱

(۳) ابوداؤد: رقم: ۵۱۱۲

(۴) وسوسہ ہی خالص ایمان نہیں ہے، جیسا کہ ذہن میں اول دفعہ میں سبقت کر جاتا ہے۔

۲—نماز میں :

اور کبھی شیطان انسان کا نماز میں سامنا کرتا ہے، نماز میں فساد پیدا کرنے کے ارادے سے۔ یہی صورت عثمان بن ابی العاص کو پیش آئی تو وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! شیطان میرے اور میری نماز کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور میری قراءت مجھ پر گڈ مڈ کر دیتا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ شیطان ہے جس کو خنزب کہتے ہیں، جب تمھیں اس کا احساس ہو تو اس سے اللہ کی پناہ طلب کر و اور اپنی بائیں طرف تین مرتبہ تھوک دو، صحابی مذکور بیان کرتے ہیں میں نے یہ عمل کیا تو اللہ نے اس کو مجھ سے دور کر دیا۔ (۱)

شیخین کی ابوہریرہؓ سے تخریج کردہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان اس کے پاس آکر اس پر نماز گڈ مڈ کر دیتا ہے، حتی کہ اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کتنی نماز پڑھی، جب تم میں سے کوئی یہ حالت پائے تو بیٹھ کر دو سجدے کرے۔ اور انھیں کی روایت ہے: حتی کہ شیطان انسان اور اس کے نفس کے درمیان وسوسہ ڈالتا ہے اور کہتا ہے: فلاں چیز یاد کر، فلاں چیز یاد کر، وہ چیزیں یاد کرواتا ہے جو اس کو یاد نہ تھی حتی کہ انسان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کتنی نماز پڑھی؟۔“ (۲)

اور شیطان کی تلبیس سے بچنے کے لیے مذکورہ دو علاجوں میں سے کوئی بھی علاج کیا جا سکتا ہے۔

۳—خاندان و برادری کے میدان میں :

شیطان خاندان میں داخل ہو کر فساد پیدا کر دیتا ہے، اور نبی ﷺ نے اس پر متنبہ بھی کیا ہے، حتی کہ زوجین میں سے ہر ایک اپنے دل میں پیش آمدہ وسوسہ وخیال سے بصیرت رکھے تا کہ شیطان پر اس کے منصوبے کو بے کار کر دے۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکر روانہ کرتا ہے ان سب میں ابلیس سے قریب تر

---

(۱) مسلم شریف: ۲۲۰۳

(۲) متفق علیہ: رقم: ۱۲۳۱۔۶۰۸، م: ۳۸۹

رتبے والا وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنے والا ہوتا ہے، ان میں سے ایک آکر کہتا ہے: میں نے ایسا ایسا کیا۔ دوسرا کہتا ہے: میں نے یہ عمل انجام دیا پھر ایک اور آکر کہتا ہے: میں نے اس کو نہیں چھوڑا حتی کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان پھوٹ ڈال دی۔ نبی ﷺ نے فرمایا: وہ اس کو اپنے سے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے: تو بہت اچھا ہے"۔ (۱)

۴—دوسرے میدان:

اور یہاں دوسرے بہت سے میدان ہیں جو ہر عمل کو شامل ہیں، نبی ﷺ نے اس عمل کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جس پر مسلمان کار بند رہ کر شیطان کو اپنے مختلف امور سے دور کر سکتا ہے۔

اپنے گھر میں داخل ہونے کے وقت بسم اللہ پڑھے۔

کھانے پینے کے وقت بسم اللہ پڑھے۔

غضب کے وقت یہ پڑھے: اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

اگر مگر کے کلمات استعمال کرنے سے دور رہے، کیونکہ وہ شیطان کے عمل کو کھولنے والا ہے۔

اور حدیث میں ہے:

"دروازے بند کرو اس وقت بسم اللہ پڑھو، اس لیے کہ شیطان بند دروازے کو کھول نہیں پاتا اور اپنے مشکیزے ڈھانکو تو اس وقت بھی اللہ کا نام لو اور اپنے برتن ڈھانکو، اس حال میں کہ تم اللہ کا نام یاد کرو"۔ (۲)

اسی طرح ان وسائل کی طرف رہنمائی فرمائی جو ہر میدان عمل میں شیطان کو بھگاتے ہیں۔

۵—شیطان کی پہچان و معرفت:

چونکہ انسان کی نجات کے لیے شیطان ایک خطرہ ہے، تو بعض سلف شیطان کی پہچان کو ضروری سمجھتے ہیں، تاکہ اس سے بچا جاسکے۔

امام محاسبی کہتے ہیں کہ: بہر حال اللہ کے دشمن ابلیس کے بارے میں تم جانتے ہو کہ حق

---

(۱) مسلم: رقم: ۳۸۱۳

(۲) متفق علیہ: رقم: ۵۶۲۳، م: ۲۰۱۲

تعالیٰ نے تمھیں اطاعت و معصیت میں ظاہر و باطن میں اس سے مقابلہ اور پوری طاقت سے لڑنے کا حکم دیا ہے

اور تمھیں بخوبی معلوم ہے کہ اس نے اس کے بندے آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ کا حکم ٹھکرا دیا اور ان کی ذریت کا مقابل بنا، تو سوتا ہے اور وہ تیری فکر میں نہیں سوتا ہے، تو غافل ہوتا ہے اور وہ غافل نہیں ہوتا ہے، تو سہو کرتا ہے، لیکن اسے سہو نہیں ہوتا ہے، وہ تندہی اور جانفشانی کے ساتھ تیری نیند و بیداری کی حالت میں تیرے ظاہری و باطنی امور میں تیری ہلاکت و بربادی میں لگا ہوا ہے۔

اور اسے تجھے صرف معصیت میں ڈالنے اور تجھے عجب و ریا میں ڈالنے میں راحت نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کی تمنا و آرزو یہ ہے کہ تو بھی اس کے ساتھ وہیں پہنچ جائے جہاں اس کو پہنچایا جائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اللہ اس سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

جب تو نے اس صفت اور مرتبے کے ساتھ اس کو پہچان لیا تو اپنے قلب میں اس کی معرفت کو پکّا کرلے، اور بغیر غفلت و سہو کے حق و باطل میں اس سے بچنے کی ٹھان لے۔ اس کی سخت مخالفت کر اور قوت کے ساتھ مقابلہ کر اور اپنی تمام حرکات میں ڈرتے ہوئے اللہ کی پناہ اور سہارا لینا نہ چھوڑ، پس اس کی مدد طلب کر اور تیرے نفس کو وہاں تک فقر و فاقہ اور اس کا سہارا پہنچائے گا، اس لیے کہ تیرے لیے اس کے بغیر کوئی حیلہ اور قوت نہیں ہے''۔(۱)

(۲) دنیا سے تحذیر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«اعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَّفِي الْاٰخِرَةِ

''تم خوب جان لو کہ دنیوی حیات محض لہو و لعب اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال اور اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے، جیسے مینہ ہے کہ اس کی پیداوار کافروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے، سو اس کو تو زرد

---

(۱) شرح المعرفۃ وبذل النصیحۃ للمحاسبی

عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ »[1].

دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں عذاب شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے۔ اور دنیوی زندگانی محض دھوکہ کا اسباب ہے۔"

مزید فرمایا:

«يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَاللهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللهِ الْغَرُوْرُ »[2].

" اے لوگو! اللہ تعالیٰ کا وعدہ ضرور سچا ہے۔ سو ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تم کو دھوکہ میں ڈالے رکھے اور ایسا نہ ہو کہ دھوکہ باز شیطان تم کو اللہ سے دھوکہ میں ڈال دے۔"

دنیوی زندگی سے دھوکہ کھانے کی نہی کے بارے میں وارد آیات بہت زیادہ ہیں اور دنیا سے تحذیر کے بارے میں وارد احادیث بھی بے شمار ہیں، ہم یہاں ان میں سے کچھ بیان کرتے ہیں:

"نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" دنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنی یہ انگلی اور — سبابہ (انگشت شہادت) سے اشارہ کیا— سمندر میں ڈالے پھر وہ دیکھے کہ انگلی کیا لے کر واپس لوٹتی ہے"۔[3]

عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ نے میرے دونوں مونڈھے پکڑے، پھر ارشاد فرمایا: دنیا میں تم اس طرح رہو گویا کہ تم اجنبی یا مسافر ہو"۔[4]

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

" رسول اللہ ﷺ بازار سے گزر رہے تھے کہ آپ کا گزر کن کٹے مردار بکرے پر ہوا، آپ

---

(۱) سورۃ الحدید: آیت: ۲۰

(۲) سورۃ الفاطر: آیت: ۵

(۳) مسلم: رقم: ۲۸۵۸

(۴) بخاری: رقم: ۶۴۱۶

نے اس کو ہاتھ میں لیا اور کانوں سے پکڑ کر فرمایا: تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ یہ ایک درہم میں اس کے لیے ہو جائے؟ سب نے عرض کیا: کسی بھی چیز کے عوض میں ہم اس کو اپنے لیے پسند نہیں کرتے اور ہم اس کو لے کر کیا کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمھیں یہ پسند نہیں کہ یہ تمھاری ملکیت ہو جائے تو سب نے عرض کیا: خدا کی قسم! اگر یہ زندہ ہوتا تو بھی اس میں عیب ہے، اس لیے کہ وہ کن کٹا ہے، تو ہم مردہ ہونے کی حالت میں لے کر اس کو کیا کریں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم! دنیا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ حقیر و ہلکی ہے جتنا یہ مردار تمھارے نزدیک"۔ (۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے"۔ (۲)

نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"میرے اور دنیا کے درمیان کیا نسبت؟ میں تو دنیا میں اس سوار کی طرح ہوں جو کسی درخت کے سایہ میں ٹھہرا اور آرام پا کر اس کو چھوڑ گیا"۔ (۳)

اور احادیث دنیا سے تحذیر کے باب میں بہت زیادہ ہیں، اور اس دنیوی زندگی میں انسان کی بہت سی لازمی ضروریات ہیں، جیسے کھانا پینا، لباس رہائش گاہ، اور ان چیزوں کی فراہمی کے لیے سعی کرنا امر مشروع ہے۔

اور دوسروں کی ضرورتوں سے نفس کو روکنا ایسا امر ہے جس کا شریعت نے مطالبہ کیا ہے اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

اور ممنوع تو وہ طلبِ دنیا میں غرق ہو جانا اور اس کے جمع کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو جانا ہے جو ان چیزوں میں سے ہے جس کی وجہ سے دوسرے بہت سے واجبات پامال ہو جاتے ہیں، جس کو بجالانا انسان پر ضروری ہے، جیسے اپنے اوقات میں مطلوب عبادت کی ادائیگی، اولاد کی تربیت پر توجہ اور مسلمانوں کے حقوق کی ادائیگی۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۹۵۷

(۲) مسلم: ۲۹۵۶

(۳) ترمذی: رقم: ۲۳۷۷

پس اس دنیوی محبت کے دل پر قابو پانے سے بچنا ہے جس میں انسان کی پوری ہمت دنیا کسبی ہی کی طرف مصروف ہو جائے اور دوسرے واجب بھول جائے۔

اسی وجہ سے وقفہ وقفہ سے محاسبۂ نفس کی طرف مراجعت کرنا انتہائی ضروری ہے، جس سے انسان اپنے نفس کی حالت پر واقف ہو جائے کہ دنیا نے اس کا کتنا وقت لیا، اور کتنا وقت آخرت کے لیے باقی بچا، جب وہ یہ کرے گا تو اپنی روش بدلنے پر قادر ہو جائے گا، جب جب وہ انحراف پائے گا تو اس کی راہ پکڑ سکے گا۔

(۳) نفس سے تحذیر

خود پسندی اور اتراہٹ ان خطرناک امراض میں سے ہے جو بسا اوقات انسان کے لیے دنیوی واخروی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔

شیخین نے ابو ہریرہؓ کی حدیث بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ایک انسان عمدہ پوشاک میں چل رہا ہے کہ نفس اس کو خود پسندی میں مبتلا کر دیتا ہے، وہ بال بھی سنوارے ہوئے ہے پھر اللہ اس کو (زمین میں) دھنسا دیتا ہے تو وہ قیامت تک دھنستا ہی جائے گا"۔(۱)

اور جب ظاہری خود پسندی انسان کو اس گھاٹ میں اتار دیتی ہے تو باطنی خود پسندی اور نفس سے رضامندی انتہائی خطرناک اور نتیجۃً بہت بری ہے۔

اور خود پسندی کو کمال کی نگاہوں سے اپنی طرف دیکھنا ہے اور یہ ایسا غرور ہے کہ دوسرا غرور اس کے قریب بھی نہیں آتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے نفس کی صفائی بیان کرنے اور اس کی مدح کرنے سے منع کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا تُزَكُّوٓا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ ٱتَّقَىٰٓ﴾(۲) "تو تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو، تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے۔"

اور ہم اخلاص کی بحث میں وہ خواہشات دیکھ آئے ہیں، جو نفس پر طاری ہوتی ہیں، جیسے ریا،

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۵۷۸۹، م: ۲۰۸۸

(۲) سورۃ النجم: الآیۃ: ۳۲

شہرت طلبی اور خود ستائی کی خواہش اور وہ خواہشات کہ جن سے بچنے کے لیے انسان کو اپنے نفس سے مسلسل مجاہدہ وریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور یہ گزر چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس طرح وہ وسائل بیان کئے جو اس کو صراطِ مستقیم تک پہنچائے اور اس میں سب سے مقدم حقیقی تواضع اور نفس سے خوش نہ ہونا ہے۔

(۴) جہنم سے تحذیر

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہنم سے ڈرانے بچانے میں بہت ہی زور لگاتے تھے، اور یہ ایسا امر ہے جس سے تحذیر قرآن کریم میں بار بار آئی ہے۔

اور جہنم سے تحذیر وہاں تک پہنچانے والے اسباب، گناہ اور نافرمانیوں سے بچنا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

«يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ»(۱).

"اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جس پر تند خو مضبوط فرشتے ہیں، جو خدا کی نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو بجالاتے ہیں۔"

نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطبہ دیتے ہوئے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تم کو جہنم سے ڈراتا ہوں، میں تم کو جہنم سے ڈراتا ہوں، میں تم کو جہنم سے ڈراتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو برابر دہراتے رہے، حتیٰ کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری اس جگہ پر ہوتے تو یہ بات بازار والے سن لیتے (آپ کی آواز کے بلند ہونے کی طرف اشارہ ہے) یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم پر موجود دھاری دار چادر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروں میں آگری"۔(۲)

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) سورہ تحریم: ٦

(۲) اخرجہ الدارمی: ۱۸۱۲، والحاکم فی المستدرک: ۲۸۷/۱

"رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا تو اس میں فرمایا: میرے سامنے جنت اور جہنم پیش کی گئیں میں نے آج کی طرح کا خیر وشر میں کوئی دن نہ دیکھا اور اگر تم بھی وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم یقیناً کم ہنسو اور زیادہ رونے لگو، راوی فرماتے ہیں: صحابہ رضی اللہ عنہم پر اس سے بھاری کوئی دن نہیں گزرا، وہ فرماتے ہیں: سب نے اپنے سر ڈھانک لیے اور وہ (بغیر آواز کے) رو رہے تھے"۔ (۱)

جی ہاں ! یہ خطرناک مرحلہ ہے، کیونکہ آدمی یا تو جنت میں جائے گا یا جہنم میں اور نبی ﷺ کھلم کھلا ڈرانے والے ہیں۔

(۵) دجال سے تحذیر / خبردار کرنا

نبی ﷺ نے بہت سی احادیث میں اپنی امت کو دجال سے ڈرایا ہے، ہم ان میں سے صرف ایک حدیث ذکر کرتے ہیں:

شیخین نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے پھر اللہ کی اس کی شایان شان تعریف بیان کی پھر دجال کا ذکر کیا، اور فرمایا: میں تم کو اس سے ڈراتا ہوں اور ہر ایک نبی نے اپنی قوم کو اس سے ڈرایا ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو ڈرایا لیکن میں تمھیں اس کے بارے میں ایک ایسی بات بتاؤں گا جو کسی نبی نے اپنی قوم کو بیان نہیں کی، تم یہ یاد رکھ لو کہ وہ "کانا" ہے، اور اللہ تعالیٰ اس صفت سے پاک ہے۔

اور مسلم کی روایت میں ہے: اور آپ نے فرمایا: یہ بات خوب یاد رکھو کہ تم میں سے کوئی بھی اللہ عزوجل کو موت تک ہر گز نہ دیکھ پائے گا (یعنی مرنے کے بعد ہی اللہ کی زیارت ممکن ہے"۔ (۲)

(۶) سابق امتوں کی اتباع سے تحذیر

حضرت ابو سعید خدری ؓ نبی ﷺ سے روایت بیان کرتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۲۹۴، م: ۲۳۵۹، واللفظ لمسلم

(۲) متفق علیہ: رقم: ۳۳۳۷، م: ۱۶۹

"تم ضرور بالشت در بالشت اور ذراع در ذراع گذشتہ لوگوں کے طریقوں کی پیروی کروگے، حتی کہ اگروہ گوہ کے بل میں داخل ہوئے تو تم اس میں بھی ان کی اتباع کروگے ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ کی مراد پہلی امتوں سے یہود اور نصاریٰ ہیں؟ توآپ ﷺ نے فرمایا: پھر اور کون؟"۔ (۱)

یہ امر واقع کا بیان ہے جو مسلمانوں کو آئے گا، اور یہ اسی سے تحذیر و تنبیہ ہے، مشرک مسلمان ہو جائے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو مشرکین کے درمیان مقیم رہنے سے ڈرایا ہے، مبادا ان سے متاثر ہو جائے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کسی مشرک نو مسلم کا کوئی عمل قبول نہیں کرتا ہے حتی کہ وہ مشرکین سے علیحدگی اختیار کر کے مسلمانوں میں آجائے"۔ (۲)

اور حضرت جریر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

"میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز قائم کرنے، زکوۃ ادا کرنے، ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی چاہنے اور مشرک سے علیحدگی اور فراق اختیار کرنے پر بیعت کی"۔ (۳)

پس مسلمان سے مشرکین کی مادی، اخلاقی اور اجتماعی علیحدگی مطلوب ہے، حتی کہ وہ ان سے بالواسطہ و بلاواسطہ اثر پذیر ہونے سے بھی دور رہے۔

یہ علیحدگی اس خوف سے ہے کہ وہ ان میں رہ کر ان کو پسند نہ کرنے لگے اور یہ پسندیدگی اس کو ان کی محبت تک پہنچادے، اور خطرہ یہیں چھپا ہوا ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

(۱) بخاری: ۳۴۵۶

(۲) نسائی: رقم: ۲۴۳۵، وابن ماجہ: رقم: ۲۵۳۶

(۳) نسائی: رقم: ۴۱۸۶

﴿لاَ تَجِدُ قَوۡمًا یُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ یُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَوۡ کَانُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَهُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَهُمۡ اَوۡ عَشِیۡرَتَهُمۡ﴾[1]

"جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں؛ آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور رسول کے خلاف ہیں، گو وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ والے ہی کیوں نہ ہوں۔"

یہ ان امورِ عامہ کی مثالیں ہیں، جن سے آپ ﷺ نے ڈرایا ہے، ان کو اپنے مبادیات واولیات میں سرفہرست رکھنا ہر فرد مسلم پر ضروری ہے، مذکر ہو یا مؤنث؛ تاکہ وہ اللہ کے عذاب سے بچ جائے اور جہنم سے بچالیا جائے اور اللہ کے فضل ورحمت سے ان اہل جنت میں سے ہو جائے جن پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگیں ہوں گے۔

---

(۱) سورۂ مجادلہ: آیت: ۲۲

دوسری فصل

امور عامہ کی ذمہ داری سے تحذیر

ہر امت میں کچھ ایسے لوگوں کا ہونا لازمی ہے جو ادارۂ امور عامہ کے ذمہ دار ہوں، انھیں میں سے حکمران، قاضی، شعبۂ مالیات کے ذمہ دار، اور امت کے شعبہ تنظیم وترقی کے ذمہ دار ہوں گے۔

اور یہ تمام ذمہ داریاں امت (کے مختلف امور) سے متعلق ہیں اور اس (بوجھ کا اٹھانا) بڑا خطرہ ہے اور جن امور سے نبی ﷺ نے ڈرایا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ نااہل ونالائق شخص کو ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے کی باگ ڈور سونپی جائے، اور ہم اس کی کچھ مثالیں ذکر کرتے ہیں۔

ائمہ کو تحذیر:/امراء (اصحابِ امارت) کو تنبیہ:

آپ ﷺ نے اس منصب کے طلب نہ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے، اس میں عام ذمہ داری ہے۔

آپ نے عبدالرحمن بن سمرہؓ سے ارشاد فرمایا:

''تم امارت کا سوال نہ کرو، اس لیے کہ اگر وہ تمھیں سوال کرنے کے نتیجے میں دی گئی تو تم اس کے حوالے کر دیئے گئے، (وہ تمھارا حال خراب کر دے گی) اور اگر وہ تمھیں بغیر طلب کے دی گئی تو اس کی ذمہ داری نبھانے کے سلسلہ میں تمھاری مدد کی جائے گی''۔(۱)

نیز فرمایا:

''تم قریب ہی امارت کی خواہش اور لالچ کروگے حالانکہ وہ قیامت کے دن ندامت (کا باعث) ہوگی''۔(۲)

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے کیوں عامل (گورنر) مقرر نہیں کرتے! فرماتے ہیں: آپ نے اپنا دست اقدس میرے کندھے پر رکھا، پھر فرمایا: اے ابوذر تم کمزور ہو، اور یہ

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۶۶۲۲، م: ۱۶۵۲

(۲) بخاری: رقم: ۷۱۴۸

امانت ہے اور وہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا باعث ہو گی، مگر وہ شخص جس نے حق کے ساتھ لیا اور اس سے متعلق تمام ذمہ داریاں نبھائیں...... اور آپ نے ان سے فرمایا: میں تمھیں کمزور دیکھ رہا ہوں اور میں تمھارے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں، تم ہر گز دو آدمیوں کی امارت بھی قبول نہ کرنا"۔ (۱)

یہ ہے جو آپ ﷺ نے امارت طلب کرنے اور اس سے دور رہنے کی شان میں بیان فرمایا، مگر وہ شخص جو ان ذمہ داریوں کے نبھانے کا اہل ہو، اور بعض چیزیں اپنے اپنے مقام پر بہت سی احادیث میں گزر چکی ہیں۔

اسی میں سے:

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"سنو! تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے، اور ہر ایک سے اس کی نگہداشت میں رہنے والوں کے متعلق سوال کیا جائے گا پس جو لوگوں پر ذمہ دار ہوتا ہے اس سے زیر دست رعایا کے بارے میں باز پُرس ہو گی"۔ (۲)

فرمایا: "جس بندے کو بھی اللہ تعالیٰ نے رعیت کا ذمہ دار بنایا پس اس نے ان کی خیر خواہی نہیں کی تو وہ جنت کی بو نہیں پائے گا"۔ (۳)

مزید فرمایا:

"جو بھی مسلمان رعیت کا والی بنا پھر وہ مرا اس حال میں کہ وہ ان کے حق میں خیانت کرنے والا تھا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر چکے"۔ (۴)

آپ ﷺ ہی نے فرمایا:

"جس کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے معاملات میں سے کسی معاملہ کا والی بنایا پھر وہ ان کی حاجت

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۸۲۵-۱۸۲۶

(۲) متفق علیہ: رقم: ۷۱۳۸، م: ۱۸۲۹

(۳) متفق علیہ: رقم: ۷۱۵۰، م: ۱۴۲

(۴) بخاری: رقم: ۷۱۵۱

،ضرورت اور فقر کے وقت چھپ گیا تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے اس کی حاجت، ضرورت اور فقر کے وقت چھپ جائیں گے"۔ (۱)

اور فرمایا:

"کوئی بھی شخص دس آدمیوں کا امیر نہیں ہوگا، مگر قیامت کے دن اس کو لایا جائے گا، اس کے ہاتھ اس کی گردن میں بندھے ہوں گے، اب حق اس کو چھڑائے گا یا ہلاک کرے گا"۔ (۲)

کیا اس میں یا بعض میں اس امارت کی طرف پیش قدمی کرنے سے تحذیر اور تنبیہ نہیں ہے جیسا کہ اس میں والی کے لیے استقامت کی ترغیب ہے۔

عہدۂ قضا سے تحذیر و تنبیہ:

قضا کا مقصد و فریضہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا ہے اور یہ انبیاء کا کار منصبی ہے اور ہر انسان اس کار منصبی اور فریضہ کی انجام دہی کا اہل نہیں ہوتا، اس لیے جو آدمی بھی اس فریضہ کا ذمہ دار بنا، حالانکہ وہ اس کا اہل نہیں ہے تو اس نے جہنم میں جانے کی جسارت کی (العیاذ باللہ)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"قاضی تین طرح کے ہیں؛ ایک جنت میں اور دو جہنم میں، بہر حال جنت میں وہ ہے جس نے حق پہچانا، پھر اسی کے مطابق فیصلہ کیا، اور دوسرا وہ ہے جس نے حق جانا پھر فیصلہ کرنے میں ظلم اور ناانصافی کی تو وہ جہنم میں ہوگا اور تیسرا وہ شخص جس نے جہالت کے باوجود لوگوں کے فیصلے کئے تو وہ جہنم میں ہوگا"۔ (۳)

اور قاضی کی اس قدر عظیم ذمہ داری کی وجہ سے اس امت کے اسلاف میں سے بہت سے حضرات اس کار منصبی کی ذمہ داری سنبھالنے سے رکے رہے؛ بلکہ امام ابو حنیفہؒ قضاء کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے قید کئے گئے ہیں، پھر بھی انھوں نے اس سے انکار کر دیا اور قید کو ترجیح دی۔

---

(۱) ابوداؤد: ۲۹۴۸، والترمذی: ۱۳۲۲

(۲) الدارمی: رقم: ۲۵۱۵

(۳) ابوداؤد: ۳۵۷۳، ترمذی: ۱۳۲۲، وابن ماجہ: ۲۳۱۵

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے قضاء کی ذمہ داری سنبھالی تو وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا''۔[1]

اور اس سے اس مہم کی خطرناکی واضح ہو جاتی ہے اور اس کی طرف پیش قدمی کرنے والا اس معاملہ میں بصیرت پا چکا ہو گا۔

علماء کو خبردار کرنا:

اسلام نے علم کا درجہ بلند کیا ہے اور علما کو عزت و تکریم عطاء کی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَّاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ»[2].

''اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا ہے درجے بلند کر دے گا۔''

نیز فرمایا:

«اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا»[3].

''خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔''

اور ہم احادیث رسول میں سے صرف ایک ہی حدیث پر اکتفاء کرتے ہیں، اور احادیث بہت زیادہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو آدمی طلب علم کے لیے راہ چلا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے راستے پر چلائے گا، اور فرشتے طالب علم سے خوش ہو کر اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔ اور طالب علم کے لیے وہ تمام مغفرت طلب کرتے ہیں، جو آسمانوں میں ہے اور وہ تمام جو زمینوں میں ہے حتی کہ مچھلیاں پانی میں۔ اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر۔ اور علماء انبیاء کے وارثین ہیں، اور انبیاء درہم و دینار کے وارث نہیں بناتے، وہ تو علم کے وارث بناتے ہیں، جس نے اس کو حاصل کر لیا

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۳۵۷۱

(۲) سورۂ مجادلہ: آیت: ۱۱

(۳) سورۂ فاطر: آیت: ۲۸

اس نے بہت ہی بڑا حصہ (نیک بختی) پالی''۔ (۱)

یہی علماء کا درجہ ہے، وہ انبیاء کے وارث ہیں، اللہ کی مخلوق میں سب سے منتخب بندے ہیں، وہ ہدایت کے حاملین ہیں، بھلائی کا حکم کرنے والے اور برائی سے روکنے والے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو اپنی لسان حال ولسان قال سے تعلیم دیتے ہیں، وہ لوگوں کو خیر کی دعوت دیتے ہیں اور وہی اس میں قدوہ اور نمونہ ہیں اور لوگوں کو شر سے روکتے ہیں، اور وہ اس شر سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔

اور جب علماء کا یہ درجہ ہے تو ان کی ذمہ داریاں بھی اللہ کے یہاں بڑی ہیں، جو ان کے رتبہ کے ہم مرتبہ و ہم پلّہ ہیں، اور اسی وجہ سے نبی ﷺ کی ان کے حق میں تحذیر واضح اور بیّن ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے علم حاصل کیا، جس علم سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے وہ علم حاصل کرتا ہے؛ تاکہ اس کی وجہ سے دنیوی متاع اور دنیا میں منصب پائے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو نہیں پائے گا''۔ (۲)

نیز فرمایا:

''جس نے علم اس لیے حاصل کیا تاکہ اس کے ذریعے علماء سے مقابلہ بازی کرے یا اس کے ذریعے سفیہ اور کم عقل لوگوں سے حجت بازی کرے، یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں داخل کر دے گا''۔ (۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: وہ فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جس کے خلاف قیامت کے دن سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا وہ وہ شخص ہو گا...... اور دوسرا وہ آدمی جس نے علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن پڑھا، پس اس کو لایا جائے گا، اس کو اپنی نعمتیں بتائی جائے گی، تو وہ اعتراف کرلے گا، اس سے پوچھا جائے گا: تونے اس کے مقابلے میں کیا عمل کیا؟ تو وہ کہے گا میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور تیرے لیے

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۳۶۴۱، ترمذی: رقم: ۲۶۸۲، وابن ماجہ: ۲۲۳، والدارمی: ۳۴۲

(۲) ابوداؤد: رقم: ۳۶۶۴، وابن ماجہ: ۲۵۲

(۳) ترمذی: رقم: ۲۶۵۴

قرآن پڑھا، اللہ فرمائیں گے: تو جھوٹا ہے، تونے علم اس لیے حاصل کیا تاکہ تجھے عالم کہا جائے، اور تونے قرآن اس لیے پڑھا تاکہ قاری کہا جائے، سو تجھے کہا جاچکا، پھر اس کے بارے میں حکم دے دیا جائے گا اور چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا"۔[1]

یہ ان لوگوں کا ٹھکانا ہے جو اپنے علم کے سبب وراثت نبوی کی راہ سے دنیوی مقاصد، مال، شہرت اور منصب حاصل کرنے کے لیے منحرف ہو جاتے ہیں۔

اور عالم کا انحراف بہت ہی خطرناک معاملہ ہے، اس لیے کہ وہ لوگوں کے سامنے ان کے دینی امور گڈمڈ کر دیتا ہے، اور لوگ عالم کے اقوال دیکھنے سے پہلے اس کا طرز عمل دیکھتے ہیں۔

اور اسی بنیاد پر عالم کی لغزشیں حضرت عمرؓ کے قول کے مطابق دین کو ڈھا دیتی ہیں۔[2]

خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ عالم کا امت کی تربیت و رہنمائی میں بڑا اثر ہوتا ہے، رتبہ عالی اور اس کا ثواب بہت بڑا ہے، جب وہ اس رتبہ کو غلط جگہ استعمال کرے گا تو وہ سزا کا مستحق ہوگا، آپ ﷺ کی تحذیر علماء کو منہج قویم پر استقامت طلب کرنے کے لیے بہت واضح ہے۔

امت کے مال میں گھسنے والے کو تحذیر:

اور انھیں لوگوں میں سے جن کو نبی ﷺ نے ڈرایا ہے —وہ لوگ بھی ہیں جو امت کے مالی امور میں جمع و خرچ کی تدبیر پر نگرانی کے ذمہ دار حضرات ہیں۔

اور اصل تو یہ ہے کہ امت کے معاملات میں سے یہ شعبہ اپنے دین میں باوثوق، اللہ کا دھیان رکھنے والے، امانت دار لوگ سنبھالیں۔ اور ان لوگوں کے نفوس میں شیطان کی گزرگاہیں بند کرنے ہی کے لیے آپ ﷺ کا یہ ڈرانا تھا۔

خولہ انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے؛ وہ فرماتی ہیں:

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۹۰۵

(۲) دارمی نے زیاد بن حدیر سے اس کی تخریج کی ہے، وہ فرماتے ہیں: مجھ سے حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیا آپ جانتے ہیں کہ کون سی چیز اسلام کو ڈھانے والی ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں، انھوں نے فرمایا: عالم کی لغزشیں، منافق کا کتاب سے جدال اور گمراہ ائمہ کے فیصلے دین کو ڈھانے والے ہیں۔ حدیث نمبر: ۲۱۴، اور اس کی سند صحیح ہے، مشکوۃ کی تخریج کے مطابق: ۸۹/۱

''میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: کچھ لوگ اللہ کے مال میں ناحق گھستے ہیں (خیانت کرتے ہیں) ان کے لیے قیامت کے دن جہنم ہے''۔ (۱)

عدی بن عمیرہ کندی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: تم میں سے جس کو ہم نے کسی عمل کا ذمہ دار بنایا تو اس نے ہم سے سوئی یا اس سے بھی حقیر چیز چھپائی تو یہ خیانت ہے، قیامت میں وہ اسے لے کر آئے گا، راوی کہتے ہیں: آپ کے سامنے انصار میں سے ایک سیاہ آدمی کھڑا ہوا، گویا میں اس کی طرف دیکھ رہا ہوں، اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میری طرف سے آپ کا (سپرد کیا ہوا) عمل قبول کر لیجیے، آپ نے پوچھا: تجھے کیا ہو گیا؟ اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو یہ یہ فرماتے ہوئے سنا، آپ نے فرمایا: اور اب میں یہ بھی کہتا ہوں: ہم نے تم میں سے جس کو بھی کسی عمل کا ذمہ دار بنایا تو چاہیے کہ وہ قلیل و کثیر سب لے کر حاضر ہو، اس کو اس میں سے جو بھی دیا جائے اسے وہ قبول کر لے اور جس سے روکا جائے اس سے رک جائے''۔ (۲)

خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے مروی، وہ فرماتی ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: یہ مال شیریں و شاداب ہے جو اس کو حق کے ساتھ لے گا اس میں برکت دی جائے گی اور بہت سے لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مال میں اپنی نفسانی خواہش کے مطابق گھستے ہیں اور ان کے لیے قیامت کے دن جہنم کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے''۔ (۳)

اور آپ ﷺ کا اس امر سے لوگوں کو ڈرانے کا سبب ان کے بارے میں اس عقوبت کا خوف ہے جو ان کا انتظار کر رہی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا مال وہ امت کا مال ہے، جس میں ضعیف و ناتواں، بیوہ، مساکین اور یتیموں وغیرہ کا حق ہے، یہ وہ مال ہے جس کے مصارف کی شریعت نے تعیین کی ہے، جب انسان اس کا نگراں مقرر

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۱۱۸

(۲) مسلم: رقم: ۱۸۳۳، وابوداؤد: ۳۵۸۱

(۳) ترمذی: رقم: ۲۳۷۴

ہواوراس کواپنی شہوت اور من مانی ضرورتوں میں خرچ کرے تو یہ تمام حقوق پامال ہو گئے۔

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس عمل کی ذمہ داری سنبھالنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا، یہ ابو مسعود انصاریؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس عمل سے سبکدوشی چاہ رہے ہیں جبکہ آپ ہی نے ان کو اس عمل کا مکلف اور ذمہ دار بنایا تو آپ نے فرمایا: تب تو میں تم کو مجبور نہیں کرتا ہوں''۔ [1]

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۲۹۴۷

تیسری فصل

مردوں اور عورتوں کو تنبیہ

مرد اور عورتیں ہر سوسائٹی اور معاشرہ کے لیے اصل اور بنیاد ہیں، اور اسلام نے ان دونوں کے درمیان تعلق کو اس طرح منظم و مرتب کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے خوش گوار زندگی کا ضامن ہو، البتہ خلل اس وقت واقع ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے ضوابط سے روگردانی کی جائے، اور نبی ﷺ نے طرفین میں سے ہر ایک کو دوسرے (کے حقوق) سے ڈرایا ہے۔

مردوں کو عورتوں کے بارے میں تحذیر:

اسلام نے خاندان کے اندر بالادستی و سربراہی مرد کو دی ہے اور اس کے معنی عورت کا کمتر ہونا نہیں ہے، بلکہ ہر چھوٹی بڑی سوسائٹی اور معاشرہ کے لیے ایک کارآمد نظام و ضابطہ کا ہونا ضروری ہے، لہذا سربراہی مرد کی ذمہ داری اور عمل ہے۔

"قوامہ"[1] کا معنی: خاندانی معاملات و امور کو اللہ تعالیٰ اور حضور ﷺ کے اوامر کے مطابق انجام دینا اور اس نظام کی حفاظت کے لیے آپ ﷺ نے اس بات سے خبردار کیا ہے کہ عورت مرد پر اس درجہ اثر انداز ہو جائے کہ وہ درست راستہ سے بہک جائے۔ اور اس باب میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔

ان میں سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"میں نے اپنے بعد مردوں پر عورتوں سے بڑا کوئی فتنہ نہیں چھوڑا"۔[2]

نیز فرمایا:

"یقیناً دنیا دل کو لبھانے والی اور شاداب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے تم کو اس میں خلیفہ بنایا ہے تاکہ وہ

---

(۱) الرجال قوامون علی النساء (سورۃ النساء: ۳۴) کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) متفق علیہ: رقم: ۵۰۹۶، م: ۲۷۴۰

دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟ پس دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو، کیونکہ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتوں کی شکل میں تھا''۔ (۱)

اور نبی ﷺ نے عورت کے مرد پر غلبہ اور تاثیر کی قوت کو واضح کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے عقل و دین میں ناقص عورتوں سے زیادہ، عاقل مرد کی عقل کو زائل کر دینے والا کسی کو نہیں دیکھا''۔ (۲)

یہ تحذیر مرد کی شخصیت کے کمزور پہلو کو اجاگر کرنا ہے کہ وہ اس جانب سے نہ گھیر لیا جائے۔ اس کا مطلب عورتوں کی حقارت، ان کے ساتھ بدسلوکی، اور ان کو بے عزت کرنا نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ان کے اور اللہ کی جانب سے ان کو دی گئی ذمہ داریوں کے درمیان حائل ہونا ہے۔

اسلام کی طرف سے عورتوں کو دی گئی تکریم واحترام میں سے بعض کا بیان سابق فصلوں میں گزر چکا ہے۔

البتہ خوف مرد کے عورت کی تاثیر میں دب جانے کا ہے، ان امور میں جن میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت ہوتی ہے، جیسا کہ نعمان بن بشیرؓ کے والد کو پیش آیا، جب وہ اپنی کسی بیوی کی باتوں کی تاثیر میں آگئے اور اس کے بطن سے مولود اپنے بیٹے کو دیا جو اپنی دوسری اولاد کو نہیں دیا اور اس پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنانے کے لیے پہنچے تو آپ نے فرمایا: تم مجھے ظلم پر گواہ مت بناؤ۔ (۳)

یا عورت مرد کو اپنے بہت سے ایسے امور دنیوی کے مطالبات میں مجبور کرے کہ جن مطالبات کی ادائیگی دینی امور کی ادائیگی سے انسان کو غافل کر دے۔

اسی وجہ سے اسلام وہ کرتا ہے جو عورتوں کے حقوق کی ان کی ہی جیسی عورتوں کے ظلم و زیادتی سے حفاظت کرے، اسلام مرد کو عورتوں کے فتنے سے ڈراتا ہے تو وہ اس سے جہاں عورتوں کی عزت نفس کی حفاظت کرتا ہے، وہیں عورت کے لیے اس کے شوہر کی بھی حفاظت کرتا ہے، اس مفہوم کی

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۷۴۲

(۲) بخاری: رقم: ۳۰۴، مسلم: رقم: ۸۰

(۳) بخاری: رقم: ۲۶۵۰

مؤید بہت سی احادیث ہیں، انہی میں سے یہ ہے:

آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم عورتوں کے سامنے داخل ہونے سے بچو، ایک انصاری نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! دیور کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ تو موت ہے''۔ (۱)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''سن لو! کوئی بھی مرد کسی ثیبہ عورت کے پاس شب باشی نہ کرے مگر یہ کہ وہ اس کا شوہر ہو یا اس کا ذی رحم محرم ہو''۔ (۲)

یقیناً قواعد وضوابط عورت کے دین واخلاق اور اس کی نیک نامی کی ہی خاطر ہیں، جیسا کہ وہ مرد کی صلاح وفلاح کے لیے بھی ہیں، کہ وہ اس کو ان لغزشوں اور پھسلاہٹوں سے ڈراتا ہے جو اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے غضب تک پہنچانے والی ہیں۔

عورتوں کی تحذیر:

آپ ﷺ نے عورتوں کو ان کے مخصوص امور سے ڈرایا ہے، اور تحذیر کا مقصد عورتوں کی نجات کی سعی کرنا ہے اور اس مقصد میں آپ ﷺ کی مثال طبیب کی سی ہے جو اپنے مریض کی بیماریاں جانتا ہے اور اس کو بتاتا ہے، وہ ان بیماریوں کے پیش نظر اپنے کھانے پینے میں خیال رکھے، تاکہ اپنے نفس کو جلد ہلاکت تک نہ لے جائے۔

عمران بن حصینؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں؛ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے جنت میں دیکھا تو اس میں زیادہ تر فقراء کو پایا اور میں نے جہنم میں دیکھا تو اس میں زیادہ تر عورتیں پائیں''۔ (۳)

ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ یا عید الفطر میں عید گاہ کی طرف نکلے تو آپ کا گزر عورتوں پر

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۵۲۳۲، م: ۲۱۷۲

(۲) مسلم: رقم: ۲۱۷۱

(۳) بخاری: رقم: ۲۳۴۱، مسلم: رقم: ۲۷۳۷

ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عورتوں کی جماعت! خوب صدقہ کرو، کہ میں نے جہنم میں سب سے زیادہ تم کو پایا ہے، ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کس وجہ سے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: تم بہت زیادہ لعن طعن کرتی ہو، شوہر کی نافرمانی کرتی ہو، میں نے عقلمند آدمی کی عقل کو ختم کرنے والی عقل ودین کے اعتبار سے ناقص تم سے زیادہ کسی کو نہ دیکھا، ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمارے دین اور عقل کے نقصان کی کیا دلیل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا عورت کی شہادت مرد کی شہادت سے نصف نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ان کا عقلی نقص ہے اور کیا ایسا نہیں ہے کہ جب اسے حیض آتا ہے تو وہ نماز نہیں پڑھتی اور روزہ نہیں رکھتی؟ ہم نے عرض کیا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: یہ اس کا دینی نقص ہے"۔ (۱)

ابن عمرؓ سے اسی کے مثل وارد ہے اور اس میں یہ زیادتی بھی ہے:

"اے عورتوں کی جماعت! تم خوب صدقہ کرو اور کثرت سے استغفار کرو، اور اس میں یہ بھی ہے: بہر حال عقلی نقصان تو دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہوتی ہے، پس یہ عقل میں نقصان ہے اور عورتیں کئی راتیں ایسی گزارتی ہیں کہ نماز نہیں پڑھتیں، اور رمضان میں افطار کرتی ہیں، تو یہ ان کا دینی نقصان ہے"۔ (۲)

حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

"نبی ﷺ عید الفطر کے دن کھڑے ہوئے اور نماز پڑھ کر چل دیئے حتی کہ عورتوں کے پاس پہنچے اور انھیں پند ونصیحت کی، آپ ﷺ نے فرمایا: صدقہ کرو، کیونکہ تمھاری اکثریت جہنم کا ایندھن ہے، تو عورتوں کے درمیان سے سرخی مائل بسیاہی رخسار والی ایک عورت نے کھڑی ہو کر پوچھ لیا: کیوں اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: اس لیے کہ تم بہت زیادہ شکوہ شکایت کرتی ہو اور شوہروں کی نافرمانی کرتی ہو۔ راوی کہتے ہیں: تو عورتیں صدقہ کرنے لگیں"۔ (۳)

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث صلوۃ الکسوف میں ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۰۴، م: ۸۰

(۲) مسلم: رقم: ۷۹

(۳) مسلم: رقم: ۸۸۵

"میں نے جنت دیکھی تو میں نے ایک خوشۂ انگور لیا، اگر میں اس کو لے آتا تو تم لوگ اس میں سے جب تک دنیا باقی رہتی کھاتے رہتے، اور میں نے جہنم دیکھی تو آج کی طرح زیادہ خوف زدہ منظر میں نے نہیں دیکھا اور اس میں اکثریت عورتوں کی دیکھی۔

صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نافرمانی کی وجہ سے، پوچھا: اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے؟ فرمایا: شوہر کی نافرمانی کرتی ہیں، اور احسان کے مقابلہ میں ناشکری کرتی ہیں، اگر تو ان کے ساتھ پورا زمانہ احسان کرے گا پھر وہ تیری طرف سے کبھی کوئی تکلیف دیکھے گی تو وہ کہے گی: میں نے کبھی بھی تیری طرف سے خیر نہیں دیکھی"۔ (۱)

ابوہریرہؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"دو گروہ جہنمیوں کے میں نے نہیں دیکھے ایک وہ قوم ہے جن کے پاس کوڑے ہیں، گایوں کی دموں کی طرح جس سے وہ لوگوں کو مارتے ہیں، اور (دوم وہ) عورتیں جو لباس پہنے ہوئے بھی ننگی، مائل کرنے والی، اور مائل ہونے والی، ان کے سر خراسانی اونٹوں کے جھکے ہوئے کوہانوں کی طرح ہیں، وہ جنت میں داخل نہ ہوں گی اور نہ اس کی بو پائیں گی، حالانکہ اس کی بو اتنے اتنے فاصلے سے محسوس ہوتی ہے"۔ (۲)

سابقہ احادیث شریفہ درج ذیل امور ثابت کرتی ہیں:

۱۔ جہنمیوں کی اکثریت عورتوں کی ہوگی۔

۲۔ اور ان کے جہنم میں داخل ہونے کے اسباب درج ذیل ہیں:

☆ زیادہ تر لعن طعن۔ ☆ اپنے شوہر کی نافرمانی و ناشکری۔

☆ شکوہ و شکایت کی زیادتی۔ ☆ احسان کی ناشکری۔

۳۔ ان کو صدقہ اور استغفار کا حکم۔

ان کے دینی و عقلی نقص کا ثبوت اور اس کی وضاحت:

اب ہم اس کی کچھ وضاحت کریں گے، ہم کہتے ہیں:

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۰۵۲، م: ۹۰۷

(۲) مسلم: رقم: ۲۱۲۸

جہنمیوں کی اکثریت عورتوں کا ہونا وہ آپ ﷺ کی طرف سے حقیقت کو بیان کرنا ہے، جیسا کہ آپ نے یہ بھی بیان کیا کہ جنتیوں کی اکثریت فقراء ہیں.... اور احادیث نے عورتوں کے جہنم میں جانے کے اسباب بھی ذکر کئے ہیں، ان کے جہنم میں جانے کا سبب ان کا عورت ہونا نہیں ہے، بلکہ ان کے وہ اوصاف ہیں جن کو احادیث میں بیان کیا گیا ہے، اور جب یہی معاملہ ہے تو آپ ﷺ نے یہ امور بیان کر دیئے تاکہ ہر عورت اپنے نفس کی نگاہ داشت رکھے، اپنا سلوک مضبوط کرے، اور ہر اس چیز سے دور رہے جو دخول جہنم کا سبب ہو، لہذا ہر ایک کو چاہیے کہ وہ یہ کوشش کرے کہ وہ اپنی زبان کو لعن طعن کے کلمات سے دور رہنے کی عادی بنائے اور اپنے شوہر میں موجود خیر کے ساتھ اس کا ذکر کرے اور اس کی نافرمانی نہ کرے۔ اور شکوے کم کرے اور اس کی دی ہوئی اللہ کی نعمتیں اور اس کی زیادتی کو بیان کرے اور احسان کی ناشکری نہ کرے اور احسان کا بدلہ تو احسان ہی ہو سکتا ہے۔ اور ان کو صدقہ واستغفار کا حکم ان سئیات کی تلافی ہے جو ان کی طرف سے اس سلسلے میں ظاہر ہوتی ہیں اور حسنات سیئات کو مٹا دیتی ہے اور ان صفات کا تذکرہ جو عورتوں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں، ان صفات سے ان کو ڈرانے کے لیے ہے اور اس کے ذکر سے مقصود عورتوں کی حقارت اور ان کے عیب بیان کرنا نہیں ہے۔

بہر حال ان کے عقل و دین کے نقصان کے بارے میں جو کچھ وارد ہوا ہے وہ مطلق نہیں ہے جیسا کہ بعض جہلاء کم فہمی کی بناء پر سمجھتے ہیں۔

اور کسی کے لیے اس کو مطلق سمجھنے کا حق نہیں ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تفسیر کر دی ہے اور بیان شافی سے اس کو مقید کر دیا ہے۔

عورتوں کی عقلی تعمیر میں کوئی نقص نہیں ہے:

پس عورت کی عقلی تعمیر میں کوئی نقص نہیں ہے، عورت کی عقل اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہے اور اس کی تخلیق ہر اعتبار سے اعلیٰ و احسن ہوتی ہے، یہ نقص صرف ''شہادت'' تک محدود ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے فرما دیا ہے، ورنہ تو صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ ام سلمہؓ کا مشورہ قبول نہ کرتے اور نہ تو صحابہ اور تابعین میں سے کوئی بھی ان کے عقلی نقص کو حجت بنا کر حضرت عائشہؓ و دیگر امہات المومنین اور صحابہ کی عورتوں کی مرویات میں سے ایک حدیث بھی روایت کرتے اور نہ ہی کسی

نے حضرت عائشہؓ یا دیگر کسی زوجہ مطہرہ سے دوسرے گواہ کا مطالبہ کیا جو ان کی نبی ﷺ سے روایت کردہ حدیث یا آپ سے متعلق کہی بات کو مؤکد کردے، اور صحابہ اس وقت بہت زیادہ تھے۔

یہ تمام اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نقصان آپ ﷺ کی بیان کردہ قیود سے مقید و محدود ہے اور جو اس کو علی الاطلاق سمجھتا ہے تو یہ اس کی جہالت کی دلیل ہے۔

اور ان کا دینی نقصان تو اس میں ان کے کسی فعل و عمل کا دخل نہیں ہے، اور آپ ﷺ کا اس بارے میں فرمان مبارک محض حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

اور ہم آپ ﷺ کے اس فرمان کی طرف لوٹتے ہیں کہ میں نے عقل مند آدمی کی عقل کو ختم کرنے والی تم سے زیادہ دین و عقل کی ناقص نہیں دیکھی۔ یہ آپ ﷺ کی طرف سے طاقتور آدمی کی عقل پر تسلط اور اپنی چاہت کو اس سے آسانی سے حاصل کرنے کی عورت کی قدرت پر دلیل ہے، حالانکہ وہ ضعیف و کمزور ہے۔

اور جیسا کہ اس جملہ میں مرد کو تنبیہ و تحذیر ہے تو عورت کو بھی اپنی قدرت و طاقت کو اللہ کی نامرضیات میں کام میں لانے سے ڈرانا ہے؛ بلکہ اس پر ضروری ہے کہ اس کو وہ مرد کو خیر کی طرف متوجہ کرنے اور خیر میں اس کی مدد و معاونت میں کام میں لائے۔

بہر حال! ''حدیث کاسیات عاریات'' تو یہ آپ ﷺ کا معجزہ ہے، ان مغیبات کے بارے میں خبر دینے پر جس کے حدوث اور واقع ہونے کی آپ کو اطلاع دی گئی۔

اور لوگوں نے آپ ﷺ کی بیان کردہ دونوں قسمیں دیکھ لی، گایوں کی دموں جیسے کوڑے سے مارنے والے مرد بھی اور کپڑے پہنے ہوئے ننگی عورتیں بھی۔

یہ آپ ﷺ کی طرف سے خبر دینا ہے، اس سے مراد مردوں کو فریق اول کا مصداق بننے سے اور عورتوں کو فریق ثانی کا مصداق بننے سے ڈرانا ہے۔

اور جو عورت ان صفات کی حامل ہو وہ یقیناً فحش اور رذائل کی چلتی پھرتی دعوت ہے، اور اس امت کی بناء و تعمیر میں فسادی عنصر ہے۔

اس وجہ سے ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ اس فریق کی ہر ایک عورت اپنے ساتھ ایک ایک آدمی کو جہنم

میں کھینچ کر لے جائے گی، بشمول ان آدمیوں کے جنھوں نے اسے خراب کیا ہے، اور وہ اس کا ولی ہے، باپ ہو یا بھائی ہو یا چچا۔

یہ وہ ولی ہے جس نے اپنا فریضہ انجام نہ دیا اور بہترین دیکھ بھال اور پرورش نہ کی؛ حالانکہ نبی ﷺ نے فرمایا: آدمی اپنے اہل وعیال کا ذمہ دار ہے اور اس سے اپنے ماتحتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔ (۱)

اور یہی وہ ''دیوث'' ہے جس کا ذکر آپ کی حدیث میں آیا ہے، جہاں آپ نے فرمایا:

''تین لوگ ایسے ہیں کہ قیامت میں اللہ ان کی طرف نظر نہ فرمائیں گے: اپنے والدین کا نافرمان، مرد نما عورت، اور دیوث''۔ (۲)

دیوث وہ شخص ہے جس کو اپنی اہل کے بارے میں کوئی غیرت نہ ہو۔

☆☆☆

---

(۱) بخاری: رقم: ۷۱۳۸، مسلم: رقم: ۱۸۲۹

(۲) نسائی: رقم: ۲۵۶۱

آٹھواں مقصد

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کا ایک گوشہ

ہم اس مقصد میں آپ ﷺ کی عبادات، صلوۃ وصوم، صدقات وحج کے متعلق گفتگو قطعاً نہ کریں گے، اس لیے کہ یہ تو وہ پہلو ہے کہ اس کی بحثوں سے کتب شریفہ ودیگر کتب بھری پڑی ہے اور وہاں تک رسائی بھی خوب آسان ہے، بلکہ یہ تو عوام وخواص سب کو عموماً معلوم ہیں۔ ہم یہاں آپ کی عبادات میں سے تین ہی قسموں کی بحث پر اکتفاء کرتے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱ —غور وفکر۔

۲ —جہاد۔

۳ —ذکر ودعاء

اور یہ بھی اہم ہے کہ ہم ذکر کر دیں کہ آپ ﷺ کی پوری حیات طیبہ بلکہ ہر لحظہ عبادت ہے، اور یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ ﷺ کا ہر عمل اس چیز کا زندہ جاوید بیان ہے کہ مسلمانوں پر آپ ﷺ کی اقتداء کرنا اور آپ کے نقش قدم پر چلنا لازم ہے۔

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی حیات طیبہ کا ہر وہ لحظہ جس میں بیان ہے تو یہ لحظہ بایں معنی عبادت ہے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طرف ذکر اتارا؛ تاکہ وہ لوگوں کو بیان کریں جو ان کی طرف نازل کیا گیا۔

علامہ قسطلانیؒ ''مواہب'' میں فرماتے ہیں: بندہ جتنا اپنے رب کے قریب ہوگا اس کی خدا کے لیے محنت اور کوشش بھی اتنی ہی بڑی ہوگی؛ اسی وجہ سے نبی ﷺ تمام مخلوق میں محنت ومشقت اور وظائف وعبادت کو مضبوطی سے تھامنے والے اور اس کی محافظت میں سب سے بڑھ کر تھے، حتی کہ اللہ سے جاملے۔

پہلی فصل
غور وفکر کے بارے میں

قرآن میں مناظر کونیہ:

مناظر کونیہ بہت زیادہ ہیں، قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے، اور لوگوں میں ان کی واقفیت اور ان میں غائرانہ نظر کے بعد سوچ وفکر کو کام میں لانے کی دعوت دی ہے، ہم اس کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

«اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ»(۱).

"بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو کہ لے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کام کی چیزیں، اور پانی میں جس کو اتارا اللہ نے آسمان سے، پھر جلایا زمین کو اس کے مرگئے پیچھے، اور پھیلائے اس میں سب قسم کے جانور، اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو کہ تابعدار ہے اس کے حکم کا درمیان آسمان اور زمین کے، بیشک ان سب چیزوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے۔"

فرمایا:

«هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ○ یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ النَّخِیْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ○ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ

"وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے اتارا آسمان سے تمھارے لیے پانی، اس سے پیتے ہو اور اسی سے درخت ہوتے ہیں جس میں تم چراتے ہو، اگاتا ہے تمھارے واسطے اس سے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے میوے، اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں، اور تمھارے کام میں لگادیا رات اور

---

(۱) سورۃ البقرۃ: ۱۶۴

الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ○ وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ○ وَ هُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○ وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ○ وَ عَلٰمٰتٍ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ○ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ»[1].

دن اور سورج اور چاند کو اور ستارے کام میں لگے ہیں اس کے حکم سے، اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں اور جو چیزیں پھیلائیں تمھارے واسطے زمین میں رنگ برنگ کی، اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں، اور وہی ہے جس نے کام میں لگادیا دریا کو کہ کھاؤ اس میں سے گوشت تازہ اور نکالو اس میں سے گہنا جو پہنتے ہو، اور دیکھتا ہے تو کشتیوں کو چلتی ہیں پانی پھاڑ کر اس میں اور اس واسطے کہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ احسان مانو اور رکھ دیئے زمین پر بوجھ کہ کبھی جھک پڑے تم کو لے کر، اور نالے ندیاں اور راستے تاکہ تم راہ پاؤ اور بنائیں علامتیں اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں، بھلا جو پیدا کرے برابر ہے اس کے جو کچھ نہ پیدا کرے؟ کیا تم سوچتے نہیں۔“

اور فرمایا:

«وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ○ وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ○ وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ○ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ

”اور تمھارے واسطے چوپایوں میں مقام غور وفکر ہے، پلاتے ہیں تم کو اس کے پیٹ کی چیزوں میں سے گوبر اور لہو کے بیچ میں سے دودھ ستھرا خوشگوار پینے والوں کے لیے، اور میوؤں سے کھجور کے انگور کے بناتے ہو اس سے نشہ اور روزی خاصی، اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے واسطے جو سمجھتے ہیں، اور حکم دیا تیرے رب نے شہد کی مکھی کو کہ بنائے پہاڑوں میں گھر اور درختوں میں اور جہاں ٹٹیاں تیار باندھتے ہیں، پھر کھا ہر طرح کے میوؤں سے، پھر چل راستوں میں اپنے رب کے صاف پڑے ہیں، نکلتی ہے ان کے پیٹ میں سے پینے کی چیز جس کے مختلف رنگ

(۱) سورۃ النحل: الآیۃ: ۱۰-۱۷

مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾[1].

ہیں، اس میں مرض اچھے ہوتے ہیں، لوگوں کے، اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو دھیان کرتے ہیں۔"

اور فرمایا:

﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ○ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ○ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ○ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ○ فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ﴾[2].

"بھلا کیا نظر نہیں کرتے اونٹوں پر کہ کیسے بنائے ہیں، اور آسمان پر کہ کیسا اس کو بلند کیا ہے اور پہاڑوں پر کہ کیسے کھڑے کر دیئے ہیں، اور زمین پر کہ کیسی صاف بچھائی ہے، سو تو سمجھائے جا تیرا کام تو یہی سمجھانا ہے۔"

یہ کائنات کی کھلی کتاب میں مخلوقات میں غور و فکر کر کے اس کے خالق کو پہچاننے اور اس پر ایمان لانے کی لوگوں کو دعوت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ وہ مثالی طریقہ ہے، جو انسان کو یقینیات کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے، جس سے انکار کی عاقل شخص کو گنجائش نہیں رہتی۔

جب دل اندھے ہو جائیں:

یہاں لوگوں میں ایک فریق وہ بھی ہے جو حِس کے منافذ اور راستے بند کرنے اور انتہائی تاریکیوں میں چلنے کو ترجیح دیتے ہیں، قلب اور غور و فکر کو کام میں لانے سے دور رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾[3]

"کیا سیر نہیں کی ملک کی، جو ان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے، سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں پر اندھے ہو جاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں۔"

---

(۱) سورۃ النحل: الآیۃ: ٦٦-٦٩

(۲) سورۃ الغاشیۃ: الآیۃ: ١٧-٢١

(۳) سورۂ حج: آیت: ۴۶

فرمایا:

«قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ»(۱)

”تو کہہ: دیکھو تو کیا کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں اور کچھ کام نہیں آتیں نشانیاں اور ڈرانے والے ان لوگوں کو جو نہیں مانتے۔“

مزید فرمایا:

«وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ۝ وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ»(۲).

”اور بہتیری نشانیاں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں جن پر گزر ہوتا رہتا ہے ان کا اور وہ ان سے منھ پھیر لیتے ہیں، یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شریک بھی کرتے ہیں۔“

عقل والے/اولوالالباب:

یہ اور دیگر آیات جن کے سامنے مومن کھڑا ہوتا ہے وہیں ایک مغائر موقف ہے اور ایجابی نتیجہ ہوتا ہے جو ایمان میں زیادتی کرتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جسے آیات کریمہ ثابت کرتی ہے:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

« اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ »(۳).

”تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اتارا آسمان سے پانی، پھر چلایا وہ پانی زمین کے چشموں میں، پھر نکالتا ہے اس سے کھیتی کئی کئی رنگ بدلتے اس پر، پھر آئے تیاری پر تو تو دیکھے اس کا رنگ زرد پھر کر ڈالتا ہے اس کو چورا، بے شک اس میں نصیحت ہے عقلمندوں کے واسطے۔“

اور فرمایا:

«اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۝ الَّذِيْنَ

”بے شک آسمان اور زمین کا بنانا، رات دن کا آنا جانا اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے، وہ جو یاد

(۱) سورۂ یونس: آیت: ۱۰۱
(۲) سورۂ یوسف: آیت: ۱۰۵-۱۰۶
(۳) سورۂ زمر: آیت: ۲۱

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ»[1].

کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے اور غور وفکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش میں، کہتے ہیں: اے ہمارے رب! تونے یہ عبث نہیں بنایا، تو پاک ہے سب عیبوں سے، سو ہم کو بچا دوزخ کے عذاب سے۔"

اسی طرح غور وفکر اور تفکیر حق سبحانہ وتعالیٰ کی عظمت کا اعتراف اور اس سے عبث و باطل فعل کی نفی کرنے کا نتیجہ برآمد کرتا ہے۔

اور اسی طرح مومنین کے نفوس میں، غور وفکر کو کام میں لانے کے بعد، حقائق جاگزیں ہو جاتے ہیں، پھر دل جھک جاتے ہیں، اور آنکھیں رو پڑتی ہیں۔

تفکیر اور غور وفکر کی عبادت:

سابق میں یہ اشارہ ہو چکا ہے کہ قرآن کریم میں کائناتی مشاہد کی آیات نے اس کتاب مقدس کے صفحات کا ایک وسیع حصہ لے لیا ہے۔

اور جب ان آیات کریمہ کی تلاوت عبادت ہے تو ان آیات پر عمل کرنا بھی — بطریق اولی — عبادت ہے، جن میں غور وسوچ اور حقیقت فکر کا بیان ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا»[2].

"کیا دھیان نہیں کرتے قرآن میں یا ان کے دلوں پر لگ رہے ہیں قفل۔"

امام مسلمؒ نے ابو وائل سے حدیث بیان کی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

"نہیک بن سنان نامی ایک شخص عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں ایک رکعت میں مفصل تلاوت کرتا ہوں، عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: شعر پڑھنے کی

---

(۱) سورۂ آل عمران: آیت: ۱۹۰-۱۹۱

(۲) سورۂ محمد: آیت: ۲۴

طرح (تیز) پڑھتا ہے؟ کچھ لوگ قرآن پڑھتے ہیں تو وہ ان کی ہنسلیوں سے تجاوز نہیں کرتا ہے، لیکن یہ تو جب دل میں پہنچ کر راسخ ہو جائے تو نفع پہنچادے''۔[1]

تب تو قرآن محض تلاوت کے لیے نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی آیات نفوس میں پہنچ کر عمل کرتی ہیں پھر معاشرہ میں۔

اسی لیے آیات میں اللہ کا یہ قول کثرت سے ہے (لِقَوْمٍ یَعْقِلُوْنَ) ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں، (لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ) ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں، (لِقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ) ان لوگوں کے لیے جو نصیحت پکڑتے ہیں، (لِأُولِی الْاَلْبَابِ) عقلمندوں کے لیے۔

جن چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس میں غور فکر کو عمل میں لانا ہی طاعت وعبادت ہے۔

اور سنت مطہرہ نے رسول اللہ ﷺ کا فعل نقل کیا ہے: اور آپ آسمانوں میں غور وفکر کرتے تھے اور آل عمران کی آیت تلاوت فرماتے تھے۔

بخاری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث کی تخریج کی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

''میں اپنی خالہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے یہاں سو گیا تو آپ ﷺ اپنی اہل کے ساتھ تھوڑی دیر محو گفتگو رہے پھر آرام فرما ہوئے، جب رات کا آخری ثلث ہوا تو بیٹھے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ کر یہ پڑھنے لگے: '' اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ''[2] (بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات ودن کے آنے جانے میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے) پھر آپ نے اٹھ کر وضو کیا اور مسواک کیا پھر گیارہ رکعات نماز پڑھی، پھر حضرت (بلالؓ) نے اذان دی تو دو رکعت نماز پڑھی پھر نکل کر دو رکعت نماز پڑھی''۔[3]

حمید بن عبد الرحمن بن عوف سے مروی ہے کہ میں نے ایک صحابی رسول کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''میں نے (دل ہی دل میں) کہا جبکہ میں آپ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھا: میں ضرور آپ ﷺ پر نماز کی نظر رکھوں گا حتی کہ میں آپ کا طریقہ دیکھ لوں، جب آپ عشاء کی نماز پڑھ چکے تو آپ نے رات کا کچھ حصہ آرام فرمایا، پھر بیدار ہوئے تو افق میں دیکھ کر یہ پڑھا: ''رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً ''

---

(۱) مسلم: رقم: ۸۲۳

(۲) سورۂ آل عمران: آیت: ۱۹۰

(۳) متفق علیہ: رقم: ۴۵۶۹، م: ۷۶۳، واللفظ للبخاری

پڑھتے ہوئے "اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادِ" (۱) تک پہنچے پھر آپ کی نماز کا ذکر کیا۔"

اور اسی طرح یہ دونوں حدیثیں اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ یہ آیات کریمہ، پہلی حدیث میں اس کی تلاوت کرنے والوں کو آسمان میں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں، اور دوسری حدیث میں افق میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

یہ فعل تلاوت کے ساتھ چلتا ہے، اور کیوں نہ ہو! جبکہ قرآن ان آیات میں ہمارے سامنے وہ حالات بیان کرتا ہے کہ ضروری ہے اولوا الالباب اس حالت و کیفیت پر ہوں، جبکہ وہ لوگ اس جیسی آیات کی تلاوت کر رہے ہوں۔

اور چاہیے کہ ہم اس نص قرآنی میں غور و فکر کے ساتھ دیکھیں:

«اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ○ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ○ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ○ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ»(۲).

"بے شک آسمان اور زمین کا بنانا، رات دن کا آنا جانا اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے، وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے اور غور و فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش میں، کہتے ہیں: اے ہمارے رب! تو نے یہ عبث نہیں بنایا، تو پاک ہے سب عیبوں سے، سو ہم کو بچا دوزخ کے عذاب سے، اے ہمارے رب! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا سو اس کو رسوا کر دیا اور نہیں کوئی مددگار گنہگاروں کا، اے رب ہمارے! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا کہ وہ ایمان لانے کے لیے اعلان کر رہے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ، سو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے رب! اب بخش دے ہمارے گناہ، اور دور کر دے ہم سے برائیاں ہماری اور موت دے ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ، اے ہمارے رب! دے ہم کو جو وعدہ کیا تو نے ہم سے رسولوں کے واسطے سے اور رسوا نہ کر ہم کو قیامت کے دن، بیشک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔"

اب کیا یہ بات معقول ہو سکتی ہے کہ صحابہ نے یہ آیات دھیان سے سنیں پھر جو کچھ اس میں حکم

---

(۱) سورۂ آل عمران: آیت: ۱۹۰۔ ۱۹۴

(۲) سورۂ آل عمران: آیت: ۱۹۰-۱۹۴

ہے اس کو روبہ عمل لانے میں جلدی نہ کی ہو؛ حالانکہ یہ وہ مقدس گروہ ہے جنھوں نے علم و عمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا۔

سلف اور عبادت تفکیر:

سلف کی زبانی بہت سے اقوال ایسے وارد ہوئے ہیں جو اس عبادت کے ساتھ ان کے انتہائی اہتمام اور اس کی رعایت پر دلالت کرتے ہیں۔

حسن بصری عامر بن عبد قیس سے نقل کرتے ہیں؛ وہ فرماتے ہیں: میں نے کئی ایک صحابہ سے یہ فرماتے سنا: ایمانی روشنی یا ایمانی نور تفکر اور غور و فکر کرنا ہے۔

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: تفکر کے قصد سے پڑھی گئی معتدل دو رکعت اس شب بیداری سے بہتر ہے جس میں دل غافل ہو۔

شیخ ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں: میں جب اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو میری نگاہ جس چیز پر بھی پڑتی ہے تو میں اس میں بھی اللہ کی طرف سے مجھ پر ہونے والی نعمت اور اپنے لیے اس میں عبرت دیکھتا ہوں۔

اور حسن بصریؒ فرماتے ہیں: ایک ساعت کا غور و فکر ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے۔

سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں: غور و فکر تیرے قلب میں داخل ہونے والا نور ہے۔

اور عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے ہیں: اللہ کے ذکر میں لگے رہنا اچھا ہے اور اللہ کی نعمتوں میں غور و فکر کرنا افضل العبادۃ ہے۔

انھیں کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنے ہم نشینوں کے درمیان ایک دن رونے لگے، ان سے وجہ پوچھی گئی تو فرمایا: میں نے دنیا، اس کی لذتوں اور شہوتوں میں غور و فکر کیا تو اسی سے میں نے عبرت حاصل کی، اس کی شہوتیں برابر ختم ہوتی جاتی ہیں، حتی کہ اس کی تلخی ان شہوات کو مکدر کر دیتی ہے، اور اگر اس میں عبرت پکڑنے والوں کے لیے کوئی عبرت نہ ہو تو اس میں نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے نصیحت کا سامان موجود ہے (۱)

محمد بن واسعؒ سے مروی ہے کہ ایک بصری شخص حضرت ابو ذرؓ کی وفات کے بعد سفر کر کے ام ذر کی خدمت میں پہنچا اور حضرت ابو ذرؓ کی عبادت کا حال ان سے پوچھا؛ انھوں نے جواب دیا: وہ پورا

---

(۱) یہ خبر اور اس کا ماقبل تفسیر ابن کثیر میں (آل عمران آیت: ۱۹۰) اور اس کے بعد کی آیات کے ضمن میں مذکور ہے۔

دن گھر کے کونے میں تفکر میں مشغول رہتے تھے۔

اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

جس کے کلام میں حکمت نہ ہو وہ لغو ہے، اور جس کے سکوت میں تفکر نہ ہو وہ لغو ہے اور جس کی نظروں میں عبرت نہ ہو وہ لہو ہے۔ (۱)

تفکر و خشیت:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا وَ مِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيۡضٌ وَّ حُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَ غَرَابِيۡبُ سُوۡدٌ ○ وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ غَفُوۡرٌ »(۲).

”کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اتار آسمان سے پانی پھر ہم نے نکالے اس سے میوے، طرح طرح کے ان کے رنگ، اور پہاڑوں میں گھاٹیاں ہیں سفید اور سرخ طرح طرح کے ان کے رنگ، اور بھجنگے کالے، اور آدمیوں میں اور کپڑوں میں اور چوپایوں میں کتنے رنگ ہیں، اسی طرح اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جن کو سمجھ ہے، تحقیق کہ اللہ زبردست ہے بخشنے والا۔“

ان دونوں آیتوں سے واضح ہے کہ پھلوں میں مختلف رنگوں کی رؤیت، پہاڑوں اور زمینوں میں نوع بنوع رنگوں کا نظارہ، لوگوں میں قسم قسم کے رنگوں کا دکھائی دینا، اور چوپایوں اور کپڑوں میں قسم قسم کے رنگوں کا نظر آنا، عالم نبات، عالم جماد اور عالم احیاء کو شامل اس رؤیت میں یہ بات واضح ہے کہ یہ رؤیت صانع کی وحدت، قدرت اور عظمت میں غور و فکر کا پابند کرتی ہے، جس سے بصیرت افروز قلوب ڈر جاتے ہیں، جو دل فقط چیزوں کے ظاہر پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اس کی تہہ اور حقائق تک پہنچتے ہیں اور تنوع سے وحدت کی طرف منتقل ہوتے ہیں، یہ ہر انواع و اقسام کے رنگ دینے پر قادر ہے۔

یہ عمل رؤیت سے شروع ہوتا ہے پھر مقارنت، نتیجہ و استنباط کی وجہ سے فکر کی طرف منتقل

---

(۱) یہ خبر اور اس کا ماقبل احیاء علوم الدین مہذب: ۴۲۹/۲ میں مذکور ہے۔

(۲) سورۂ فاطر: آیت: ۲۷-۲۸

ہوتا ہے، پھر رؤیت، غور وفکر اور نتیجہ نکالنے کے بعد مبدع اور مخلوقات کے درمیان اس کی معرفت تک پہنچتا ہے، یہی وہ عمل ہے جس پر قرآن کریم نے "علم" کا اطلاق کیا ہے۔

اور جب سابقہ دونوں آیتیں ہمیں لے کر زمین کے طول وعرض، اس پر موجود حیوانات، انسان اور نباتات نیز اس کی چٹانیں اور پہاڑوں کے درمیان گھومتی ہیں تو دوسری آیت ایک ہی میدان میں نظر وفکر کی تحدید کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَفِيۡٓ اَنۡفُسِكُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ﴾(۱). "اور خود تمھارے اندر کیا تم کو سوجھتا نہیں۔"

اور نفوس میں دقتِ نظر کے بعد یہ روشن ہوتا ہے کہ انسان، یہ مخلوق ایک عالم قائم بالذات ہے، اس میں حیات کا عالم بھی ہے، اور وہ مختلف اعمال جن کو جسم اور اعضاء انجام دیتے ہیں، یہ اس نظر کی محتاج ہے جو اس نظر سے کم حیثیت نہ ہو، جو پوری روئے زمین کا احاطہ کئے ہوتی ہے اور یہ نفس مکمل طور پر مجہول ہی رہے گا، جیسا کہ علماء اطباء نے کہا۔(۲)

اور یہاں اور وہاں دلوں میں خشوع آجاتا ہے جب اس کے سامنے علم کے آفاق کھل جاتے ہیں۔

اور توجہ ہٹانے کے اخیر میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" ان دونوں آیات کے اخیر میں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ علم قیود سے خالی ہو، پس مخلوقات میں غور وفکر علم ہے اور علم علم اسی وقت ہوگا جبکہ خشیت اس کے ثمرات میں سے ہو۔

تفکیر اور حیات:

اور جب اسلام نے اللہ کی مخلوقات میں غور وفکر کرنے کو عبادت قرار دیا ہے تو مراد یہ نہیں کہ یہ قضیہ ایمانی پر منحصر ہے اور یہ کہ اس کا فائدہ اسے صرف آخرت ہی میں پہنچے گا، چونکہ دنیا اسلامی منہج

(۱) سورۂ ذاریات: آیت: ۲۱

(۲) مثال کے طور پر دیکھئے الکسیس کاریل کی کتاب "الانسان ذلک المجہول"۔

ونقطۂ نظر کے لحاظ سے آخرت سے جدا نہیں ہے۔

اس لیے نظر و تفکیر کا دنیوی زندگی کی بناء و تعمیر اور اللہ کی طرف سے ہمارے لیے مسخر کردہ چیزوں سے استفادہ میں اثر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ »(۱).

’’کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے کام میں لگائیں جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں اور پوری کردی تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی، اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں، نہ سمجھ رکھیں نہ سوجھ نہ روشن کتاب۔‘‘

اور جب مسلمانوں نے قرآنی ہدایت پر عمل کیا تو ان کے لیے زمین میں قیادت کا دور رہا، اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مسخر کردہ اشیاء سے پوری انسانیت کی فلاح وصلاح کے لیے فائدہ اٹھایا۔

اور جب ہم اپنی زندگی میں اس پہلو سے غافل ہوتے ہیں تو ہم اپنے دین کے بعض اوامر واحکام کو ترک کردیتے ہیں۔

شیخ محمد غزالیؒ فرماتے ہیں:

کائنات کی چیزوں پر توجہ دیئے بغیر راہِ حیات پر چلنے کا کیا معنیٰ؟

اسی حیات کے خالق نے فرمایا:

کہ زمان ومکان کی راہ داریوں، زندگی اور زندوں کے سفر میں میرے اسمائے حسنیٰ اور میری صفاتِ علیا کو پہچانو، اگر تم مہد سے لحد تک زمین وآسمان میں پھیلی ہوئی میری نشانیوں پر اندھے رہ کر گزروگے تو تم کبھی میری عظمت ورفعت کو نہ پہچان سکوگے، اور نہ افراد وامم میں میرے فیصلوں کو!

اس نے آفتاب وماہتاب، شب وروز، فجر وشفق اور والد وولد کی قسم کھائی، بلکہ وہ تو ان کی بھی قسم کھاتا ہے جو ہم دیکھتے ہیں اور ان کی بھی جو ہم نہیں دیکھتے؛ کیونکہ سطح کا دیکھ لینا تہہ کی رؤیت سے بے نیاز نہیں کرسکتا۔

اس نے آندھیوں کی قسم کھائی اور نسیم سحر کی بھی، مجاہدین کے گھوڑوں کی جن کے ٹاپوں سے

---

(۱) سورۂ لقمان: آیت: ۲۰

شعلے اڑتے ہیں، جبکہ وہ حق و باطل کے ازلی معرکے میں ہوتے ہیں، ان تمام کی قسم کھائی کہ ہم اس کو پہچانیں، اسی فضاء میں زندگی گزاریں اور اس کی عبرتوں سے فائدہ اٹھائیں۔

پس وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں عارف باللہ ہوں جو حیات، اس کے اسرار، اس کی قوتوں اور اس کے قوانین سے جاہل ہو۔

جس وقت منکرین بعث آپس میں سوال کررہے تھے: نشور کیسے واقع ہوگا؟ تو قرآن کریم اس طرز پر جواب لے آیا:

«اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ○ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ »(۱).

"کیا دیکھتے نہیں، کیونکر شروع کرتا ہے اللہ پیدائش کو پھر اس کو دہرائے گا، یہ اللہ پر آسان ہے، تو کہہ: ملک میں پھرو، پھر کر دیکھو کیونکر شروع کیا ہے پیدائش کو؛ پھر اللہ اٹھائے گا پچھلا اٹھان، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

زمین میں سیر کرنا زندگی کے مطالعے کے لیے ہے، جو کہ اللہ پر ایمان لانے اور اس کی ملاقات پر ایمان لانے کا طریق ہے، اور زندگی کی موجوں میں تیرنا، اس کی لہروں اور اس کے اتار چڑھاؤ، اور اس کے کناروں کی بابت جاننا اور غرق و نجات کے اسباب کا جاننا ضروری ہے۔

بے وقوفی اور بے عقلی ایمان نہیں اور نہ جہالت صلاح و نیکی ہے، بلکہ زندگی سے باخبر ہونا اور اس کے مالہٗ وما علیہ پر قابو پانا اور اس کو اپنے رب کی خدمت کے تابع کرنا اور پابند بنانا ہی ایمان اور عمل صالح ہے (۲)

اور جس طرح زکوۃ عبادت ہونے کے باوجود اسلام کے اقتصادی نظام میں ایک بنیادی جزء بھی ہے، ٹھیک اسی طرح تفکیر، غور و فکرِ کائنات بھی عبادت ہے، اور وہ ایمان وحیات کی بناء و تعمیر اور وسیلہ بھی ہے۔

---

(۱) سورۂ عنکبوت: آیت: ۱۹-۲۰

(۲) "الحق مر" مصنفہ محمد غزالی، "الطب الحازمة للحق" عنوان کے ماتحت، اشاعت اول: ۱۹۹، ناشر: الشركة السعودية لأبحاث والنشر۔

دوسری فصل

جہاد

جہاد عبادت ہے:

علماء مسلمین کی ایک بڑی جماعت جہاد فی سبیل اللہ کو ارکان اسلام میں چھٹا رکن شمار کرتی ہے۔

قرآن کریم ایسی آیات سے بھرا ہوا ہے جو جہاد کا حکم دیتی ہیں اور اس پر ابھارتی ہیں۔

معاذ بن جبلؓ کی اس حدیث میں ہے جو ارکانِ اسلام کی بابت بتاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کیا میں تمھیں معاملے کی اصل (رأس) اس کے ستون اور اس کے کوہان کی چوٹی کے بارے میں نہ بتاؤں؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیوں نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: رأس الامر اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے اور کے کوہان کا بالائی حصہ جہاد ہے''۔(۱)

اور قتال جہاد فی سبیل اللہ اسی وقت شمار ہوگا جبکہ وہ اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے اس لیے قتال کیا تاکہ اللہ کا کلمہ ہی سربلند ہو تو وہ اللہ کی راہ میں ہے''۔(۲)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جہاد:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جہاد مکے اور مدینے میں زندگی بھر چلتا رہا، اور مطالعہ کرنے والے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

مکے میں کفار کا مقابلہ کیا اور مدینے میں کفار و منافقین سے جہاد کیا، غزوات بھی کیے اور سرایا بھی بھیجے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال بھی اس حال میں ہوا کہ حضرت اسامہؓ کا لشکر مدینہ چھوڑنے کے قریب ہی تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا جھنڈا اپنے ہاتھ سے باندھا تھا۔

---

(۱) ترمذی: رقم: ۲۶۱۶، ابن ماجہ: رقم: ۳۹۷۳

(۲) متفق علیہ: رقم: ۳۱۲۶، م: ۱۹۰۴

جہاد چلتا ہی رہے گا:

اور جہاد چلتا ہی رہے گا، یہاں تک کہ اللہ کی زمین اور اس میں جو کچھ ہے اس کا وارث ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ»(۱).

”اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جائے حکم سب اللہ کا۔“

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

”میری امت میں سے ایک گروہ برابر قتال کرتا رہے گا حق پر غالب رہے گا قیامت تک“۔(۲)

سلمہ بن نفیل کندی سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

”میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، تو ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! لوگوں نے گھوڑے چھوڑ دیئے اور ہتھیار رکھ دیئے اور کہتے ہیں: اب جہاد نہیں ہے، جنگ نے اپنے ہتھیار و آلات رکھ دیئے، تو آپ ﷺ پورے طور متوجہ ہوئے اور فرمایا: انھوں نے جھوٹ کہا، اب! اب تو قتال آچکا اور میری امت میں سے ایک گروہ برابر حق پر قتال کرتا رہے گا“۔(۳)

حضرت انسؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

”اور جہاد چلتا رہے گا میری بعثت سے لے کر میری امت کے آخر گروہ کے دجال کے ساتھ قتل کرنے تک“۔(۴)

اور جہاد کے لیے توقف کیسے ممکن ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اعداء اسلام کے مسلمانوں کے بارے میں موقف کے متعلق فرماتے ہیں:

---

(۱) سورۃ الانفال: آیت: ۳۹

(۲) مسلم: رقم: ۱۹۲۳

(۳) نسائی: رقم: ۳۵۶۳

(۴) ابوداؤد: رقم: ۲۵۳۲

﴿ وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ﴾[1].

"اور کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمھارے دین سے اگر قابو پاویں۔"

نیز فرمایا:

﴿وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ﴾[2].

"اور ہر گز راضی نہ ہوں گے تجھ سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تو تابع نہ ہو ان کے دین کا۔"

جہاد کے لیے تیاری:

بہت سی آیات ہیں جو جہاد پر ابھارتی ہیں، اور اسی طرح احادیث شریفہ بھی۔

اور نبی اکرم ﷺ نے اسباب اختیار کرنے اور پورے طور تیاری کرنے کی دعوت دی اور یہاں تیاری کرنے کی تین صورتیں ہیں: اعداد نفسی، جسمانی تیاری اور مادی تیاری اور ہم ان میں سے ہر ایک قسم پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

ا: ـــ نفسیاتی اعتبار سے تیاری کرنا:

ہر ایک مسلمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ جہاد کے اعمال اور میدان جنگ کی سرگرمیوں میں شرکت کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے اور اس سے کسی کو معافی نہیں، مگر جن اصحاب آفات یا اصحاب امراض کا آیات کریمہ نے ذکر کیا ہے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جو اس حال میں موت پائے کہ نہ اس نے جنگ کی اور نہ جنگ کا خیال اس کے دل میں آیا تو وہ نفاق کے ایک حصہ کے ساتھ مرا"۔[3]

اور جو مسلمان جہاد کی آیات کی تلاوت کرے اور اس کی فضیلت میں وارد احادیث سے واقف ہو جائے اور جو اپنے اندر نفاق کا ایک حصہ ہونے کی حالت میں مرنے سے خوف کرے تو اس کے لیے

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت: ۲۱۷

(۲) سورۃ البقرۃ: آیت: ۱۲۰

(۳) مسلم: رقم: ۱۹۱۰

جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی طرف سے شرکت کرنے میں سبقت اور جلدی کرنا ضروری ہے۔
اس طرح اسلام نفسیاتی فضا فراہم کرتا ہے، مسلمان کو چاہیے کہ حکومت کی طرف سے کسی اجبار وزبردستی کے بغیر صرف جذبۂ ایمانی سے اپنے جان ومال کی قربانی کے لیے آگے بڑھے۔

۲: —جسمانی اعتبار سے تیاری کرنا:

اور جسمانی تیاری کے لیے رسول اللہ ﷺ نے تمام انواع ریاضت کی مشق کرنے پر ابھارا ہے تاکہ وہ میدان جنگ میں قادر وفعال ہو۔
اور اسی وجہ سے آپ ﷺ کی توجہ گھڑسواری وغیرہ کے مقابلوں اور آپس میں دوڑ کے مقابلوں کے منعقد کرانے اور آپ کے ان میں حاضر ہونے اور شرکت کرنے پر تھی۔
اور اسی قبیل سے آپ کا تیر اندازی پر اُبھارنا اور اس پر گرفت باقی رکھنے پر اُبھارنا تھا، جیسے فرمایا:
''جس نے تیر اندازی سیکھی پھر اس کو چھوڑ دیا وہ ہم میں سے نہیں یا اس نے معصیت کا ارتکاب کیا''۔[۱]
نیز ایک دن آپ ﷺ نے منبر پر ارشاد فرمایا:
''تم ان کے مقابلے میں اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تیاری کرو، قوت بہم پہنچاؤ، اور سن لو قوت تیر اندازی ہے، سن لو قوت تیر اندازی ہے، سن لو قوت تیر اندازی ہے''۔[۲]
اور آپ کی حدیث میں ہے:
''تم میں سے کوئی اپنے تیر کا کھیل یعنی نشانہ کی مشق کو نہ چھوڑے''۔[۳]
اور اس طرح نبی ﷺ نے لہو وعبث کو ایک ذی مقصد مستقل عمل کی طرف پھیرنے کی طرف توجہ دلائی؛ کیونکہ عبث کے لیے اس دین میں کوئی جگہ نہیں ہے اور وقت تو بہت قیمتی ہے؛ چہ جائے کہ اس کو بے مقصد کام میں ضائع کیا جائے۔
بلکہ گھڑسواری کی ریاضت اور اس کے مسابقات —اور یہ ان افعال میں سے ہے جن پر نبی ﷺ نے ابھارا ہے— جس وقت وہ اس نیت کے بغیر ہوں گے جو اسلام چاہتا ہے تو اس میں کوئی

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۹۱۹
(۲) مسلم: رقم: ۱۹۱۷
(۳) مسلم: رقم: ۱۹۱۸

فائدہ نہیں ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

”گھوڑے تین قسم کے ہیں؛ ایک شخص کے لیے اجر ہے، ایک کے لیے ستر ہے اور ایک کے لیے بوجھ ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اور جس نے اہل اسلام سے فخر کرنے اور ریاء کے طور پر گھوڑا پالا تو یہ اس پر بوجھ ہے“۔ (۱)

ان معانی کی روشنی میں مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی جسمانی بناء کے لیے محنت اور اس پر توجہ کی کوشش کرے، اللہ کے فرض کردہ احکام کو بجالانے کے لیے اور نبی ﷺ کے فعل کی اقتداء کرنے کے لیے۔

۳: —مادی تیاری:

محض قوی جسم اور عالی روح جنگی سرگرمیوں میں ناکافی ہے، کیونکہ اس میں ہتھیاروں کی تیاری بھی ضروری ہے۔

اور اس باب میں صریح آیت کریمہ وارد ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ﴾ (۲).

”اور ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعے تم رعب جمائے رکھو، تمھارے اور اللہ کے دشمنوں پر۔“

اور نبی ﷺ نے ہتھیار بنانے اور اس کی تیاری کی طرف توجہ دینے پر ابھارا ہے۔

عقبہ بن عامر فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

”اللہ تعالیٰ ایک ہی تیر کی وجہ سے تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائیں گے؛ اس کو بنانے والا جو اس کے بنانے میں خیر کا قصد رکھتا ہو، اس کو چلانے والا اور تیر اٹھا کر دینے والا“۔ (۳)

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۲۳۷۱، م: ۹۸۷

(۲) سورۃ الانفال: آیت: ۶۰

(۳) ابوداؤد: رقم: ۱۵۱۳

تیسری فصل

ذکر ودعاء کے بیان میں

کتاب اللہ کی تلاوت کے بعد زبان سے ادا کی جانے والی کوئی عبادت ذکر اللہ اور خالص دعاؤں سے اس کی جانب حاجات کو اٹھانے سے افضل نہیں۔ (۱)

ذکر کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ» (۲).

"خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا» (3).

"اے ایمان والو! تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہو۔"

اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں:

"نبی ﷺ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے"۔ (۴)

اور حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے روایت ہے:

"ایک شخص نے آکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! شرائع اسلام تو مجھ پر بہت زیادہ ہیں، آپ مجھے کوئی ایسی چیز بتادیں جسے میں اچھی طرح تھامے رہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو برابر ذکر اللہ میں

---

(۱) المهذب من احياء علوم الدين: ۲۵۰/۱

(۲) سورۃ الرعد: آیت: ۲۸

(۳) سورۃ الاحزاب: آیت: ۴۱-۴۲

(۴) مسلم: ۳۷۳

رطب اللسان رہ"۔ (۱)

اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی دائم الذکر تھے اور اس کا حکم دیتے تھے۔

حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان ہے:

"مفردون سبقت لے گئے، صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول مفردون کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے اور ذکر کرنے والیاں"۔ (۲)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

"کوئی بھی قوم اللہ کے ذکر میں مشغول نہیں ہوتی مگر فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور رحمت ان پر چھا جاتی ہے اور ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور اللہ ان کا ذکر ان لوگوں میں کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں"۔ (۳)

اور ذکر کی دو قسمیں ہیں: مطلق اور مقید۔

اس میں بعض وقت کے ساتھ مقید ہے: ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جس نے ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ اللہ کی تسبیح بیان کی، (سبحان اللہ) ۳۳ مرتبہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی (الحمد للہ) اور ۳۳ مرتبہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم و تکبیر کی (اللہ اکبر) تو یہ ۹۹ ہوئے اور ۱۰۰ ویں مرتبہ "لا اله الا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد وهو على كل شئ قدير" پڑھا تو اس کی خطائیں بخش دی جائیں گی، اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں"۔ (۴)

اور آپ ﷺ نے حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

"جب تم اپنی خواب گاہوں میں پہنچو تو ۳۴ مرتبہ اللہ کی تکبیر، ۳۳ مرتبہ اللہ کی حمد اور ۳۳ مرتبہ اللہ کی تسبیح بیان کرو"۔ (۵)

---

(۱) ترمذی: رقم: ۳۳۷۵، وابن ماجہ: ۳۷۹۳

(۲) مسلم: رقم: ۲۶۷۶

(۳) مسلم: رقم: ۲۸۰۰

(۴) مسلم: رقم: ۵۹۷

(۵) متفق علیہ: رقم: ۳۱۱۳، م: ۲۷۲۷

اور ان میں سے بعض دن کے ساتھ مقید ہے:

ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس نے ''لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریك له. له الملك وله الحمد وهو علی کل شیٔ قدیر'' ایک دن میں ۱۰۰ مرتبہ پڑھا تو یہ اس کے لیے دس غلام آزاد کرنے کے ثواب کے برابر ہو گا اور اس کے لیے ۱۰۰ نیکیاں لکھی جائیں گی، اور اسکی ۱۰۰ برائیاں مٹادی جائیں گی، اور یہ اس کے لیے اس دن شیطان کے شر سے ذریعۂ حفاظت بنے گا، حتی کہ شام ہو جائے اور کوئی بھی اس سے افضل عمل لے کر نہ آئے گا جو وہ لے کر آیا، مگر وہ شخص جس نے یہ عمل زیادہ کیا''۔(۱)

اور انھیں سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس نے ایک دن میں ۱۰۰ مرتبہ ''سبحان اللہ وبحمدہ'' پڑھا تو اس کی خطائیں مٹادی جائیں گی، اگرچہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں''۔(۲)

اور ان میں سے کچھ روایات مطلق ذکر میں وارد ہوئی ہیں:

آپ ﷺ نے فرمایا:

''سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا الٰہ الا اللہ، واللہ اکبر'' پڑھنا مجھے ان سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے''۔(۳)

اور آپ ﷺ ہی نے فرمایا:

''دو کلمے رحمن کو خوب محبوب ہیں، زبان پر خوب ہلکے ہیں اور ترازو میں بہت وزنی ہیں، سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم''۔(۴)

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۲۹۳، م: ۲۶۹۱

(۲) متفق علیہ: رقم: ۶۴۰۵، م: ۲۶۹۱

(۳) مسلم: رقم: ۲۶۹۵

(۴) متفق علیہ: رقم: ۷۵۶۳، م: ۲۶۹۴

دعاء کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي﴾[۱].

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں منظور کرلیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والے کی جب وہ میرے حضور میں درخواست دیں۔''

نیز فرمایا:

﴿أُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾[۲].

''تم لوگ اپنے پرودگار سے دعا کیا کرو تذلل ظاہر کرکے اور چپکے چپکے ، واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں جو حد سے نکل جاتے ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دٰخِرِينَ﴾[۳].

'' اور تمہارے پروردگار نے فرمایا کہ مجھ کو پکارو، میں تمھاری درخواست قبول کرلوں گا، بیشک جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''دعاء بھی عبادت ہے، تمھارے رب نے فرمایا: تم مجھے پکارو میں تمھاری دعا قبول کروں گا''۔[۴]

آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعاء سے زیادہ نفیس وعمدہ کوئی چیز نہیں ہے''۔[۵]

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت: ۱۸۶

(۲) سورۃ الاعراف: آیت: ۵۵

(۳) سورۂ غافر: آیت: ۶۰

(۴) ابوداؤد: رقم: ۱۴۷۹، م: ۲۹۶۹، وابن ماجہ: رقم: ۳۸۲۸

(۵) ترمذی: رقم: ۳۳۷۰، وابن ماجہ: رقم: ۳۸۲۹

یقیناً دعاء عبادت ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور اسی سے بندے کی عبدیت خالص اللہ تعالیٰ ہی کے لیے متمثل و متشکل ہوتی ہے، اس لیے کہ وہ پیش آمدہ مہمات یعنی منفعت کوشی اور دفع مضرت میں اسی کی پناہ لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سبحانہ وحدہ ہی اس پر قادر ہے۔

اور تیسری آیت کریمہ میں اللہ نے اپنی عبادت سے —اور عبادت سے مراد یہاں دعاء ہے— تکبر کی وجہ سے منھ موڑنے والوں کی سزا دخول جہنم قرار دی ہے۔

تبھی تو دعاء ان اہم امور میں سے ہے جس میں انسان کی اللہ کے سامنے عبدیت کا اظہار ہوتا ہے اور اسی لیے تو وہ عبادت ہے۔

اور آپ ﷺ بہت زیادہ دعاء کرتے تھے، آپ کی عادت وسنت تھی، اذان اور نماز کے بعد، خطبوں میں، نماز میں، روزوں کے بعد اور مناسک حج میں دعاء کرنا۔

اور انسان ایک دن بھی دعاء ترک نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کا محتاج ہے۔

بلکہ قرآن کریم کی بہت سی آیات دعاؤں ہی سے عبارت ہیں۔

یقیناً دعا— قطعِ نظر اس کے عبادت ہونے سے —وہ انسان کی ایک نفسیاتی ضرورت ہے، اس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی کے معانی قوت، رحمت، رزق کو محسوس کرتا ہے، پس مظلوم شخص دعا کرتا ہے تو کہتا ہے: یا اللہ، یا قوی۔

اور جو تنگی اور پریشانی میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا طالب ہو وہ کہتا ہے: یارحیم۔ اور جس پر زندگی (گزارا) تنگ ہو وہ کہے: یارزاق، یاکریم!

اور اسی طرح مومن امن محسوس کرتا ہے جبکہ وہ اپنی تمام حاجات میں اللہ تعالیٰ کی پناہ لے، اور یہی بندگی اور عبودیت ہے اور دعاء تو عبادت ہے ہی۔

دعاء میں کن امور کی رعایت کرنا ضروری ہے؟

بہت سی احادیث ایسی وارد ہیں جو دعاء میں قابل رعایت امور کی وضاحت کرتی ہیں اور انھیں میں سے:

ا: — پختگی سے دعاء مانگنا: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جب تم میں سے کوئی شخص دعاء مانگے تو پختگی سے دعاء مانگے، یہ نہ کہے کہ الٰہی اگر تو چاہے تو مجھے عطا کردے، کیونکہ خدا تعالیٰ کسی چیز سے مجبور نہیں“۔(۱)

۲: —حلال کھانا: ابوہریرہؓ کی نبی ﷺ سے بیان کردہ حدیث میں ہے:

”... پھر آپ نے ایسے شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر کرے جس کے بال بکھرے ہوئے غبار آلود ہوں، وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے کہتا ہے: یارب یارب! حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام ہے اور حرام ہی سے پرورش پاتا ہے تو کہاں سے اس کی دعاء قبول ہوگی“۔(۲)

۳: —قبولیت میں جلد بازی نہ ہو: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تم میں سے ہر ایک کی دعاء قبول ہوتی ہے جب تک عجلت نہ کرے، انسان کہتا ہے: کہ میں نے دعاء کی تو میری دعاء قبول نہ ہوئی“۔(۳)

۴: -دعاء میں اصرار: ابن مسعودؓ نے فرمایا:

”رسول اللہ ﷺ جب دعاء کرتے تھے تو تین تین مرتبہ کرتے تھے، اور جب سوال کرتے تو تین تین مرتبہ مانگتے تھے“۔(۴)

۵: -پُر مغز دعاء: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتی ہیں:

”رسول اللہ ﷺ جامع اور پُر مغز دعاء کرتے تھے اور اس کے ماسوا کو چھوڑ دیتے تھے“۔(۵)

اپنی اور اپنی اولاد کے لیے بد دعاء نہ کرے:

رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے بد دعا کرنے سے منع کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) بخاری: رقم: ۶۳۳۸، مسلم: ۲۶۷۸

(۲) مسلم: رقم: ۱۰۱۵

(۳) متفق علیہ: رقم: ۶۳۴۰، م: ۲۷۳۵

(۴) مسلم: رقم: ۱۷۹۴

(۵) ابوداؤد: رقم: ۱۴۸۲

"تم اپنے خلاف دعاء نہ کرو اور اپنی اولاد کے لیے بد دعاء نہ کرو، اور نہ تم اپنے اموال کے بارے میں بد دعاء کرو، کہ کہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی گھڑی میں موافقت نہ ہو جائے جس میں تم کسی چیز کا سوال کرو اور وہ تمھارے لیے قبول کرلے"۔(۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں؛ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"تین دعاؤں کے مستجاب ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، والد کی دعاء، مسافر کی دعاء اور مظلوم کی دعاء"۔(۲)

فائدہ: اللہ سے دعاء کرنی چاہئے کہ مندرجہ بالا حضرات کی بد دعاء سے اللہ مامون و محفوظ رکھے۔ آمین

---

(۱) مسلم: رقم: ۳۰۰۹

(۲) ابوداؤد: رقم: ۱۵۳۶، والترمذی: ۱۹۰۵، وابن ماجہ: ۳۸۶۲

نواں مقصد

جو معاشرہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم فرمایا

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے اسلامی معاشرے کی بنیاد ڈالی کہ جس میں علاقائی، قومی، قبائلی وغیرہ تعلقات کی جگہ عقائد کا تعلق قائم ہو گیا اور مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہو گئے؛ قطع نظر رنگ اور جنس سے۔

حضرت بلال، ابو بکر، سلمان، عمر، صہیب وغیرہم صحابہ رضی اللہ عنہم اسی دینی سایہ تلے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

لہذا مسلمانوں کے شہروں اور آبادیوں میں کتنی ہی دوری ہو اور ان کے ملکوں میں کتنے ہی فاصلے ہوں پھر بھی وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اور خاندان اس معاشرے کے بنانے میں بنیادی پتھر ہوتا ہے، لہذا ہم ابتداءً اسی کے متعلق گفتگو کرتے ہیں، اور پھر ہم ان دوسرے گوشوں کو بھی اجاگر کریں گے جس میں معاشرہ کی شکل اس کی اخلاقی تعمیر کے ذریعہ مکمل ہوتی ہے۔

پہلی فصل

کنبہ قبیلہ

اسلام نے کنبہ کو اخلاقی بنیاد پر قائم کیا ہے، اس کے افراد کے آپسی روابط مادیت سے بہت بلند ہوتے ہیں، اور ہم کنبے میں درج ذیل تعلقات وروابط میں تمیز کر سکتے ہیں:

- زوجین کے باہمی تعلقات۔
- ان دونوں کا اولاد کے ساتھ علاقہ ورابطہ۔
- خاندان کا ذی رحم رشتہ داروں کے ساتھ علاقہ ورابطہ۔
- یتیم کا درجہ

عورت اور بیوی نیز مرد اور شوہر کی شخصیت پر تھوڑی روشنی ڈالنے کے بعد ہم ان تمام رشتوں کو مستقل عنوان کے ساتھ ذکر کریں گے۔

عورت:

امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"بخدا! زمانۂ جاہلیت میں ہم عورت کو کسی خاطر وشمار ہی میں نہ لاتے تھے، یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے ان کے بارے میں قرآن نازل فرمایا اور ان کو اپنے حقوق عطا کئے"۔ (۱)

اسلام آیا اور عورت نے اسی کے سایہ میں اپنی انسانیت کو واپس لیا، پس اُس سے بھی ایمان وعبادات کا مطالبہ کیا گیا۔ جیسا مرد سے کیا گیا، اور اس نے ہر میدان (عمل) میں اپنی جگہ بنالی، اس نے دین کے خاطر ہجرت بھی کی اور اللہ کی راہ میں جہاد بھی کیا۔ اور اللہ نے اس کے لیے میراث میں حصہ مقرر کیا، اور اس کی مالی حیثیت مستقل ہو گئی اور اسی طرح اس نے مرد کے مانند حیات اور زندگی پائی؛

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۹۱۳، م: ۱۴۷۹

اس فرمان باری تعالیٰ کی روشنی میں: «وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ»(1).

اس تمام اعزاز و تکریم کے باوجود بہت سے مسلمان—اوران بہت سوں میں دانشور ثقافت پسند، تعلیم یافتہ اور اسلام کے دامن کو تھامنے والے بلکہ بہت سے داعیان اسلام بھی ہیں جو عورتوں کے سلسلے میں جاہلیت کی بعض رسم ورواج کی روشنی میں جی رہے ہیں۔

بلکہ بعض لوگ اپنی اس روش کو جائز قرار دیتے ہیں، جمعہ میں واعظین وخطباء سے سنی ہوئی بعض نصوص کے غلط مفہوم و معنی سمجھنے کی وجہ سے، ان میں سے بہت سے واعظین صرف اخبار ومجلات پڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور علم وفقہ سے کورے ہوتے ہیں، امت کو اس صنف کے واعظین سے پہنچنے والی مصیبت اعداء اسلام سے پہنچنے والی مصیبت کی بہ نسبت بڑی خطرناک ہوتی ہے، اور اس قسم کے مفہوم کی بعض مثالیں اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔

لگے ہاتھ ہم ''طاعت'' کا مفہوم بھی ذکر کرتے ہیں، کیونکہ مردوں کی طرف سے اس کا استعمال تسلط اور تعنت کے طور پر بہت پایا جاتا ہے، حتی کہ بعض شوہر یہ سمجھتے ہیں کہ شوہر کو اپنی بیوی کو اس کے رشتہ داروں کی زیارت اور صلہ رحمی سے روکنے کا حق ہے، وہ یہ بھول بیٹھا کہ شریعت مطہرہ نے طاعت کی حد بندی کی ہے اور اسے بے قید و مطلق نہیں چھوڑا ہے۔

اور فہم خطا وار یا مسلک میں انحراف کی روشنی میں، عورت کی حیثیت و مرتبے کی ایک غلط صورت تیار ہو گئی، قریب تھا کہ یہ صورت اس کو اس حالت تک پہنچادے، جو صورت حال (اس کے لیے) زمانۂ جاہلیت میں تھی۔

اور مسلمانوں کے بہت سے شہروں میں—اور اسلام آنے کے ۱۴ صدیوں بعد بھی—عورت اپنی میراث سے محروم ہو رہی ہے، کبھی تو تقلید پر عمل کی وجہ سے اور کبھی تو ظلم واکراہ کا شکار ہونے کے نتیجہ میں۔

اور جس وقت عورت اپنی وضع صحیح میں نہ رہے گی تو یہ چیز کنبوں کے وجود پر اثر انداز ہو گی اور بچے ایسی بری اور خراب فضا میں پلیں اور بڑھیں گے، تو یہ ان کے منحرف ہونے میں بھی موثر ہو گی۔

اور ما قبل میں بیان کردہ تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے:

---

(1) سورہ اسراء: آیت: ۷۰

کیامرداورعورت کے درمیان کاقضیہ قضیۂ معرکہ ہے؟اورعورت مرد کے لیے آخرہے کیا؟

کیایہی عورت بہن اوربیٹی نہیں ہے؟

کیایہی وہ ماں نہیں ہے جس کے پیروں تلے جنت قراردی گئی؟

کیایہی عورت وہ بیوی نہیں ہے جس کے بارے میں فرمان رسول ﷺ ہے: تم میں بہترین شخص وہ ہے جواپنی اہل کے لیے بہترہو۔

تب مشکل کہاں؟

ممکن ہے کہ یہ مشکل اس وجہ سے ہوکہ مسلمان مرد صدیوں سے اپنی انسانیت کھوچکاہے، تو یہ صورتِ حال عورت کے معاملہ میں خودبخود منعکس ہوگئی۔ ہم بلاشبہ غلط فہمیوں کو صحیح کرنے اور امورکی ازسرنوترتیب دینے کے محتاج ہیں۔

مرد: (شوہر)

شوہرہی توخاندان کاستون ہے، اوراس کی راست روی ودرستگی خاندان کی درستگی میں بڑاعامل وعنصرہے، بلکہ وہ ہی اہم عامل ہے۔

نیزرسول اللہ ﷺ نے مرد میں پائے جانے والے مطلوبہ صفات بیان کئے ہیں، تاکہ وہ ایک صالح شوہراورایک شریف باپ کاکرداراداکرسکے، آپ ﷺ نے ارشادفرمایا:

"جب تمھیں کوئی ایساآدمی پیغام نکاح بھیجے جس کے دین واخلاق سے تم راضی ہوتواس سے (اپنی لڑکی کو) بیاہ دو"۔ [1]

اب یہ دوچیزیں ہوگئی: دین اوراخلاق۔

ہم یہاں یہ پوچھتے ہیں کہ کیااخلاق دین سے مغائرہیں؛

اس بات میں توکوئی شک نہیں کہ یہ دوامرہیں، نیزاسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں بھی اخلاق ہی وہ میزان تھاجس سے انسان کے بارے میں اندازہ کرلیاجاتاتھااوراخلاق ہی انسان کی قدرومنزلت کا معیارتھا۔

یہی تووجہ ہے کہ آپ ﷺ کی شان؛رسالت سے پہلے مکۃالمکرمہ میں بڑی بلندتھی، اوراس کو

(۱) الترمذی: رقم: ۱۰۸۴، وابن ماجہ: ۱۹۶۷

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں؛ انھوں نے آپ کی شان میں یہ کلمات بیان کیئے:

''آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کی مدد کرتے ہیں، مفلسوں کو عطا کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں''۔ (۱)

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سے مشرکین کے بارے میں ان کے اخلاق کریمانہ کی بنیاد پر تعریفی کلمات ارشاد فرمائے ہیں، انھیں لوگوں میں سے ایک مطعم بن عدی ہیں، بدر کے دن انھیں کے حق میں آپ نے ارشاد فرمایا:

''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے پھر وہ مجھ سے ان قیدیوں کے بارے میں گفتگو کرتے تو میں ان کی سفارش کی وجہ سے ان سب کو چھوڑ دیتا''۔ (۲)

اور یہ بھی محض ان کے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے فرمایا کہ جس کی وجہ سے انھوں نے کفار و مشرکین کی ناپسندیدگی کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ حسن معاملہ کیا۔

اسی بنیاد پر جب اسلام آیا تو اس نے اپنے منہج کامل کے تئیں ان تمام اخلاق کریمانہ کو بھی سمو لیا، حتی کہ وہ اخلاق اس دین کے لوازمات میں سے ہو گئے۔

اور چاہیں تو ہم یوں کہیں کہ اخلاق دین سے مغایر اور جداگانہ ہے، اور یہ حدیث کا لفظی مفہوم ہے، اس لیے کہ عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے، یا ہم یہ کہیں کہ اخلاق کا عطف دین پر ''عطف الخاص علی العام'' کی قبیل سے ہے، اس کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اور اس کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے۔

پس قضیہ تو ایک ہی ہے اور وہ دین اور اخلاق ہے۔

اور واقع و حقیقت بھی اس بات کی موید ہے کہ حج اور صوم و صلوۃ کے پابند، دین کو مضبوطی سے تھامنے والے بعض لوگوں کے اخلاق بھی وہ نہیں جو ہونے چاہئیں اور اس کے بہت سے اسباب ہیں، جس کے بسط و تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۳، مسلم: رقم: ۱۶۰

(۲) بخاری: رقم: ۳۱۳۹

یہاں پہنچ کر بہت سے لوگ اس قسم کے لوگوں سے دھوکہ کھاتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ یہ قیاس کرتے ہیں کہ اخلاق دین کا ہمدم اور اس کے لیے جزو لازم ہے۔

معاملہ جو بھی ہو نصِ حدیث کو لازم پکڑنے میں خیر ہی خیر ہے، لہذا لڑکی کے ولی کے لیے پیغام رساں کے صرف دین کے بارے میں تحقیق و تفتیش کرنا ناکافی ہے، بلکہ اس کے اخلاق اور حسن معاملات کی تحقیق کرنا بھی امر لابدی ہے، یہی وہ پہلو ہے کہ جس کے پیش نظر عورت مرد کے ساتھ معاملہ کرے گی۔

زوجین؛ زن وشوہر:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾[1].

"اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے واسطے تمھاری جنس کی بیبیاں بنائیں؛ تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہم دردی پیدا کی، اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔"

اسلام نے کنبے کی بنیاد مودت ورحمت پر رکھی جیسا کہ آیت کریمہ ناطق ہے، اور کفالت وذمہ داری مرد پر عائد کی؛ تاکہ وہ فراخ دل ہو اور زیادہ ضبط وتحمل کرے، نہ یہ کہ وہ عورت پر فقط حکم کرنے والا اور روکنے والا سلطان وحاکم بنے۔

اسی وجہ سے بہت سی احادیث مرد کے لیے عورت کی طبیعت بیان کرنے والی وارد ہوئی ہیں تاکہ مرد اس کے ساتھ اسی کے موافق نباہ کرے۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"تم عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، کیونکہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے ٹیڑھی پسلی وہ سب سے اوپر والی ہے، اگر تم اسے سیدھی کرنے جاؤگے تو توڑ دوگے اور اگر تم اسے

---

(۱) سورۂ روم: آیت: ۲۱

چھوڑ دوگے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی، لہذا تم عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اور ایک روایت میں ہے: کسر (توڑنے) سے مراد طلاق دینا ہے"۔ (۱)

اور آپ ﷺ کا اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ رہنے سہنے اور معاملات کی کیفیت اور ان کے ساتھ صبر سے پیش آنے کی کیفیت سے متعلق حدیث اس سے پہلے گزر چکی ہے، اور آپ ہی تو اس معاملہ میں اسوہ اور نمونہ ہیں۔ (۲)

اور آپ ﷺ نے نیک صالح عورتوں کے اوصاف بیان فرمائے، آپ نے فرمایا:

"بہترین عورتیں جو اونٹوں پر سوار ہوئیں قریش کی نیک صالح عورتیں ہیں، جو اولاد کی صغر سنی میں پرورش کرنے والی ہیں، اور اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں اس کے مال کی حفاظت کرنے والی ہیں"۔ (۳)

اور اس بات میں تو شک کی گنجائش ہی نہیں کہ اسلام نے زوجین میں سے ہر ایک کے حقوق وواجبات بیان کر دیئے؛ لیکن مراد یہ نہیں ہے کہ کنبے کی بنیاد اسی پر ہے بلکہ وہ آپسی تعاون اور مودت ومحبت کی بنیاد پر قائم ہے، البتہ اختلاف کے وقت رجوع حق وواجب کی حقیقت کی طرف ہوگا۔

اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ زوجین میں سے ہر ایک کا آپسی مالہ وماعلیہ حقوق کو جاننا اس مودت ومحبت کی پائیداری وبرقراری میں بہت ہی معاون ثابت ہوتا ہے۔

اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ شوہر کی اطاعت واجب ہے، اس وجہ سے کہ وہ کفیل وذمہ دار اور قوام ہے اور اس سلسلہ میں بہتیری احادیث وارد ہیں، لیکن یہ اطاعت:

کسی ایسے امر میں نہ ہوگی جس میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی معصیت ہو۔

جیسا کہ کسی ایسے امر میں بھی نہ ہوگی کہ جس میں دوسروں کے وہ حقوق تلف ہو رہے ہوں جس کی رعایت وپاسداری کا اسلام نے حکم دیا ہے۔

جیسا کہ اطاعت اس چیز کو توڑنے میں نہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو جوڑنے کا حکم دیا ہے

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۳۳۱، م: ۱۴۶۸

(۲) دیکھو: فصل: النبی الزوج الکریم، اس میں زوجین میں سے ہر ایک کے مناسب حقوق کا کافی بیان ہے۔

(۳) بخاری: رقم: ۵۰۸۳

جیسے والدین کے ساتھ صلہ رحمی، حسن سلوک اور ان کے بڑھاپے میں ان کی دیکھ بھال اور ان کو اولاد کی مدد ضرورت کے وقت۔(۱)

شوہر کے حق کی ادائیگی اور اس کی اطاعت: مناسب ہے کہ دوسرے ان واجبات کی ادائیگی کے معارض نہ ہو، جس کی ادائیگی کا مرد عورت ہر دو سے اسلام نے مطالبہ کیا ہے۔

اولاد:

والدین کا فریضہ ہے اولاد پر توجہ دینا، اس دین کے مبادیات کی روشنی میں مسلسل ان کی تربیت کرنا، نرمی، حسن اسلوب کی رعایت کرتے ہوئے۔

اور ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ آپ ﷺ کا اپنے لڑکے اور لڑکیوں کی رعایت و دیکھ بھال اور ان کی محبت اور ان پر رفق و نرمی کا کیا عالم تھا۔(۲)

اور ہم مذکر و مونث کے درمیان رعایت اور لطف و نرمی میں آپ کی عدم تفریق بھی دیکھ چکے ہیں، اور آپ نے اپنی لڑکیوں کی شادی کے بعد بھی اسی طرح رعایت و توجہ جاری رکھی اور ان کے لیے مناسب شوہر کا انتخاب فرمایا۔

---

(۱) یہاں ہم وہ واقعہ بھی ذکر کرتے ہیں جو امام غزالی نے ''احیاء العلوم: باب حقوق الزوج'' میں ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ایک شخص تھا جو سفر میں نکلا اور اپنی بیوی سے یہ عہد لیا کہ وہ بالائی منزل سے نیچے نہ اترے اور اس عورت کے والد منزل کے نچلے حصے میں تھے، وہ بیمار ہو گئے تو اس عورت نے آپ ﷺ کی خدمت میں آدمی بھیج کر اپنے والد کی خدمت میں نیچے اترنے کی اجازت طلب کی، آپ نے فرمایا: اپنے شوہر کی اطاعت کرو؛ حتی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا، پھر اس نے آپ سے اجازت طلب کی، آپ نے فرمایا: اپنے شوہر کی اطاعت کرو، ادھر اس کے والد کی تدفین ہو گئی؛ پھر آپ ﷺ نے اس عورت کے پاس آدمی بھیج کر خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے شوہر کی اطاعت کے صدقہ میں اس کے والد کی مغفرت کر دی۔

حافظ عراقی فرماتے ہیں: طبرانی سند ضعیف کے ساتھ اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ: یہ خبر—اگرچہ وہ حسن ہو—ان آیات کریمہ اور احادیث صحیحہ کے معارض ہے جو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک پر ابھارتی ہیں، نہ تو اس میں کوئی تاویل کرنا صحیح ہے، اور نہ ہی اس کا ذکر کرنا، اور میں نے تو صرف اس پر تنبیہ کے لیے ذکر کیا ہے، واعظین و خطباء مساجد اس کے ضعف اور آیات کریمہ کے معارض ہونے کی طرف توجہ کئے بغیر استشہاد میں کثرت سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

(۲) اس کا ذکر مفصل فی فصل النبی الاب الکریم میں ہو چکا ہے۔

ہم اس عنوان میں آپ ﷺ کی لڑکیوں کے بارے میں خصوصی توجہ ودیکھ بھال کی تاکید کا بھی اضافہ کرتے ہیں، یہ تاکید کئی احادیث میں وارد ہے، ان میں سے چند یہ ہیں:

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس نے دو بچیوں کی پرورش کی حتی کہ وہ بالغ ہو گئیں تو میں اور وہ قیامت میں اس طرح آئیں گے۔ اور آپ نے اپنی انگلیاں مبارک ملالیں''۔ (۱)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے جن کو بھی تین لڑکیاں ہوں یا تین بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ احسان اور اچھا برتاؤ کرے تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا''۔ (۲)

ہم ایک اور حدیث بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنالیتے ہیں''۔ (۳)

اور یہودی، نصرانی یا مجوسی بنانے میں والدین کا موثر ترین ذریعہ ہونے میں حدیث واضح ہے، اور جب مسلمان فطرت اسلام ہی پر پیدا ہوتا ہے تو وہ رعایت وتوجہ کا محتاج ہوگا حتی کہ وہ اسی فطرت پر باقی رہے اور شیاطین اس کو گمراہ کر کے پھنسا نہ دے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ (۴)

والدین کے ساتھ حسن سلوک:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (۵).

''(ہم نے حکم دیا ہے) والدین کے ساتھ بہترین سلوک کرنے کا''۔

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۶۳۱

(۲) ترمذی: رقم: ۱۹۱۲

(۳) متفق علیہ: رقم: ۱۳۵۸، م: ۱۶۵۸

(۴) مسلم: رقم: ۲۸۶۵، اور حدیث یہ ہے: میں نے اپنے تمام بندوں کو ہر مذہب سے الگ، مسلمان بنایا پھر ان کے پاس شیاطین آتے ہیں اور ان کو اپنے دین سے گمراہ کر دیتے ہیں۔

(۵) سورۂ بقرہ: آیت: ۸۳

نیز فرمایا:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا﴾ [1]. " اور ہم نے انسان کو وصیت ونصیحت کی اپنے والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی"۔

کئی ایسی احادیث بھی وارد ہیں جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دیتی ہیں اور ان دونوں کی نافرمانی سے ڈراتی ہیں، اور ان میں سے بہتیری احادیث باپ پر ماں کو ترجیح دیتی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

"ایک شخص نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر سوال کیا: اے اللہ کے رسول! میرے حسن سلوک اور فرمانبرداری کا لوگوں میں کون سب سے زیادہ حقدار ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: تیری ماں، اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپ نے جواب دیا: تیری ماں، اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپ نے جواب میں فرمایا: تیرا باپ"۔ [2]

نیز آپ ﷺ نے ان دونوں کے ساتھ بھلائی کو جہاد پر ترجیح دی، حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے:

"ایک شخص یمن سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہجرت کر کے آیا، آپ نے پوچھا، کیا یمن میں تمھارا کوئی متعلق ہے؟ اس نے جواب دیا: میرے والدین، آپ نے پوچھا: کیا ان دونوں نے تمھیں اجازت دی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ان کی خدمت میں واپس جاؤ اور ان سے اجازت لو، اگر وہ دونوں تمھیں اجازت دیں تو ہی جہاد کرو؛ ورنہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ"۔ [3]

ف: ان مسائل سے واقفیت ہر داعی و مبلغ اور محقق کو ہونی لازم ہے۔ ورنہ اس مسئلہ میں بے حد بے اعتنائی ولاپروائی ہو رہی ہے اور اس کو دین ہی سمجھا جاتا ہے۔ فیا ویلاہ ویاحسرتا۔ (قمر الزماں، مترجم)

صلہ رحمی:

اسلام نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا ہے کہ نرمی، رحم وکرم اور مودت ومحبت صرف خاندان

---

(۱) سورۂ عنکبوت: آیت: ۸

(۲) متفق علیہ: رقم: ۵۹۷۱، م: ۲۵۴۸

(۳) ابوداؤد: رقم: ۲۵۳۰

پر منحصر ہو، جس کے تنگ دامن میں صرف والدین اور اولاد کی حدود سمائی ہوئی ہوں، بلکہ اس کا دائرہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے؛ حتی کہ وہ ہر اس قریبی انسان اور رشتہ دار کو شامل ہے جس کو ماں یا باپ کی جہت سے علاقہ نسب انسان کے ساتھ ملاتا ہے، اسی وجہ سے محبت کی رسیاں اور اس کے دھاگے اس قدر طویل ہیں جو دور دراز جگہوں تک پہنچتے ہیں۔

اور صلہ رحمی پر ابھارنے والی اور قطع رحمی سے ڈرانے والی احادیث بہت زیادہ ہیں، ان میں سے کچھ ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا حتی کہ جب اس سے فارغ ہو گئے، رشتہ داری نے عرض کیا: یہ قطع رحمی سے تیری پناہ کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں! کیا تو اس بات سے راضی نہیں ہے کہ تجھے جوڑنے والے کو میں بھی جوڑوں اور تجھے کاٹنے والے کو میں کاٹ دوں؟ اس نے عرض کیا: کیوں نہیں اے میرے رب! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہی تیرا حق ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ پڑھو ''فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ '' (۱) (پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم ملک کے حاکم ہو جاؤ تو ملک میں فساد مچانے اور قطع رحمی کرنے لگو) ''۔ (۲)

حضرت جبیر بن مطعمؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔ (۳)

حضرت ابو ہریرہؓ آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم اپنے انساب کو پہچانو، جن سے تم اپنے رشتے جوڑتے ہو، اس لیے کہ صلہ رحمی اہل و عیال میں محبت، مال میں بڑھوتری اور عزت و احترام میں زیادتی کا سبب و ذریعہ ہے''۔ (۴)

ف: ماشاء اللہ کیا ہی خوب رسول اللہ ﷺ نے صلہ رحمی کے فوائد ارشاد فرمائے ہیں جو سویدائے قلب پر لکھے جانے کے لائق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مومنوں کو عمل کی توفیق دے۔ آمین۔ (قمر الزماں)

---

(۱) سورۂ محمد: آیت: ۲۲

(۲) متفق علیہ، رقم: ۵۹۸۷، م: ۲۵۵۴

(۳) متفق علیہ: رقم: ۵۹۸۴، م: ۲۵۵۶

(۴) ترمذی: رقم: ۱۹۷۹

یتیم کی دیکھ بھال:

اسلام نے لوگوں میں سے یتیم کے زیادہ قریبی رشتہ دار پر اس کا خیال رکھنے اور پرورش کرنے کو لازم قرار دیا ہے، مزید براں یہ لزوم یتیم کی کفالت کرنے والے کو اس اجر جزیل کے حصول سے مانع نہیں ہے، جس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس فرمان میں بیان فرمایا ہے:

"میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔ اور آپ نے انگشت شہادت سے اشارہ کیا اور ان دونوں کے درمیان کچھ کشادگی رکھی"۔ (۱)

اسی طرح ضعفاء کی دیکھ بھال و خیال کرنا بھی لوگوں میں سے ان سے سب سے زیادہ قریبی لوگوں پر واجب ہے، اور یہ اجر ان کو مجاہدین کی صفوں میں لا کھڑا کرتا ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" بیوہ اور مسکین کی کفالت کرنے والا راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے یا شب بیدار اور صائم النہار کی طرح ہے"۔ (۲)

اس سے کنبے کے اندر آپسی دیکھ بھال اور کفالت اخلاقِ کریمانہ کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اجباری اساس پر قائم ہونے سے پہلے۔

خلاصہ:

پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے فیملی کے افراد کے درمیان پائے جانے والے رشتوں کی بنیاد مودت و محبت، شفقت و نرمی اور بھلائی و احترام پر رکھی ہے، اسی وجہ سے ان اینٹوں کی بنی ہوئی عمارت مضبوط اور ہر قسم کی آب و ہوا میں شدید ترین حالات کو برداشت کرنے کے قابل ہوتی ہے۔

ہاں! جب عمارت مادی اساس پر قائم ہو گی تو وہ اس اول مرحلے میں ہی منہدم ہو جائے گی، جس میں ایک فرد کا دوسرے فرد کی مصلحت سے ٹکراؤ ہو گا، اُن خاندانوں کی طرح جو جدید شہروں اور اس کی (ظاہری) خوشحالی کے سائے میں جیتے ہیں۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۵۳۰۴

(۲) بخاری: رقم: ۵۳۵۳

دوسری فصل

پڑوس

جوار سے مراد دیہاتوں یا شہروں میں آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تعمیر شدہ مکانات ہیں۔

اسلام نے پڑوسیوں کے بھی حقوق متعین کیے ہیں، اور ہر انسان کے لیے پڑوسی ہونا امر لابدی ہے، جہاں کہیں وہ سکونت پذیر اور مقیم ہو۔

پڑوسی دوسروں کی بہ نسبت اپنے پڑوسی سے زیادہ ملا ہوا اور قریب ہے، وہ کام کاج کے لیے آنے جانے کے وقت صبح شام اس کو ملتا ہے جیسا کہ وہ محلہ کی مسجد میں نماز اور دیگر اوقات میں ملتا ہے۔

پڑوسی دوسروں سے زیادہ حقدار ہے، جبکہ اچانک مدد کی ضرورت یا اچانک پیش آمدہ ضرر کو دفع کرنے میں وہ پڑوسی کا محتاج ہو۔

اس طرح اور دیگر ضروریات کے لیے اسلام نے پڑوسی کے حقوق متعین کیے ہیں، ان میں سے چند کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

الوصیۃ بالجار/پڑوسی کے بارے میں وصیت:

آپ ﷺ نے بہت سی مناسبات و تقریبات میں پڑوسی کے لیے بار بار وصیت کی اور آپ کی یہ مکرر سہ مکرر وصیت حضرت جبریل علیہ السلام کے بار بار تاکید کرنے پر تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے؛ وہ آپ ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”حضرت جبریل پڑوسی کے بارے میں مجھے برابر حکم کرتے رہے حتی کہ مجھے یہ گمان ہو گیا کہ وہ اس کو وارث بنادیں گے“۔(۱)

نیز عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۲۰۱۴، م: ۲۶۲۴

"تم میں سے بہترین دوست اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے دوست کے لیے بہتر ہو اور بہترین پڑوسی عنداللہ وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بھی بہتر ہو"۔ (۱)

اور اس طرح پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی نصوص وارد ہیں اور یہ تین امور ہوں گے:

- حسن معاملہ۔
- تکلیف پہنچانے سے رکنا۔
- اس کی تکلیف کو برداشت کرنا۔

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک:

اسلام نے ہر انسان سے اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا مطالبہ کیا ہے، اور احسان ایک عام کلمہ ہے، جو مادی و معنوی دونوں پہلوؤں کو شامل ہے۔

اور پڑوسیوں کے درمیان آپسی تعلق مضبوط کرنے کے لیے آپ ﷺ نے آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دینے کا حکم دیا، لہٰذا ہر ایک کوشش کرے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ہدیہ دے چاہے وہ تھوڑا کھانا ہی ہو، اور یہ قضیہ قلیل و کثیر مقدار کا نہیں ہے، بلکہ یہ الفت و محبت کو ظاہر کرنے والا رمز و اشارہ ہے۔

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اے ابوذر! جب تم شوربا پکاؤ تو پانی زیادہ کر دو، اور (اس میں) اپنے پڑوسی کا بھی خیال رکھو"۔ (۲)

اور یہ حکم آپ ﷺ نے صرف مردوں کو ہی نہیں دیا، بلکہ آپ ﷺ نے عورتوں کو بھی اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں؛ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اے مسلمان عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کا ہدیہ حقیر نہ سمجھے، اگرچہ بکری کی کھر ہو۔ (یعنی بہت معمولی شئ ہو)"۔ (۳)

---

(۱) ترمذی: ۱۹۴۴، والدارمی: ۲۴۳۷، والبخاری فی الادب المفرد: ۱۱۵

(۲) مسلم: رقم: ۲۶۲۵

(۳) متفق علیہ: رقم: ۲۵۶۶، م: ۱۰۳۰

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے بارے میں مروی ہے:

''ان کی ایک بکری ذبح کی گئی تو وہ اپنے غلام کو یہ کہنے لگے: کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو ہدیہ بھیج دیا، کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو گوشت پہنچا دیا؟ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: حضرت جبرئیل برابر پڑوسی کے بارے میں مجھے حکم کرتے رہے حتی کہ مجھے یہ گمان ہو گیا کہ وہ اس کو وارث بنا دیں گے''۔ (۱)

اور جب انسان کو ایک سے زائد پڑوسیوں کو ہدیہ دینے کی قدرت نہ ہو تو وہ سب سے قریب دروازے والے پڑوسی کو ہدیہ پہنچائے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے؛ فرماتی ہیں:

''میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میرے دو پڑوسی ہیں، میں ان میں سے کس کو ہدیہ بھیجوں ؟آپ نے فرمایا: جس کا دروازہ تجھ سے زیادہ قریب ہو''۔ (۲)

انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے وہ امور و حالات بھی جان لے جو اس کے لیے حقوق واجبہ کی ادائیگی میں معاون و مددگار بنیں۔

حضرت ابن عباسؓ ابن زبیرؓ سے روایت کرتے ہیں؛ وہ فرماتے ہیں:

''میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: مومن نہیں ہے وہ شخص جس کا پیٹ بھرا ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو''۔ (۳)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

''ہم پر ایسا زمانہ یا وقت آیا (تھا کہ ہمارے نزدیک) کہ ہمارے درہم و دینار کا اپنے مسلمان بھائی سے زیادہ کوئی حقدار نہ تھا، پھر اب تو درہم و دینار ہی ہمیں اپنے مسلمان بھائی سے زیادہ محبوب ہو گئے، میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: بہت سے پڑوسی قیامت کے دن اپنے پڑوسی کو پکڑ کر لائیں گے اور عرض کریں گے: اے اللہ! اس نے مجھ پر اپنا دروازہ بند کر دیا اور اپنی بھلائیاں روکے رکھی

(۱) الادب المفرد: ۱۰۵

(۲) بخاری: رقم: ۲۲۵۹

(۳) الادب المفرد: ۱۱۲

تھی"۔[۱]

بھلائی و معروف کو روکنے ہی کی قبیل سے استعمالی ضرورت کے گھریلو برتن اپنے پڑوسی کو بطور عاریت دینے سے رکنا ہے جبکہ اس کو ضرورت ہو، اور قرآن نے بھی اس کے فاعل کی مذمت کی ہے۔

پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچانا:

اور جب انسان سے اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا مطالبہ کیا گیا تو اس کو تکلیف پہنچانے سے رکنے کا مطالبہ بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

اور رسول اللہ ﷺ نے بھی پڑوسی کو ایذاء رسانی سے ڈرایا ہے۔

حضرت ابو شریحؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، پوچھا گیا: کون ہے وہ اے اللہ کے رسول ﷺ۔ جواب دیا: وہ شخص جس کا پڑوسی اس کی تکلیفوں سے مامون نہ ہو"۔[۲]

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"وہ شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کا پڑوسی اس کے فتنوں سے محفوظ نہ ہو"۔[۳]

انھیں سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

"نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! فلانی عورت شب بیدار ہے، دن کو روزہ رکھتی ہے، فلاں فلاں کام کرتی ہے، اور صدقہ خیرات بھی دیتی ہے اور اپنے پڑوسی کو زبان سے تکلیف بھی پہنچاتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں کوئی خیر و خوبی نہیں ہے، وہ جہنمیوں میں سے ہے"۔[۴]

---

(۱) الادب المفرد: ۱۱۱

(۲) بخاری: رقم: ۱۰۱۶

(۳) مسلم: رقم: ۴۶

(۴) اخرجہ البخاری فی الادب المفرد: ۱۱۹

انھیں سے مروی ہے؛فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو وہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ پہنچائے"۔[1]

ایذاء کو برداشت کرنا:

پڑوسی کے ادائیگی حقوق کی تکمیل میں سے اس کی ایذاء کو برداشت کرنا،اس کے ساتھ نرمی برتنا اور اس کو بھلائی پہنچانے اور حسن سلوک میں ہاتھ بڑھانا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے کسی نے عرض کیا: میرا پڑوسی مجھے اذیت پہنچاتا ہے،مجھے برا بھلا کہتا ہے اور مجھ پر سختی کرتا ہے،آپؓ نے فرمایا: جانے دو اس نے تیرے بارے میں اللہ کی نافرمانی کی، لیکن تو اس کے حقوق کی ادائیگی میں اللہ کی اطاعت کر۔[2]

(۱) متفق علیہ: رقم:۶۰۱۸،م:۴۷

(۲) احیاء علوم الدین: ۲/۲۱۲

تیسری فصل

مسلمان کا مسلمان پر حق

اسلامی بھائی چارگی اور اخوّت:

معاشرے کے لوگوں کو عموماً وطنیت کا رشتہ آپس میں جوڑتا ہے، اسلام نے اس رشتہ کو ترقی دے کر ""اخوت"" کا رشتہ بنادیا ہے، جیسا کہ چھوٹے خاندان کے افراد کا آپس میں اخوت کا رابطہ ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح اسلام کے ماننے والے افراد بڑے معاشرے میں اخوت اسلامی کے رابطہ سے مربوط ہوتے ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی رابطہ کی تاکید فرمائی ہے، اور ایک فرد مسلم کے دوسرے فرد کے ساتھ تعلق میں بنیادی طور پر اسی رابطہ کا اعتبار کیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

""تم میں سے کوئی کامل مومن نہیں ہوسکتا حتی کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے""۔[۱]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

""مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ ہی اس کو ظالم کے حوالے کرتا ہے، اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے کے درپے ہوگا تو اللہ اس کی حاجت پوری کریں گے اور جو کسی مسلمان کی مصیبت دور کردے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت دور کردے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے""۔[۲]

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۱۳، م: ۴۵

(۲) متفق علیہ خ ۲۴۴۲ م ۲۵۸۰

اور اسی طرح مسلمانوں کے مابین رشتۂ اخوت مضبوط ہوتا ہے، اور جس طرح چھوٹی فیملی میں بھائی اپنے بھائی کے لیے ہر خیر کی چیز پسند کرتا ہے، اور اس سے ہر مکروہ چیز کو دور کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح بڑے اسلامی معاشرہ و ممالک اسلامیہ میں ہر فرد دوسرے کے لیے ہر خیر کی چیز پسند کرے اور ان میں سے کسی کو پیش آمدہ ہر مکروہ چیز سے غمگیں ہو، کیونکہ وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق:

اور آپ ﷺ نے عام حالات میں صرف اسی رابطہ و تعلق کی گفتگو پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ ان تمام چیزوں کی تعیین کی، جن کو اپنے بھائیوں کی ضرورت کے پیش نظر قائم کرنا اور بجالانا مسلمان پر ضروری ہے، ان میں سے کچھ کا تذکرہ سابق عنوان میں ہو چکا۔

بعض کا ذکر درج ذیل حدیث میں وارد ہے:

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہے۔ (۱) سلام کا جواب دینا، (۲) مریض کی عیادت کرنا، (۳) جنازے کے پیچھے چلنا، (۴) دعوت قبول کرنا، اور (۵) چھینکنے والے کو جواب دینا۔

اور مسلم کی روایت میں اتنی زیادتی ہے: اور جب وہ تم سے نصیحت و خیر خواہی چاہے تو تم اس کے حق میں نصیحت کرو"۔[(۱)]

اسی طرح ہر مسلمان سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کے ساتھ اجتماعی آداب کی رعایت کرے جیسے سلام کا جواب دینا اور چھینکنے والے کو جواب دینا۔

اسی طرح دوسروں کی خوشی و غمی میں شریک ہونا ہے، لہذا دعوت پر لبیک کہے، اور مصائب کے وقت ان کے غم واندوہ میں شریک ہو اور مریضوں کی عیادت کے لیے جائے۔

جیسا کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں وارد ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز قائم کرنے، زکوۃ ادا کرنے اور ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی پر بیعت کی"۔[(۲)]

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۱۲۴۰، م: ۲۱۶۲

(۲) بخاری: رقم: ۵۷، مسلم: ۵۶

تبھی تو یہاں ہر فرد کی طرف سے دوسروں کے تئیں سرگرم شرکت ہے، ایجابی مشارکت جس کا باعث دینی اخوت و بھائی چارگی ہے۔

اور آپ ﷺ نے زندگی کے تمام شعبوں میں اس اخوت کے حقوق کی تاکید کی ہے، جیسا کہ فرمایا:

''تم میں سے کوئی کسی کی بیع پر بیع نہ کرے۔''

''جو اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے کے درپے ہو گا اللہ اس کی حاجت پوری فرمائیں گے۔''

''جس کو اپنے بھائی کا حق کاٹ کر چیز دی جائے تو اس کو وہ ہرگز نہ لے۔''

''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نہ بھیجے۔''

''تیرا اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا صدقہ ہے۔''

''انسان کی برائی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔''

کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق رکھے۔''

جان لو! ''تمھارے بھائی ہیں، تمھارے غلام و خدّام۔''

اور اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے ہر میدان و شعبے میں اخوت کا مفہوم راسخ کر دیا۔

چوتھی فصل

اسلامی معاشرہ

نتائج وماحصل:

سابقہ نتائج کی روشنی میں ہم اسلامی معاشرہ پر گفتگو کر سکتے ہیں، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی تعمیر کی۔

سواب پورا خاندان مودت ومحبت، رحم وکرم اور بھلائی واحسان کے سایہ میں مضبوط عمارت کی طرح باہم مربوط ہے۔اور رشتہ داریاں باہم جڑی ہوئی ہیں۔اور پڑوس احسان کے مفہوم کامل پر کاربند ہے۔اور بھائی چارگی کی رسی معاشرے کے تمام افراد کو پرو رہی ہے تو پھر ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کے لیے وہ پسند کرنا چاہیے جو اپنے لیے کرتا ہے۔یہ تمام مربوط ومضبوط رشتے وتعلقات آپس میں ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں اور آپسی بندھن کو مضبوط کرتے ہیں۔

یہ ایک صورت ہے جو تمام بستیوں، دیہات اور شہروں میں بار بار پیش آتی ہیں۔اور اسی طرح یہ تمام صورتیں اور حالات یکساں اور برابر ہیں، جب ہم اسلامی معاشرہ کے درمیان ہوتے ہیں۔

اور الفاظ اس کی زندہ مثالی صورت انسان کے خیال وگمان کے سامنے نقل کرنے سے عاجز ہیں، نبی کریم ﷺ نے اسے بیان کر دیا ہے

حضرت ابو موسیٰؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی طرح ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو تقویت پہنچاتا ہے اور آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیا“۔(۱)

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومنین کی مثال آپس

---

(۱) متفق علیہ: رقم:۲۴۴۶،م:۲۵۸۵

میں رحم کرنے، محبت کرنے اور عطف ونرمی میں ایک جسم کی طرح ہے، جب ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم اس کے ساتھ بیداری و بخار میں شریک ہو جاتا ہے۔

ایک روایت میں ہے:

''مسلمان آپس میں ایک آدمی کی طرح ہیں، اگر اس کی آنکھ میں تکلیف ہوتی ہے تو پورے جسم کو تکلیف ہوتی ہے، اور اگر اس کے سر میں درد ہوتا ہے تو پورے جسم کو درد ہوتا ہے''۔ (۱)

اسی صورت حال کی تاکید اور اس کے استمرار کی تقویت کے طور پر قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی توجیہات ملاحظہ ہوں:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا﴾ (۲).

''اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہل قرابت کے ساتھ بھی، اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب غرباء کے ساتھ بھی، اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی، اور راہ گیر کے ساتھ بھی، اور ان کے ساتھ بھی جو تمھارے مالکانہ قبضہ میں ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے ہیں جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں، شیخی کی باتیں کرتے ہوں۔''

نیز فرمایا:

﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً

''اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کی رسّی کو اس طور پر کہ باہم سب متفق رہو اور باہم نااتفاقی مت کرو، اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم

(۱) مسلم: رقم: ۲۵۸۶

(۲) سورۂ نساء: آیت: ۳۶

فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ((۱)). دشمن تھے، پس اللہ تعالیٰ نے تمھارے قلوب میں الفت ڈال دی، سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔"

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جس نے مومن کی کسی دنیوی مصیبت کو دور کیا تو اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی بڑی مصیبت دور کرے گا، اور جس نے کسی تنگ دست پر آسانی کی تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس پر آسانی فرمائے گا، اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں رہتے ہیں، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے"۔ (۲)

جسم واحد:

اور جب افراد مل کر دیہات اور شہر کو تشکیل دیتے ہیں تو علاقے، سوسائٹی اور معاشرہ کو تشکیل دیتے ہیں، وہ معاشرہ کہ اگر اس کی آنکھ میں تکلیف ہو تو وہ پورا جسم تکلیف میں مبتلا ہو جائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بیان کیا۔

پس جس وقت کوئی ایک علاقہ کسی حادثہ یا تکلیف سے دوچار ہو گا تو بقیہ علاقے اس کے ساتھ اس انہونی تکلیف میں کھڑے ہو جائیں گے۔

اور قحط والے سال میں امیر المومنین عمر بن الخطابؓ نے مصر کے گورنر عمرو بن العاصؓ کے نام درج ذیل مکتوب لکھا:

اللہ کے بندے امیر المومنین بن الخطاب کی طرف سے عاص بن العاص کے نام۔

تم پر سلام ہو۔

امابعد! اے عمرو! میری زندگی کی قسم! تم اور تمھارے ساتھ کے لوگ پیٹ بھرے ہوئے ہیں، تو تمھیں پرواہ نہیں ہے کہ میں اور میرے ساتھ والے لوگ ہلاک ہو جائیں، ہائے مدد، ہائے مدد۔

---

(۱) سورۂ آل عمران: آیت: ۱۰۳

(۲) مسلم: رقم: ۲۶۹۹

تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ان کو جواباً تحریر کیا:

امابعد! ہائے! میں حاضر ہوں، پھر میں حاضر ہوں اور میں نے آپ کی خدمت میں ایک قافلہ بھیج دیا ہے، جس کا اول آپ کے پاس اور آخر میرے پاس ہے، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''۔(۱)

حضرت عمرؓ کا مکتوب غضبناک تھا، اس لیے حضرت عمروؓ کے لیے انتظار کرنا مناسب نہیں تھا، یہاں تک کہ ان کو حضرت عمر کا مکتوب پہنچے، اسی لیے حضرت عمرؓ نے ان کو ''عاص بن العاص'' لکھا۔

اگر تمام اعضاء میں سے کسی عضو میں احساس سرد ہو جائے اور اس کی ایسی حالت ہو جائے کہ اس کو اپنے ساتھ شریک دوسرے اعضاء کی تکلیف کا شعور تک نہ ہو تو یہی وہ چیز ہے جس سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ اس کو فالج ہوا ہے۔

یقیناً اسلام صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ ایک عضو کو دوسرے عضو کی تکلیف کا احساس ہو، بلکہ وہ ہر شہد کی مکھیوں کے چھتے سے یہ چاہتا ہے کہ دوسرے چھتے کے آلام کو محسوس کرے، خواہ ان میں کتنی ہی مسافت وفاصلہ ہو، کیونکہ جسم ایک کلی وحدت ہے، جس کو ٹکڑوں میں بانٹا نہیں جاسکتا۔

اسی دستور اساسی کی وجہ سے اور اس تاکید کے پیش نظر جو کہ سابقہ احادیث میں وارد ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان: ''من لم یهتم بأمر المسلمین فلیس منهم'' (جس کو مسلمانوں کے امور میں توجہ ودلچسپی نہ ہو وہ ان میں سے نہیں ہے) ایسی میزان بن کر آیا ہے کہ جس سے مسلمان اپنی توجہ واہتمام کی حد کو ناپ سکتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اپنے دل میں موجود حرارتِ ایمانی کی حد کو بھی اور یہی چیز اس کو اس دین سے مربوط رکھتی ہے۔

اور جب یہ اہتمام وتوجہ سرد پڑ جائے یا معدوم ہو جائے یا کوئی شخص مسلمانوں کی صف چھوڑ کر دوسرے کی صف میں چلا جائے یا ان کو پہنچنے والے مصائب پر خوش ہو تو اس فرد کا اسلام کہاں! اگرچہ وہ محمد، خالد، اور عمر نام کا حامل ہو۔

☆☆☆

---

(۱) کنزالعمال: ۱۲/۱۱۴، طبقات ابن سعد: ۳/۳۱۰

دسواں مقصد

مسلمانوں پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقوق

بخاری نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اس حال میں کہ چادر کے کنارے سے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اور آپ منبر پر چڑھے — اس کے بعد سے آج تک اس پر نہیں چڑھے — پھر حمد وثنا بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: میں تم کو انصار کے بارے میں بھلائی کا حکم کرتا ہوں، کیونکہ وہ میرے اصحاب اور رازدار ہیں، انھوں نے اپنے ذمہ جو کچھ حقوق تھے وہ ادا کر دئے اور ان کے جو کچھ حقوق ادا کرنے ہیں وہ باقی رہ گئے"۔ (۱)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کچھ حقوق تھے وہ آپ نے ادا فرمادیئے، حق سبحانہ وتعالیٰ کی گواہی کے ساتھ، جبکہ آپ حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دے رہے تھے، آپ نے مجمع سے سوال کیا جو کہ ہزاروں کی تعداد میں تھا: کیا میں نے (جو کچھ میرے ذمہ تھا) پہنچادیا؟ لوگوں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ نے فرمایا: اے اللہ! تو گواہ رہ۔ (۲)

اسی دن اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

«اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا»(۳).

"آج کے دن تمھارے لیے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا، اور میں نے اسلام کو تمھارے دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔"

پس اللہ تعالیٰ کی اپنے رسول کے حق میں شہادت یہ ہے کہ آپ نے امانت کا حق ادا کر دیا اور رسالت بھی پہنچادی اور آپ کو جن حقوق وواجبات کا مکلف بنایا تھا ان کو بہترین طریقے پر انجام دیا۔

جی ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اوپر جو کچھ حقوق تھے وہ سب ادا کر دیئے اور آپ کے (دوسروں پر) جو حقوق ہیں وہ باقی ہیں۔

وہ حقوق وواجبات جو آپ کے اپنی امت پر باقی ہیں وہ بے شمار اور انگنت ہیں، ان میں سے درج ذیل امور پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

- آپ کی اطاعت کا واجب ہونا۔
- آپ کی محبت کا واجب ہونا۔
- آپ پر درود وسلام بھیجنے کا وجوب۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۳۷۹۹

(۲) بخاری: رقم: ۱۷۴۱، مسلم: ۱۶۷۹

(۳) سورۂ مائدہ آیت: ۳

پہلی فصل

نبی ﷺ کی اطاعت کے واجب ہونے کے بیان میں

قاعدہ عامہ:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ»[1]. ''اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی ان کی اطاعت کی جاوے۔''

یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تمام رسولوں کے بارے میں جاری سنت ہے کہ وہ جو امانت لے کر بھیجے گئے اسے لوگوں تک پہنچادیں اور ان کی قوموں اور امتوں کے ذمہ ان کی اطاعت کرنا اور عمل کرنا ہے۔ اور اگر اطاعت مطلوب نہ ہوتی تو نہ یہ پابندی ہوتی، نہ دین ہوتا، اور نہ یہ دین کی اطاعت اور اسی سے مومن کافر سے جدا اور ظاہر ہوتا ہے۔

نبی ﷺ کی اطاعت:

اور وہ آیات جو آپ ﷺ کی اطاعت کی شان میں وارد ہیں وہ بہت زیادہ ہیں، ان میں سے بیشتر آیات ایسی ہیں جن میں آپ ﷺ کی اطاعت کا حکم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ مل کر بیان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«يَآ أَ يُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ»[2]. ''اے ایمان والو! اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا۔''

---

(۱) سورۂ نساء: آیت: ۶۴

(۲) سورۂ انفال: آیت: ۲۰

«قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ»[۱]. "آپ یہ فرما دیجئے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ کی اور رسول کی۔"

«وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوۡلَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ»[۲]. "کہنا مانو اللہ تعالیٰ کا اور رسول کا، امید ہے کہ تم رحم کئے جاؤ گے۔"

«مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ»[۳]. "جو شخص رسول کی اطاعت کرے اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی۔"

«قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ»[۴]. "آپ فرما دیجئے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ کی اور تم اطاعت کیا کرو رسول کی۔"

« وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهَاكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوا »[۵]. "اور رسول تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو۔"

اور آیات اس بارے میں بہت زیادہ ہیں اور وہ اس طور پر واضح ہیں کہ دوسرے بیان کی محتاج نہیں ہیں، اس کے باوجود احادیث شریفہ بھی وارد ہوئی ہیں، تاکہ اس معنیٰ کو مؤکد کر دیں، اور میدان تطبیق میں اس کو ثابت کر دیں، یہاں تک کہ ہر حال میں مکمل اطاعت وفرمانبرداری صرف اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی ہو، فراخی و تنگی، راحت و تکلیف اور دیگر تمام احوال میں۔

ابو سعید بن المعلی سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

"میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا، میں نے کوئی جواب نہ دیا، پھر میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نماز پڑھ رہا تھا، (اس لیے جواب نہ دے سکا) تو آپ ﷺ

(۱) آل عمران: ۳۲

(۲) آل عمران: آیت: ۱۳۲

(۳) نساء: آیت: ۸۰

(۴) سورۂ نور: آیت: ۵۴

(۵) سورہ حشر: آیت: ۷

نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے:

﴿ اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ﴾[1].

" اللہ اور رسول کے کہنے کو بجالایا کرو جبکہ رسول تم کو تمھاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہیں۔"

اس حدیث میں جو بیان و وضاحت ہے اطاعت کے معنی و مراد کی، وہ کافی ہے۔

اور حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے جن کے پاس ہدی نہیں تھی ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے احرام سے حلال ہو جائیں اور اسی کو عمرہ گردانیں، تو بعض لوگ پس و پیش کرنے لگے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

"آپ میرے یہاں غصہ اور ناراضگی کی حالت میں تشریف لائے، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کو کس نے ناراض کیا؟ اللہ اس کو جہنم رسید کرے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تو یہ نہ سمجھ پائی کہ میں نے لوگوں کو ایک چیز کا حکم دیا تو اس میں تردد کرنے لگے؟"۔[2]

آپ کا غضب محض ان لوگوں کے تردد کی وجہ سے تھا اور یہ ان لوگوں کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ کے ان پر غضب کے خوف سے تھا، اور غزوۂ احد کا سبق ناقابل فراموش سبق ہے۔

لہذا آپ ﷺ کی اطاعت مسلمان کے لیے اولین فرائض و واجبات میں سے ہے اور اس کے بغیر وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔

جزاء و ثواب:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ

"اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ

---

(۱) سورۂ انفال: آیت: ۲۴

(۲) مسلم: رقم: ۱۲۱۱

الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ أُولَٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾(۱). تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء، اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔''

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''میری امت کا ہر فرد جنت میں داخل ہوگا، اس آدمی کے سوا جس نے میرا انکار کیا، صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول کون ہے جس نے انکار کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے میرا انکار کردیا''۔(۲)

ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے والے کی قدر و منزلت اور رتبے میں اسی ایک آیت کریمہ اور حدیث شریف پر اکتفاء کرتے ہیں، کیونکہ ان دونوں میں کافی شافی بیان و وضاحت ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے رسول کے مطیع و فرمانبرداروں میں سے بنائے۔(آمین)

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اطاعت کے کچھ نمونے:

اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں شاندار مثالیں قائم کردیں، اولاً تو اس شان میں بہت سی آیات میں وارد اللہ تعالیٰ کے امر کی تعمیل کرتے ہوئے اور ثانیاً آپ کی اس محبت کے تقاضے پر لبیک کہتے ہوئے جو ان کے نفوس میں جمی ہوئی تھی اور چونکہ محب جس سے محبت کرتا ہے اس کا وہ مطیع ہوا کرتا ہے۔

اور اگر ہم اس کی مسلسل مثالیں بیان کرنے لگیں تو یہ مقام بھی تنگ ہو جائے گا، لہٰذا ہم اس یکتا و نایاب مقدس گروہ کی آپ ﷺ کی اطاعت کے بیان کے لیے دلیل کے طور پر کچھ مثالوں پر اکتفاء کرتے ہیں۔

ابوداؤد نے حضرت جابرؓ سے روایت تخریج کی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

''جب آپ ﷺ جمعہ کے دن منبر کے پاس تشریف فرما ہوئے؛ آپ نے فرمایا: ''اجلسوا'' یہ ارشاد عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی سنا تو مسجد کے دروازے پر ہی بیٹھ گئے، جب رسول اللہ ﷺ نے ان

(۱) مسلم شریف: رقم: ۲۲۰۳

(۲) بخاری: رقم: ۷۲۸۰

کو دیکھا تو فرمایا: اے عبد اللہ بن مسعود! آجاؤ"۔ (۱)

عبد اللہ بن مسعودؓ نے رسول اللہ ﷺ کا فرمان "اجلسوا" سنا تو انھوں نے اپنے آپ کو ایک قدم آگے چلنے کی اجازت نہ دی اور جہاں تھے وہیں بیٹھ گئے۔

اور یہ ابو عبد الرحمن فہریؓ ہیں؛ فرماتے ہیں:

"میں حنین میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک تھا اور ہم انتہائی سخت گرمی کے موسم میں چل رہے تھے، پس ہم درخت کے سایہ تلے ٹھہر گئے، جب زوال شمس ہو چکا تو میں اپنی زرہ پہن کر گھوڑے پر سوار ہو گیا، پھر خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہو گیا اور آپ اپنے خیمہ میں تشریف فرما تھے، میں نے عرض کیا: السلام علیك یا رسول الله ورحمة الله وبرکاته؛ کوچ کا وقت ہو چکا؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں! پھر آپ نے آواز دی: اے بلال! تو وہ ایک دم ببول کے درخت کے نیچے سے نکل آئے، گویا ان کا سایہ پرندے کا سایہ ہے: پھر انھوں نے عرض کیا: لبیك وسعدیك"۔ (۲)

حضرت ابو عبد الرحمن کا ہمارے لیے بیان کردہ یہ واقعہ ہمیں یہاں ابھار رہا ہے کہ حضرت بلالؓ نے جیسے ہی نبی ﷺ کی آواز سنی فوراً ہی لبیک وسعدیک کہتے ہوئے نکل پڑے، ان کا سایہ گویا پرندے کا سایہ ہے اور یہ آپ کی انتہائی سرعت و تیزی کو بیان کرنا ہے کہ ان کے قدم زمین پر پڑے ہی نہیں اور ان کے قدموں نے زمین کو روندا ہی نہیں، گویا ان کا سایہ پرندے کے سایہ کی طرح ظاہر ہوا۔

اور اسید بن ظہیرؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

"ہمارے پاس رافع بن خدیج تشریف لائے اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے تمھارے حق میں نفع بخش امر سے تم کو روکا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت تمھارے حق میں زیادہ نفع بخش ہے"۔ (۳)

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۱۰۹۱

(۲) ابوداؤد: رقم: ۵۲۳۳

(۳) اخرجہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ، واصلہ عندا لشیخین

اور اس طرح یہاں حضرت رافع کو اس امر کی تنفیذ میں کوئی تردد نہ ہوا پس اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت تمھارے حق میں زیادہ نفع بخش ہے۔ (۱)

اور غزوۂ بنی المصطلق جس میں رئیس المنافقین کی وہ حرکت سرزد ہوئی جسے سورۃ المنافقون نے بیان کیا ہے، اسی غزوہ میں عبداللہ بن عبداللہ بن ابی —یہ رئیس المنافقین کے فرزند ہیں — رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب ان کو اپنے باپ کی حرکت وواقعہ کی بابت علم ہوا تو عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ عبداللہ بن ابی کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں، اس حرکت کی وجہ سے جو اس کے بارے میں آپ کو پہنچی ہے، اگر آپ یہ کرنے ہی والے ہیں تو مجھے ہی اس کا حکم فرمادیں، میں آپ کی خدمت میں اس کا سر اٹھا کر لے آؤں گا، خدا کی قسم! آپ کو معلوم ہے کہ خزرج میں کوئی بھی شخص مجھ سے زیادہ اپنے والد کا فرمانبردار نہیں ہے، مجھے خوف ہے کہ آپ میرے علاوہ کسی دوسرے کو اس کے قتل کا حکم دیں اور وہ اسے قتل کردے؛ پھر لوگوں کے درمیان اپنے باپ کے قاتل کو چلتا پھرتا دیکھ کر مجھے بھی میرا نفس نہ چھوڑے حتی کہ میں اس کو قتل کردوں، نتیجۃً میں ایک کافر کے بدلے میں کسی مومن کو قتل کرنے والا بن جاؤں۔

جی ہاں! اس میں تو شک ہی نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ ﷺ اگر بیٹے کو اپنے باپ کے قتل کا حکم فرمادیتے تو وہ اسے کر گزرتے؛ لیکن آپ ﷺ نے (ان کو جواب میں) ارشاد فرمایا: بلکہ ہم اس کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کریں گے، اور ہم اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے جب تک وہ ہمارے ساتھ رہے۔ (۲)

اور ہمارے سامنے حضرت محیصہ رضی اللہ عنہ کا قصہ گزرچکا ہے، جبکہ ان کے بھائی حویصہ نے ابن سبینہ یہودی کو قتل کرنے کے بارے میں ان کی سرزنش کی؛ تو محیصہ نے اپنے بھائی کو یہ جملے کہے: مجھے اس کو قتل کرنے کا ایسے شخص نے حکم دیا کہ اگر وہ مجھے تیرے قتل کا حکم دیتے تو میں تیری بھی گردن اڑادیتا۔

جی ہاں یہاں محیصہ کی بات کی سچائی میں کوئی شک نہیں۔

---

(۱) یہ حدیث کچھ پیداوار کے بدلے میں زمین کو بٹائی پر کاشت کے لیے دینے کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے۔
(۲) ابن کثیر نے سورہ منافقین میں اپنی سند سے اسحاق سے اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

اور یہاں اس اطاعت سے بڑھ کر کوئی اطاعت ہے بھی نہیں؛ کیونکہ یہ تو صحابۂ رسول ہیں۔

حکم اور سفارش کے درمیان فرق:

اور یہاں مناسب ہے کہ ہم آپ ﷺ کے امر اور آپ کی شفاعت کے درمیان فرق کی طرف رہنمائی کردیں۔

پس امر تو واجب التنفیذ ہے اور آپ ﷺ کی اطاعت فرض ہے۔

بہر حال شفاعت تو وہ آپ ﷺ کا کسی چیز میں رغبت کرنا ہے اور یہ شفاعت جس سے سفارش کی ہے اس کے اوپر (قبول وعدم قبول کے لیے) چھوڑ دیا جاتا ہے (اب اس کو اختیار ہے) اور عمومی طور پر صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی سفارش قبول کر لیتے تھے اور ہم ان میں سے ہر دو حالت کی (یعنی سفارش قبول کرنا اور نہ کرنا) مثال بیان کرتے ہیں۔

حضرت کعب بن مالک کا ابن ابی حدرد کے ذمہ کچھ قرض تھا، مسجد میں ان کی ملاقات ہوگئی تو انہوں نے اپنے قرض کا ان سے مطالبہ کیا حتی کہ ان دونوں کی آواز بلند ہوگئی جو رسول اللہ ﷺ نے سن لی، اس وقت آپ اپنے دولت خانہ میں تشریف فرما تھے تو آپ ان دونوں ہی کے لیے نکلے اور حجرہ مبارکہ کا پردہ ہٹا کر آواز دی:

"اے کعب! تو حضرت کعبؓ نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول! حاضر ہوں، تو آپ نے فرمایا: ان کا اتنا معاف کردو اور آدھا دین معاف کرنے کی سفارش کی، حضرت کعب نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول! میں نے معاف کردیا، پھر آپ نے ابن ابی حدرد سے فرمایا: اٹھو اور ان کے (آدھے) دین کی ادائیگی کرو"۔ (۱)

پس آپ ﷺ کا حضرت کعب سے نصف دین معاف کردینے کا مطالبہ سفارش ہے، امر (حکم) نہیں ہے، اور حضرت کعب کو اختیار تھا کہ وہ آپ کی اس رغبت پر لبیک کہہ کر سفارش قبول کرلیں اور یہ بھی اختیار تھا کہ اس رغبت کو (قبول نہ کرتے ہوئے) چھوڑ دیں؛ لیکن انھوں نے آپ ﷺ کی سفارش قبول کرتے ہوئے نصف قرض معاف کردیا۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۵۷، م: ۱۵۵۸

اور یہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا باندی تھیں جو آزاد ہو گئیں اور ان کے شوہر غلام تھے، جب وہ آزاد ہو گئیں تو انھوں نے آزادی کے سبب اپنے شوہر سے نکاح فسخ کر دیا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے شوہر غلام تھے جن کو مغیث کہا جاتا تھا، گویا میں ان کو (ابھی) دیکھ رہا ہوں کہ وہ حضرت بریرہ کے پیچھے روتے ہوئے چکر کاٹ رہے ہیں، اور ان کے آنسو داڑھی پر بہہ رہے ہیں؛ تو نبی ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے عباس! کیا حضرت مغیث کی بریرہ سے محبت اور حضرت بریرہ کی مغیث سے نفرت سے تمھیں تعجب نہیں ہوتا؟ پھر نبی ﷺ نے بریرہ سے عرض کیا: اگر تو ان سے رجوع کر لے۔ تو حضرت بریرہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ آپ کا مجھے حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: بلکہ میں تو سفارش کر رہا ہوں۔ حضرت بریرہؓ نے عرض کیا: مجھے ان میں کوئی حاجت ورغبت نہیں ہے''۔[1]

اور حضرت بریرہؓ نے آپ ﷺ کی سفارش قبول نہ کی، اس وجہ سے کہ ان کے دل میں اس آدمی سے نفرت جم گئی تھی اور وہ ان کے ساتھ زندگی گزر بسر کرنے پر قادر نہ تھیں۔

اس واقعہ سے ہمارے سامنے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نفوس میں آپ ﷺ کے حکم اور سفارش کے درمیان فرق کرنے کی سمجھ اور فہم کیسے جمی ہوئی تھی حتی کہ یہ چیز باندیوں کو بھی معلوم تھی۔

---

(۱) بخاری: رقم: ۵۲۸۳

دوسری فصل

نبی ﷺ کی محبت کے واجب ہونے میں

یہ محبت ایمان کے لیے شرط ہے:

شیخین اور دیگر محدثین نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تخریج کی ہے؛ وہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"تم میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔(۱)

بخاری اور نسائی نے ابوہریرہؓ سے حدیث کی تخریج کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والدین اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔(۲)

دونوں حدیثیں اس طور پر واضح ہیں کہ کسی شرح کی محتاج نہیں ہیں، اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اور قاضی عیاض کے کلام میں ہے کہ یہ ایمان کی صحت کے لیے شرط ہے"۔(۳)

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے! نبی ﷺ کی محبت اللہ کی محبت کے ساتھ مقرون ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلۡ اِنۡ كَانَ اٰبَآؤُكُمۡ وَ اَبۡنَآؤُكُمۡ وَ اِخۡوَانُكُمۡ وَ "آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے

(۱) بخاری: ۱۵، و مسلم: ۴۴، والنسائی: ۵۰۲۸، وابن ماجہ: ۶۷، والدارمی: ۲۷۴۱

(۲) بخاری: رقم: ۱۴، نسائی: رقم: ۵۰۳۰

(۳) فتح الباری: ۵۹/۱

أَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ أَمْوَالُ ِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ »(۱).

بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیبیاں اور تمھارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں خسارے سے تم ڈرتے ہو، اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں، اور اللہ تعالیٰ حکم عدولی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا۔"

حضرت انسؓ سے مروی ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
"تین خصلتیں جس میں بھی ہوں گی وہ ایمانی حلاوت محسوس کرے گا؛ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اس کے نزدیک ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں، اور انسان کسی سے محض اللہ ہی کی خاطر محبت کرے اور کفر میں لوٹنے کو اسی طرح ناپسند کرے جس طرح آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے"۔(۲)

کمال محبت اور کمال ایمان:

بخاری نے عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں:
"ہم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے اور آپ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ میرے نفس کے سوا ہر چیز سے مجھے زیادہ محبوب ہیں، تو آپ نے فرمایا: نہیں، قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے؛ حتی کہ میں تمھارے نفس سے بھی زیادہ تم کو محبوب ہو جاؤں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یہ تو ابھی ہے، خدا کی قسم! آپ مجھے اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب ہیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! اب یہ چیز مکمل ہوئی"۔(۳)

---

(۱) سورۂ توبہ: آیت: ۲۴
(۲) بخاری: رقم: ۱۶، مسلم: ۴۳، ترمذی: ۲۶۲۴، نسائی: ۵۰۰۲، ابن ماجہ: ۴۰۳۳
(۳) بخاری: رقم: ۶۶۳۲

آپ ﷺ سے محبت کرنے کا ثواب:

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے:

"ایک شخص نے نبی ﷺ سے سوال کیا: قیامت کب ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اور تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی؟ اس نے کہا: کچھ بھی نہیں، مگر اتنی چیز ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے خوب محبت کرتا ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت کرتا ہے۔

اور ایک روایت میں ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: تم نے اس کی کیا تیاری کی؟ گویا کہ وہ شخص عاجز ہو گیا (جواب دینے سے) پھر اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے بہت زیادہ صوم و صلوٰۃ اور صدقہ کر کے تو کوئی تیاری نہیں کی، لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں، تو آپ نے فرمایا: تم اس کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت کرتے ہو۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم کسی چیز سے اتنے خوش نہ ہوئے جتنے آپ ﷺ کے اس فرمان سے ہوئے کہ تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت کرتے ہو۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ سے محبت کرتا ہوں اور حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ سے محبت کرتا ہوں اور ان سے محبت کی وجہ سے میں ان کے ساتھ ہوں گا، اگرچہ میں ان حضرات کی طرح عمل سے خالی ہوں"۔[۱]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

"ایک شخص بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا، اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو کسی ایسی قوم سے محبت کرتا ہے جن کو اس نے پایا بھی نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا: انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔"۔[۲]

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کے مانند مروی ہے۔"۔[۳]

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے؛ انھوں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول! انسان کسی قوم سے محبت تو کرتا ہے اور ان کی طرح اعمال کی سکت نہیں

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۶۸۸، ۷۱۵۳، م: ۲۶۳۹

(۲) متفق علیہ: رقم: ۶۱۶۹، م: ۲۶۴۰

(۳) متفق علیہ: رقم: ۶۱۷۰، م: ۲۶۴۱

رکھتا ہے؛آپ نے فرمایا: اے ابوذر! تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے محبت کرتے ہو، انھوں نے عرض کیا: میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں،آپ نے فرمایا: تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت کرتے ہو، حضرت ابوذرؓ نے پھر اسی کا اعادہ کیا تو آپ نے بھی وہی جواب دہرایا"۔[(۱)]

آپ ﷺ کی محبت کے آثار:

محبت ایک کیفیت ہے جس کا جائے قرار دل ہے،اور دل میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کے آثار کا اعضاء وجوارح پر ظاہر ہونا امر لابدی ہے،اور اسی وجہ سے محبت فقط دعوی نہیں ہے، کہ زبان سے وہ نکالا جائے؛ بلکہ وہ تو ایک عاطفہ اور کیفیت ہے جو دل پر چھا جاتی ہے،اور اسی وقت انسان کے تمام تصرفات وہی رنگ پکڑ لیتے ہیں جس میں انسان کا دل مشغول ہوتا ہے اور اسی پر اس کا نفس قابض ہو جاتا ہے۔

ہم یہاں مختصراً اس کے بعض آثار کا تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) آپ ﷺ کی اقتداء کرنا:

قاضی عیاض فرماتے ہیں: یہ بات خوب سمجھ لو کہ جو شخص کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو وہ اس کو ترجیح دیتا ہے،اس کی موافقت کو مقدم کرتا ہے،ورنہ وہ اپنی محبت میں سچا نہیں ہے، صرف مدعی ہے، پس نبی ﷺ کی محبت (دعوی) میں سچا وہ شخص ہے کہ جس پر اس محبت کی علامتیں ظاہر ہوں اور سب سے پہلی علامت آپ ﷺ کی اقتداء کرنا ہے،آپ کی سنتوں کو عمل میں لانا ہے،آپ کے اقوال وافعال کی پیروی کرنا ہے اور آپ کے اوامر کو بجالانا اور آپ کی منع کردہ چیزوں سے بچنا ہے، فراخی وتنگی، خوشی وغمی میں آپ کے آداب اور طریقے اختیار کرنا ہے"۔[(۲)]

(۲) آپ کی لائی ہوئی شریعت پر رضامندی:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ

"پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان والے نہ

---

(۱) اخرجہ ابوداؤد:۵۱۱۶،والترمذی:۲۷۸۷

(۲) الشفاء:۵۷۱/۲

بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا »[1].

ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ کو حکم قرار دیں پھر آپ کے اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کرلیں۔''

کوئی شخص اپنے دل میں آپ ﷺ کے کسی چیز کے فیصلے سے حرج اور تنگی محسوس کرے تو اس کو اپنے ایمان کا احتساب کرنے کے لیے مراجعت کرنی چاہیئے۔

(۳) آپ ﷺ کا کثرت سے ذکر:

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: اور آپ ﷺ سے محبت کی علامات میں آپ کا کثرت سے ذکر کرنا ہے، کیونکہ جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کا تذکرہ بھی بہت زیادہ کرتا ہے''۔[2]

اور یہ تو مجرب حقیقت ہے اور کیسے وہ آپ کا تذکرہ کثرت سے نہ کرے جبکہ وہ اپنی ایک ایک حالت میں آپ ﷺ کی ایک ایک سنت پر عمل کرتا ہے، یا آپ ﷺ کے ایک ایک فعل کی اقتداء کرتا ہے، یا آپ ﷺ کے ہر قول کا تذکرہ کرتا ہے۔

(۴) آپ ﷺ سے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھنا اور آپ ﷺ سے بغض وعدوات رکھنے والے سے بغض وعداوت رکھنا:

جو آپ ﷺ سے محبت کرے گا تو وہ ان لوگوں سے بھی محبت کرے گا جن سے آپ محبت کرتے ہیں اور وہ ان سے نفرت کرے گا جن سے آپ نفرت کرتے ہیں۔

اور آپ ﷺ نے آل بیت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت کا حکم دیا ہے، لہذا آپ ﷺ سے محبت کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ کے پاکیزہ اہل بیت اور معزز صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت کرے اور اس سلسلے میں وارد احادیث نبویہ بہت زیادہ ہیں۔

صحابہؓ کی آپ ﷺ سے محبت کے کچھ نمونے:

یہ ایک وسیع باب ہے، سیرت بہت سے ان وقائع سے بھری پڑی ہے جن سے صحابہ رضی اللہ

---

(۱) سورۂ نساء: آیت: ۶۵

(۲) الشفاء: ۵۷۲/۲

عنہم اجمعین کی آپ ﷺ سے انتہائی محبت ظاہر ہوتی ہے اور سیرت میں کوئی بھی خبر نہیں ہوتی مگر اس کے پیچھے اسی محبت کا کردار ہوتا ہے، جو کلمات یا واقعات کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے، اور ہم اس میں سے کچھ ہی مثالیں ذکر کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ کے معاہدات اور گفت وشنید میں قریش کی طرف سے نبی ﷺ کی خدمت میں آنے والے وفد میں سے ایک عروہ بن مسعود بھی تھے، جب وہ قریش کے پاس واپس لوٹے تو کہنے لگے:

"اے لوگو! خدا کی قسم! میں کئی بادشاہوں کے سامنے حاضر ہوا ہوں اور میں قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے پاس بھی پہنچا ہوں۔ خدا کی قسم! میں نے کبھی کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر تعظیم کرتے ہوں جتنی اصحاب محمد، محمد (ﷺ) کی تعظیم کرتے ہیں"۔ (۱)

اور عمرو بن العاص فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا، اور نہ میری نگاہوں میں آپ سے زیادہ کوئی لائق تعظیم تھا، اور نہ میں احتراماً آپ ﷺ کی طرف آنکھیں بھر کر دیکھنے کی سکت رکھتا تھا اور اگر مجھ سے آپ ﷺ کا حلیہ بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا ہوں؛ کیونکہ میں آپ کو آنکھیں بھر کر دیکھتا ہی نہیں تھا"۔ (۲)

فتح مکہ کے موقع پر جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابو سفیان کو نبی ﷺ کے پاس لے آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے ان کو قتل کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے حریص تھے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: اے عمر، ٹھہرو، خدا کی قسم! یہ بنی عدی میں سے ہوتے تو تم یہ نہ کہتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عباس! ٹھہریئے، جس دن سے آپ اسلام لائے اس وقت سے آپ کا اسلام لانا میرے نزدیک خطاب کے اسلام سے زیادہ محبوب ہے، اگر وہ بھی اسلام لے آتے تو اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں، مجھے معلوم ہے کہ آپ کا اسلام رسول اللہ ﷺ کو خطاب کے اسلام سے زیادہ محبوب ہے، اگر وہ بھی اسلام لے آتے"۔ (۳)

---

(۱) بخاری: رقم: ۲۷۳۲

(۲) مسلم: رقم: ۱۲۱

(۳) سیرت ابن ہشام: ۲/۴۰۳

معرکہ اُحد ختم ہونے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: کون میرے پاس سعد بن ربیع کی خبر لے آئے گا؟ ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں، پس اس نے تلاش کیا تو ان کو مقتولین کے درمیان میں زخمی پایا اور ان میں ابھی رمق باقی ہے، راوی بیان کرتے ہیں: میں نے ان سے کہا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں تحقیق کروں کہ کیا تم زندوں میں ہو یا مردوں میں؟ انھوں نے کہا میں مرے ہوؤں میں سے ہوں، رسول اللہ ﷺ کو میری طرف سے سلام پہنچا دینا اور عرض کر دینا کہ سعد بن ربیع نے آپ کے حق میں یہ کہا: اللہ آپ کو اس سے کئی گنا بہتر بدلہ دے جو وہ کسی نبی کو اس کی امت کی طرف سے دیا کرتا ہے، اور اپنی قوم کو بھی میری طرف سے سلام پہنچا دینا اور ان کو یہ کہہ دینا کہ سعد بن ربیع نے آپ لوگوں کو یہ کہا ہے: تمھارا کوئی عذر خدا کے یہاں قبول نہ ہو گا جب تم نبی سے دور رہو اور جب تک تمھارے پاس حرکت کرنے والی آنکھیں ہیں، پھر تھوڑے ہی وقت میں ان کا انتقال ہو گیا۔"۔ (۱)

اور یہ رسول اللہ ﷺ معرکہ بدر سے پہلے صفیں درست فرما رہے ہیں اور آپ کے ہاتھ میں تیر ہے، جب آپ سواد بن غزیہ کہ پاس پہنچے تو ان کو صف سے نکلا ہوا دیکھا، تو آپ نے فرمایا: اے سواد! سیدھے ہو جاؤ، سواد نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے؛ آپ مجھے چھوڑ دیں کہ میں آپ سے بدلہ لوں، تو آپ ﷺ نے تیر ان کے ہاتھ میں دیدیا اور ان کے سامنے اپنا جسم مبارک رکھ دیا تو سواد آپ سے گلے مل کر بوسہ دینے لگے۔

آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ: اس فعل پر آپ کو کس چیز نے ابھارا؟ تو عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! موت کا وقت ہے جیسا آپ دیکھ رہے ہیں، تو میں نے چاہا کہ میری آپ سے آخری ملاقات اس طرح ہو کہ میری چمڑی آپ کی جلد مبارک سے مس کر لے، آپ ﷺ نے ان کے لیے دعاءِ خیر کی۔" (۲)

غدر و خداع کے اس واقعے میں جس کو عضل اور قارہ نے انجام دیا اور وہ واقعہ سیرت میں یوم

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۹۴/۲

(۲) سیرت ابن ہشام: ۶۲۶/۱

الرجیع سے معروف ہے، اس کے آثار میں سے زید بن دثنہ اور خبیب بن عدی کا قریش کے ہاتھوں بیچا جانا ہے۔

جب زید قتل کے لیے لائے گئے تو ابو سفیان نے ان سے کہا: اے زید، میں تمھیں خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تمھیں یہ پسند ہے کہ ہمارے سامنے اس وقت تمھارے بجائے محمد ہوں، جن کی گردن ماری جائے اور تم اپنے اہل و عیال کے درمیان موجود ہو؟ انھوں نے جواب دیا: خدا کی قسم! مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ محمد اس وقت جس جگہ بھی ہوں وہاں ان کو ایک کانٹا چبھے جس سے ان کو تکلیف ہو اور میں اپنے اہل و عیال کے درمیان بیٹھا رہوں۔ ابو سفیان نے کہا: میں نے لوگوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو کسی سے ایسی محبت کرے جیسی اصحاب محمد، محمد سے کرتے ہیں۔ (۱)

عمرۃ القضاء کے موقع پر رسول اللہ ﷺ حرم میں احرام کی حالت میں داخل ہوئے اور صحابہ کرام کنگن کے کلائی کا احاطہ کرنے کی طرح آپ کا احاطہ کئے ہوئے تھے، اہل مکہ سے آپ کو بچانے کی غرض سے، اس خوف سے کہ ان میں سے کوئی آپ ﷺ کو تیر مارے، سب کے پیش نظر یہ تھا کہ تیر آپ ﷺ کو لگنے کے بجائے اس کو لگے۔ (۲)

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تو اس سلسلے میں بے شمار واقعات ہیں۔ اسی میں سے ایک واقعہ وہ ہے جس کو ابو سعید خدریؓ نے بیان کیا ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ارشاد فرمایا: ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا کہ وہ دنیوی خوشحالی اور چمک دمک لے لے، یا وہ جو اللہ کے پاس ہے، تو اس بندے نے وہ اختیار کیا جو اس کے پاس ہے، تو حضرت ابو بکرؓ رونے لگے اور کہنے لگے؛ ہمارے آباء واجداد اور ہماری مائیں آپ پر قربان، تو ہم ان پر تعجب کرنے لگے اور لوگ کہنے لگے کہ اس بوڑھے کو دیکھو؛ رسول اللہ ﷺ خبر دے رہے ہیں ایک ایسے بندے کی جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیوی خوشحالی اور نعمتوں اور اپنے یہاں موجود چیزوں کے درمیان اختیار دیا اور یہ وہ کہتے ہیں: آپ پر ہمارے آباء اور مائیں قربان، پس رسول

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱۷۲/۲

(۲) بخاری: رقم: ۱۷۹۱

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہ بندے تھے جن کو اختیار دیا گیا اور ابو بکر صدیقؓ ہی آپ کو ہم میں سے سب سے زیادہ جاننے والے تھے"۔ (۱)

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے سچ کر دکھایا اور صحابہؓ نے بھی سچ کر دکھایا، بس انھوں نے اپنی جانیں نچھاور کر دیں اور کئی صحابہ نے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظروں کے سامنے ہی جام شہادت نوش فرمایا:

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا مطلب:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرنا اس دین میں فرض ہے، جیسا کہ ہم ماسبق میں ذکر کردہ نصوص میں دیکھ آئے ہیں۔

اور وہ یہ ہے کہ اطاعت فرض ہے اور وہ مسلم امر ہے، لہذا انسان حسبِ استطاعت: اس امر کو بجالائے جو اس کو پہنچا ہے، محبوب یا مبغوض شخص کی طرف سے؛ جب تک انسان کی قدرت اور طاقت میں ہو، بہرحال محبت فرض ہے اور یہ ایسا امر ہے کہ اس کو اس دین کی طبیعت اور مزاج سے ناواقف لوگ نادر اور تعجب خیز سمجھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محبت ایک کیفیت ہے اور کیفیات دائرۂ امر و نہی کے تحت داخل نہیں ہیں؛ بلکہ یہ شخص ارادے کے دائرہ عمل میں بھی داخل نہیں ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا: اے اللہ! میری یہ تقسیم اس میں ہے جس کا میں مالک ہوں، پس تو اس میں مجھے ملامت نہ کرنا جس کا تو مالک ہے، اور میں مالک نہیں ہوں۔ (۲) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: مراد قلب ہے۔

پس محبت کا جذبہ ان چیزوں میں نہیں ہے کہ جن پر انسان کنٹرول کر سکے، بغیر ارادہ واختیار انسانی نفس کے پاس آتی ہے، بزور امر و حکم اس کو نفس میں داخل ہونے سے شریعت روکتی ہے، بسا اوقات انسان کسی چیز کو مجبور و مکرہ ہونے کی صورت میں انجام دیتا ہے، اور جبر واکراہ قواعد شریعت کے مطابق مردود ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۳) اور اس انکار کے باوجود محبت وہ رشتہ ہے جو مسلمانوں اور اس کے

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۹۰۴، م: ۲۳۸۲

(۲) اس کی تخریج اصحاب سنن اور دارمی نے کی ہے، دیکھو مؤلف کی کتاب: زوائد السنن علی الصحیحین: ۵۴۰۴

(۳) سورۃ البقرۃ: آیت: ۲۵۶

نبی کے درمیان اور مسلمانوں اور اس کے دین کے درمیان کے ربط کو مضبوط کرتا ہے، اور یہ ایسی امتیازی شان ہے کہ انسانی تعلقات اس کو نہیں جانتے، الاّیہ کہ یہ اسی منہج سے پیدا ہوئی ہو۔(۱)

اور ایک اٹھایا جانے والا سوال یہ ہے: اس محبت کی تفسیر ہم کیسے کریں گے؟

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: اور محبت کی حقیقت انسان کا اپنے موافق چیز کی طرف مائل ہو جانا اور انسان کا اس کے موافق ہو جانا:

- یا تو اپنے ادراک سے اس کی لذت حاصل کرنے کی وجہ سے ہو گا، جیسے خوبصورت چہرے، اچھی آوازیں، لذیذ خورد و نوش کی اشیاء اور اس کے مانند عمدہ چیزوں سے محبت، یہ چیزیں ہیں کہ ہر طبع سلیم اپنے موافق ہونے کی وجہ سے اس کی طرف مائل ہوتی ہے۔
- یا تو حاسّۂ عقل و قلب سے شریف باطنی معانی کا ادراک کر کے لذت حاصل کرنے کی وجہ سے جیسے نیک صالح لوگ، علماء، اہل خیر حضرات اور ان سے منقول اچھی سیرت اور بہترین افعال و اقوال سے محبت؛ کیونکہ انسانی طبیعت اس جیسے لوگوں کے ساتھ مشغول ہونے کی طرف مائل ہوتی ہے۔
- یا تو کسی شخص کے احسانات و انعامات کی وجہ سے طبیعت اس شخص سے موافقت و ہم آہنگی محسوس کرے گی، اور محبت کرنے لگے گی، اور ظاہر ہے کہ نفس انسانی اپنے محسن سے طبعی طور پر محبت کرتا ہے۔

جب یہ ثابت ہو چکا تو یہ تمام اسباب تمھیں آپ ﷺ کی ذات اقدس میں نظر آئیں گے اور تمھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ آپ ﷺ محبت کو واجب کرنے والے مذکورہ تینوں معانی کے جامع ہیں۔

بہر حال حسن صورت اور ظاہری جمال و خوبصورتی؛ اور اخلاقی و باطنی کمال؛ تو یہ دونوں چیزیں سابق میں کتاب کے گزرے ہوئے اوراق میں ہم اس طرح ثابت کر چکے ہیں کہ اب اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔

---

(۱) اضواء علی دراسۃ السیرۃ: ص: ۱۶-۱۷

رہ گیا آپ کا امت پر انعام واحسان، نرمی، رحم وکرم، ان کو سیدھی راہ کی ہدایت کرنا، ان کے ساتھ شفقت، ان کو جہنم سے چھڑانا اور یہ کہ آپ مومنین پر مہربان رحم وکرم کرنے والے تمام عالموں کے لیے رحمت وبشارت دینے والے، ڈرانے والے، اللہ کے حکم سے لوگوں کو اس کی دعوت دینے والے اور روشن چراغ ہیں۔

آپ ﷺ کے تمام مومنین پر احسان سے بڑھ کر اب کون سا احسان مرتبہ کے اعتبار سے عظیم الشان اور نتیجہ وبدلہ کے اعتبار سے بڑا ہوگا؟ کیونکہ وہ امت کے لیے ہدایت کا ذریعہ، ان کو گمراہی سے نکالنے والے، ان کو فلاح وبہبود کی طرف دعوت دینے والے، اپنے رب سے ملاقات کا وسیلہ، ان کی شفاعت کرنے والے، ان کے بارے میں گفتگو کرنے والے، ان کے حق میں گواہی دینے والے اور ان کے لیے دائمی بقاء اور ابدی جنت واجب کرنے والے ہیں۔

اور جب کسی بادشاہ سے اس کی حسن سیرت کی وجہ سے طبعی طور پر محبت کی جاتی ہے یا کسی حاکم سے اس کے حسن انتظام کی وجہ سے محبت کی جاتی ہے یا کسی واعظ دور افتادہ سے اس کی علمی شہرت یا کریمانہ اخلاق کی وجہ سے محبت کی جاتی ہے تو جس ذات میں یہ تمام کمالات انتہائی اعلیٰ درجہ میں پائے جاتے ہیں، وہ محبت کی زیادہ حقدار اور میلان کی زیادہ مستحق ہوگی، ان کا کلام تلخیص کے ساتھ ختم ہوا"۔ (۱)

اور اسی طرح قاضی عیاض نے آپ ﷺ سے محبت کو تین اسباب میں منقسم کیا ہے:

(۱) جمال وخوبصورتی (۲) کریمانہ اخلاق (۳) عظیم الشان احسانات۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اسباب کا اپنے موضوع میں بڑا درجہ ہے، لیکن ان تمام کی اصل واساس ہے "معرفت"۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: معرفت وادراک کے بعد ہی محبت متصور ہوسکتی ہے، اس لیے کہ انسان اسی سے محبت کرتا ہے، جس کو اچھی طرح جانتا پہچانتا ہے"۔ (۲)

اور امام غزالیؒ کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے میں کہتا ہوں:

---

(۱) الشفاء للقاضی عیاض: ۵۷۹/۲۔۵۸۱، اور یہ تفصیل —واللہ اعلم— امام غزالی کی احیاء علوم الدین سے ماخوذ ہے۔

(۲) احیاء علوم الدین: ۳۶۲/۲

آپ ﷺ سے عداوت کرنے والے بہت سوں نے آپ کی شخصیت سے ناواقفیت اور آپ سے بُعد کی وجہ سے عداوت و دشمنی کی، اگر ان کو آپ سے قربت و میل جول کا موقع ملتا، اس وقت ان کا موقف دوسرا ہوتا، اور سیرت میں اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

شیخین نے حضرت ابوہریرہؓ سے حدیث کی تخریج کی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

''نبی ﷺ نے نجد کی طرف ایک لشکر بھیجا تو وہ بنو حنفیہ کے ایک آدمی کو پکڑ لائے؛ جن کو ثمامہ بن اثال کہا جاتا ہے، لوگوں نے ان کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا، جب نبی ﷺ ان کی طرف نکلے تو آپ نے پوچھا: اے ثمامہ تمھارے پاس کیا ہے؛ انھوں نے کہا: اے محمد! میرے پاس خیر ہے، اگر تم مجھے قتل کروگے تو ایک قصاص والے کو قتل کروگے، اگر احسان کروگے تو ایک شکر گزار آدمی پر احسان کروگے، اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو جو چاہیں مانگ لیں۔

ان کو اسی حال پر چھوڑ دیا گیا حتی کہ دوسرا دن ہوا؛ پھر آپ نے ان سے پوچھا: اے ثمامہ! آپ کے پاس کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: وہی ہے جو میں نے کل بتایا، اگر آپ احسان کریں گے تو ایک شکر گزار آدمی پر احسان کریں گے۔ پھر ان کو چھوڑ دیا حتی کہ تیسرا دن ہوا تو پھر آپ نے ان سے پوچھا: اے ثمامہ! تمھارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے جواب دیا: وہی جو میں نے کل بتایا: آپ نے فرمایا: ثمامہ کو چھوڑ دو۔

وہ مسجد کے قریب ایک باغ میں چلے گئے، غسل کر کے پھر مسجد میں آئے اور کہنے لگے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اے محمد خدا کی قسم! اس روئے زمین پر میرے نزدیک آپ سے زیادہ مبغوض چہرہ کوئی نہ تھا، اب آپ کا چہرۂ انور میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہو گیا، اور خدا کی قسم! میرے نزدیک سب ے زیادہ مبغوض آپ کے دین سے کوئی دین نہیں تھا، اب آپ کا دین مجھے سب سے زیادہ محبوب ہو گیا، اور خدا کی قسم! آپ کے شہر سے زیادہ مبغوض شہر میرے نزدیک کوئی دوسرا شہر نہیں تھا، اب آپ کا شہر مجھے سب سے زیادہ محبوب ہو گیا''۔[1]

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۴۳۷۲، م: ۱۷۶۴

حضرت ثمامہ کو یہ کلی تغیر مسجد نبوی میں تین دن قید کی حالت میں مقیم ہونے کے درمیان پیش آیا، اسی مدت کے دوران رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو قریب سے پہچان لیا تو ان کے نفس پر چھائی ہوئی تاریکیاں منتشر ہو گئیں، اور نفس پر نبی ﷺ کے احوال وصفات منور ہو گئے، ان کے نفس سے رسول، ان کا دین اور ان کے شہر کا بغض ختم ہو گیا، اور اس کی جگہ محبت جم گئی۔ اس پورے واقعے میں کھلا ہوا ظاہری سبب وہ معرفت ہی ہے۔

اور یہ حضرت ابوسفیان کی بیوی حضرت ہندہ بنت عتبہ ہے، اور وہ نبی ﷺ سے بغض وعداوت اور کینہ میں مشہور تھی اور وہ فتح مکہ کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی:

اے اللہ کے رسول! روئے زمین پر کسی خیمہ والوں کی تذلیل مجھے آپ کے خیمہ والوں کی تذلیل سے زیادہ پسند نہ ہونا چاہیے تھی، اب مجھے ہر خیمہ والے سے آپ کے خیمہ والوں کی تکریم وتوقیر عزیز تر ہے۔ راوی کہتے ہیں: اور یہ بھی کہا: قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے"۔ (۱)

وہ کون سا سبب ہے کہ جس نے ان میں تغیر کر دیا؟ انھوں نے اعلی صورت میں عفو ودر گزر دیکھا، جس قوم نے آپ کو اپنے شہر سے نکالا اور جس شہر میں آپ نے اقامت کی اس میں بھی آپ سے مقابلہ اور جنگ کی، پھر آپ ان پر قابو یافتہ ہو گئے؛ اس کے باوجود نہ آپ نے ان سے بدلہ لیا نہ ان کی طرح ان کے ساتھ پیش آئے، بلکہ عفو ودر گزر کا معاملہ کیا۔

انھوں نے بڑی کامیابی اور فتح دیکھی، لیکن فتح مند آدمی اتراتے ہوئے اور تکبر کرتے ہوئے داخل نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ اللہ کی خاطر تواضع کرتے ہوئے اس کا شکر گزار اور ثناخواں بن کر داخل ہوتا ہے۔

یہ صورت حال ان تمام حالات کو دیکھنے والے کے سامنے ظاہر ہوتی ہے، تو یہ صورت اس چیز کو ختم کر دیتی ہے، جس پر بغض وکینہ کی بنیاد تھی۔

اور اگر ہم سیرت سے مثالیں بیان کرنے لگیں تو یہ مقام ہم پر طویل ہو جائے گا، لیکن ہم اتنی ہی مثالوں پر اکتفاء کرتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک مثال قربت کی وجہ سے ہونے والی معرفت کے مختلف رنگ پیش کر رہی ہے۔

---

(۱) متفق علیہ: رقم: ۳۸۲۵، م: ۱۷۱۴

محبت کی ابتداء کیسے ہوتی ہے؟:

ہم یہ بات موکد کررہے ہیں کہ محبت اختیاری عمل نہیں ہے، اسی وجہ سے اس میں امر و نہی نفع بخش ثابت نہیں ہوتا، اور مجھے یہ لگتا ہے کہ محبت کی ابتداء پسندید گی سے ہوتی ہے، پھر مختلف عوامل واسباب کی بدولت یہ پسندید گی پختہ ہو کر محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اور قاضی عیاض کے ذکر کردہ یہ تینوں امور محبت کے وجود میں آنے کے بعد اس کو موکد کرنے کے سہارے ہیں۔

امام مسلمؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسلام کی خاطر جس چیز کا بھی سوال کیا گیا آپ نے سائل کو وہ چیز دے دی۔ راوی فرماتے ہیں: ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دو پہاڑوں کے درمیان کی بکریاں اس کو عطاء کردیں، وہ اپنی قوم میں واپس لوٹا تو کہنے لگا: اے لوگو! اسلام قبول کرلو؛ اس لیے کہ محمد اتنی بخشش دیتے ہیں کہ فاقے کا خوف نہیں رہتا۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص محض دنیا حاصل کرنے کے ارادے سے اسلام لانا چاہتا ہے تو (ہوتا یہ ہے کہ) اسلام لاتے ہی خود اسلام اس کو دنیا اور اس کی نعمتوں سے زیادہ محبوب ہو جاتا ہے''۔ (۱)

یقیناً یہی شخص جس کا حضرت انسؓ نے ذکر کیا، کوئی شک نہیں کہ وہ بہت ہی زیادہ ایسی جود و سخا اور کریمانہ صورت کے سامنے تھا کہ جس نے اس کی عقل لے لی اور اس کی پسندید گی چرالی، لیکن یہی اعجاب و پسندید گی اس کے بعد بڑی محبت میں تبدیل ہو گئی۔

اور اس معنی کی صفوان بن امیہ نے تائید کی جس وقت انھوں نے کہا:

''خدا کی قسم! مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت کچھ دیا اور یقیناً وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض تھے، لیکن وہ مجھے برابر دیتے رہے حتی کہ وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہو گئے''۔ (۲)

---

(۱) مسلم: رقم: ۲۳۱۲

(۲) مسلم: ۲۳۱۳

پس صفوان بن امیہ کو پہلی عطاء و بخشش میں صرف اعجاب تھا، پھر یہ اعجاب و پسندیدگی بڑھتے بڑھتے محبت میں تبدیل ہو گیا۔

آپ ﷺ سے محبت پر ابھارنے والے اسباب:

آپ ﷺ سے محبت پر ابھارنے والے اسباب بہت زیادہ ہیں، ان کو قاضی عیاض نے سابق الذکر تین امور میں مجملاً ذکر کر دیا۔

اور ہم ان کے ساتھ چوتھے سبب کا بھی اضافہ کرنا چاہتے ہیں، شاید وہی ان تمام میں اصل ہے، وہ یہ ہے کہ محبت کا بنیادی مبعث و سبب آپ ﷺ کا اللہ کا رسول ہونا ہے اور جب اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتے ہیں کہ اپنی رسالت کا منصب کسے عطا کریں (اور اللہ تعالیٰ نے یہ منصب آپ ﷺ کو عطا کیا) تو رسول اللہ ﷺ ہی اس وصف اور اس مرتبہ کی وجہ سے سب سے انسب ٹھہرے۔

اور ہمارا آپ ﷺ سے محبت کرنا یقیناً اس پر ابھارنے والا عنصر ہمارا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا ہے، اور ہمارا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہم سے محبت کرنا محض اس رسول کریم ﷺ کے واسطے سے ہے تو اب ہمارے لیے اس مقام و مرتبہ کا اندازہ لگانا ممکن ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دیا ہے اور جس پر آپ ﷺ کو فائز کیا۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ»(۱).

"آپ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو، خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے، اور تمھارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑی عنایت فرمانے والے ہیں۔"

تم اللہ تعالیٰ سے اپنی محبت ثابت کرنا چاہتے ہو تو تمھارے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے جو آپ ﷺ سے ہو کر گزرتا ہے، اور وہ ہے آپ ﷺ کی اطاعت و اتباع۔

اور جب تمھاری طرف سے اتباع رسول ہو گی تو یقیناً تمھیں اللہ تعالیٰ کی محبت بھی اس آیت کریمہ کی رو سے حاصل ہو جائے گی، اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے؟

---

(۱) سورۂ آل عمران: آیت: ۳۱

اور تمھارا آپ ﷺ کا متبع ہونا تم سے چاہتا ہے کہ تم آپ ﷺ کو پہچانو، اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی مقدس جماعت نے آپ ﷺ کے دیدار اور آپ ﷺ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی راہ سے آپ کو پہچان لیا اور یہ وہ شرف وسعادت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص کیا ہے تو ان کے علاوہ دوسرے لوگ سیرت پاک کو اس کے عام مفہوم میں دراستہ ومطالعہ کر کے اس معرفت پر قادر ہیں۔ اور سلف صالحین نے اس دراسہ ومطالعہ کے مقام ومرتبہ کو پہچانا ہے تو انھوں نے لوگوں کو اس پر ابھارا اور اس کی طرف دعوت دی ہے۔

زین العابدینؒ — علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب — فرماتے ہیں کہ : ہم مغازیٔ رسول کو اس طرح جانتے (سیکھتے) تھے جس طرح قرآن کی سورت کو جانتے (سیکھتے) ہیں اور مغازی سیرۃ النبی ﷺ کا ایک حصہ ہے۔[1]

ابن القیمؒ فرماتے ہیں: اور جب بندے کی سعادتِ دارین نبی ﷺ کے طور طریق پر موقوف ہے تو ہر وہ شخص جو اپنی ذات کا خیر خواہ ہو اور اپنے نفس کی نجات چاہتا ہو اس پر واجب ہے کہ آپ کے طور وطریق، اور آپ کی سیرت مقدسہ اور عادت شریفہ کو اس طرح جان لے کہ وہ آپ کی ذات اور شخصیت سے ناواقف اور جاہل لوگوں کی فہرست سے نکل جائے۔[2]

نیز محبِ رسول ﷺ کے بارے میں مزید فرماتے ہیں: پس انسان نبی ﷺ کو اسی طرح اپنا امام، معلم، استاذ شیخ اور قدوہ ونمونہ بنالے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا نبی، رسول اور اپنی طرف دعوت دینے والا ہادی بنایا، پس انسان آپ کی سیرت، امرِ نبوت کے مبادیات وقواعد، آپ پر نزول وحی کی کیفیت کا مطالعہ کرے، اور حرکات وسکنات میں آپ ﷺ کے آداب، نوم وبیداری، عبادات اور اپنے اہل وعیال واصحاب کے ساتھ معاشرت میں آپ ﷺ کے احوال، اخلاق، آداب جانے اور معلوم کرے حتی کہ وہ اس طرح ہو جائے گویا کہ آپ کے ساتھ آپ کے اصحاب کا ایک فرد (بیٹھا ہوا) ہے۔[3]

---

(۱) البدایہ والنہایۃ: ۲۴۲/۳

(۲) زاد المعاد: ۶۹/۱

(۳) مدارج السالکین: ۲۶۸/۳

تیسری فصل

نبی ﷺ پر درود و سلام کے بیان میں

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا حکم:

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا»[1].

”بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں پیغمبر پر، اے ایمان والو! تم بھی آپ ﷺ پر درود اور سلام بھیجو۔“

صلوۃ کا معنی اور آیت کریمہ کا مطلب:

ابو العالیہ فرماتے ہیں: صلاۃ اللہ: اللہ کی صلاۃ ملائکہ کے سامنے آپ ﷺ کی تعریف و ثنا کرنا ہے، اور صلاۃ الملائکۃ: فرشتوں کا دعا کرنا“۔[2]

حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں فرماتے ہیں: اور یہ تمام اقوال میں سب سے بہتر قول ہے، پس اللہ تعالیٰ کی آپ پر صلوۃ کا مطلب آپ ﷺ کی ثناء و تعظیم ہے اور فرشتوں اور دوسروں کی صلوۃ سے مراد اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے آپ کے لیے اس کا سوال اور دعاء کرنا ہے، اور مراد اس سے زیادتی کی دعاء کرنا ہے؛ نہ کہ نفس صلوۃ کا طلب کرنا“۔[3]

سید قطبؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا نبی ﷺ پر صلوۃ کا مطلب حق تعالیٰ کا ملاء اعلیٰ (یعنی عام فرشتوں یا مقرب فرشتوں) میں آپ کی ثنا کرنا ہے، اور فرشتوں کا صلوۃ ان کا آپ ﷺ کے لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعا کرنا ہے، کیا ہی بلند مرتبہ ہے درود شریف کا، کہ عالم وجود کا رواں رواں باری تعالیٰ

---

(۱) سورہ احزاب: آیت: ۵۶

(۲) بخاری نے کتاب التفسیر میں اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں تخریج کی ہے۔

(۳) المواہب اللدنیہ: ۳۲۹/۳

کی ثنائے نبی کو دہراتا ہے، اور اس کی برکت سے پوری کائنات روشن ہو جاتی ہے، اور یہ ثناء ازلی، قدیم، ابدالآباد، باقی رہنے والی اندرون وجود ثابت و قائم ہو جاتی ہے، اور اس عظیم نعمت اور اس عظیم تکریم کے بعد کوئی نعمت اور کوئی تکریم کوئی معنی نہیں رکھتی۔

انسان کا درود و سلام اللہ تعالیٰ کے ملاء اعلیٰ میں صلوۃ و سلام اور فرشتوں کے صلوۃ و سلام کے بعد کیا حیثیت رکھتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ مومنین کو عزت بخشنا چاہتے ہیں کہ ان کے صلاۃ و سلام کو اپنے صلاۃ و سلام کے ساتھ ملا رہے ہیں، اور اس طریقے سے ان کو عالم بالا و کریم، ازلی و قدیم کے ساتھ جوڑ رہے ہیں"۔ (۱)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود کا طریقہ:

عبد الرحمن بن ابی لیلی سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں: مجھے کعب بن عجرہ ملے تو کہنے لگے: کیا میں آپ کو ایسا ہدیہ نہ دوں جو میں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! وہ مجھے دے دیجیئے، تو انھوں نے فرمایا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! آپ اہل بیت پر صلوۃ کا کیا طریقہ ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے، ہم کیسے آپ پر سلام بھیجیں تو آپ نے فرمایا: یہ الفاظ کہو:

اللّٰہم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی إبراهیم وعلی آل إبراهیم إنك حمید مجید"۔ (۲)

ابو حمید ساعدیؓ سے مروی ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ پر کس طرح درود بھیجیں؟ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اللّٰہم صلّ علی محمد وأزواجه وذریته، کما صلّیت علی آل إبراهیم ، وبارك علی محمد وأزواجه وذریته، کما بارکت علی آل إبراهیم ، إنّك حمید مجید"۔ (۳)

ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں؛ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ تو آپ پر سلام ہے، اب ہم آپ پر درود کیسے بھیجیں؟ تو آپ نے فرمایا: یہ کہو:

---

(۱) فی ظلال القرآن: ، تفسیر آیت کریمہ۔
(۲) بخاری: رقم: ۳۳۷۰، مسلم: رقم: ۴۰۶
(۳) متفق علیہ: رقم: ۳۳۶۹، م: ۴۰۷

اللھم صل علی محمد عبدك ورسولك كما صليت على إبراھیم، وبارك على محمد وعلى آل محمد، كما باركت على إبراھیم وعلى آل إبراھیم ''۔ (۱)

ابو مسعود انصاریؓ کی حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ الفاظ کہو:

اللّٰھم صل على محمد وعلى آل محمد كما صليت على آل إبراھیم وبارك على محمد وعلى آل محمد، كما باركت على آل إبراھیم في العالمين، إنك حميد مجيد ''

اور سلام تو تم جانتے ہی ہو۔ (۲)

اور آپ ﷺ کا یہ فرمان ''اور سلام تو تم جانتے ہی ہو'' وہ ہے جو دعاء تشہد میں وارد ہے: ''السلام علیك ایھا النبی ورحمة الله وبر کاته۔'' (۳)

اور زید بن خارجہ کی حدیث میں ہے؛ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر درود بھیجو اور دعاء میں محنت و کوشش کرو اور یہ پڑھو: اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد''۔ (۴)

اور نبی ﷺ پر درود بھیجنے کا حکم عام ہے، اور اس میں بہترین صیغے وہ ہیں جو احادیث صحیحہ میں وارد ہیں۔

آپ ﷺ پر درود بھیجنے کے مواقع:

ہم وہ بعض مواقع ذکر کرتے ہیں جس میں آپ ﷺ پر درود بھیجنا مشروع ہے۔

اسی میں سے ایک مقام:

نماز میں تشہد کے بعد، فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز میں دعاء کرتے ہوئے سنا: اس شخص نے نہ تو اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی بیان کی، اور نہ آپ ﷺ پر درود بھیجا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس نے جلدی کی، پھر اس کو بلایا اور اس سے یا کسی دوسرے سے کہا: جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اللہ کی حمد وثنا

---

(۱) بخاری: رقم: ۶۳۵۸

(۲) مسلم: رقم: ۴۰۵

(۳) یہ، حدیث ابن مسعود کا حصہ ہے، بخاری: رقم: ۸۳۵، مسلم: رقم: ۴۰۲

(۴) نسائی: رقم: ۱۲۹۱

سے ابتداء کرے پھر نبی ﷺ پر درود بھیجے، اس کے بعد جو چاہے دعاء کرے''۔ (۱)

اس میں سے ایک موقع: مسجد میں داخل ہونے کے وقت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو چاہیئے کہ نبی ﷺ پر سلام بھیجے، پھر یہ پڑھے: اللھم افتح لی ابواب رحمتك (اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیجئے) پھر جب مسجد سے نکلے تو یہ پڑھے: اللھم انی اسألك من فضلك (اے اللہ! میں تجھ سے تیرے فضل کا سوال کرتا ہو''۔ (۲)

اسی میں سے: اذاان کے بعد: عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''جب تم مؤذن کی آواز سنو تو اسی طرح کہو جس طرح مؤذن کہتا ہے، پھر مجھ پر درود بھیجو، اس لیے کہ جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے، اللہ اس پر اس کے بدلے دس رحمتیں بھیجیں گے، پھر اللہ سے میرے لیے وسیلہ کا سوال کرو؛ کیونکہ یہ جنت میں ایک درجہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے کسی ایک بندے کے مناسب ہے، اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں، لہٰذا جس نے میرے لیے وسلیہ مانگا تو اس کے لیے میری شفاعت مباح ہو گئی''۔ (۳)

اور ہر اس وقت میں جس میں نبی ﷺ کا ذکر آئے۔

آپ ﷺ پر درود بھیجنے کی فضیلت:

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے تو اللہ اس پر دس (رحمتیں) نازل فرماتے ہیں''۔ (۴)

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے تو اللہ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتے ہیں، اس کی دس

---

(۱) ابوداؤد: رقم: ۱۴۸۱، ترمذی: ۳۴۷۶، نسائی: ۱۲۸۳

(۲) ابوداؤد: رقم: ۴۶۵، وابن ماجہ: ۷۷۲، والدارمی: ۱۳۹۴

(۳) مسلم: رقم: ۳۸۴، وہو عند ابی داؤد والترمذی، والنسائی

(۴) مسلم: رقم: ۴۰۸

خطائیں معاف فرماتے ہیں، اور اس کے دس درجات بلند کر دیئے جاتے ہیں"۔ (۱)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: اس شخص کی ناک خاک آلود ہو کہ جس کے پاس میرا ذکر ہو، اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے، اور اس شخص کی ناک بھی خاک آلود ہو کہ جس پر رمضان مبارک آیا، اور بنا اس کی مغفرت کیے ہوئے گزر گیا، اور اس شخص کی ناک بھی خاک آلود ہو کہ جس کے والدین اس کے پاس بوڑھے ہوئے، اور (اس شخص کے اُن کی خدمت نہ کرنے کی وجہ سے) وہ اس کو جنت میں داخل نہ کرا سکے"۔ (۲)

حسین بن علی بن ابی طالب سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"وہ شخص بخیل ہے جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے"۔ (۳)

ابو طلحہ سے مروی ہے:

"رسول اللہ ﷺ ایک دن اس حال میں تشریف لائے کہ آپ کے چہرۂ انور پر خوشی تھی، ہم نے عرض کیا: ہم آپ کے چہرے پر خوشی کے آثار دیکھ رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا: میرے پاس فرشتہ آیا تھا، اس نے کہا: اے محمد! آپ کے رب فرماتے ہیں: کیا آپ اس سے راضی نہیں کہ آپ پر جب کوئی درود بھیجے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمت بھیجیں گے اور آپ پر جب کوئی سلام بھیجے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر دس سلام بھیجیں گے"۔ (۴)

اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کو درود و سلام پہنچانا:

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"تم اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ، اور میری قبر پر جشن نہ مناؤ، اور مجھ پر درود بھیجو، کیونکہ تمھارا درود مجھے پہنچایا جاتا ہے، جہاں کہیں تم ہو"۔ (۵)

---

(۱) نسائی: رقم: ۱۲۹۶

(۲) ترمذی: رقم: ۲۵۴۵

(۳) ترمذی: رقم: ۳۵۴۶

(۴) نسائی: رقم: ۱۲۸۲، والدارمی: ۲۷۷۳

(۵) ابوداؤد: رقم: ۲۰۴۲

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے؛ وہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ کے زمین پر گھومنے والے فرشتے ہیں جو میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے ہیں''۔[1]

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کوئی بھی شخص مجھ پر سلام نہیں بھیجتا ہے مگر اللہ تعالیٰ مجھے اپنی روح میں واپس لوٹاتے ہیں تاکہ میں اسے سلام کا جواب لوٹاؤں''۔[2]

آپ پر درود بھیجنے کا فائدہ:

آپ پر درود بھیجنے کے فائدے بہت ہیں اور یہ تمام فائدے مجموعی طور پر اس کی طرف لوٹتے ہیں جو آپ پر درود بھیجتا ہے۔

ہم ان میں سے بعض فائدے یہاں ذکر کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک: اللہ کے حکم کی بجاآوری کے نتیجہ میں اس کا تقرب حاصل ہونا جیسا کہ فرمایا:

«اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا»[3]

''بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں پیغمبر پر، اے ایمان والو! تم بھی آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجو۔''

نبی ﷺ کے حقوق میں سے ایک حق کی ادائیگی ہوتی ہے، اور وہ تو بہت ہیں۔

ابن عبدالسلام فرماتے ہیں: ہمارا آپ ﷺ پر درود بھیجنا آپ ﷺ کے حق میں شفاعت نہیں ہے، اس لیے کہ ہم جیسے آپ کی شخصیت کی شفاعت نہیں کر سکتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو ان لوگوں کے معاوضہ و مکافئہ کا حکم دیا ہے جو ہمارے محسن ہیں، لہذا اگر اس سے عاجز ہو تو دعاء کے ذریعے مکافات کریں، تو اللہ تعالیٰ نے ہماری آپ پر درود بھیجنے کی طرف رہنمائی فرمائی، جب اس نے یہ جان لیا کہ ہم اپنے نبی کو بدلہ پہنچانے سے عاجز ہیں''۔[4]

---

(۱) نسائی: ۱۲۸۱، والدارمی: ۲۷۷۴

(۲) ابوداؤد: رقم: ۳۰۴۱

(۳) سورۂ احزاب: ۵۶

(۴) المواہب اللدینیہ: ۳۲۲/۳

اور انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ جب ہم نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں، تو ہم یہ پڑھتے ہیں: ''اللھم صل علی محمد'' تو اس دعا کے ذریعے ہم اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ وہ آپ پر رحمتیں نازل فرماوے اور دعاء خود عبادت ہے۔

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں؛ انھوں نے فرمایا:

''دعاء خود عبادت ہے، تمھارے رب نے فرمایا: ''اُدْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ''۔ (۱) مجھ کو پکارو، میں تمھاری درخواست قبول کرلوں گا''۔ (۲)

اور جب تم نبی ﷺ پر بار بار درود بھیجتے ہو، تو عبادت میں ہوتے ہو۔

اور یہ ثواب بھی ہے جو اس کے پڑھنے والے کے لیے اللہ کے یہاں ذخیرہ ہوتا ہے، اور ہمارے سامنے اس سلسلے میں وارد صحیح احادیث گزر چکی ہیں، اور ان سب میں سب سے مقدم حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے: جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا اللہ اس پر دس رحمتیں نازل کرتے ہیں۔

ان تمام فوائد کے بعد یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کی عزت افزائی (بلکہ ذرہ نوازی) ہے جیسا کہ سید قطب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درود کو اپنے درود کے ساتھ اور ہمارے سلام کو اپنی سلام کے ساتھ ملاتے ہیں۔

اب تو ہمارے لیے کیا ہی زیادہ بہتر ہے کہ ہم آپ ﷺ پر کثرت سے درود بھیجیں۔

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین، والحمد للہ رب العالمین۔

---

(۱) سورۂ غافر: آیت: ۶۰

(۲) ابوداؤد: رقم: ۱۴۶۹، والترمذی: رقم: ۲۹۶۹، وابن ماجہ: ۳۸۲۸